فیض احمد فیضؔ:
احوال و افکار
مرتب : مرغوب علی

فیض احمد فیضؔ: احوال و افکار

(مضامین)

مرتب: **مرغوب علی**

احوال و افکار

مرتب :

مرغوب علی

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

54-C/5، بے۔ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی ۔۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : فیض احمد فیضؔ : احوال وافکار (مضامین)
مرتب : مرغوب علی
پتہ : ۴۹۔دھرم داس، نجیب آباد۔(یو۔پی)
(Ph: 0134-220657)
تعداد : ۵۰۰

ناشر : انیس امروہوی
○ تخلیق کار پبلشرز
54-C/5، جے۔ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

سرِ ورق : مسعود التمش
کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲
مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۱(یو۔پی)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، نزد جے۔جے۔اسپتال، ممبئی۔۴۰۰۰۰۸

T.P.: 0256 ISBN-978-93-80182-72-8
FAIZ AHMAD FAIZ : AHWAL-O-AFKAR *(Articles)* 2013
Compiled By MARGHOOB ALI ₹ 500.00
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
54-C/5, J - EXTENSION, LAXMI NAGAR, DELHI-110092
Ph.:011-22442572, 9811612373 E-mail: qissey@rediffmail.com

○

ایس۔ سیّد

اور

اکرام تبسمؔ

کے نام

جو میرے لیے

چاند اور سمندر جیسے ہیں

جن کی شفقت اور محبت کا سایہ

سرمایۂ حیات ہے

○○
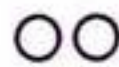
— مرغوب علی

PRIDE OF PERFORMANCE (ART)

ASLAM KAMAL

568-Jahanzeb Block, Allama Iqbal Town
Lahore. (Pakistan) Tel : (Res.) 7844954.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادر مکرم محمد حسن مرغوب صاحب قبلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپکی کتاب کے لئے کلامِ فیض کی مصوری
کے 8 فوٹوگراف پیش خدمت ہیں
قبول فرمائیے

والسلام مخلص
اسلم کمال

12-6-2011

حصہ اوّل : احوال

حصہ دوئم : افکار

حصہ سوئم : متفرقات

پیش لفظ

(۱)

فیضؔ احمد فیضؔ ۱۳؍فروری ۱۹۱۱ء میں گاؤں لاقادر میں پیدا ہوئے تھے جو تحصیل نارووال میں ہے۔ اُن کے والد سلطان محمد خان راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد مویشی چرانے کا کام کرتے تھے، لیکن مویشیوں کو چراگاہ میں چھوڑ کر پڑھنے کی للک لیے اسکول میں حاضر رہتے تھے اور اُسی گاؤں کے اسکول سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے انہوں نے بیرسٹر بننے اور سفیر افغانستان بننے تک کا بہت کٹھن وقت گزارا۔ فیضؔ کی پہلی والدہ شاہ افغان میر عبدالرحمٰن افغانی کی بھتیجی تھیں جو سلطان محمد خاں کے ساتھ بہت دن نہ رہ سکیں۔ ان کے انتقال کے بعد سلطان محمد خان نے پانچ شادیاں کی تھیں۔

فیضؔ کے والد سلطان محمد خاں نے جو دوسری شادی کی وہ تھیں فیضؔ کی والدہ محترمہ سلطان فاطمہ، جو زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ فیضؔ کی ابتدائی تعلیم مذہبی طریقے سے شروع ہوئی تھی۔ انہوں نے دو ''سی پارے'' حفظ کیے تھے کہ بیمار ہو گئے اور آگے قرآن پاک کو حفظ کرنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد اُنہیں مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کے مکتب میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور سیالکوٹ اسکاچ مشن ہائی اسکول سے ۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن

سے میٹرک پاس کیا۔ مرے کالج، سیالکوٹ سے فیض احمد فیضؔ نے فرسٹ ڈویژن سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا، آگے کی تعلیم کے لیے فیضؔ لاہور آگئے اور اپنے ساتھ اپنے والد کا خط بھی علامہ اقبالؔ کے نام لائے۔ اُن کے والد اور علامہ اقبالؔ لندن کے ایک سفر کے دوران ایک دوسرے کے دوست تھے۔ فیضؔ نے علامہ اقبالؔ کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے فارسی اور عربی کی مزید تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے بی۔اے اور پھر عربی سے بی۔اے۔ آنرز بھی کیا۔ ۱۹۳۳ء میں اسی کالج سے انگریزی میں ایم۔اے اور ۱۹۳۵ء میں اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں ایم۔اے کیا۔

کچھ عرصے بعد فیضؔ ۱۹۳۵ء میں امرتسر کے ایم۔اے۔او۔ کالج کے انگریزی کے شعبے میں لیکچرر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد کے عہدے پر تقرر ہوا۔

۱۹۴۲ء میں فیضؔ فوج میں کیپٹن کے عہدے پر تقرری کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور سے مستعفی ہو کر دہلی آگئے۔ کچھ وقت پہلے (۱۹۳۸ء میں) اُن کی ملاقات دین محمد تاثیر کی بیگم کی چھوٹی بہن ایلس سے ہوئی تھی اور دونوں طرف آگ برابر لگ گئی تھی جو بالآخر کافی جدوجہد کے بعد شادی میں بدل گئی۔ فیضؔ کی ایلس سے شادی ۱۹۴۱ء میں کشمیر میں ہوئی اور اُن کا نکاح شیخ محمد عبداللہ نے پڑھایا۔ فیضؔ کی والدہ نے دُلہن کا اسلامی نام کلثوم تجویز کیا۔ ۱۹۴۷ء میں فیضؔ کیپٹن کے عہدے سے مستعفی ہو کر میاں افتخارالدین کے انگریزی روزنامے ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر بنا دیے گئے۔

فیض کی دو بیٹیاں ہیں، سلیمہ (۱۹۴۲ء) اور منیرہ (۱۹۴۵ء)۔ فیض کی زندگی میں راولپنڈی سازش کیس (۱۹۵۱ء) کی بڑی اہمیت ہے، اور ان کے فن کو بھی اس زنداں نے عجیب نکھار اور شہرت بخشی۔ فیضؔ اس کیس کی پاداش میں تقریباً گیارہ برس مختلف جیلوں میں رہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب جنرل ایوب خاں نے عنان حکومت سنبھالی تب ایک بار پھر فیضؔ قید کر لیے گئے۔ وہ دسمبر ۱۹۵۸ء سے اپریل ۱۹۵۹ء تک جیل میں رہے۔ فیض احمد فیضؔ انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' کے علاوہ ''لیل و نہار'' ہفتہ وار

اور روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایفرو ایشین رائٹرز فیڈریشن کے ترجمان ''لوٹس'' کے بھی ایڈیٹر رہے ہیں۔ انہیں ۱۹۶۲ء میں دُنیا کے مشہور ''لینن'' ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ فیضؔ دمہ کے مریض تھے اور اُنہیں دل کا دورہ بھی پڑ چکا تھا۔

فیضؔ نے ایک عام شاعر و ادیب سے بہت اچھی زندگی گزاری۔ وہ ہمیشہ لوگوں کی محبت سے گھرے رہے۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے لوگ انہیں دیوانہ وار پیار کرتے تھے جن میں خواتین بھی پیچھے نہ تھیں۔ امرتا پریتم سے بات کرتے ہوئے انہوں نے اپنی عشقیہ زندگی کے بارے میں اِن الفاظ میں بتایا تھا......

''فیضؔ نے کہا۔ ''لے ہن تینوں دساں (لے میں تجھے بتاؤں) پہلا عشق اٹھارہ دریاں دی عمر وِچ کیتا سی (پہلا عشق اٹھارہ سال کی عمر میں کیا تھا) نقش فریادی کی ساری نظمیں میں نے اُسی عشق میں لکھیں۔''

''لیکن اُسے زندگی میں حاصل کیوں نہ کیا؟''

''ہمت کب ہوتی تھی اُس وقت زبان کھولنے کی، اس کا بیاہ کسی ڈوگرے جاگیردار کے ساتھ ہوگیا، پھر دوسرا عشق میں نے اس کے دس برس بعد 'ایلس' سے کیا۔''

''جو اَب تمہاری بیوی ہے۔''

''ہاں، میں سوچتا ہوں اچھا ہی کیا۔ زندگی کے جس اُتار چڑھاؤ سے میں گزرا ہوں، جیلوں میں بھی رہا، ایلس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو ان حالات سے نہ گزرا جاتا۔''

''پھر......؟''

''پھر ایک شناسا چھوٹی سی لڑکی تھی، وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اچانک محسوس ہوا کہ وہ بچی نہیں، بڑی حساس اور نوجوان خاتون ہے۔ میں نے پھر عشق کی گہرائی دیکھی۔ پھر اس نے کسی بڑے افسر سے بیاہ کرلیا۔ درد سے گھبرا گئی تھی۔''

''ایک تمہاری نظم ہے جس میں تم رقیب سے مخاطب ہو...... ''تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی / وہ رخسار وہ ہونٹ / زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے......''

یہ نظم اُس کے بارے میں تھی؟''

''نہیں، یہ تو پہلی کے بارے میں تھی، جس کی خاطر ''نقش فریادی'' کی نظمیں لکھیں۔''

''پھر......؟''

''جیل میں تھا جب کان میں بڑی تکلیف ہوگئی تھی۔ مجھے ہسپتال بھیجا گیا۔ وہاں ایک ڈاکٹر ہوتی تھی جس نے مجھ سے بے پناہ عشق کیا۔ یہاں سے یاد آیا کہ کئی بڑے پولیس افسر بھی تھے جو دن کو مجھ پر مقدمے کی کارروائی کرتے تھے اور رات کو اکیلے بیٹھ کر میری نظمیں گاتے تھے!''

''یہ ہوتی ہے شاعر کی طاقت۔ اچھا یہ بتاؤ...... ایلس کو تمہارے ان عشقوں کا علم ہے؟''

''ہاں، اصل میں وہ میری بیوی نہیں، میری دوست ہے۔ اس لیے زندگی چل سکی۔ عشق میں بہت درد ہوتا ہے، جبکہ دوستی میں ایک سکون ہوتا ہے۔''

اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب مزید عشق نہیں کروں گا۔ البتہ دوستی کروں گا جب بھی کوئی دوستی کے قابل ہوا۔''

(فیض احمد فیضؔ: تنقیدی جائزہ، مرتب: خلیق انجم، ص: ۳۰۰)

فیضؔ نے میو ہسپتال، لاہور میں ۲۰ر نومبر ۱۹۸۴ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں حفیظ جالندھری کے مزار کے قریب ابدی نیند سو گئے!

فیضؔ صدی کے حوالے سے مرتبہ یہ کتاب اپنے اندر فیضؔ پر لکھے گئے مضامین کا ایسا مجموعہ ہے جن کو پڑھ کر اُن کی زندگی، اُن کے فن اور اُن کے رُتبے سے اچھی طرح فیضیاب ہوا جا سکتا ہے۔

کتاب کے کچھ مضامین اگر فیضؔ کو محض خراج عقیدت کے طور پر لکھے گئے مضامین کا حصہ ہیں تو کچھ مضامین میں اُن کے فن سے ایسی بحث بھی کی گئی ہے جن سے پڑھنے والوں کو اُن نکات کی آگاہی بھی میسر آئے گی، جن سے موجودہ زمانے میں

واقفیت کم سے کم ہوتی جارہی ہے۔

جعفر علی خاں اثر، رشید حسن خاں، حمید نسیم، راہی معصوم رضا اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مضامین پڑھنے والوں کی دلچسپی کا صرف باعث ہی نہیں بنیں گے بلکہ ان مضامین سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔ ظ۔انصاری، قرۃالعین حیدر کے مضامین تنقیدی ہونے کے ساتھ سوانحی اشاروں سے بھی بھرے ہیں، جن میں ان خوبصورت یادوں کو پرو دیا گیا ہے جن سے گزرتے ہوئے فیض احمد فیضؔ کی مختلف جہات کا سامنا ہوتا ہے۔ اقبال مسعود کا رپورتاژ ایک بڑے شاعر کے پُرتپاک خیر مقدم اور اس کے اثر کو ہی اُجاگر نہیں کرتا بلکہ پڑھنے والے کو قدم قدم ساتھ لیے پھرتا ہے۔

فیضؔ پر زندگی کے تعلق سے اختر جمال اور خدیجہ بیگم کے مضامین اپنے اندر ایسی روشنی لیے ہوئے ہیں جن سے وہ راہیں بھی روشن ہو جائیں گی جن پر کسی کے نقش قدم نہیں۔ ایلس فیض کا مضمون ایک بیدار ذہن محبوبہ، محبت کرنے والی بیوی اور ہمدرد دوست کے کئی روپ کی دھوپ بکھیرتا محسوس ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا خاکہ بظاہر مخالفت میں لکھا گیا محسوس ہوتا ہے لیکن فیضؔ کی خوبیوں اور خامیوں کو پوری طرح پڑھنے والے کے سامنے رکھتا ہے۔ آغا ناصر نے اپنے دھیمے اور ٹھہرے ہوئے اندازِ تحریر میں فیضؔ کو پوری طرح منعکس کیا ہے۔

سرفراز اقبال کے نام فیض احمد فیضؔ کے خطوط عشق کے ایک اور دَر کو وَا کرتے ہیں۔ فیضؔ ان خطوط کے آئینے میں کتنے رنگوں کو اُنڈیل گئے ہیں، یہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مشفق خواجہ کا اس کتاب پر تبصرہ، (جو انہوں نے خامہ بگوش کے نام سے لکھا تھا) ایسی تحریر ہے جسے بار بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

''فیضؔ: مختصر زندگی نامہ'' میں انیس امروہوی نے فیضؔ کی زندگی کے واقعات اور اُن کے کاموں کی جو فہرست دی ہے وہ کسی بھی وقت فیضؔ پر کام کرنے والوں کے کام آسکتی ہے۔ امین الرحمٰن کا مضمون ''کلام فیضؔ: موسیقی کے روپ میں'' بے حد معلوماتی اور سنجیدگی سے کیا ہوا کام ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں بہت سے ایسے

مضامین بھی نظر سے گزرے جو محض فیضؔ کو چھوٹا کرنے یا اپنی جھنجلاہٹ کو بروئے کار لانے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ فیضؔ آج بھی ہمارے درمیان ہیں اور آنے والے وقت میں بھی نئی نئی نسلوں کے بیچ سانس لیتے رہیں گے۔

اس کتاب کو ترتیب دینے کا خیال انیس امروہوی (مدیر ''قصے'، مالک تخلیق کار پبلشرز، دہلی) کو ''فیضؔ صدی'' پر خصوصی پیش کش کے طور پر آیا تھا۔ ان کی ہی تحریک پر یہ تمام تحریریں جمع کی گئی ہیں۔ اُمید کرتا ہوں کہ قارئین اپنی رائے سے باخبر رکھیں گے۔

پاکستان کے مشہور، مقبول اور بہت پیارے مصور حضرت اسلم کمال کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے فیضؔ صدی کے حوالے سے بنائی گئی پینٹنگ کے عکس مجھے عنایت کئے۔ میں اُن تمام مضمونگار حضرات کا بھی تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے اپنے مضامین اس کتاب میں شامل کرنے کی اخلاقی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کا بھی شکریہ جس کا نام لینا ضروری نہیں مگر جس کو ہر وقت اس کام کی فکر لگی رہتی تھی، سائیں تیرا بھلا ہو......!!!

(۲)

فیض احمد فیضؔ پر مضامین کی ابتداء ہمیشہ یوں ہوتی ہے...... ''غالبؔ، اقبالؔ کی طرح فیضؔ مقبولیت کے اعتبار سے ان دونوں برگزیدہ اور عوامی مقبولیت کی انتہا کو پہنچے ہوئے شاعروں سے کسی طرح کم نہیں......'' اس پہلے جملے سے ہی پڑھنے والے کے ذہن میں ایک ایسا مضبوط اور پائیدار محل تعمیر ہو جاتا ہے کہ اُسے فیضؔ کو پڑھتے ہوئے ان دو بڑے شاعروں کے سائے سے نجات نہیں ملتی۔ فیضؔ پر جتنے مضامین موافقت میں لکھے گئے، اس سے کچھ کم نہیں تو برابر کے ان کی مخالفت میں بھی لکھے گئے ہیں، لیکن ہر مخالف مضمون نے ان کی مقبولیت میں اور اضافہ ہی کیا ہے۔ جبکہ ان کے ساتھ، قدم سے قدم ملا کر چلنے والے میراجی اور ن۔م۔ راشد بھی تھے۔ میراجی نے اپنے ہیئتی

نظام اور ہندوستانی اساطیر کے ذریعہ اپنی راہوں کو روشن کرتے ہوئے جدید نظم کو وہ سمت عطا کی جس کے بوتے پر آج نئی اُردو نظم بین الاقوامی نظم سے آنکھ ملانے کی جرأت رکھتی ہے۔ راشدؔ کے یہاں زبان اور بحروں کے تجربے اور انسانی نفسیات سے جگمگاتی بزم کا وہ جلوہ دکھائی دیتا ہے جو ہماری نئی نظم کے لیے ترقی کا اشاریہ ثابت ہوا۔ راشدؔ کے مفرد مصرعے بھی خود میں اتنی قوت رکھتے ہیں کہ ان پر سوچنے لگئے تو پوری اور مکمل نظموں کا احساس جاگتا ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں ن۔م۔ راشدؔ نے فیضؔ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا......

''فیضؔ کی شاعری اور ذہن میں فکری تساہل نے ایک ناگزیر عنصر کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ کسی بھی مسئلے کے بارے میں گہرائی سے نہیں سوچ سکتے۔ ان کی طبیعت میں تجربہ کاری کی صلاحیت تقریباً مفقود ہے۔ ہوسکتا ہے حقیقت یہ ہی رہی ہو، مگر اس دریافت پر خوش ہونے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حقیقتوں کی تعبیر کا ایک راستہ اعصاب اور احساسات سے ہوکر بھی جاتا ہے۔ تعقل کی سطح تاثر کے طور پر بھی سامنے آتی ہے۔ فیضؔ کے مزاج میں بے شک باریک بنی اور دُور رسی کی طلب کمزور تھی۔ چنانچہ اپنی نثر و نظم میں بھی فیضؔ کسی غیر معمولی نکتے کی تلاش میں سرگرداں نظر نہیں آتے۔ وہ چیزوں کو دیکھتے ہیں، ان سے تاثر قبول کرتے ہیں اور داؤ پیچ سے خالی اُسلوب اور صبح کے ساتھ اُجالے کی طرح دھیرے دھیرے پھیلتی ہوئی ستھری، سلجھی سوہنی زبان میں اس تاثر کو بیان کر دیتے ہیں، کلاسیکوں میں سوؔدا کے منطقی اُسلوب کی داد فیضؔ نے خوب دی۔ خواجہ حافظؔ شیرازی کی حیثیت بھی فیضؔ کے اپنے شخصی وجدان کے ایک سرچشمے کی تھی۔''

فیضؔ کے یہاں مذکورہ بیان کی طرح زبان اور ہیئت کی گلیوں کی چھل پہل نا کے برابر ہے۔ مگر ان کے لہجے کی مٹھاس اور لفظوں کی چاشنی کسی بھی شخص کو ایک شعر پڑھنے کے بعد ہی اپنے گہرے دوست میں تبدیل کر لینے کی طاقت ہی نہیں رکھتی بلکہ

ایک ایسے جادوئی اثر کا ملکہ بھی رکھتی ہے جس سے کسی بھی ذہن اور دل پر بھی وہ نقش بنتے چلے جاتے ہیں جو نہ مٹ سکتے ہیں نہ مٹائے جا سکتے ہیں۔ دھیمی دھیمی آنچ سے سلگتے لوبان کی خوشبو سے معطر فضا کو خلق کرنا اور اپنے مصرعوں میں لفظوں کے چراغ کی مدھم لو سے دِل کے اندھیروں میں روشنی بھرنا فیضؔ کی شاعری کا وہ کمال ہے جس سے ان کا دُشمن بھی اِنکار نہیں کر سکتا۔

اُن کے لہجے کی مٹھاس، لفظوں کے دروبست اور منظرنگاری کسی تعارف کی محتاج نہیں......

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور...... اُفق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم
اس قدر پیار سے اَے جانِ جہاں رکھا ہے
دِل کے رُخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

ترقی پسندوں میں اس لہجے، لفظیات اور میٹھے پن کا سایہ کئی شاعروں کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن فیضؔ کے اس خود پیدا کردہ لہجے کی غنائیت اور ایک احتیاط کے ساتھ لفظوں سے گلاب کے پھولوں کی نرماہٹ کا ریشمی سلوک کسی اور سے ممکن نہ ہو سکا۔ فیضؔ کی کئی نظمیں موضوع کے اعتبار سے ہی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ اپنے اثر اور طرزِ استعمال کے اعتبار سے بھی منفرد اور لامثال ہیں......

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اِک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اَب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

پوری نظم پڑھ لینے کے بعد ذہن پر جو منظر بنتا ہے، وہ ایک طرح کے افسردہ خیالات کو ہی جنم نہیں دیتا بلکہ اس حزنیہ کیفیت سے بھی دوچار کرتا ہے جو فیضؔ نے لفظوں کے ایک ایک دریچے میں کسی نوحہ کی طرح رکھ دی ہے۔ فیضؔ کو پڑھنے والے جانتے ہوں گے کہ ان کا یہی لہجہ ان سے دوستی کا باعث بنتا ہے......

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رَنگ رُخسار کی پھوار گری
رات چھائی تو کوئے عالم پر
تری زُلفوں کی آبشار گری

فیضؔ کے شعر واقعتاً آبشار کی طرح ہی ذہن پر گرتے اور اپنی گرفت کو مضبوط کرتے چلے جاتے ہیں۔ فیضؔ کے دوسرے مجموعے ''دستِ صبا'' سے فیضؔ کا ایک اور لہجہ تنومند ہوکر اُبھرنے لگتا ہے اور وہ عوام دوست اور انسانیت سے پُر راستوں پر گامزن ہو جاتے ہیں......

یہ خوُں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوُشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

یہاں مجھے فضیل جعفری کا ایک بیان یاد آتا ہے جو انہوں نے ''فیض عالمی سیمینار'' ۱۹۸۷ء میں لکھنؤ میں دیا تھا......

''کلامِ فیض کے بتدریج ارتقاء پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بڑی دانشمندی کے ساتھ اپنی شاعری کی اسٹریٹجی (Strategy) تیار کی تھی اور یہ ان کی ہوشمندی کا ہی نتیجہ تھا جو وہ اتنی کامیاب شاعری کر سکے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ انہوں نے نوجوانی کے زمانے میں سیاسی شاعری بہت کم کی۔ شاید وہ اس راز سے شعوری یا غیر شعوری طور پر آگاہ تھے کہ نوجوان شاعروں کے حق میں ان کے غیر معمولی اور غیر ضروری جوش وولولے کے سبب سیاسی شاعری عام طور پر سَمِ قاتل ہوا کرتی ہے۔''

(فضیل جعفری، فیض شخص اور شاعری، مرتب: اطہر نبی، ۱۹۹۱ء)

یہی وہ نکتہ ہے جس پر آگے چل کر فیض احمد فیض پر عالمی محبت کے در وا ہوئے اور وہ ''لوٹس'' جیسی میگزین کے ایڈیٹر اور لینن پرائز کے حقدار بنے۔

فیض نے جب لکھا......

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے
نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

○○

مت رو بچے
رو رو کے ابھی
تری امی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
ترے ابا نے
اپنے غم سے رُخصت لی ہے

○○

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے تو بَن دے رہا ہے تال
میں ایفریقا ہوں دھار لیا میں نے تیرا روپ

میں تو ہوں، میری چال ہے تیرے ببر کی چال

آ جاؤ افریقا..................

○○

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے
قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے!
جن کی راہ طلب سے ہمارے قلم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

○○

کون سخی ہے
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن، چھن، چھن، چھن
دھرتی کی پیہم پیاسی
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
جگمگ جگمگ رخشاں رخشاں

جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن

○○

...........تو ان سے محبت کرنے والے حیرت واستعجاب سے ان کی طرف دیکھنے لگے کہ انہیں تو ان کے اسی غنائی لہجے کی عادت سی ہو گئی تھی، جس میں حزنیہ کیفیت کے ساتھ ساتھ محبت کے گل اور گلزار کھلتے تھے......

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اُداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں
محبت کی دنیا پہ شام آچکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں

○○

درد سا درد ہے تنہائی سی تنہائی ہے
ایسی تنہائی کہ پیارے نہیں دیکھے جاتے
آنکھ سے آنکھ کے تارے نہیں دیکھے جاتے
درد سے درد کے مارے نہیں دیکھے جاتے
ضعف سے چاند ستارے نہیں دیکھے جاتے
ایسا سناٹا کہ شمشانوں کی یاد آتی ہے
دل دھڑکنے کی بہت دور صدا جاتی ہے

فیضؔ نے ''دست صبا'' کے نصف کے بعد ان ہی لفظوں سے گل کاری تو کی، ان کے لفظوں کا نظام بھی وہی رہا مگر جذبے اور موضوع میں جو آفاقیت آچکی تھی، اس

سے انہوں نے پھر کبھی پرانے کوچہ و بازار سے مفاہمت نہیں کی۔ وہ اپنی دھن میں پھر انسانیت پر جبر واستبداد اور ظلم کے خلاف لڑنے کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہے۔ سچ کے علمبردار ہو جانے پر ان کے لیے اپنی زمین اور وطن کے کتنی ہی بار در بند ہوئے، مگر ہر بار ان کے لہجے میں ایک آتش سیال بھرتی اور بڑھتی چلی گئی۔ وطن عزیز کی یادیں انہیں مستقل کچوٹتی رہیں۔ وہ ان سے بے حال ہوتے رہے، لیکن انہوں نے اپنی لے کو مدھم نہیں ہونے دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے وقار میں اضافہ اور ان سے محبت کرنے والوں کے خلوص میں ذرا بھی کمی نہ آسکے گی۔

فیضؔ اُردو کے ایسے اکیلے شاعر ہیں جنہیں جیتے جی وہ شہرت، محبت اور عزت کی دولت وافر مقدار میں میسر رہی جس سے ان کے قد کے کسی دوسرے آدمی کے آنگن میں نہ تو کوئی چاند اُترا نہ ہی کوئی پون چلی۔

ان کے لہجے کا جادو ان کے آخری ایام تک برقرار رہا۔ وہ جن منزلوں کو گرد کر چکے تھے، ان سے ہمیشہ آگے کی طرف ہی قدم رنجہ رہے......

مرے دل مرے مسافر
ہوا حکم پھر سے صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشناساں
ہمیں دن سے رات کرنا

کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شب غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

○○

فیضؔ نے کلاسیکی اشعار اور تراکیب سے اپنی شاعری کے در و دیوار پر وہ گل بوٹے سجائے کہ ان کی آواز کا غنائی اثر دل اور دماغ کو یوں جکڑ لیتا ہے کہ پڑھنے والا ان کے جادوئی آنگن میں داخل ہو کر عجیب فرحت و انبساط محسوس کرتا ہے۔

فیضؔ ہمارے دور کی وہ آواز بن گئے جنہیں فراموش کرنا یا جن سے یوں ہی گزر جانا ناگزیر لگتا ہے۔ ان کے شعری پیرائے نہ کل پرانے ہوئے تھے نہ آج پرانے لگتے ہیں اور آنے والے وقت میں ان کے شاعرانہ کمالات اور اچھی طرح کھلیں گے اور لوگ ان کے کلام سے آج سے زیادہ محظوظ ہوں گے کہ ان کے اس طرح کے مصرعے اور اشعار لافانی لبادہ اوڑھ کر امر ہو چکے ہیں......

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات

شام فراق اب نہ پوچھ آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے

......اور یہ مصرعے بھی دیکھئے......

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

جمے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھتا ہوں

کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتا ہوں

ان تمام اشعار اور جدا جدا مصرعوں میں فیضؔ کا لہجہ ہی نہیں بولتا بلکہ ان کی مشاقی اور مستقل ریاض بھی جلوہ فگن دکھائی دیتا ہے۔ ادھر کچھ لوگوں کا خیال یہ ہو چلا ہے کہ فیضؔ بہت عرصہ تک یاد رہنے والی شاعری کے شاعر نہیں ہیں۔ ممکن ہے یہ بات کچھ لوگوں کو اپیل کرنے لگے لیکن سطور بالا میں جو شعر اور مصرعے درج کیے گئے ہیں، کیا ان کو بھولنا آسان ہوگا اور کیا نئے پڑھنے والے اور آئندہ شعر و شاعری سے شغف رکھنے والے فیضؔ کی سخن طرازی سے بچ پائیں گے

فیضؔ اپنی تمام تر پرانی تراکیب اپنے لہجے اور شعری بساط کو ایک ایسے خوبصورت انداز، دل کو چھو لینے والے لفظوں اور انسانی ذہن کو بے کل کر دینے والے موضوعات کو اتنی خوبی اور لگاوٹ کے ساتھ بیان کر گئے ہیں کہ جب بھی انسان پر ظلم و زیادتی ہوگی، جب بھی کہیں مظلوم انقلابی حرارت محسوس کریں گے اور جب بھی جوانی کی کونپلیں پھوٹیں گی، فیضؔ کے کسی مصرعے، کسی شعر کی اُسے شدید ضرورت محسوس ہوگی۔ بہت سے نئے تجربے ہوں گے، بہت سے نئے لہجے تراشے جائیں گے اور بہت سی خوبصورت نظمیں اور شعر لفظوں کے نئے نئے پیراہن میں جلوہ گر ہوں گے، اور زندگی کی رنگا رنگی کی طرح بہت سے البیلے لکھنے والے آئیں گے، مگر اس سب کے باوجود فیضؔ ہمیشہ دلچسپی کا باعث بنے رہیں گے اور سدا تازہ بھی......!!

○○

— مرغوب علی

۱۵ر نومبر ۲۰۱۲، شام ڈھلے

حصہ اوّل : احوال

قرۃ العین حیدر

سرودِ شبانہ

ابھی چند روز قبل علی گڑھ میں، میں نے نواب مزمل اللہ خاں شیروانی کے صاحبزادے کی ذاتی لائبریری میں ایک نادر و بے بہا کتاب دیکھی جس کے سرورق پر شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے چند سطور میں اپنے ہاتھ سے سقوطِ بغداد کا احوال قلمبند کیا ہے۔ کس طرح مقول نے دجلہ عبور کیا وغیرہ۔ جلدی میں پوری عبارت نہ پڑھی جو کھجور سے بنی ہوئی روشنائی میں لکھی گئی تھی۔ آخر میں دستخط 'مصلح الدین المشتہر بہ سعدی'

شیخ سعدی نے بغداد کی تباہی دیکھی۔ تاتاریوں سے بچ کر نکلے تو فلسطین میں صلیبی جنگ جاری تھی، وہاں ان کو یوروپین فوجیوں نے پکڑ کر قید میں ڈال دیا۔ دس دینار دے کر جلب کے ایک تاجر نے چھڑایا۔ سعدی کی قیمت دس دینار لگی تھی۔

معاملہ سارا یہی ہے کہ ہر زمانے میں یورش تاتار کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتی ہے اور آج ان شہروں پر صلیبی سرداروں کی اولاد اور ان کے ساتھی گولہ باری میں مصروف ہیں۔

کن کن شاعروں نے دُنیا کو کیا کیا دیا اور دُنیا نے ان پر کیا ستم ڈھائے ان کی فہرست بنانا چاہیے، اس میں بھی آفت رسیدہ جہانِ سوئم کے شعرا ہی بازی لے جائیں گے۔

ہر عہد اپنے ایک شاعر کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ فیضؔ صاحب کا دور ہے اور یہ دور نقش فریادی کی اشاعت کے وقت سے چلا آ رہا ہے۔ فیضؔ صاحب کی کمیونزم، 'روس دوستی'، بھارت نوازی، پنجابیت، بے پناہ مقبولیت، یہ تمام چیزیں آپ کو کتنی ہی

کھلتی ہوں آپ ان کے متعلق کچھ نہیں کر سکتے۔ اب یہ نوبت آچکی ہے کہ مغرب کے Pop Stars کی Gruoupies کی طرح خواتین شہروں شہروں فیضؔ صاحب کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔

(حال ہی میں جب فیضؔ صاحب لکھنؤ گئے تھے، ایک اُردو روزنامے نے لکھا کہ فیض احمد فیضؔ پنجابی زبان کے علمبردار اور اُردو کے مخالف ہیں۔ لہٰذا اُن کی یہاں پذیرائی نہ کی جائے، اور بقول ڈاکٹر ایوب مرزا پاکستان کے چند اخبار ان کو 'بھارت نواز' کہتے ہیں۔ رہی ان کی کمیونزم تو وہ الم نشرح ہے۔) فیضؔ صاحب اب ایک Super Star ہیں۔ اُردو افسانہ ناول نگار کے برعکس اُردو شاعر ایک پرفورمنگ آرٹسٹ بھی ہوتا ہے۔ مشاعروں کے ذریعے اس کا گہرا رابطہ عوام سے قائم رہتا ہے اور وہ براہِ راست لوگوں کے دلوں سے بات کرتا ہے۔ فیضؔ صاحب ان خوش قسمت شعرا میں سے ہیں جو خواص وعوام دونوں کو خوش آتے ہیں حالانکہ موصوف بہت قابل ذکر پرفورمنگ آرٹسٹ نہیں ہیں۔ نہ ترنم سے پڑھتے ہیں نہ ان کا تحت لفظ تہلکہ خیز ہے مگر ان کا کلام اتنا سحر انگیز اور دِل پذیر ہے اور وہ شخصیت کا ایسا Charisma رکھتے ہیں جو بہت کم لوگوں کو میسر آیا ہے۔ دوسرے بہت اہم شاعر ن۔م۔ راشدؔ نے آزاد شاعری کا پودا لگایا لیکن ان کے کلام کے Intellectual content اور مشکل پسندی نے ان کو خواص تک محدود رکھا۔ یوں بھی ان کے اور فیضؔ صاحب کے رویوں میں بہت فرق تھا۔

ایک بات قابلِ غور ہے۔ اقبالؔ، فیضؔ اور راشدؔ تینوں پنجابی...... تینوں اس علاقے کے باشندے جس کو ہم تک چڑھے یو۔پی والے 'اک صوبہ پنجاب ہے معلوم نہیں کیوں' الاپ کر اپنی دانست میں گویا بڑا تیر مارا کرتے تھے اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ اہلِ پنجاب کی مادری زبان اُردو نہیں۔ اُردو محاورے اور روزمرہ سے انہیں کوئی سروکار نہیں، لب ولہجہ ان کا اتنا مختلف انہیں اُردو سے ایسا قلبی لگاؤ کیوں ہوا؟ مثال کے طور پر پشتو، بلوچی اور سندھی علاقوں نے اُردو کے جید شاعر اور ادیب کیوں نہ پیدا کیے یا لکھنؤ اور دلّی کے بجائے لاہور اُردو ادب وصحافت کی راجدھانی کیسے بنا؟

اس کی ایک وجہ میری سمجھ میں آتی ہے۔ انتہائی شائستہ اور نستعلیق لیکن شکست خوردہ دلّی، یو۔پی، بہار ۱۸۵۷ء کے بعد بھی باقی دُنیا کو (یعنی ان لوگوں کو جو وادیٔ گنگ وجمن میں جنم لینے کا شرف نہ رکھتے تھے) Bar Barians سمجھا کیے۔ ان کے برعکس میڈیول پنجاب برطانوی فتح کے بعد اچانک دور جدید میں داخل ہوگیا۔ (پنجابی تاریخی وجوہ کی بنا پر ہمیشہ سے سخت جان اور مہم جو رہا ہے) اور نئے برطانوی دور میں اس کے اندر وہی امریکیوں والی فرنیٹر اسپرٹ پیدا ہوئی۔ ایک لحاظ سے پنجابیوں کو اس برصغیر کا امریکن کہا جاسکتا ہے۔

لیکن ہم اہل زبان لوگ پنجاب کو 'وائلڈ ولیٹ' ہی سمجھا کیے۔ ہم پنجاب کی اس توانائی کرنل کلچر سے ناواقف تھے جو غزنوی عہد سے لے کر سکھوں کے زمانے تک وہاں پھلی پھولی اور جسے میں پنجابی پرشین سکھ کلچر کا نام دے سکتی ہوں اور اس کے پس منظر میں وہ سدھوں جوگیوں اور راجاؤں کا پنجاب تھا اور عہدِ مغلیہ میں اس نے وہ بڑے صوفی شعرا پیدا کیے جن کی تخلیقات عالمی ادب کے بہترین سرمائے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ پنجاب کے رومان' وہاں کی لوک سنگیت اور ناچ اور وہاں کی صوفیشا داستانیں اور صوفیانہ موسیقی یہ ایک علاحدہ دُنیا تھی جس پر خود تعلیم یافتہ پنجابیوں نے فخر کرنا کافی عرصے بعد سیکھا۔ چنانچہ ہندوستانی اور پاکستانی پنجاب میں 'پنجابی نیشنلزم' کے فروغ پر ہم کو متعجب نہ ہونا چاہیے (سوال یہ ہے کہ اگر فیضؔ احمد فیضؔ کی مادری زبان پنجابی ہے تو وہ اس زبان میں بھی شعر کیوں نہ کہیں۔ میں نے لاہور میں فیضؔ صاحب سمیت پنجابی دانشور وہاں کے عوامی شاعر استاد امام دین اور استاد دامن پر بے انتہا فخر کرتے پایا ہے۔ یہ لسانی سوشلزم بھی ہمارے معاشرے کی ایک خصوصیت ہے۔ اقبال جب اپنے آپ کو اکبال کہتے تھے تو اہلِ زبان ان پر ہنستے تھے۔ خود میں نے ایک مرتبہ فیضؔ صاحب سے کہا تھا کہ 'خبر ہو تیری لیلاؤں کی' میں پنجاب بہت ہے!)

ہائی اسکول میں ایک سبق اس طرح شروع ہوتا تھا "۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کے ایما پر لاہور میں ایک مشاعرے کی بنا ڈالی۔" انگریز کی

لسانی حکمت عملی ہر صوبے کے لیے مختلف تھی۔ وادیٔ گنگ و جمن میں انھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی۔ غدر کے بعد مسلم معاشرے کو برباد اور تہ و بالا کر دیا تھا۔ یہاں مسلمان تہذیبی طور پر حاوی رہے تھے۔ لہٰذا ان کو مزید کچلنے کے لیے سر انٹنی میکڈانل نے اُردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کروایا۔ پنجاب میں حکومت سکھوں سے چھینی تھی وہاں ہندو مسلم سکھ تینوں فرقوں کا طرز زندگی بہت حد تک یکساں تھا۔ پنجابی مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی کرنے کے لیے ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی بھی منظور تھی۔ وہاں اُردو روزی روٹی کی زبان بنائی۔ جس طرح یو۔پی ممالک متحدہ آگرہ و اودھ سے انھوں نے تجربہ کار دیسی افسر پنجاب کے انتظام اور آبپاشی کی نہریں کھدوانے کے لیے بھیجے۔ اسی طرح اُردو پڑھانے والے یو۔پی سے گئے اور پنجاب نے آناً فاناً ایک عدد علاّمہ اقبال پروڈیوس کر دیئے اور ان کے بعد ایک سے ایک اچھے مسلمان ہندو سکھ شاعر اور ادیب۔

لیکن اہلِ لکھنؤ اقبال کی زبان پر معترض رہے۔ جس زمانے میں یوپی کے اُردو والوں کو غم روزگار لاحق نہ تھا اور 'نیاز مندان لاہور' ایک دوسرے سے بکثرت چونچیں لڑا کرتے تھے۔ اب یو۔پی۔ میں خود اُردو کی جان کے لالے پڑے ہیں، وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟ پنجاب میں زبان اور فوک اور قبائلی کلچر تقریباً یکساں تھی (پنجابی ہندو اور سکھ آج تک خدا کو رب اور ربا کہتا ہے۔ یوپی کا عام ہندو 'رب' کہتا ہوا نہیں پایا جائے گا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو نے ان تینوں فرقوں کو مزید ایک لڑی میں پرو دیا۔ صورتِ حال کا ایک بنیادی تضاد یہ تھا کہ کٹر فرقہ وارانہ رجحانات 'آریہ سماج' اور مسلم فرقہ پرستی نے بھی پنجاب ہی میں زور پکڑا۔ گو سارا آریہ سماجی پریس اُردو میں تھا۔ آریہ سماجی اور سناتن دھرم دونوں لٹریچر اُردو میں شائع ہوتے تھے۔ آج تک ہر دوار کی دوکانوں میں پنجابی زائرین کے لیے زیادہ تر دھارمک کتابیں اُردو رسم الخط میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔)

ایک اُردو داں پنجابی ہندو اور سکھ جس طرح اقبالؔ اور فیضؔ پر سر دھنتا ہے اس

میں لاشعوری طور پر قبائلی تھرو بیک بھی کار فرما ہے جس طرح اہل پنجاب ہندو مسلمان اور سکھ فیضؔ صاحب کے شیدائی ہیں، یو۔ پی۔ اور بہار اور دلّی کے مسلمان اور ہندو اکٹھے ہو کر کسی واحد ادبی شخصیت کے لیے اس طرح کی والہانہ عقیدت کا اظہار نہ کریں گے۔ کیونکہ وادیٔ گنگ و جمن کی لسانی اور تہذیبی تنویت میں اس قسم کی مشترکہ پرستش کی گنجائش نہیں۔ اس کی ایک مثال پریم چند کا معاملہ ہے جن کے متعلق ہندی اور اُردو والے مستقل ایک دوسرے سے رسہ کشی میں مصروف ہیں۔

لاہور میں محمد حسین آزاد اور کرنل ہالرائیڈ کے بعد مخزن کا دور آیا۔ اس کے بعد کے دور کے متعلق فیضؔ صاحب نے دست تہِ سنگ کے دیباچے میں لکھا ہے۔ '۲۰ء، ۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور پر کچھ عجیب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا۔ جس میں اہم قومی سیاسی تحریکوں کے ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا اَنداز تھا۔ شعر میں اولاً حسرت موہانی اور اس کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی۔ افسانہ میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔

(نقشِ فریادی کے پہلے حصے میں ۲۹، ۲۸ء سے ۳۵، ۳۴ء تک کی چیزیں شامل ہیں۔)

"نقش فریادی کی ابتدائی نظمیں 'خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو'، 'مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو' 'تہہِ نجوم ہیں چاندنی کی تہہ میں' وغیرہ وغیرہ ایسے ماحول کے زیر اثر مرتب ہوئیں اور اسی فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ پائے تھے کہ صحبتِ یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے، کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ اُجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوزِ محبت کا کہرام مچا ہوا تھا۔ یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی

راستے بند ہوگئے اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ 'نقش فریادی' کے پہلے حصے کی آخری نظموں میں اس کیفیت کی جھلکی ملتی ہے۔

۱۹۳۵ء میں فیضؔ صاحب امرتسر کے ایک کالج میں لیکچرر ہوگئے۔ یہاں ان کی ملاقات دہرہ دون کے صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیوی یعنی رشیدہ آپا سے ہوئی۔ رشیدہ آپا نے فیضؔ صاحب کو کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھنے کو دیا جس کو پڑھ کر موصوف پر چودہ طبق روشن ہوگئے۔

گیان حاصل ہونے کے بعد فیضؔ صاحب نے اپنی مشہور نظم لکھی۔ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ۔

اسی زمانے میں ۳۶ء میں ترقی پسند تحریک باضابطہ شروع ہوئی۔ ۳۸ء میں علاّمہ اقبال نے رحلت فرمائی۔ محمد حسین آزاد کے بعد سے لے کر ن۔ م۔ راشد اور فیض احمد فیضؔ کی آمد کے وقت تک اُردو ادب پر اقبال کی چھتر چھایا موجود تھی۔ (اقبال غالب کی طرح Time less اور بہت اونچے تھے۔ ان سے مفر نہ تھی۔ ترقی پسندوں نے ان کو رجعت پسند کہا لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا، آل انڈیا ریڈیو کا نیٹ ورک پھیلایا جا رہا تھا۔ پطرس بخاری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل طلباء جو پنجاب کے دانشوروں کی Cream سمجھے جاتے تھے بہت سے آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہو چکے تھے۔ جنگ چھڑی، لاہور کے ان ہی دانشوروں میں سے ایک کرنل مجید ملک فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں چنے گئے تھے جن کے انداز پر فیضؔ صاحب نے بھی کنگز کمیشن لے لیا۔ اس وقت حفیظ جالندھری (مصنف شاہنامہ اسلام) بھی سرکاری سونگ پبلٹی میں شامل یہ اڑوس پڑوس کہیے جو کہیے میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رہے۔ لکھ رہے تھے۔

اب آزاد ایک اور فوٹو گراف کھینچتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے آخری سال قحط بنگال کے متعلق اخبارات میں زین العابدین کی تصویریں چھپ رہی تھیں۔ وامق جونپوری کا بھوکا ہے بنگال رے ساتھی' مجاز کا 'راج سنگھاسن ڈانوا ڈول' اور فیضؔ احمد فیضؔ کی 'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب

نہ مانگ' نوجوانوں کے قومی ترانے بن چکے ہیں۔ کنہیا لال کپور کی 'غالب ترقی پسند شعرا کی محفل میں' نے آفت جوت رکھی ہے۔ پروفیسر غیظ احمد غیظ کی نظم 'فون آیا دلِ زار بھی سب کو یاد ہو گئی ہے۔

پارک سا ہیڈ نارتھ قرولباغ دہلی میں چچا مشتاق احمد زاہدی کے مکان کے برابر والے گھر میں لیفٹیننٹ کرنل فیضؔ معہ اپنی ولایتی بیوی کے مقیم ہیں۔ چچا زاہدی کے ہاں ضعیف العمر نواب سائل دہلوی آ کر تخت پر چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ گویا ایک طرف عہدِ رفتہ کی آخری یادگار اور دوسری طرف عہدِ نو کے نقیب کون۔ م۔ راشد کے برعکس پروفیسر غیظ احمد غیظ داغ و سائل کی شعری روایت کے مخالف نہیں......

پارک کی دوسری طرف ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور قریب چند قدم کے فاصلے پر ریلوے کے ظہیر شمسی دونوں کی بیگمات جو من اتوار کے روز چچا زاہدی کے فرزند اکبر نور الدین احمد بیرسٹر مع اپنی انگریز بیگم نہر سعادت خاں سے آ جاتے۔ ان تینوں ولایتی بیگمات کا آپس میں میل جول تھا، خصوصاً مسز سلیم الزماں اور مسز نور الدین احمد۔ لیکن ایک روز پارک میں ٹہلتے ہوئے مارگریٹ شمسی نے چپکے سے کہا یہ انگریز لوگ ہمارا دشمن ہے۔ ہمارے ملک کو برباد کر رہا ہے۔' اس زمانہ میں یوروپ میں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ ہلاکو خاں اب ہٹلر کے روپ میں ظاہر ہوا تھا اور کرنل فیضؔ احمد فیضؔ اپنے اینٹی برٹش رویے کے باوجود برطانوی وردی پہنے فسطائیت کے خلاف انگریزوں کی مدد کر رہے تھے۔ یہ اس وقت کی 'پارٹی لائن' تھی اور یہ کانگریسی قوم پرستوں کی لائن سے مختلف تھی۔ چچا زاہدی اور نور الدین احمد دونوں قوم پرست تھے اور ڈاکٹر سلیم الدین صدیقی کے بھائی چودھری خلیق الزماں مسلم لیگ لیڈر۔ یہ منظر نامہ بالکل تلپٹ ہونے والا تھا۔ مسٹر ظہیر شمسی اور مارگریٹ شمسی کی بڑی لڑکی آمنہ نے رائل انڈین ایئر فورس کے ایک نوعمر انگریز نما پٹھان افسر اصغر خان سے شادی کر لی۔ وہ چودھری خلیق الزماں کی نئی مملکت پاکستان کی ایئر فورس میں ایئر مارشل تک ترقی کرنے والے تھے لیکن اس وقت کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر کم گو اور صاحب آدمی ایک روز پاکستان کی

حزبِ مخالف کا ایک کھدر پوش لیڈر بن جائے گا۔ نہ لیفٹیننٹ کرنل فیضؔ کو مستقبل کے بلوریں پیالے میں شہر بیروت اور لوٹس رسالے کی ایڈیٹری نظر آئی تھی۔

پنڈت نہرو آدمی پہچانتے تھے۔ ۴۲ء میں انھوں نے فیضؔ صاحب سے فرمائش کی تھی کہ وہ 'انٹرنیشنل' کا منظوم ترجمہ کریں! پروفیسر غیظ احمد غیظ نے اپنے دور کی ترجمانی اس طرح شروع کی کہ لوگ چونک اٹھے۔ فیضؔ کا اُسلوب ایک پورے عہد کا شعری مزاج اور شناخت بن گیا اور بہت سوں نے کہا کہ موصوف اقبال کے بعد اہم ترین شاعر ہیں۔

ہمارے ہاں ادب میں ایک مشغلہ عرصے سے چلا آتا ہے جس کے ڈانڈے ہمارے سابقہ مشغلے یعنی مذہبی مناظرے سے جا کر ملتے ہیں۔ یعنی ہمعصر اہل قلم کا ایک دوسرے سے موازنہ اور مقابلہ، شاگردوں یا حمایتوں (اب ناقدین) کی فوجیں دونوں طرف صف آرا ہوتی ہیں۔ ایک ہنگامہ رہتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یوپی میں کچھ لوگ کہتے تھے کہ جگر، اقبال سے بڑا شاعر ہے! یہ فلاں فلاں سے بڑا یا چھوٹا ہے۔ وہی فلم انڈسٹری کی Star Rating والا معاملہ ہے۔ اسی طرح پاکستان میں ایک حلقہ احمد ندیم قاسمی کو اپنا مرشد مانتا ہے لیکن مریدینِ فیضؔ کی تعداد بہر حال بہت زیادہ ہے۔

فلم انڈسٹری میں عوام کی پسند ناپسند کے علاوہ ذاتی پبلسٹی اور پبلک ریلیشنز پر بھی لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ادب میں یہ پرسنل پبلسٹی ترقی پسند تحریک کے زمانے سے شروع ہوئی۔ اس سے قبل لکھنے والے زیادہ تر شوقیہ ادیب تھے اور نقادوں کی ایک باقاعدہ جماعت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں منشی پریم چند کے علاوہ کوئی بھی پروفیشنل ادیب نہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی ادبی تنقید سنجیدہ ہوئی اور طرفدار بھی۔ حلقۂ اربابِ ذوق پیدا ہوا۔ گھمسان کے رن پڑے۔ ترقی پسندوں نے ایک دوسرے کے متعلق توصیفی کتابچے لکھے۔ ادھر میراجی کا Cult تیار ہوا۔

ہم غریبوں کے مفلس ادب میں تو اس طرح کی پبلسٹی کا خواب بھی نہیں دیکھا جاسکتا جو مغرب میں ناشرین ایک کتاب لانچ کرنے سے پہلے کرتے ہیں۔ ساٹھ کروڑ آبادی کا ہندوستان۔ دس کروڑ پاکستان کی رکھ لیجئے۔ اس میں ایک ہزار کا

ایڈیشن ایک کتاب کا چھپتا ہے! اس کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے طرم جنگ ہوگئے۔ ایک ہزار کے ایڈیشن کے لیے کون ڈھول بجائے گا۔ جو کچھ موافقت یا مخالفت یا چرچا ہوتا ہے وہ ناقدین ہی کر لیتے ہیں۔ قبولِ عام کی سند محض چند ہزار پڑھنے والوں سے ملتی ہے۔ شاعروں کا آڈینس البتہ وسیع تر ہے گو ہمارے ہاں۔ یہاں بھی خصوصاً جب سے ادبی انعامات کا سلسلہ شروع ہوا ہے پبلسٹی اینڈ پبلک ریلیشنز کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم جیسے باکمال استاد کے ذکر پر جن کو وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ فیضؔ صاحب نے کہا ہے کہ 'صوفی واجب سے کم درجے کے شاعر اور رائٹر نے وہ شہرت حاصل کر لی۔ شہرت حاصل کرنے کی کوالٹی ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ بعض حضرات خود اس بات کا حساب رکھتے ہیں کہ وہ کتنے مشہور ہیں اور مزید شہرت کے لیے کیا کیا بندوبست کرنا ہے۔ اس کے لیے وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن کا علم وادب سے تعلق نہیں، یہ ایک الگ فن ہے اور صوفی صاحب اس فن سے واقف نہیں۔

غالباً ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ فیضؔ صاحب فوج چھوڑ کر پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر ہوگئے۔ سبطِ حسن اور بنے بھائی بھی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے پاکستان بھیج دیئے گئے تھے۔ اب لاہور میں ایک بے حد سرخا سرخ فرخ آبادی گروپ جمع ہوگیا۔ نظریاتی کٹرپن اس گروہ کا ایک وصف تھا۔ اسی قسم کا کٹر گروہ اس وقت بمبئی میں جمع تھا۔ ان حضرات میں سے اب کافی عرصے سے کوئی بھی کٹر نہیں رہا لیکن فیضؔ صاحب کی ذہنی پختگی اس چیز سے ظاہر ہوتی ہے کہ جن دنوں یہ سارے ترقی پسند حضرات اقبال کو فسطائی پکارتے تھے، محض فیضؔ صاحب اس انتہا پسندی کے مخالف تھے اور اس زمانے میں انہوں نے اقبال ہی کے رنگ میں وہ خوبصورت چیز لکھی تھی۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا

سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سیکڑوں لذت شناس ہیں
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور اس کا خروش اس کا سوز ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوّالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یہ شمع بزمِ صبح کی آمد سے بے خطر

ان ہی دنوں پہلی مرتبہ فیضؔ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کراچی میں میرے چچا زاد بھائی اور بہن سید سعید حیدر اور بیگم عذرا حیدر کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ میں نے چھوٹتے ہی ان سے نہایت بے وقوفی کا سوال کیا۔ "فیضؔ صاحب! سنا ہے بنّے بھائی آج کل پاکستان میں انڈر گراؤنڈ ہیں، کس جگہ انڈر گراؤنڈ ہیں؟"

آپا عذرا ایک نہایت دانشور خاتون ہیں۔ گو میری طرح ان کو بھی شعر یاد نہیں رہتے۔

انھوں نے فیضؔ صاحب سے کہا۔۔۔

فیضؔ صاحب واہ کیا عمدہ شعر ہے کہ......

جنے کیا جنے کیا جنے کیا
اور جنے کیا جنے کیا جنے کیا

فیضؔ صاحب نے نہایت سنجیدگی سے سر ہلا دیا۔

کراچی میں ہمارے ہاں اور لاہور میں میرے Cousins لقمان حیدر اور بیگم لقمان حیدر اور جری احمد سید اور حمیرا سید کے ہاں فیضؔ صاحب کی بڑی دلچسپ محفلیں رہتیں۔ پھر اچانک وہ غائب ہو جاتے۔ یعنی جیل چلے جاتے۔ اسی درویشانہ انداز سے واپس آ کر ان محفلوں میں شامل ہو جاتے۔ فیضؔ صاحب کو کسی نے برافروختہ یا جھلایا ہوا نہیں دیکھا۔ بسلسلہ پنڈی سازش کیس فیضؔ صاحب چار سال قید میں رہے۔ اسی زمانے میں لندن میں ایک بار میں نے ڈان اخبار کی شاہ سرخی دیکھی۔۔۔ سجاد ظہیر اور فیضؔ احمد فیضؔ کو پھانسی کی سزا (بڑی خیریت ہوئی کہ بچ گئے) تو سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ وہ شاعر جس کے لیے سچ مچ سزائے موت کی خبریں چھپ رہی ہوں وہ......

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

محض رسماً نہیں لکھے گا۔

فیضؔ صاحب کے منفرد اُسلوب نے ان کو ڈبلیو۔ ایچ۔ آڈن کی طرح Poet's Poet بنایا اور اقبالؔ کے مانند انہوں نے ملکی سیاست میں نمایاں رول ادا کیا۔ بحیثیت انگریزی جرنلسٹ وہ پاکستان کے اہم ترین روزنامے کے ایڈیٹر رہے (پاکستان ٹائمز ہندوستان کے بہترین انگریزی اخباروں کا مقابلہ کر سکتا تھا) مزید برآں پاکستان کی کوئی حکومت فیضؔ صاحب کو نظر انداز نہ کر سکتی تھی۔ ایک لطیفہ مشہور تھا کہ ہر نئی گورنمنٹ فیضؔ احمد فیضؔ کو In Herit کرتی ہے۔ میں نے کراچی اور لاہور میں اعلیٰ حکمرانوں کو فیضؔ صاحب کی دربارداری کرتے دیکھا ہے جبکہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ اکثر شعرا اور ادیب اعلیٰ حکام کی دربارداری کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی فیضؔ صاحب کو سراہا جو ان کی بائیں

بازو کی سیاست کے مخالف یا خائف تھے۔ ذہن پرست دانش جو اور درسگاہوں کے اساتذہ، سرکاری حکام، سوسائٹی کی فیشن ایبل بیگمات ان سب کی فیضؔ صاحب سے ملاقات ایک Status Symbol قرار پائی۔

مجھے یاد ہے ۱۹۵۶ء میں جب دہلی میں ایشین رائٹرز کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں لاہور سے فیضؔ صاحب اور اعجاز حسین بٹالوی شرکت کے لیے گئے تھے۔ واپس آکر اعجاز نے کہا۔ فیضؔ صاحب تو کانفرنس میں اشوک کمار بنے ہوئے تھے۔ فیضؔ صاحب کو جو مقبولیت ہندوستان میں حاصل ہے اس سے سب واقف ہیں۔ سویت یونین میں ان کی جو آؤ بھگت کی جاتی ہے وہ میں بچشم خود ملاحظہ کرچکی ہوں، اور ادھر مغرب میں کینیڈا، انگلستان، امریکہ جہاں جہاں اُردو داں اور بالخصوص اہلِ پنجاب آباد ہیں وہ فیضؔ صاحب کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔

تو کیا فیضؔ احمد فیضؔ کی اس ہر دلعزیزی میں ان کا کچھ Put-on بھی شامل ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ میں ایک بہت طویل عرصے سے فیضؔ صاحب سے واقف ہوں اور اس دوران وہ اہم سے اہم تر اور مقبول سے مقبول تر ہوتے گئے۔ مگر ان کے بدّھاہڈ والے انداز میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔

موصوف رفتہ رفتہ ایک Cult Figure میں تبدیل ہوتے گئے اور اب ایک نوع کے Sage بن چکے ہیں۔ ۷۷ء میں ایک کتاب لاہور سے چھپی۔ 'ہم کہ ٹھہرے اجنبی' جس کا عنوان دراصل 'ملفوظات حضرت فیضؔ شاہ جہاں دوست' ہونا چاہیے۔ اس میں موصوف کے ایک عقیدت مند نے جو ان کے ذاتی معالج بھی ہیں (نام ان کا ڈاکٹر ایوب مرزا ہے) اُن سے مختلف ملاقاتوں میں سوالات کیے ہیں اور ان کا تشفی بخش جواب پایا ہے۔ ان مکالموں میں فیضؔ صاحب کی دھیمی، پرسکون شخصیت، منکسر المزاجی، حق گوئی، خلوص نیت، شائستگی، شدید حب الوطنی، غم خواری اور دردمندی، شرافتِ نفس حس مزاح بخوبی آشکار ہوتی ہیں۔ دُنیا کے اہم ترین مسائل کو فیضؔ صاحب (جن کو Bombast سے ہمیشہ للٰہی بیر ہے) نہایت سلاست اور نرمی سے حل کر دیتے

ہیں۔ مثلاً ایک روز کافی دیر خاموش رہنے کے بعد حضرت کہنے لگے: بھئی میں نے تو چین پر تین نظمیں لکھی ہیں۔ روس پر تو ایک بھی نہیں لکھی۔ مجھے یہ چین اور روس کا جھگڑا پسند نہیں...... روس سمجھتا تھا میں بڑا چودھری ہوں...... اب چین بھی محنت اور خود اعتمادی اور Self- Reliance کے تحت بڑا چودھری ہو گیا ہے...... مسئلہ تو چودھراہٹ کا ہے۔

مرید: فیضؔ صاحب اتنے بڑے مسئلے کو آپ اتنا سادہ سمجھتے ہیں۔

مرشد: تو بھئی اس میں رکھا ہی کیا ہے؟

مرید: Revisionism

مرشد: لاحول ولا قوۃ، بھئی مارکسزم کوئی Dogma نہیں ہے۔ یہ تو سائنس ہے۔ اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس میں سے جو اصول اور مفروضے تجربے سے غلط ثابت ہوں انہیں Revise کرتے رہنا چاہیے۔

مرید مزید لکھتا ہے: ”ایک دن ہم پوچھ بیٹھے۔“

فیضؔ صاحب یہ کیا فراڈ ہے۔ کہنے لگے کون سا فراڈ۔ میں نے کہا یہ M.B.E. کا واڈ اور پھر آپ لینن انعام یافتہ بھی ہیں۔

فرمایا بھئی اس میں الجھن کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے فوج اس لیے Join کی تھی کہ فاشزم کے خلاف سرگرم عمل ہوں، لہٰذا وہاں ہم جو مشورے دیتے تھے وہ انگریز سرکار کو پسند آتے تھے اور وہ ان پر عمل کرتے تھے، اس کے صلے میں انہوں نے کہا بھئی ہم تمہیں M.B.E. دیتے ہیں۔ ہم نے کہا دے دو۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ ہم نے تو اسے فاشزم کے خلاف اپنی جدو جہد کی کامیابی تصور کیا۔ علامہ اقبال کو بھی تو سر کا خطاب ملا تھا وہ اس لیے تو نہیں ملا تھا کہ خاکم بہ دہن وہ انگریزوں کے پٹھو تھے۔

”......میں نے کہا فیضؔ صاحب! مسلم لیگ تو ایک قسم کی نوابوں اور جاگیرداروں کی کیچڑ تھی جسے قائدِ اعظم عوام کی طاقت کے بل بوتے پر نیّا کھیتے رہے۔

فیضؔ کہنے لگے، بھئی مسلم لیگ جو تھی وہ تھی اور پھر آزادی کے بعد نا اہل قیادت کے ہاتھوں جس انجام کو پہنچی اسے وہاں لامحالہ پہنچنا ہی تھا۔ مگر یہ کیچڑ والی بات نہیں......

یہ باقاعدہ ایک سیاسی تحریک تھی۔ ہندوستان میں بہت بڑی اقلیت کے مفادات کے تحفظ کی تحریک......

مرید: فیضؔ صاحب جب آپ کو پکا یقین ہوگیا کہ انگریز بہادر ہندوستان کو روس کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے اور ہمیں نیوزی لینڈ آسٹریلیا کی قسم کا ڈومینین اسٹیٹس دینا چاہتا ہے تو پھر آپ کے ذہن پر کیا گزری؟

''کیا گزرتی۔ ہم نے کہا لعنت بھیجو فوج کی نوکری پر جو ہمارے لیے اب بے مقصد ہو چکی تھی......''

چنانچہ فیضؔ صاحب نے دلّی سے لاہور آکر چٹرجی ڈائریکٹر ایجوکیشن سے کہا کہ جنگ ختم ہوگئی ہے، ہماری استادی لوٹا دو۔ چٹرجی بہت حیران ہوئے کہ بھئی فیضؔ فوج سے باہر آکر کیا کرو گے۔ G.I کے چسکے تم نے لیے، عیش تم نے کیے، بنگلہ اردلی تمہارے پاس، تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ میں نے کہا ڈھائی ہزار روپے۔ چٹرجی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے بھئی اتنی تنخواہ تمہیں فوج سے باہر کہاں ملے گی...... بھئی میری صلاح یہی ہے کہ فوج سے واپس تعلیم میں مت آؤ۔ ہم نے چٹرجی کو سمجھایا کہ ہمیں بنگلہ وغیرہ نہیں اور ڈھائی ہزار تنخواہ بھی نہیں چاہیے۔ ہمیں بس صرف پانچ سو روپے ماہانہ مل جائیں تو تقدیر سنور جائے—

لیکن لیکچرر کی سب سے اونچی تنخواہ ساڑھے تین سو روپے تھے، اس میں گزر کرنا مشکل تھا۔ فیضؔ صاحب دلّی واپس گئے۔ اسی زمانے میں میاں افتخار الدین نے ان کو اپنے نئے اخبار پاکستان ٹائمز کے لیے چیف ایڈیٹری کی پیش کش کی اور فیضؔ صاحب واپس لاہور پہنچے۔

ایک مرتبہ اسلام آباد میں فیضؔ صاحب مقیم تھے۔ ایک شام مرید نے ان سے پوچھا۔ فیضؔ صاحب یہ ہماری ترقی پسند مصنفین کی انجمن کدھر گئی۔ کہنے لگے بھئی عرصہ ہوا ہم تو اس سے الگ ہوگئے تھے۔

مرید نے سوال کیا۔ فیضؔ صاحب ترقی پسند مصنفین کے معترضین نے یہ الزام

لگایا تھا کہ یہ انجمن دراصل کمیونسٹ پارٹی کا بغل بچہ ہے۔

مرشد: بھئی یہ ہرگز نہیں تھا۔ منشی پریم چند کا کمیونسٹ پارٹی سے کیا واسطہ۔ پھر مولانا سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا حسرت موہانی کہاں کے کمیونسٹ تھے؟ ہم خود کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے۔ اس غلط پروپیگنڈے کی دو وجہیں ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل انگریز حکومت نے اس انجمن کے بارے میں سب سے پہلے یہ لیبل لگایا تھا...... تقسیم ہند کے بعد نوآبادیاتی نظام نے نیا روپ دھار لیا...... امریکہ کے ایٹم بم کے خلاف عالمی امن کمیٹی نے ایک اسٹاک ہوم امن اپیل جاری کی۔ یہ اپیل روسی قیادت کے زیر اثر تھی۔ ہمارے ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے بھی اس امن اپیل پر دستخط کرنے کی ہدایت جاری کی...... دوسرے انجمن میں باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی، کسان کمیٹی ٹریڈ یونین کے لوگ بھی شریک ہو گئے تھے یا انجمن کے ممبروں نے یہ پارٹیاں جوائن کر لیں۔ بھئی مطلبی فرید آبادی بھی تو تھے نا۔ ان لوگوں نے انجمن میں ادب کا Realism سے Committed Socialist Realism کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ یہ ہمارے ملک کے مخصوص سماجی اور سیاسی حالات میں ممکن نہ تھا...... اگر غربت، افلاس اور ناداری کی عکاسی کرتے وقت اس کے منبع کی نشاندہی کی جائے تو ہوسکتا ہے کہ سرکار برداشت کرے مگر جب آپ اس کا علاج تجویز کرنے لگیں تو پھر رجعت پسند طاقتوں اور حاکم وقت کا حملہ یقینی ہوتا ہے۔ اب اصولاً بات درست ہے۔ اگر آپ بیماری کی تشخیص کر پاتے ہیں تو پھر اس کا علاج تجویز نہ کرنا بد دیانتی ہے اور پھر مجوزہ علاج سے اس بیماری کا قلع قمع نہ کرنا مزید بد دیانتی ہے۔ Realism کی معراج Committed Socialism ہے لیکن ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا یہ ابتدائی مسلک نہ تھا جیسا کہ اس کے مینی فیسٹو سے عیاں ہے۔ لہٰذا Confusion تطہیر اور علاحدگی کی تحریکوں نے زور پکڑ لیا۔

مرید: فیض صاحب یہ تحریک آپ کے خیال میں کامیاب رہی؟

مرشد: بھئی ایک طرح سے تو یہ کامیاب رہی کیونکہ گلشنِ ادب میں اس

تحریک نے ایک نئی طرزِ فغاں دی۔ دوسری لحاظ سے اس تحریک کو دھکا لگا وہ ہمارے چند دوستوں کی وجہ سے۔ بھئی ۱۹۴۹ء میں احمد ندیم قاسمی انجمن کے سکریٹری تھے، حکم ہوا کہ علامہ اقبال کو Demolish کریں اور عصمت چغتائی منٹو اور ن۔ م۔ راشد کو Exterminate کریں کہ یہ ترقی پسندوں کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے۔ ہمیں یہ بک بک لگی۔ علامہ مرحوم کے ہاں بے پناہ ذخیرہ سامراج' جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف ملتا ہے۔ یہی قصہ منٹو وغیرہ کے ساتھ تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ ہماری ان سے جنگ ہوگئی۔ ہمارا موقف تھا کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کو اس کی Totality اور عصری تقاضوں کے Perspective میں پرکھا جاتا ہے اور اس کے ادب پارے کے کسی ایک ٹکڑے سے اس کی Contribution کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا جائزہ حقائق کے خلاف ہوگا اور باطنی طور پر ضعیف بھی ......

پھر ایک روز مظہر علی خاں کے گیراج میں انجمن کی میٹنگ ہوئی۔ صفدر میر صدر تھے۔ قاسمی صاحب نے علامہ اقبال کے خلاف ایک بھرپور مقالہ پڑھا۔ ہمیں بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ ہم نے اعتراض کیا یہ کیا تماشہ ہے۔ یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو سکہ بند قسم کی بے معنی انتہا پسندی ہے۔ ہم بہت دل برداشتہ ہوئے۔ اس کے بعد ہم انجمن کی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے اور صرف پاکستان ٹائمز چلاتے رہے۔'' فیضؔ صاحب بقراطی Targon کو Demolish کرنے میں ہمیشہ سے اُستاد رہے ہیں، چنانچہ ایک روز مرید ایک نقاد کا حوالہ دے کر پوچھتا ہے۔ 'شعر کیا ہوتا ہے اور اچھے شعر کی تعریف کیا ہوسکتی ہے؟' کہنے لگے بھئی شعر شعر ہوتا ہے اور شعر لکھنے کے عمل کو شاعری کہتے ہیں۔ شعر کسے کہتے ہیں یہ یار لوگوں نے خواہ مخواہ کا سوال کھڑا کر دیا ہے۔ اگر فاطمی صاحب کا شعر کی تعریف سے مدعا بحر وزن ردیف قافیہ اور تقطیع قسم کی کوئی چیز ہے تو بھئی مجھے تو خود تقطیع ٹھیک سے نہیں آتی اور جب ہم شعر کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں تقطیع وغیرہ کا ہرگز خیال نہیں ہوتا...... فیضؔ صاحب عربی کے ایم اے ہیں۔ جیل میں درس قرآن و حدیث بھی دے چکے ہیں اور صوفیائے کرام کی تصانیف پڑھا چکے

ہیں اور ایک مرتبہ کسی عرس میں جا پہنچے، جہاں آپ کی دستار بندی بھی کی گئی۔ موصوف دراصل صوفیائے کرام کو اصل کا مریڈ لوگ' سمجھتے ہیں جنھوں نے بھید پالیا تھا۔'

فیضؔ صاحب نے ایک مرتبہ کالج کے مشاعرے میں اپنی نظم پڑھی۔ علامہ اقبال نے بلا کر بہت شاباشی دی۔ اس واقعے کے متعلق مرید نے پوچھا۔ آپ کے خیال میں علامہ اقبال کا شاعری میں کیا مرتبہ ہے۔ فرمایا جہاں تک شاعری میں Sensibility زبان پر عبور اور غنائیت کا تعلق ہے ہم تو ان کے خاک پا بھی نہیں۔ علامہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ پھر کہنے لگے اگر علامہ سوشلزم کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ ہوتا۔

مرید نے پوچھا کہ آپ نے غالب سے رنگِ تغزل، اقبال سے غنائیت لی ہے اور دونوں میں اپنا سوشلزم مکس کر دیا ہے۔ مسکرائے اور کہا بھئی اس سے کسے انکار ہے۔

فیضؔ صاحب لندن میں تھے اور پاکستان میں جنرل ایوب خاں نے مارشل لا لگا دیا۔ آرام سے لندن میں رہ سکتے تھے۔ مارے حب الوطنی کے پاکستان پہنچے اور پھر پکڑے گئے۔ فرمایا 'بھئی اس مرتبہ جیل میں عجیب تجربہ ہوا۔ وہ شروع ہی سے اکتاہٹ کا تھا۔ ہم تنگ آچکے تھے۔ جب دیکھو وجہ بلا وجہ ملک میں کچھ ہو، ہم جیل خانے میں۔ آخر یہ کیا ترکیب ہے، ہم کوئی چور ہیں۔ ڈاکو ہیں، کوئی قتل کیا ہے۔ ملک کے خلاف کچھ لکھا ہے......"

پھر جنرل یحییٰ خاں کے مارشل لا کا زمانہ آیا۔ مرید و مرشد دونوں پھر لندن میں موجود تھے۔ "معلوم ہوا ہم لوگ پھر اندر ہونے والے ہیں، فہرست تیار ہو چکی ہے، ہم نے اپنے دل کو تسلی دی کہ چلئے لندن سے لاہور قلعے تک ہو آئیں، فیضؔ صاحب مسکرا رہے تھے کہ بھئی کم از کم ہمارے معاملے میں بس کر دینی چاہیے۔ آزمائش ایک مرتبہ ہوتی ہے۔ دو دفعہ بھی چلئے ٹھیک ہے، مگر یہاں جب بھی تخت الٹے ہیں، ہماری آزمائش کی گھڑی خواہ مخواہ آجاتی ہے۔ ہم نے کچھ کیا ہو پھر بھی بات سمجھ میں آئے۔ بیٹھے بٹھائے دھر لیے جاتے ہیں۔ بھئی ہم تو تخت نہیں گراتے، ہم تو تاج نہیں اچھالتے۔ ہم

تو صرف کہتے ہیں کہ یوں ہو جائے یا ہم یوں کر دیں گے......"

چنانچہ فیضؔ صاحب لندن سے کراچی پہنچے اور پھر جیل میں......

وہی گوشۂ قفس ہے وہی فصل گل کا ماتم

پھر مرید کہتا ہے کہ فیضؔ صاحب کو عمر کے اس حصہ میں زیادہ دکھ اور قلق محض اسی بات سے ہے کہ اب دیوانے غائب ہو چکے ہیں۔ غائب نہیں بلکہ ہوشیار ہو گئے ہیں۔ وارفتگیٔ جنوں میں گھر پھونک کر دشتِ نوردی کے اب دیوانے نہیں نکلتے۔ اب تو در و بام سجا کر ڈرائنگ روم میں حسن و مستی کی باتیں کرتے ہیں۔"

یہ بات کس قدر صحیح ہے!

ملفوظات حضرت فیضؔ شاہ جہاں دوست پڑھتے ہوئے راقم الحروف کو وہ سب زمانے یاد آئے جب حضرت کی اچانک گرفتاری کی خبر سن کر ہم سب اُداس ہو جاتے تھے اور بے حد تعجب ہوتا تھا۔ آخر فیضؔ صاحب اس قدر مرنجاں مرنج شرمیلے قسم کے انسان جو اونچی آواز میں بات تک نہیں کرتے اتنے خطرناک انقلابی کس طرح ہیں کہ ان کو آئے دن پکڑ کر بند کر دیا جاتا ہے۔ ایک نوعمر بوجھ بجھکڑ کزن نے سر ہلا کر کہا۔ آیا اب سمجھ میں آیا یہ فیضؔ صاحب جو ہیں یہ پولیس والوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اُن سے کہہ رکھا ہے کہ مجھے وقتاً فوقتاً جیل بھیج دیا کرو تا کہ وہاں کی صعوبتیں اُٹھا کر بڑھیا شاعری کروں۔ آپ ہی سوچئے......

سرفروشی کے انداز بدلے گئے دعوے قتل پر مقتل شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل فراز دار و رسن سے پہلے

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

رفیق راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد
چھٹا یہ ساتھ تو راہ کی تلاش بھی نہ رہی
ملول تھا دلِ آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا، اک خراش بھی نہ رہی

......جیسی خوبصورت شاعری فیضؔ صاحب کے علاوہ اور کون کرسکتا تھا؟

تو کیا ہر سعدی کے لیے یورشِ تاتار ضروری ہے؟

فیضؔ صاحب کا اثر اُن کے متعدد معاصر شعرا پر بہت گہرا اور واضح ہے۔ علاوہ ازیں ''شیشوں کا مسیحا، درد کا رشتہ، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، میرے ہمدم مرے دوست، یہ داغ داغ اُجالا، نثار میں تری گلیوں پہ، متاعِ لوح وقلم، چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے، بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام، خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو— درد بیچیں گے گیت گائیں گے، ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے، نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا، جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز— گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام— وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا، دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں۔ درد آئے گا دبے پاؤں لیے سرخ چراغ پرورشِ لوح وقلم، مجھ سے پہلی سی محبت— آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ— آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم— '' وغیرہ وغیرہ اب تک ادبی کلیشے بن چکے ہیں۔ خود میں نے سب سے پہلے ''یہ داغ داغ اُجالا'' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا۔ جو امروز میں چھپا۔ پھر جب کبھی فیضؔ صاحب لاہور سے تشریف لاتے، میں کہتی۔ ''آپ نے اپنا ہوم ورک کیا؟ کوئی ایسا شعر کہا ہے جسے میں ناول کا عنوان بنالوں؟'' پھر میں نے ''سفینۂ غمِ دل'' اُڑایا۔ چند سال بعد ''آخر شب کے ہمسفر'' اپنی گھریلو میوزک پارٹیوں میں، ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار، کیدارا میں الاپ کر ہم محفل ختم کرتے۔ یہ باقاعدہ ایک Ritual تھا۔ اس پر یاد آیا کہ فیضؔ صاحب اس لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت

ہیں۔ ان کے کلام کو سُروں میں ڈھالنے کے لیے مہدی حسن، نور جہاں، فریدہ خانم، ملکہ پکھراج اور نیرہ نور جیسی آوازیں ملیں۔

فیضؔ صاحب کے ہاں 'شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارہ شام' یہاں سے شہر کو دیکھو اور زرد پتوں کا بن جو میرا دیس ہے۔ سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی کمی نہیں۔

راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہ گیر تمام
اور کچھ دیر میں لُٹ جائے گا ہر بام پہ چاند

زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
رقصِ مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں
ایک ایک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

اب کوئی طبل بجے گا نہ کوئی شاہسوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہوگا

فیضؔ صاحب زبان کے معاملے میں اس اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں وہ اطمینان سے 'خوشبوئے خوش کناراں اور' بادبان کشتی صہبا' کے ساتھ ساتھ 'پوسٹ مینوں کے نام' بھی لکھتے چلے جاتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔

فیضؔ صاحب نے ایک فلم 'جاگو ہوا سویرا' بھی بنائی تھی۔ جس نے ایوارڈ حاصل

کیے اور باکس آفس پر فیل ہوئی۔

پاکستان کے مشہور صحافی ایوب احمد کرمانی کی ٹریجک موت پر فیضؔ صاحب نے ایک انتہائی خوبصورت مرثیہ لکھا......

جمے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِشام بجھ گئے ہیں

محض یہ ایک غزل فیضؔ صاحب کے اسٹائل اور ڈکشن کی مکمل عکاسی کرتی ہے، لیکن فیضؔ کی شاعری کی مخصوص فضا اور ڈیکور کو انگریزی میں منتقل کرنا بہت مشکل ہے۔ وکٹر کیرنن کلام فیضؔ کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس سے قبل راقم الحروف نے کیمبرج کی ایک Poetry Reading کی محفل میں پڑھنے کے لیے دستِ صبا کی متعدد نظموں کا ترجمہ کیا تھا جو افسوس کہ لندن واپس آتے ہوئے ٹرین میں رہ گیا، لیکن میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اُردو شاعری کا انگریزی میں کامیاب ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔

فیضؔ صاحب آرام چیئر سوشلسٹ کبھی نہیں رہے۔ وہ اپنے بے حد متمول والد کی خریدی ہوئی زمینیں اپنے غریب رشتہ داروں کو بانٹ چکے ہیں اور بسلسلہ دیش بھگتی انہوں نے جو کچھ جھیلا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ لیلائے وطن کی چاہت میں اب پھر دشتِ نوردی کر رہے ہیں......

فیضؔ نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

فیضؔ صاحب آج بھی ایسی چیزیں لکھ رہے ہیں جیسے ننّے بھائی کا مرثیہ......

خلا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے

اور فلسطینی بچے کی لوری۔۔۔

مت رو بچے

تیرے آنگن میں

مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں

چندرما دفنا کے گئے ہیں

فیضؔ صاحب کی شاعری کبھی کمہلا نہیں سکتی۔ یہ ایسی شاعری ہے جسے آج کے فلسطین اور ایران والجیریا کا شاعر پہچان سکتا ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ بھی اس کو پسند کرتے اور پنجاب کے بھلّے شاہ اور وارث شاہ اور بابا فرید بھی۔

○○

اختر جمال

بھائی کی کہانی بہن کی زبانی

(فیضؔ کی سب سے بڑی بہن بیگم شجاع الدین کی عمر اس وقت اسی (۸۰) برس کے اوپر ہے۔ خاندان میں بی بی گل کہلاتی ہیں۔ اختر جمال نے بی بی گل سے مل کر فیضؔ اور ان کے خاندان کی بابت گفتگو کی اور یہ مضمون تیار کیا: مرتب)

ایبٹ آباد میں داخل ہوتے ہی پہاڑوں کا ایک سلسلہ دائیں اور بائیں جانب سے گلے لگاتا نظر آتا ہے۔ دائیں طرف کا سلسلہ سربن کہلاتا ہے۔ اس کی ڈھلانوں پر کچے مکان ہیں جن میں سرِ شام دیئے روشن ہوجاتے ہیں۔ اس وقت یہ پہاڑ اپنے دامن میں شرارے لیے ملگجے اندھیرے میں نہایت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ سردیوں میں جب برف گرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے پہاڑ اپنے قومی شانوں پر سفید چادر لپیٹے بڑے وقار سے کھڑا ہے، اور سورج کی پہلی کرن آسمان سے اتر کر سب سے پہلے اس کا ماتھا چومتی ہے اور ہر طرف صبح کا دودھیا اجالا پھیل جاتا ہے۔ یہاں کے باسی اس کے گلے لگ کر اپنے دُکھ درد بھول جاتے ہیں۔ یہ پہاڑ حوصلے اور استقامت کی علامت بنا ہوا ہے۔

سربن کے دامن میں ہمارے محبوب شاعر فیضؔ احمد فیضؔ کی بڑی بہن بی بی گل کا گھر ہے۔ کسی زمانے میں ان کے گھر کی کنڈی بجاتے ہی خونخوار شکاری کتوں کی بھوں بھوں سنائی دیتی تھی۔ بڑی بڑی بطخیں اپنی لمبی لمبی چونچیں اٹھا کر قطار میں قیں قیں کرتی اس طرح آگے بڑھتی تھیں گویا دروازہ کھلتے ہی حملہ کردیں گی۔ ان دنوں یہ گھر اچھا

خاصہ چڑیا گھر لگتا تھا۔ بی بی گل کے چہرے پر عبادت اور ریاضت کا نور ہے، دل میں شفقت اور محبت کا بے پایاں جذبہ ہے جو ان کی بیٹی اور نواسیوں ہی کو نہیں گھر کے پلے ہوئے پرندوں، چرندوں کو بھی محسوس ہوتا ہوگا۔

میں نے بی بی گل کو پہلی بار اس دعوت میں دیکھا جو انہوں نے اپنی بیٹی سعادت کی (میجر سرور سے) شادی کے سلسلے میں دی تھی۔ سفید لباس میں جنت کی حور معلوم ہو رہی تھیں۔ شادی کے بعد سعادت اسکول آئیں اور ہم سب نے ان سے بی بی گل کی تعریف کی تو ہنس کر بولیں۔ ''بھئی یہ بڑی زیادتی ہے۔ دلہن میں بنی تھی اور تعریف تم لوگ میری ماں کی کر رہے ہو۔'' پھر کہنے لگیں۔ ''یہ سچ ہے میری ماں بہت خوبصورت ہیں۔ ذرا سوچو وہ جوانی میں کتنی حسین ہوں گی۔''

اسکول چھوڑا تو سعادت کا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ کچھ عرصے بعد سعادت نے بھی اسکول چھوڑ دیا۔ لیکن جب میرا گجرات سے ایبٹ آباد کالج تبادلہ ہوا تو کالج کی دیوار اور سعادت کے گھر کی دیوار ایک تھی۔ جب بھی ادھر اُدھر ملاقات ہوتی بہت محبت سے گھر بلاتیں اور کہتیں فرصت کے اوقات میں آجایا کرو، گپ لگائیں گے، لیکن مصروفیت کی وجہ سے میں صرف دو تین بار ہی ان کے گھر جا سکی۔ اب کی بار جو گئی تو خیال تھا کہ بی بی گل مجھے بھول گئی ہوں گی۔ سعادت نے میرا تعارف کرانا چاہا تو بولیں۔ ''ہمیں آپ بہت اچھی طرح یاد ہیں بلکہ کاکول کے مینا بازار میں پان کی ایک دکان پر آپ نے ہمیں پان کھلایا اور کہا تھا فیضؔ کے متعلق آپ کا کچھ لکھنے کا ارادہ ہے۔ ہمیں آپ کا بہت انتظار رہا مگر آپ اس کے بعد نہیں آئیں۔ ہم سمجھے بھول بھال گئی ہوں گی۔

''نہیں بھولی نہیں۔ دیکھئے آ ہی گئی۔''

باتیں کرنا ایک فن ہے۔ سعادت جیسی دلچسپ باتیں کرنا مشکل فن ہے۔ ہمارے اسٹاف روم کی رونق ان کے دم سے تھی۔ بیتے دنوں کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ استانیاں، پادری بچے وغیرہ میں نے سعادت سے کہا۔ ''اب تم مجھے بی بی گل سے

فیضؔ صاحب کی کہانی سننے دو۔'' سعادت نے کہا۔ ''ہماری اماں بہت اچھی کہانیاں سناتی ہیں۔ بی بی گل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فیضؔ کو بچپن میں کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔'' سعادت نے ہماری دعوت کے لیے خود جو پکایا تیار کیا تھا ہمیں کھلانے لگیں۔ باتوں باتوں میں جوش صاحب کی دعوت کا قصہ سنایا کہ وہ جب ایبٹ آباد آئے تو میں نے اس خیال سے کہ انکل فیضؔ سے ان کے گہرے تعلقات ہیں ان کو کھانے پر مدعو کیا۔ ان کے لیے سب کچھ خود پکایا۔ مگر جوش صاحب وعدے کے باوجود نہیں آئے۔

اس پر مجھے یاد آیا گجرات کالج میں طالبات کے بہبودی فنڈ کے لیے ایک مشاعرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہماری فارسی کی لیکچرار مسز سعیدہ عروج مظہر جو خود بھی شاعرہ ہیں اس کام میں پیش پیش تھیں۔ طالبات نے بڑی محنت کی تھی۔ کالج کو خوب سجایا اور پنڈال کو خوب آراستہ کیا۔ مشاعرے کے بعد فیضؔ صاحب اور دوسرے شاعروں کی کھانے کی دعوت تھی۔ لڑکیوں کو انہیں دیکھنے سننے اور ان کے دستخط لینے کی بڑی آرزو تھی۔ سارا دن لڑکیاں فیضؔ ہی کا کلام گا گا کر کھانا پکاتی رہیں اور دوسرے کام کرتی رہیں۔ مغرب کے وقت مسز عروج باورچی خانے میں آئیں اور مجھ سے بولیں۔ ''تم ناحق دھوئیں میں آنکھیں لال کر رہی ہو، فیضؔ صاحب نہیں آئیں گے۔''

''واہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آخر کیوں نہیں آئیں گے؟''

''انہیں تو گجرات کے ڈپٹی کمشنر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

''آپ نے جانے کیوں دیا؟ روکا ہوتا اور بتایا ہوتا کہ لڑکیاں......''

''میں کیا کہتی۔ ڈپٹی کمشنر نے پورے اسٹاف کو مدعو کیا ہے۔ تم بھی چلنا۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ نے فیضؔ صاحب کو یہ تو بتایا ہوتا کہ لڑکیوں نے ان کی دعوت کا اہتمام کیا ہے۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ سب کا ڈپٹی کمشنر کے ہاں انتظام ہے۔''

مسز عروج کو طیش آ گیا، بولیں۔ ''تم نے تو آرام سے سگھڑ گھر ستن بن کر باورچی خانہ سنبھال لیا۔ میں اتنے دنوں سے شاعروں کے پیچھے دھوپ میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔ تم ایک شاعر کو بھی بلا لاؤ تو پتا چلے کہ کتنا مشکل کام ہے۔ فیضؔ کے ہاں چلچلاتی دھوپ میں گئی تو انہیں ترس آ گیا اور حاضرین میں سے کسی سے کہا۔ ''بھئی پہلے انہیں اندر لے جا کر ان کا منہ ہاتھ دھلواؤ پھر بات کریں گے۔ بے چاری کا گرمی سے برا حال ہے اگر میں ہمت نہ کرتی تو مشاعرہ ہی نہ ہوتا۔''

میں نے مسز عروج کو منانے کی کوشش کی اور لڑکیوں کو بھی سمجھا بجھا کر راضی کیا اور انہیں یقین دلایا کہ فیضؔ صاحب وعدہ خلاف نہیں ہیں ضرور آئیں گے۔ میں سب کے آٹو گراف البم اسٹیج پر پہنچا دوں گی اور مسز عروج ان پر فیضؔ صاحب کے دستخط لے لیں گی۔ اس دعوے سے طالبات کی تسلی ہوئی اور لڑکیاں پھر اسی طرح فیضؔ کا کلام گا گا کر کام کرنے لگیں۔

اس مشاعرے کے لیے فیضؔ صاحب اپنی گاڑی میں آئے تھے اور سلیمہ اور شبنم عابد علی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ سلیمہ ہم سب کو بہت پسند آئیں اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ فیضؔ صاحب کی شاعری کا سارا حسن ان کی بیٹی میں زندگی ہو کر سانس لے رہا ہے۔ یہ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ شہر والوں نے اسے گجرات کی تاریخ کا یادگار مشاعرہ قرار دیا۔

آپ کو یاد ہو گا جوش صاحب اور فیضؔ کی دعوت اور مشاعرے کی باتوں سے پہلے بی بی گل کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ ہاں تو بی بی گل نے بتایا۔ ''کسی زمانے میں ایک راجپوت راجہ ہوا کرتا تھا، اس کا نام راجہ سین پال تھا اور اس کا تعلق سہارنپور سے تھا۔ اس کی اولاد میں سے ایک نے اسلام قبول کر لیا۔ ہمارے والد کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ ہمارے پردادا کا نام سربلند، دادا کا صاحبزادہ خاں اور والد کا سلطان محمد تھا۔''

''ہمارے والد کی شخصیت بہت شاندار تھی۔ صحت مند اور گورے چٹے تھے۔

ملکہ وکٹوریہ کی بھانجی ڈاکٹر مس ہملٹن نے ایک ناول لکھا ہے جس میں ہمارے ابا کا ذکر ہے۔ افغانستان میں ۱۳ سال ملازمت کی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنی بھتیجی سے شادی کی جن کا نام سائر جان تھا اور وہ سردار محمد رفیع خاں کی بیٹی تھیں مگر شادی کے دوسال بعد ان کا انتقال ہوگیا اور کابل سے چار پانچ میل دور ایک جگہ بدھ خاک ہے جہاں انہیں دفن کیا گیا۔''

''سائر جان کے جہیز میں گھر کی ایک منتظمہ، غلام اور لونڈیاں تک دی گئی تھیں۔ منتظمہ کو سب نانا جان کہتے تھے مگر اصلی نام سردار جان تھا۔ ان کا تعلق شاہ شجاع کے خاندان سے اس طرح تھا کہ انہوں نے شجاع کی بیٹی کو پالا تھا۔ ان کی بیٹی کا نام آغا کلاں تھا۔ سردار جان کی شاہی حرم میں پرورش ہوئی تھی، عربی، فارسی خوب جانتی تھیں، بہت عابد، پرہیزگار اور نیک خاتون تھیں، آداب شاہی اچھی طرح جانتی تھیں۔ انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ فیضؔ کی پرورش میں نانا جان (سردار جان) کا بہت حصہ تھا۔ انہیں بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ بادشاہوں کی فیاضی، جلال، انصاف اور سزا کے قصے بڑی تفصیل سے سناتی تھیں اور فیضؔ شوق سے سنا کرتے تھے۔''

''افغان دربار کی سیاست سے سلطان محمد خاں تنگ آکر بلکہ گھبرا کر ہندوستان آگئے اور جہلم میں دریا کے کنارے ایک بنگلہ کرائے پر لیا جس کا نام 'ساحل' تھا۔ یہ بنگلہ اب ایک ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس زیدی صاحب کے پاس ہے۔ ہمارے والد کو انگریزی حکومت نے سرگودھا اور منٹگمری میں زمینات دیں جہاں گھوڑوں کی افزائش نسل کے فارم تھے۔ کچھ مدت بعد وہ اپنے خاندان والوں کو افغانستان سے بلانا چاہتے تھے اور امیر کابل نے انہیں ان کے ساز و سامان، لونڈیوں، غلاموں اور چالیس باوردی سپاہیوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ درہ خیبر میں لنڈی کوتل تک یہ سپاہی ہمیں چھوڑ کر واپس کابل چلے گئے۔''

''والد کے خاص ملازم کا نام لالہ بہرام تھا...... کچھ لونڈیوں کے نام بھی یاد

ہیں۔ صنوبر، کلثوم، مروارید آپا بانو اور آپا سلیمہ، نانا جان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے وہ بھی خاندان کی خواتین اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آئیں۔ جہلم میں ابا کے ایک رشتہ دار تھے جو گھر کا انتظام کرتے تھے۔ ان کا نام ضیاء الدین تحصیلدار تھا۔ گھر کے اندر کے معاملات نانا جان کے ہاتھ میں تھے۔ ابا بیرسٹری کے کاموں میں لگے ہوتے۔ ہاں میں یہ بتانا بھول گئی تھی کہ ابا کابل سے آنے کے بعد لندن گئے، وہاں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور پھر جہلم آ کر وکالت کرنے لگے۔ اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد سے بہت پریشان رہتے تھے۔ جہلم میں جی نہ لگا تو پھر سیالکوٹ بس گئے۔ ہم لوگ بھی چلے گئے۔''

''خاندان والوں نے کہہ سن کر ابا کی دوسری شادی کرادی۔ ہماری دوسری والدہ کا تعلق ایک گاؤں جسٹر سے تھا جو نارووال تحصیل میں ہے۔ زمیندار خاندان کی تھیں اور اُن کے والد کا نام عدالت خاں تھا۔ ان کا قد چھوٹا تھا، رنگت بہت صاف تھی، ذہین اور تیز تھیں۔ ان سے ایک بیٹے طفیل اور ان کے تین سال بعد فیضؔ پیدا ہوئے۔ ہمارے چھوٹے بھائی کا نام عنایت ہے۔''

''فیضؔ جب پیدا ہوئے تو بہت سرخ، سفید اور موٹے تازے تھے۔ بچپن سے ہی بہت خاموش مزاج اور حلیم الطبع تھے۔ صاف ستھرے رہنے کا بہت شوق تھا۔ کہانیاں سننے کا بھی بہت شوق تھا۔ نانی جان انہیں کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ایسی کہانیاں جو بادشاہوں کے زمانے کی اور پشت در پشت چلی آ رہی ہیں۔ ان میں بعض تو عجیب ہی ہوتی تھیں۔ ایک قصہ بلکہ واقعہ جو فیضؔ بچپن میں بہت اشتیاق سے سنتے تھے، دو ڈاکوؤں کی بابت تھا۔ دادو اور سادو اپنے زمانے کے بڑے ظالم ڈاکو تھے۔ بڑی لوٹ مار مچائی اور ظلم و ستم کیے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن نے انہیں پکڑوا کر لوہے کے ایک پنجرے میں بند کرا دیا اور وہ پنجرہ عبرت کے لیے ایک اونچی ویران پہاڑی پر رکھوا دیا۔ دونوں بھوک پیاس اور وحشت سے مر گئے۔ ان کا گوشت پوست گل سڑ گیا اور ہڈیوں کا پنجرہ وہیں پڑا رہا۔''

''ہمارے ابا کے ایک چچا نادر بھائی تھے۔ چودھری نبی بخش وکیل ہائی کورٹ، وہ اپنے بھائی سے ملنے کابل آئے اور ابا کے ساتھ امیر عبدالرحمٰن کے دربار میں گئے۔ اتفاق سے اسی دن ایک آدمی کو اپنی صفائی کا موقع دیئے بغیر امیر نے موت کی سزا سنا دی۔ اس ظالمانہ سزا کا فیصلہ سن کو چودھری صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ امیر نے ابا سے پوچھا۔''اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟'' ابا نے جواب دیا۔''آپ کے جلال کے باعث۔'' ابا نے دوراندیشی سے کام لے کر ایسا جواب دیا ورنہ تو بادشاہ کے حکم کے خلاف آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کیئے جاسکتے تھے۔

سلطان محمد خاں نے جب سیالکوٹ میں وکالت شروع کی جو خوب چمکی تو گھر میں عزیزوں اور مہمانوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ ایک من آٹے کی روٹیاں پکتی تھیں۔ چھ بھینسیں تھیں اور چار گھوڑوں کی ایک گاڑی، نوکروں کی ریل پیل اور روپوں کی بارش۔ ایسے ماحول میں فیض کی پرورش ہوئی اور بڑے نازونعم سے، گھر میں مذہب کا بڑا زور تھا۔ نماز باقاعدگی سے پڑھی جاتی تھی۔ پورے روزے رکھے جاتے تھے۔ کلام پاک کی تلاوت ہر صبح باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ بی بی گل بتاتی ہیں۔''فیض نے دو سپارے حفظ کیے مگر جب اس کی آنکھیں دکھنے لگیں تو حفظ کرنا چھوڑ دیا۔ ہم سب بھائی بہنوں میں بہت پیار تھا اور مل جل کر رہتے تھے۔''

بی بی گل ماضی کی یاد میں کھو گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ سیالکوٹ کے کنک منڈی والے مکان میں وہ اپنے حافظے کے سہارے چل اور ہنس بول رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اپنے شوہر شجاع الدین بیرسٹر کا ذکر کرتے ہوئے بتایا۔''وہ پانچ سال ولایت میں رہے، انہیں سولہ سال کی عمر کنگس کمیشن ملا۔ انگریز کی فوج میں میجر کے عہدے تک پہنچے، ایک انگریز بیوی بھی تھی۔'' بی بی گل کہتی ہیں۔''میں نے مڈل تک پڑھا تھا، گھر پر ایک استانی بھی آتی تھیں۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت قدامت پسند تھا۔ پردے کی سخت پابندی تھی۔ [illegible] نے ایک عمر تک افغانوں کا سا لباس پہنا جس

میں سر کی ٹوپی بھی شامل تھی۔"

اپنی شادی کے بعد کے حالات سناتے ہوئے۔" ہندوستان میں دھرم سالہ ایک بہت خوبصورت جگہ ہے جہاں ہم شادی کے بعد چلے گئے۔ فیضؔ ان دنوں مرے کالج سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چھٹیاں ہوتیں تو ہمارے پاس آ جاتے۔ ان کے بہنوئی انہیں چاہتے تھے اور ان کے آنے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ فیضؔ کے ساتھ ان کے دو ایک دوست بھی آتے تھے جیسے خواجہ خورشید انور خواجہ مسعود اور ایس ایم دین پیر۔ فیضؔ کا زیادہ وقت سیر و تفریح اور گھومنے پھرنے میں صرف ہوتا تھا۔ جب یہ دوست اکٹھے ہوتے تو گراموفون ریکارڈ بجائے جاتے۔ خورشید انور کو جو ریکارڈ ناپسند ہوتا وہ اسے توڑ ڈالتے۔ پکّے گانے سب ہی کو پسند تھے اور وہی سنا کرتے تھے۔ جیسے جمنا کے تیر، لاگی کریجوا میں چوٹ، یا بسنت راگ، جب ہنسنے ہنسانے کو جی چاہتا تو سب لڑکے مل کر ایک گانا گاتے۔ "میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا"

"فیضؔ اپنے بھانجے اور بھانجی کو بہت پیار کرتے تھے۔ انہیں میز پر مکّا مار مار کہنا سکھایا تھا۔

"ٹوڈی بچہ ہائے ہائے
مال ولایتی بائیکاٹ"

"سالے بہنوئی دونوں انگریزوں کو پسند نہیں کرتے تھے مگر ہمارے میاں کا انگریزوں سے میل جول تھا۔ ان کے ساتھ ٹینس برج وغیرہ کھیلتے تھے۔ البتہ انہیں ترکوں سے بہت ہمدردی تھی۔ ہمارے دھرم سالہ کے گھر میں مصطفیٰ کمال پاشا، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی تصویریں لٹکی تھیں۔"

اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بی بی گل نے کہا۔" ہمارے والد بھی انگریزوں سے متاثر تھے مگر اولاد پر الٹا اثر پڑا۔ فیضؔ اپنے والد کے کہنے پر آئی سی ایس کے

امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ امتحان سے پہلے انہیں ہیضہ ہوگیا، اس لیے امتحان نہ دے سکے۔ پھر خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی اور انگریزوں کے اتنے خلاف ہو گئے کہ آئی سی ایس کا امتحان ہی نہ دیا۔ خورشید انور آئی سی ایس میں اوّل آئے مگر بم بنانے کی وجہ سے انہیں ملازمت نہیں ملی بلکہ سزا ہوئی۔ فیضؔ کے باقی دوست سرکاری ملازمت میں شامل رہے۔''

''ایک سال فیضؔ دھرم سالہ آئے تو ایک دلچسپ اتفاق ہوا۔ ایک دن چوڑی دار پاجامہ اور اچکن پہن کر سیر کے لیے نکلے تو کچھ ہندوؤں نے غلط فہمی میں ان کو گھیر لیا اور کہا آپ کب تشریف لائے اور کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ فیضؔ نے جواب دیا ''بیرسٹر شجاع الدین کے ہاں'' اس پر لوگوں نے کہا۔ ''ان کے ہاں ٹھہرنے سے مذہب بھرشٹ ہوتا ہے۔'' اتنے میں کچھ عورتیں تھالوں میں مٹھائیاں سجا کر لے آئیں۔ فیضؔ نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی کہ میں پنڈت نہرو نہیں ہوں فیضؔ احمد فیضؔ ہوں اور اپنے بہنوئی بیرسٹر شجاع الدین کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ان پڑھ لوگوں کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ جس کا سواگت کرنے چلے تھے وہ نہرو نہیں فیضؔ نکلے۔ دھرم سالہ میں بہت بڑا میلہ لگتا تھا اور فیضؔ کو ہمیشہ میلوں ٹھیلوں سے دلچسپی رہی۔ اس لیے میلے میں اکثر جایا کرتے تھے۔''

بی بی گل نے اپنی بیٹی سعادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ فیضؔ کو بہت تنگ کرتی تھی کہ کوئی کہانی سناؤ۔ جان چھڑانے کے لیے وہ اسے آدمی کا ایک قصہ سناتے تھے۔ اس طرح شروع کرتے 'ایک آدمی تھا۔ تم سمجھ گئیں نا ایک آدمی۔ وہی آدمی جو بالکل آدمی کی طرح ہوتا ہے۔ آدمی تو پھر آدمی ہوتا ہے نا۔'' بی بی گل بتاتی ہیں۔ ''فیضؔ نے ہمیشہ اس آدمی کا اتنا ہی قصہ سنایا اور کبھی پورا نہ کیا ادھورا ہی رکھا۔ آدمی کی کہانی آدمی سے آگے نہ بڑھتی تھی۔'' سعادت اس کہانی کو یاد کر کے بہت ہنسیں۔

بی بی گل ماضی کی مشعل تھامے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان جگہوں پر گئیں جہاں وقت نے بہت سی چیزوں کو مٹا دیا ہے اور جب کوئی نقش اجالا جائے تو پھر یکا یک یادوں کا کوندا سا لپک آتا ہے اور بہت سے دوسرے نقش چمکنے لگتے ہیں۔ لوگ جو رُخصت ہوگئے۔ ان کے مرحوم شوہر، عزیز و اقارب چھوٹے بڑے واقعات یادوں کے پردے پر ایک متحرک فلم خاموشی سے چلنے لگتی ہے۔

''میں دھرم شالہ میں تھی۔ فیضؔ کی چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ ابا جی کا خط آیا لکھا تھا۔ مجھے زندہ دیکھنا ہے تو بہن کی شادی پر آؤ ورنہ زندہ نہ دیکھ سکو گی۔'' میں سیالکوٹ پہنچ گئی۔ انہوں نے شادی کا مکمل انتظام کرایا۔ دُور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کے قیام و طعام کا اہتمام کیا، گھر کی رونق اور چہل پہل سے بہت خوش تھے۔ اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور ڈاکٹر کے آنے آنے تک ختم ہوگئے۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

فیضؔ صاحب کی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے بی بی گل کہنے لگیں۔ ''انہیں مجھ سے بہت محبت تھی۔ ان کا خط بہت خوبصورت تھا اور مجھے ہمیشہ پیاری بیٹی لکھتی تھیں۔ کچھ خط میں نے سنبھال کے رکھے ہیں آپ کو دکھاؤں گی۔ انہیں فیضؔ سب سے پیارا تھا اور اس سے بہت توقعات وابستہ تھیں۔ ان کے جیتے جی فیضؔ نے جو عزت اور شہرت حاصل کی اس سے بہت خوش ہوتی تھیں لیکن جب وہ جیل گئے تو بہت پریشان بھی رہیں۔'' ان کے مزاج کے متعلق کہا۔ ''خاموش طبیعت، سمجھدار، عبادت گزار بلکہ تہجد گزار تھیں۔''

''والد کے انتقال کے بعد پے در پے مشکلات پیش آئیں۔ زمینوں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ چالیس ملازموں کی پلٹن کو آہستہ آہستہ رخصت کیا۔ صرف مہر دین رہ گیا جس نے جانے سے انکار کر دیا۔ گاؤں کی ایک عورت تھی جسے سب پھوپی

پھوپی کہتے تھے وہ بھی رہ گئی۔ دونوں نے کہا ہم تنخواہ کے بغیر کام کریں گے۔ پھوپی بھولی گھر کا انتظام کرتی تھی اور مہر دین باہر کا کام۔ فیضؔ نے ان حالات میں بڑی سمجھداری سے کام لیا۔''

کسی بات پر کھانے کا ذکر چھڑا تو بی بی گل نے بتایا۔ ''فیضؔ کو افغانی کھانے بہت پسند تھے۔ شب دیگ، قورمہ پلاؤ، حبشی پلاؤ مگر خود کبھی فرمائش نہیں کی، جو مل گیا کھا لیا بلکہ اس کے مزاج کا یہ حال تھا جن دنوں حکم تھا کہ لڑکے اگر کھانے کے وقت پر یعنی رات نو بجے تک گھر نہ آئیں تو کھانا نہ دو، تو محمد طفیل مجھے یا کسی اور کو جگا کر کھانا لیتے اور گرم کرا کے کھاتے، چھوٹے بھائی عنایت خود باورچی خانے میں جا کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر پیٹ بھر لیتے مگر فیضؔ آتے تو نہ کسی کو جگاتے اور نہ کھانا تلاش کرتے بلکہ چپ چاپ بھوکے سو جاتے۔ مجھے اس کے مزاج پر رحم آتا اور میں پوچھتی فیضؔ کھانا کھاؤ گے؟ جواب دیتے ہاں مل گیا تو کھا لیں گے۔''

بی بی گل کہتی ہیں۔ ''فیض کو اپنے سب بھائی بہنوں میں مجھ سے بہت محبت تھی اور اپنے بہنوئی سے بھی۔ ان کا انتقال ہوا تو کئی دن تک بالکل خاموش اور گم سم رہے اور کھانا بھی نہیں کھایا۔ اپنی بھانجی کو اسکول میں داخل کرایا اور مجھے سمجھایا بچوں کو اچھی تعلیم دلوانی چاہیے۔ ہمیشہ ہر طرح کی مدد کی اور ہر ضرورت کے وقت نیک رائے دی اور نصیحت کی۔''

شادی کے متعلق میرے ایک سوال کے جواب میں بی بی گل نے بتایا۔ ''فیضؔ کے لیے بہت رشتے تھے مگر جہاں والدہ اور بہنیں چاہتی تھیں فیضؔ نے شادی نہیں کی۔ ایلس کا انتخاب کیا۔ والدہ نے مشرقی روایات کے مطابق انہیں دلہن بنایا۔ چینی بروکیڈ کا غرارہ تھا اور گوٹے کناری والا دوپٹہ، جوڑا سرخ تھا جیسا کہ شادیوں میں پہنایا جاتا ہے۔ ایلس نے کہا تھا میں سب کچھ مانوں گی برقع نہیں پہنوں گی۔''

ایلس کے متعلق کہا۔ ''ان کی بہت سادہ طبیعت ہے۔ بہت خلیق اور محبت کرنے والی ثابت ہوئیں۔ انہوں نے سسرال میں قدم رکھتے ہی سب کا دل جیت لیا اور خاندان میں اس طرح گھل مل گئیں جیسے اسی گھر کی لڑکی ہیں۔ وہی لباس اختیار کیا۔ یہاں سعادت نے کہا۔ ''ہم سب کی چہیتی ممانی ہیں۔'' ساس بہو کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے بی بی گل نے کہا۔ ''ساس نے بہو کو محبت دی اور بہو نے ساس کی عزت کی۔''

''ایلس نے ثابت کر دکھایا کہ وفا، ایثار اور محبت تنہا مشرق کی روایات نہیں ہیں۔ یہ تو عورت کی سیرت کا حصہ ہیں۔''

OO

خدیجہ بیگم

یادوں سے معطر

یاد نہیں کہ وہ امرتسر میں ۱۹۳۵ء کے اکتوبر کی شام تھی یا ۱۹۳۶ء کی۔ رشیدہ آپا اپنی ننھی سی کالے رنگ کی موٹر سے شور مچاتی ہوئی اُتریں اور ان کے قہقہوں سے بھائی جان کا گھر گونج اٹھا۔ چمکتی آنکھوں نے پورے گھر کو روشن کر دیا۔ ہم سب محو ہوگئے اور رشیدہ کو سننے اور دیکھنے لگے۔ کسی نے غور بھی نہیں کیا کہ ایک دبلا پتلا نوجوان کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنے اپنی خاموش مسکراہٹ کے ساتھ دروازے پر رکا ہوا ہے۔ یکا یک رشیدہ آپا نے چونک کر کہا۔ ''خدیجہ ان سے ملو، یہ فیضؔ ہیں۔ ہمارے نوجوان شاعر۔'' ہم نے سر سے پیر تک ان پر نظر ڈالی، دل کو یہ ماننے پر مجبور کیا کہ یہ شاعر ہیں مگر دل نے انہیں صرف نوجوان مانا شاعر نہیں۔ ہمارے تصور میں اس وقت شاعر کا حلیہ کچھ اور ہی تھا۔ لمبے لمبے بال والا۔ جھومتا جھامتا، کھویا کھویا سا، اور جگر جیسا۔ یہ سوچ کر کہ یہ شاعر وائر نہیں ہیں نہ ان کی طرف دوبارہ دیکھا اور نہ ان سے کوئی بات کی۔ فیضؔ نے نہ شراب پی نہ شعر سنایا نہ شور مچایا۔ پھر یہ شاعر کس قسم کے ہوئے؟ کھانے کے بعد رشیدہ آپا کے ساتھ لاہور چلے گئے اور ہم بالکل بھول بھال گئے کہ کسی شاعر سے مڈ بھیڑ ہوئی تھی۔

۱۹۴۳ء میں رشیدہ آپا کے پاس لکھنؤ گئی جہاں اِدھر اُدھر کی گھریلو باتوں کے بعد اُنہوں نے سوال کیا۔ ''تم فیضؔ کو تو جانتی ہو نا؟'' میں حیران کہ یہ فیضؔ کون ہیں اور رشیدہ آپا نے کیوں مان لیا کہ میں انہیں جانتی ہوں۔ رشیدہ آپا کی عادت تھی کہ وہ سوال

کرنے کے بعد اس کے جواب کا انتظار نہیں کرتی تھیں بلکہ فوراً کوئی دوسرا سوال پوچھ ڈالتیں یا بات کہہ ڈالتیں چنانچہ فوراً الماری سے پیلے اور نیلے رنگ کی ایک کتاب نکال کر دی جس کے سرِ ورق پر فیضؔ کی تصویر تھی۔ دل سے مشورہ کیا جواب ملا ہم فیضؔ کو نہیں جانتے کتاب کے اندر نہایت خوبصورت خط میں لکھا تھا۔ ''رشیدہ آپا کے لیے۔۔ فیضؔ۔'' اندر کے صفحات الٹے پڑھے اور ان چار مصرعوں نے چونکا دیا' جگا دیا۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

بات انوکھی، زبان سادہ، لہجہ نرم۔۔ بہت اثر ہوا اور بار بار یہ اشعار پڑھے۔ تیسرے دن جب لکھنؤ سے روانہ ہوئی تو رشیدہ آپا نے ناشتہ اور نقش فریادی ہمارے ساتھ کیا۔ اس کے بعد ہر رسالے میں فیضؔ کا کلام تلاش کیا مگر کم ہی نظر آیا۔

۱۹۴۷ء میں حالی سے دہلی میں ملاقات ہوئی اور گہری دوستی ہوگئی اور اکثر ملنا ہوتا تھا۔ حالی نے جب پہلی مرتبہ۔

اک فرصت گناہِ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

گا کر سنایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فیضؔ کی عظمت پوری کائنات پر چھا گئی ہے اور شوق پیدا ہوا کہ اس شاعر سے ملا جائے۔ دن گزرتے گئے اور ملاقات نہ ہونے کے باوجود ہم دوستوں کی محفلوں میں فیضؔ کے اشعار گائے اور سنائے جاتے تو ایسا لگتا فیضؔ بہ نفس نفیس شریک محفل ہیں۔ ان کا ایک ایک شعر مجھے زبانی یاد ہوگیا۔ بالکل محاورے اور کہاوت کی طرح ہم لوگ فیضؔ کا حوالہ دینے لگے۔ نہ جانے ایک دن کسی نے کہہ دیا کہ فیضؔ جیسے کہ وہ اپنے اشعار میں نظر آتے ہیں واقعی وہ ویسے ہیں نہیں۔ میں نے اپنے دل میں فیضؔ کا جو مجسمہ بنایا تھا اسے کسی قیمت پر بدلنے کے لیے تیار نہیں

تھی اس لیے ٹھان لیا کہ ان سے کبھی نہیں ملوں گی۔

ایک زمانے کی بات ہے میں لاہور میں اپنے بھائی کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ ہم سب شامیانے میں بیٹھے تھے کہ کسی نے کہا فیضؔ آ رہے ہیں۔ میں ایک دم وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئی اور اس وقت تک باہر نہیں نکلی جب تک کہ فیضؔ چلے نہیں گئے۔ بات وہی تھی کہ اپنے تصور میں ان کا جو مجسمہ تیار کیا تھا کہیں وہ پاش پاش نہ ہو جائے۔

۱۹۵۶ء میں علی گڑھ سے دہلی حالی کے یہاں گئی اور ارادہ تھا کہ ایک ہفتہ قیام کر کے لاہور لوٹوں گی لیکن حالی نے اپنی دانست میں 'خوشخبری' سنائی کہ پرسوں فیضؔ آ رہے ہیں۔ چنانچہ میں پرسوں کے آنے سے پہلے دہلی سے بھاگ نکلی۔ میں 'نقش فریادی' اور 'دست صبا' والے اس فیضؔ کے علاوہ جس کی خاص تصویر میرے دل میں اتری ہوئی تھی کسی دوسرے فیضؔ سے نہیں ملنا چاہتی تھی۔ میں فیضؔ کے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات معلوم کرنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ میں بھی جیل کی چہار دیواری میں وقت گزار آئی ہوں، ان کی طرح زمانے کی سختیاں جھیلی ہیں۔ وہ صبح و شام اور وہ چاند تارے میں نے بھی دیکھے ہیں جو شاعر کا حصہ تھے۔ 'زنداں نامہ' شائع ہوئی تو یوں لگا ہمارے نام کوئی پیام آیا ہے۔

۱۹۶۱ء کی ایک شام آئی جب میں کراچی میں باجی سے ملنے گئی۔ باجی کہنے لگیں ''ارے تم ذرا پہلے آتیں، فیضؔ آیا ہوا ہے۔ اس سے مل لیتیں۔'' میں نے شکر کیا کہ اس وقت وہ حضرت باہر گئے ہوئے ہیں ورنہ یہاں تو ٹکراؤ ہو ہی جاتا۔ باجی کی گفتگو یک طرفہ ٹریفک ہوتی ہے۔ وہ دوسرے کو گفتگو کا موقع ہی نہیں دیتیں اور نہ سننے کا موقع۔ فیضؔ کے متعلق بس ایک جملہ کہہ کر دوسرا موضوع چھیڑ دیا کہ ہائے قیامت کا زمانہ آ گیا ہے۔ سگریٹ ملتے ہی نہیں۔ بعض بعض دن تو آنکھیں ترس جاتی ہیں سگریٹ کو۔ ہم نے تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت لی اور قریب کے بازار کی دکان دکان پھر کر باجی کے لیے تھری کاسل سگریٹ کی دو ڈبیاں خریدیں اور دوبارہ گئے تا کہ باجی کو دیدیں۔ اب جو

پہنچے' دروازہ کھولا تو دیکھا باجی تو دیوان پر براجمان ہیں لیکن ایک صاحب سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ٹہل رہے ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر کچھ ٹھٹکی وہ صاحب مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ باجی بولیں۔ ''فیض تم خدیجہ سے بھی نہیں ملے؟''

فیض صاحب نے باجی کے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ ایک نرم و نازک ''ہوں'' کے ساتھ میٹھی آواز مدھم لہجے میں سوال کیا۔ ''ارے ہم اب تک ملے کیوں نہیں؟'' اس پر مجھے کچھ ہنسی آئی کھسیانی ہنسی۔ باجی کو سگریٹ دیئے اور کوئی جھوٹا بہانہ کر کے جلدی سے باہر آ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیض صاحب لاہور آرٹ کونسل میں بڑے بڑے کارنامے انجام دے رہے تھے۔

تیسرے چوتھے روز صبح گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب میرے گھر آئے اور بولے فیض صاحب آئے ہیں اور آپ کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں سٹ پٹائی۔ اپنی ایک سے زیادہ حیرانیوں، پریشانیوں اور پشیمانیوں کو سمیٹنے بھی نہ پائی تھی کہ فیض صاحب اور ان کے ساتھ ان کے تین چار حالی موالی گھر میں گھس آئے۔ فیض صاحب آئے اور خاموش بیٹھ گئے۔ سگریٹ پہ سگریٹ پی رہے ہیں اور منہ ہی منہ میں کچھ فرما رہے ہیں۔ کیا مجال جو ایک جملہ بھی پورا سنائی دیا ہو۔ کبھی شروع کے اور کبھی آخر کے الفاظ غائب اور کبھی بیچ کے دور چار لفظ۔ آدھ گھنٹہ ٹھہرے اور چلے گئے۔

تصویروں کی نمائش کے سلسلے میں دو چار بار اور ملنا ہوا۔ افتتاح کے بعد میں، زاہد بھائی اور میری بھاوج فیض صاحب کے دفتر میں کافی دیر تک بیٹھے رہے، ایک دو اصحاب اور بھی موجود تھے۔ سب ہی بولتے رہے سوائے فیض صاحب کے۔ صرف مسکراتے رہے اور سگریٹ سے شوق فرماتے رہے۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں مجھ سے میری تصویروں کا ذکر نہ کر دیں۔ ایک لمحہ ایسا آیا جب باقی سب کسی موضوع پر گفتگو میں مصروف ہو گئے اور فیض صاحب نے میری طرف جھک کر نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ ''ضروری ہے کہ آپ کی تصویروں کا میں ذکر کروں؟'' میں نے جواب دیا۔ ''بالکل ضروری نہیں۔'' اس کے بعد میں نے چین کی سانس لی

کہ چلو یہ موضوع تو ختم ہوا۔ کوئی تعجب نہیں جو خود فیضؔ صاحب نے بھی یہ سوچ کر اطمینان کی سانس لی ہو کہ انہوں نے بھی تصویروں پر سیر حاصل گفتگو کر لی۔ پھر ہم دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

بعد کے دنوں کی بہت سی شاموں اور ملاقاتوں کی جو باتیں یاد ہیں ان میں قابل ذکر یا فیضؔ صاحب کے نقطۂ نگاہ سے کوئی قابل گفتگو موضوع نکل آیا یا بحث چھڑ گئی تو بس کچھ اس قسم کی باتیں کیں۔ ''ٹھیک ہے۔'' ''ٹھیک ہو جائے گا۔'' ''یوں بھی ہوسکتا ہے۔'' بیشتر محسوس ہوا کہ فیضؔ صاحب نے بحث کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ایک دن میں نے پوچھا۔ ''جب آپ کو معلوم ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے تو آپ ٹھیک ہے کیوں کہتے ہیں۔ ایک غلط بات ٹھیک کیسے ہوسکتی ہے جبکہ آپ اس کا غلط ہونا تسلیم کر لیں۔'' اس بار بھی وہی جواب دہرایا'' ٹھیک ہے'' فرق صرف اتنا تھا کہ لفظ ٹھیک پر زیادہ زور دیا تھا۔

فیضؔ صاحب کی امن پسند طبیعت اور صلح آمیز مزاج دیکھ کر اور پرسکون باتیں سن کر میں حیران ہوتی ہوں کہ یہ ترقی پسند باغی شاعر تو کسی طرح بھی نہیں ہوسکتا جو شخص دوست سے زبانی اختلاف تک سے گریز کرتا ہے۔ سماج اور نظام سے کیسے ٹکر لے سکتا ہے۔

دوستی اور بے تکلفی بڑھ جانے کے باوجود میں انہیں ہمیشہ ''فیضؔ صاحب'' کہتی ہوں۔ کبھی فیضؔ نہیں کہتی۔ آپ جناب سے بات کرتی ہوں۔ ہمیشہ با ادب با ملاحظہ۔ انہیں اپنے لیے یہ احترام اور ایسا ادب ناگوار گزرتا ہے۔ ایک روز مسکراتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔ ''اگر تم مجھے اسی طرح فیضؔ صاحب کہا کرو گی تو ہمیں بھی خدیجہ بیگم صاحبہ کہنا پڑے گا۔'' ان کا مزاج دیکھئے اس کے بعد بھی میں نے کبھی فیضؔ نہیں کہا مگر اس روز کے بعد نہ انہوں نے مجھے ٹوکا اور نہ مجھے خدیجہ بیگم صاحبہ وغیرہ کہا۔

شروع دوستی کی بات ہے، کھانے کی طرف ہماری بے التفاتی دیکھ کر ایک دن کہنے لگے۔ ''تمہاری ہماری دوستی نبھے گی کس طرح؟ تمہیں نہ کھانے کا شوق ہے

اور نہ کھلانے کا۔''

میں نے کہا۔''یہ تو دوستی میں رکاوٹ یا خلل کا سبب نہیں ہوسکتا۔'' چنانچہ لندن تک میں نے فیض صاحب کو بہت مزے مزے کے کھانے خود پکا کر کھلائے اور بڑے چاؤ چاہت کے ساتھ مگر ہر بار دیکھا کہ جو چیز بہت نزدیک ہوتی بس وہی کھاتے رہتے۔ دال قریب ہے تو وہ کھا رہے ہیں، مچھلی دور ہے تو طلب نہیں کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی فرق ہی محسوس نہیں کیا کہ بیگن کا بھرتہ نوش جان کر رہے ہیں کہ بھیجہ۔ شاہی ٹکڑے لے لیے ہیں کہ بگھارے آلو، فیض صاحب کی اس اچھی یا بری عادت کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اگر اچانک آ گئے تو ہمیں کھانے کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اچھا بُرا جو بھی پکا تھا، پیش کر دیا۔ انہوں نے مزے لے کر کھا لیا۔ جب ٹیلیفون پر کہا۔''ہم آ جائیں کھانا کھلاؤ گی؟'' میں نے جواب دیا''ضرور'' وہ آئے۔ حاضر میں کوئی حجت نہ کی اور کھا لیا۔

فیض صاحب بڑے اچھے مہمان ہیں۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے آتے ہیں۔ آنے کے بعد اگر ان سے پوچھیں۔''چائے، کافی، شربت یا کوئی اور چیز؟'' تو کہہ دیتے ہیں۔ ''چائے'' اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اگر ہر چیز سے انکار کر دیں تو میزبان کی دل شکنی ہوتی ہے اور چائے ایسی چیز ہے جو کم سے کم وقت میں تیار ہو جاتی ہے۔ باقی چیزوں میں کچھ نہ کچھ اہتمام کرنا پڑتا ہے تو اس جھنجھٹ میں کون اپنے میزبان کو ڈالے۔

ان کی میزبانی کا شرف ہر ایک حاصل کر سکتا ہے۔ جو بھی دعوت پر بلائے چلے جاتے ہیں انکار نہیں کرتے۔ اگر کوئی کہے کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھایئے اور انہیں اس دن کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو دعوت قبول کر لیتے ہیں یا پھر میزبان ہی کی بتائی ہوئی کوئی دوسری تاریخ مان لیتے ہیں۔ ہم نے انہیں ایسی بہت سی دعوتوں میں جاتے ہوئے دیکھا ہے جن سے انہیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہاں بہت بور ہوئے مگر گئے ضرور۔ معلوم ہوتا ہے''نہیں'' کا لفظ ان کی ڈکشنری میں موجود نہیں۔ انکار سے گریز اور اس اقرار کے صرف دو سبب سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک تو وہ کسی کو ناخوش نہیں

کر سکتے۔ دوسرے لمبی چوڑی بحث کے بعد مان لینے سے بہتر یہ سمجھتے ہیں کہ فوراً ہاں کہہ دو اور چلے جاؤ دعوت میں۔ میں نے ایک دن کہا۔ ''فیضؔ صاحب! یہ جو آپ ہر ایک کے گھر چلے جاتے ہیں اگر خدانخواستہ عورت ہوتے تو نہ جانے کب کیا گڑ بڑ ہو جاتی۔'' اس پر بہت محظوظ ہوئے۔

ہم پر مدتوں فیضؔ صاحب کی عظمت اور قابلیت کا رعب رہا۔ رعب تو اب بھی اتنا ہی ہے مگر اب اسے چھپانے کا سلیقہ آ گیا ہے۔ پہلے تو بہت سوچ سمجھ کر کوئی علمی یا ادبی مسئلہ چھیڑتے اور ان کے خیالات اور گفتگو سنتے تھے تاکہ محفل میں کچھ گرمی رہے، کوئی تو کچھ بولے اور فیضؔ صاحب سے اس کا کوئی جواب سنے۔ بعد کے تجربے سے یہ سبق سیکھا کہ ہم دونوں اکیلے ہوں تو ضروری نہیں کہ کوئی بات ضرور ہی کہی جائے۔ وہ بیشتر خاموش رہتے ہیں اس لیے ہم کو بھی خاموشی اختیار کرنے کا ڈھنگ آ گیا۔ چنانچہ ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھے ہیں وہ چپ ہم بھی چپ۔

ایک بار انہیں آزمانے کے لیے کہ وہ ہماری گفتگو سنتے بھی ہیں یا محض سننے کی ایکٹنگ کرتے ہیں میں نے اپنے بچپن کی سنی ہوئی چڑیا اور چڑے کی کہانی شروع کی۔ ان کی محویت میری سمجھ میں نہ آئی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مجھے خیال ہوا لیلیٰ شعر و سخن انہیں کسی اور دُنیا کی گشت کرانے لے گئی ہے اور اب وہ میری محفل میں ذہنی طور پر حاضر نہیں ہیں۔ میں نے اچانک ایک جگہ وہ کہانی روک دی اور بالکل خاموش ہو گئی۔ سگریٹ کے دس بیس کش لگا کر بولے۔ ''پھر اس سفید چڑیا نے پہلے چڑے کا خیال دل سے کیسے نکال دیا؟'' اس استفسار پر مجھے یقین ہو گیا کہ کہانی سن رہے تھے۔ چنانچہ انہیں پوری کہانی سنانی پڑی۔

سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یہ کیسے فیضؔ ہیں جن سے ہم ملتے ہیں۔ اگر نقش فریادی، دست صبا اور زنداں نامہ ان کے تخیلات و تجربات کا آئینہ ہیں تو پھر ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے فیضؔ صاحب اپنے خول کے باہر نکلتے ہی نہیں، وہی خول جس کے بغیر انہوں نے ایک سے ایک شاہکار تخلیق کیا۔ نہ گفتگو میں گرمی نہ تلفظ میں تیزی۔ نہ

کبھی کوئی شوخی دکھائیں نہ کہیں کوئی تڑپ محسوس کریں۔ نہ غم نہ غصہ نہ شور نہ شکوہ یہ کیسے انقلابی شاعر ہیں کہ کبھی گفتگو میں سیاست کا رنگ ہی نہیں جھلکتا۔ شعر میں موتی رولتے ہیں محفل میں چپ چاپ رہتے ہیں۔ یہ تو سراسر بخیلی ہے۔ میرے تخیل میں جو بانکا اور اپنی شعری تراکیب کی طرح سجیلا شاعر تھا وہ تو یہ فیض صاحب نہیں ہیں۔ یہ تو بے حد دوست قسم کے انسان ہیں۔ شاعر بھی دوست ہوتا ہے، بہت اچھا دوست مگر یہ تو اتنے اچھے دوست نکلے کہ اندر کا شاعر ہی غائب ہوگیا۔

یک طرفہ دوستی کے باوجود کبھی جی نہ چاہا کہ صرف فیض کہوں۔ ان کی خاموش طبیعت سے کبھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مہینوں نہ آئیں یا ٹیلیفون نہ کریں تو کبھی شکایت کی ہمت نہ ہوئی۔ خط کے جواب نہ دیں تو شکوہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یہ سب غالباً مزاج شناسی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ انہوں نے ہمیں پہچانا ہو یا نہ ہو، ہم تو انہیں جان گئے پہچان گئے۔

ایک بات پر میرا ان کا اختلاف موجود ہے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ دوستی ہوتی تو خود بخود ہے مگر اسے قائم رکھنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ کہتے ہیں محنت مشقت کی دوستی، دوستی نہیں فیکٹری کا بنا بنایا مال ہے۔

لاہور کے قیام کے زمانے میں ایک بار فیض صاحب کا فون آیا اور خلاف عادت بات شکایت سے شروع کی۔ ''تم نے ہمیں فون کیوں نہیں کیا۔'' ہم حیران کہ آخر بلاوجہ فون کیوں کرتے۔ کبھی شکایت نہ کرنے والے سے کہا۔ ''اس شکایت کا سبب پوچھ سکتی ہوں؟ کیا آپ کو کوئی خاص بات کہنی تھی جو میں فون کرتی تو کہہ دیتے؟''

فرمایا: ''ہم آجائیں کیا کھلاؤ گی؟''

''دال روٹی۔''

''تو پھر نہیں آتے۔''

''اور اگر نرگسی کوفتے، سیخ کباب اور مرغ مسلم ہو تو؟''

''آجائیں گے۔''

ایک بجے تشریف لائے۔ معمول سے زیادہ خوش مگر خموشی بھی نمایاں۔ اس بشاشت کا سبب دریافت کرنے کو جی چاہا مگر برسوں کی سنگت نے سکھایا ہے کہ فیضؔ صاحب سے کم سے کم سوال پوچھنا چاہیے تاکہ انہیں جواب کی زحمت نہ ہو۔ کھانے کے بعد دھوپ میں بیٹھنا چاہتے تھے۔ باہر سبزہ زار پر کرسیاں رکھوا کر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ یوکلپٹس کے بڑے بڑے درخت چاروں طرف رنگوں کے بیسیوں موسمی پھول، ان کی مہک، چڑیوں کی چہکار، شاعر کی مسرتوں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ کبھی درختوں کو دیکھتے کبھی پھولوں پر غور کرتے، کبھی بے سبب مسکراتے کبھی بے وجہ ٹہلتے۔ پھر ایک بار دھیمے سے بولے۔ ''شعر کہنے کو جی چاہ رہا ہے۔''

معلوم نہیں مجھ جیسا کوئی اور خوش نصیب ہے جس نے فیضؔ صاحب کی زبان سے یہ جملہ سنا ہو، ایسا منظر دیکھا ہو، ان کا ایسا موڈ دیکھا ہو۔ میرے لیے یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ دیکھتے دیکھتے آسمان سے پھول برسیں گے، ستارے اتریں گے۔

درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا یوکلپٹس کے درخت کو اُردو میں کیا کہتے ہیں؟''

شکر ہے حافظے نے ساتھ دیا اور میں نے کہا۔ ''شاید لغت میں یہ لفظ ملے یا نہ ملے اس کو سفیدہ کہتے ہیں اور مالی بھی یہی نام بتاتے ہیں۔'' معلوم نہیں فیضؔ صاحب نے یہ جواب سنا یا نہیں سنا۔ سگریٹ کی طلب ہوئی۔ ہاتھ میں ڈبیہ تھی مگر خالی، کھوئے کھوئے سے دکھائی دینے لگے۔ میں اندر گئی اور ان کے لیے سگریٹ لے آئی۔ سگریٹ کے چند کش لیے اور آسمان کی طرف دیکھ کر کچھ مسکرائے اور اس کے بعد گنگنانے لگے۔ میں سمجھ گئی نزول شعر کا لمحہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ چائے کا بہانہ کر کے اندر چلی گئی۔ اطمینان سے چائے بنائی اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد باہر آئی تو دیکھا گنگناتے ہوئے ٹہل رہے ہیں۔ چائے کی پیالی رکھ کر پھر اندر چلی گئی۔ دوبارہ بھی بہت دیر بعد باہر آئی تو دیکھا اب پہلے سے بہت زیادہ مسرور ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس دن فیضؔ صاحب نے شعر کہے یا نہیں۔ اگر کہے تو کون

ہے۔بس ہماری ان کی دوستی ایسی ہے نہ ہم پوچھیں نہ وہ بتائیں۔

اتنا کچھ انہیں جاننے اور ان کے اتنے قریب رہنے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے جیسے ہم فیضؔ صاحب کو جانتے ہی نہیں۔ واقعی کتنا جانتے ہیں اور کیا جانتے ہیں۔ اگر آج رشیدہ آپا ہوتیں اور پوچھتیں۔ ''فیضؔ کو تو تم جانتی ہونا؟'' تو ہم اثبات میں جواب نہ دے سکتے۔

خوش قسمت ہیں کہ ہم رشیدہ آپا کو جانتے تھے اور وہ فیضؔ کو جانتی تھیں۔ اس لیے ان ہی کے رشتے ناطے سے دعویٰ کرسکتے ہیں کہ فیضؔ صاحب کو جانتے ہیں۔

○○
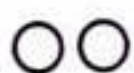
اندر کمار گجرال

بہ یادِ فیضؔ

فیضؔ نے ایک دفعہ لکھا تھا......

اب کوئی پوچھے بھی ہم سے تو کیا شرح حالات لکھیں
دِل ٹھہرے تو دَرد سنائیں دَرد تھمے تو بات کریں

دسمبر ۱۹۸۳ء میں اسلام آباد میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کے لیے مجھے بھی دعوت نامہ ملا۔ پرانے دوستوں سے ملاقات کی خواہش اور اپنا پرانا وطن دیکھنے کی پُرزور کشش کھینچ کر تین ہفتوں کے لیے وہاں لے گئی، لیکن جانے سے تشنگی اور بڑھی، کم نہیں ہوئی۔

لاہور سے میرا رشتہ بہت گہرا ہے۔ اِسی شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر جوانی کا بیشتر حصہ گزرا تھا۔ وہی یونیورسٹی کی پُرانی بلڈنگ، وہی میرے کالج اور ہاسٹل، وہی منرنگ روڈ پر واقع میری سسرال کی کوٹھی جہاں ہماری شادی ہوئی تھی۔ اُس شام کی یادیں عود کر آئیں، جب بارات میں فیضؔ اور مظہر علی باراتی تھے۔ یہ بات تو فیضؔ نے بھی نہ بھولی تھی۔ میری بیوی سے ملتے ہی پوچھا۔ ''اپنا گھر دیکھ آئی ہو نا۔''

لاہور میں وہ تاریخی بریڈلا ہال بھی اور لاجپت رائے بھون بھی تھے، جہاں بقول مجازؔ......

فطرت نے سکھائی تھی ہم کو
اُفتاد یہاں، پرواز یہاں

گائے تھے وفا کے گیت یہاں
چھیڑا تھا جنوں کا ساز یہاں

......اور اُسی جنون نے فیضؔ سے ملاقات بھی کروائی تھی۔

اسلام آباد میں کانفرنس ختم ہوئی تو پشاور ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ فون پر بات تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اطلاع ملتے ہی فیضؔ اور ایلس ہمارے ہوٹل آ گئے۔ یوں تو انہوں نے دعوت دی تھی کہ ہم دونوں اُن کے ہاں ٹھہریں، لیکن اُن کا گھر ماڈل ٹاؤن میں تھا، شہر سے باہر اور ہم بہت سے دوستوں سے ملاقات کے متلاشی بھی تھے، اور اس سے زیادہ خواہش تھی اُن گلیوں اور سڑکوں پر گھومنے کی جو جانی پہچانی تھیں۔ یوں بھی فطرتاً فیضؔ ظاہری تکلفات سے پرہیز کرتے تھے۔ ہماری معذرت کی وجوہ اُن کو معقول لگیں۔

اُن دنوں ہندوستان کی کرکٹ ٹیم بھی لاہور میں میچ کھیلنے گئی تھی۔ ہمارے سفیر کبیر نے ان کے اعزاز میں ہمارے ہی ہوٹل میں ایک دعوت دے رکھی تھی۔ جوں ہی اُن کو معلوم ہوا کہ فیضؔ اور ایلس میرے کمرے میں ہیں تو یہ حضرت مع عملہ آ گئے۔ فیضؔ سے پہلے ان کی ملاقات تو نہ تھی لیکن اس بہانے سے ان کا تعارف ہو گیا اور ہم سب تھوڑی دیر میں پارٹی میں جا پہنچے۔ پارٹی تو پرہیز گاروں کی تھی۔ ہر قسم کے کباب تو حاضر تھے، لیکن پاکستانی قوانین شراب بندی پر مصر تھے۔ کافی دیر تک فیضؔ، کوکا کولا قسم کے ڈرنکس سے گزارا کرتے رہے۔

ماسکو کے بعد فیضؔ سے میری ملاقات کوئی دو برس بعد ہو رہی تھی۔ چہرہ کچھ ڈھلا ہوا تھا اور چال بھی معمول سے دھیمی۔ میں نے ایلس سے وجہ پوچھی تو کہنے لگیں۔ ''ڈاکٹروں نے قلب کے متعلق وہم ڈالا تھا لیکن اب ان کی تسلی ہو گئی ہے۔'' اور فیضؔ حسب عادت سگریٹ کی جھڑی لگا رہے تھے، لیکن یہ کوئی پہلی دفعہ تو تھا نہیں کہ ڈاکٹروں نے ان کو کچھ ''ٹمپرنس'' کی صلاح دی تھی۔ ماسکو میں بھی ایک دفعہ ڈاکٹروں نے ان کو ہسپتال میں بند کر دیا تھا۔ یوں تو ان کے لیے وہاں کا قیام اچھا تھا۔ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد، ہاجرہ بیگم، پی۔ سی۔ جوشی بھی اُن دنوں وہیں تھے اور ہسپتال میں ان

کی آپس میں خوب جمتی تھی۔ ایک دن مجھ سے فون پر کہنے لگے۔

''بھائی جب ملنے آؤ گے تو ہماری پیاس کا دھیان کرتے آنا۔''

میں نے کہا۔ ''غضب کر رہے ہیں آپ، ڈاکٹروں نے آپ کو سختی سے منع کر رکھا ہے۔''

بولے۔ ''ارے بھائی تم بھی خوب ہو۔ ڈاکٹروں نے مجھے منع کیا ہے، آپ کو نہیں، اور یوں بھی ڈاکٹر احمد برا مان رہے ہیں۔''

لیکن غضب تو یہ ہوا ہے کہ ان کو موت اس وقت آئی جب تقریباً ایک برس سے وہ مکمل پرہیز گار بنے ہوئے تھے اور انہیں جو لوگ حال ہی میں لندن میں دیکھ کر آئے تھے، اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اب پہلے سے زیادہ صحت مند لگ رہے ہیں۔

اگلے دن شام کو ہم دونوں کھانے کے لیے ان کے گھر پہنچے۔ ایلس نے صرف اپنی دونوں بیٹیوں اور دامادوں کو بلایا تھا۔ سلیم اور منیرہ بہت پہلے ہی آ گئے تھے، لیکن جب وہ بہت چھوٹے تھے۔ اب تو ان کے بچے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ فیض کو تو معلوم تھا کہ میں ہمیشہ سے ہی بوتل سے دُور رہتا ہوں، لیکن پھر بھی ہندوستانی وِسکی حاضر تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''ارے یہ کیسے؟ ہم تو سنتے ہیں کہ قانون اب گھروں کے اندر بھی محتسب بھجوا دیتا ہے اور پھر یہ ہندوستانی وِسکی یہاں کیسے پہنچی؟''

''ارے بھائی سب چلتا ہے یہاں، ہم اور کون سے حکم مان رہے ہیں جو اس پر پابند رہیں۔''

کراچی میں کسی نے ایک لطیفہ سنایا تھا کہ اکیلے پینا زیادہ خطرناک ہے کیونکہ ضیا صاحب کے راج میں اب دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، لیکن بڑی پارٹی میں آسان ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ پارٹی کے سائز کے حساب سے حسب درجہ کسی فوجی افسر کو بھی مدعو کر لیجیے۔

اس دن بات زیادہ تر سیاسی موضوعات پر رہی۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات، روس کی افغانستان میں آمد کا اثر مختلف لوگوں پر مختلف تھا۔ بایاں طبقہ اس میں خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ ان کے نظریہ میں یہ سب نہ

ہوتا اگر حکومت پاکستان امریکہ کی آلہ کار نہ بنتی اور اشتمالی انقلاب کو چھوڑنے کی کوشش میں شریک نہ ہوتی۔ ایک اور سوچ زیادہ تھی کہ اس موقع پر پاکستانی پروگریسیو عناصر کو بھارت سے تعلقات سدھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان ہی دنوں فیضؔ بیروت سے لوٹے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی بدحالی نے ان کے من پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اس زمانے کی نظمیں اس کرب کا اظہار کرتی ہیں۔ اس شام ہم نے ان سے ''فلسطینی بچے کے نام لوری'' سنی۔

ابھی کچھ ماہ پہلے دہلی میں ہم لوگوں نے مل کر فیضؔ کے ۷۰ ویں جنم دن کا جشن منایا تھا۔ فیضؔ صاحب کے داماد ہاشمی صاحب کہنے لگے کہ اس کا اثر پاکستان کے لوگوں پر بہت گہرا تھا۔ مہینوں لوگ، ہندوستان کے لوگوں کی جمہوریت اور لبرل سماج کی باتیں کرتے رہے۔ بہت سے لوگوں نے تو ہندوستانی ٹی۔وی کے اس پروگرام کی کیسٹ بھی بنالی تھی، لیکن ہمارے ہاں کی بھی سنئے، فیضؔ تو یہاں تھے نہیں۔ یہاں بھی ایک جنم دن کمیٹی بنائی گئی۔ خبر نکلتے ہی اس کے سب ارکان میرے ساتھ گرفتار کر لیے گئے اور ہم نے چند دن پرانی انارکلی کے تھانے کے گندے سیل میں گزارے اور پھر وہ بتانے لگے کہ ''اسی تھانے میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ہمارے ساتھ نہ جانے کیوں پولیس والے ایک نوجوان مولوی کو بھی پکڑ لائے تھے۔ وہ بے چارہ پریشانی میں بہت رو رہا تھا اور بار بار کہتا تھا کہ میں تو جنرل صاحب کا حامی ہوں، مجھے پکڑنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

ہم میں سے کسی نے کہا کہ...... ''ارے صاحب ہم سب بھی تو ضیاء صاحب کے مداح اور حامی تھے، لیکن کل رات کچھ فوجی افسروں نے ضیاء صاحب کو باہر کر دیا ہے، اس لیے ان کے سب حامی پکڑے جانے والے ہیں۔''

باہر کھڑا اسنتری سن رہا تھا، وہ بھاگا تھانیدار کو بتانے۔ تھانیدار نے کسی کو فوراً فون کیا۔ جواب میں ڈانٹ پڑی تو ہمارے پاس آ کر کہنے لگا، آپ کا یہ مذاق ہم کو تو چوپٹ ہی کرنے والا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ افسر مہربان تھا۔'' یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اگلے دن ہم واپس دہلی آ رہے تھے۔

پچھلے سال میں نے اُن کو انبالہ کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے لکھا، لیکن قلبی دورے کی وجہ سے یہاں آنے کی بجائے ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ مظہر نے ان کی بیماری کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی وہ نظم جو انہوں نے مئو ہسپتال میں لکھی تھی، حسب معمول اس میں کرب بھی تھا اور عزم بھی......

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں میں کسی حسن کی جھلکی
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم ہو ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے گرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اک بیر، نہ اک مہر نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط ایک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کی ابھی عمر پڑی ہے

فیضؔ کی شاعری میں جہاں کرب کی گہرائی ہے، اس کے ساتھ ہی ہمت اور عزم ہمیشہ اُمید کی طرف لے جاتے ہیں۔

لمبی قید اور یہ ڈر کہ پھانسی کی سزا نہ ہو جائے، اس رجحان کو کم نہ کر پائے......

لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

......یوں تو راولپنڈی کیس سے پہلے بھی سب کی طرح کئی دفعہ ان پر بھی مایوسی کا غلبہ نظر آتا ہے۔ مگر بہت کم۔

یہ بزم چراغاں رہتی ہے
اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا

اور یہ بھی......

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیوں آس لگائے بیٹھے ہو

لیکن ان کی شاعری کی خوبصورتی یہ تھی کہ اس دُکھ اور مایوسی کے پیچھے ماحول کے دُکھ درد کی کہانی ہے جسے وہ خوبصورتی سے اپنے میں سمیٹ کر اور نتھار کر پیش کر دیتے ہیں۔ فیضؔ کے اس زمانی Lyricism اور انقلاب نے ہی ہماری پیڑھی کو اُن کی طرف کھینچا تھا۔ اب تو بات بہت پرانی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی لڑائی پورے زوروں پر تھی۔ کہنا مشکل تھا کہ آخر میں ہٹلر ہارے گا یا جیتے گا۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو پورا وشواس تھا کہ اس کی تکمیل کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ میں اس زمانے میں کالج کے آخری دنوں میں تھا، لیکن پڑھائی سے بھی زیادہ اُلجھاؤ تھا۔ میں بائیں بازو کی سیاست کے ساتھ تھا اور اس ناتے ہمیں جیل بندی ہوئی تھی۔ ہم جیسے لوگوں کے سیاسی خواب آزادی کے بھی اگلے پڑاؤ کی سوچتے تھے۔ اسی لیے وقتی، سماجی رشتے، ادب اور انقلاب کے باہمی اثرات پر اکثر بحث رہتی تھی۔ اس زمانے میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک بھی اُبھر کر سامنے آرہی تھی۔ نئے لکھنے والوں میں فیضؔ کے خصوصی انداز کا چرچا چل نکلا تھا۔

اچانک ہی ہمارے کالج میں خبر آئی کہ فیضؔ امرتسر چھوڑ کر لاہور ہمارے ہی کالج میں انگریزی ادب کے لکچرر ہو کر آرہے ہیں۔ حیرانی ہوئی کیونکہ نہ صرف ہمارا کالج سرکاری تھا بلکہ ہمارے پرنسپل انگریز تھے، لیکن تھے بڑے کھلے دماغ کے آدمی۔ ان کو تحریک آزادی کے ساتھ ہمدردی تھی۔ شاید اسی لیے فیضؔ کے انتخاب میں اُن کو کوئی پس و پیش نہ ہوا۔ کسی حد تک غائبانہ ملاقات تو تھی ہی، تھوڑے ہی دنوں میں ہمارا رشتہ شاگرد، اُستاد کی حد پھلانگ گیا اور ایک لمبی دوستی کی بنیاد پڑی۔

Adolesene میں کئی کھنچاوٹیں ایک ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور ہم لوگوں کے لیے انقلاب کے کئی معنی تھے۔ اس میں دیش دوستی بھی تھی، سماجی رشتوں کو بدل دینے کا عزم بھی تھا، نئی قسم کی شاعری سے دلچسپی بھی تھی اور اس پیڑھی میں ہمارے دوست ساحر اور سردار جعفری جیسے شاعر اپنی فنی صلاحیتوں کو دکھا رہے تھے، لیکن ان سب رجحانوں میں رومانیت کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اسی لیے فیض کی اس وقت کی شاعری ہماری ان تمام جذباتی کشمکشوں کی ترجمانی کرتی تھی اور دل میں اُتر جاتی تھی۔ ہمارا کوئی بھی ساتھی یا دوست نہ ہوگا جس کو ''نقش فریادی'' یاد نہ ہو۔ یا روزمرہ کے مشغلوں میں ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' کی بات نہ کرتا ہو۔

فیض کی مقبولیت کی وجہ اُن کی سادہ اور عام فہم زبان بھی تھی۔ اُسی زمانے میں Caud Well کی کتاب Studies in a Dying Culture شائع ہوئی۔ اس کا پیش لفظ آج بھی یاد آتا ہے جس میں اُس نے کہا تھا کہ شاعری ایک رومان بھی ہے کیونکہ اس کا رشتہ زبان اور سماج سے ہے، اس لیے ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی بات فیض نے اپنے ڈھنگ سے پیش کر دی ہے۔

اُسی زمانے میں John Freeman کی سوانح حیات New Testament کا بھی چرچا چلا، اور اس نے بائیں بازو کے دانشوروں میں ایک Negative قسم کی ہلچل پیدا کر دی۔ Freeman ایک منحرف کمیونسٹ تھے، شاعر بھی تھے، اس لیے ان کے متعلق رائے میں شدید اختلاف تھا، لیکن ان کی زندگی کا ایک واقعہ بڑی خوبصورتی سے بیان ہوا تھا۔ اپنے یونیورسٹی کے دنوں میں اُن کی ملاقات ایک خوبصورت لڑکی سے ہوئی جس نے ان سے ایک دن پوچھا کہ کالج چھوڑنے کے بعد آپ کیا کریں گے۔ ''شاعری اور انقلاب'' لڑکی کو یہ خیال بڑا خوبصورت نظر آیا لیکن اس نے بہتر یہی سمجھا کہ اُبھرتی محبت کو چھوڑ کر کسی خوشحال نوجوان سے شادی کر لی جائے۔ فیض بھی تو شاعری اور انقلاب کو اپنا چکے تھے لیکن ان کی قسمت Freeman سے بہتر تھی۔

یہ خبر کہ فیض ایک انگریز عورت سے شادی کر رہے ہیں اور وہ بھی انگلستان گئے

بغیر، بڑی عجیب لگی، لیکن اس میں بھی فیض کا انوکھا پن تھا۔ ایلس اپنی بہن مسز تاثیر سے ملنے امرتسر آئی ہوئی تھیں کہ فیض سے ملاقات ہوگئی۔ ہم خیالی نے پیار کے رشتے کو مضبوط کر دیا۔ جس زمانے میں فیض لاہور آئے، اس وقت تاثیر سری نگر میں پرنسپل ہوکر چلے گئے۔ اس لیے شادی وہاں رچائی گئی اور نکاح شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے پڑھایا۔ بعد کے برسوں میں شیخ صاحب اس کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ شادی میں کشمیر نیشنل فرنٹ کے تمام سرکردہ رہبر شامل ہوئے تھے۔ صادق صاحب اور بخشی غلام محمد کے ساتھ فیض کی دوستی اسی وقت شروع ہوئی۔ فیض کو قدرت نے بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا۔ لیکن ایلس جیسی رفیقۂ حیات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جس ڈھنگ اور بانکپن سے بیگم فیض نے مشکل کے دن کاٹے ہیں۔ وہ ان کی قابل رشک ہمت کا ثبوت ہیں۔ فیض کی جنگ میں شمولیت سے بائیں بازو کے فنکار اور سوچنے والے یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ پہلی بات نازی بربریت کو ہرانے کی ہے اور ہٹلر کی فتح کے پس منظر میں کوئی انقلابی ترقی پسند طاقت اس اصلیت کو نظرانداز نہیں کر سکتی۔ یہ سوچ فیض اور مظہر علی جیسے حساس لوگوں کو فوج میں لے گئی اور فیض کالج کی نوکری چھوڑ کر دہلی آئے۔ میں کالج ختم کر کے کراچی چلا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے دہلی آیا۔ اس زمانے میں نئی دہلی بھی کچھ اور تھی۔ رات کو ''بلیک آؤٹ'' ہوتا تھا اور انڈیا گیٹ کے اس طرف تو تھا ہی جنگل۔ فیض صاحب کو گھر ملا تھا لودھی اسٹیٹ میں۔ رات کو ان کے ساتھ کھانا تو میں نے مان لیا تھا، لیکن تانگے پر وہاں پہنچتے پہنچتے پسینہ آگیا۔ اب فیض صاحب کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ یا تو مجھے اپنی بوسیدہ آسٹن گاڑی میں واپس پہنچائیں یا رات کے قیام کا انتظام کریں۔ پھر تو پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ وطن بدر ہوکر دہلی آ گئے۔ لیکن فیض واپس لاہور چلے گئے۔ کچھ برسوں تک رشتے معطل ہو گئے۔ اب فیض کی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ میاں افتخارالدین نے ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کا اجراء کیا۔ فیض اور مظہر علی اس کے ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہاں ہم لوگ یہ خبر سن کر ان پر رشک کرنے لگے۔ یہاں تو دن رات مکانوں کی الاٹمنٹ اور راشن کارڈوں کی

گردش میں کٹتے تھے اور وہ نئے ملک میں نئی قدروں کے رجحان بنا رہے تھے۔ لیکن نہ ہی ان کی وہ حالت بہت دنوں رہی اور نہ اپنی۔ ایوب خاں کا راج آیا تو ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کو سرکار نے دبوچ لیا اور اب بھی وہ سرکاری ٹرسٹ کی ملکیت میں ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد راولپنڈی سازش کیس کا ڈرامہ رچا گیا۔ فیضؔ اور سجاد ظہیر لمبے عرصے کے لیے جیل میں بند ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد میاں افتخار الدین انتقال فرما گئے۔ اپنے وقت میں بڑے ٹھاٹھ کے انسان تھے۔ آکسفورڈ میں پڑھتے پڑھتے انقلابی بن گئے۔ واپس آکر پنجاب کانگریس کے صدر جواہر لعل جی کے ساتھ اُن کا قریبی رشتہ تھا۔ میرے والد اور وہ جیل میں دوبارا اکٹھے ہوئے تھے۔ ان کا رشتہ فیضؔ، محمود علی، مظہر علی اور ہم جیسے Leftist لوگوں کے ساتھ بہت گہرا تھا۔ فیضؔ کو اُن کی موت کا بہت رنج ہوا اور جیل سے انہوں نے ایک دردناک مرثیہ لکھا......

کرو کج جبیں پہ سر کفن
مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن
پس مرگ ہم نے بھلا دیا

جب ہم لوگوں نے یہاں اس شعر کو سنا تو ہندوستان کی سیاست ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ کانگریس دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔ جس دن اِندرا جی کو کانگریس سے نکال دیا گیا تو میں نے ان کو یہی شعر لکھ کر بھیج دیا۔ ان کو بہت بھایا۔ گو اُن کو شعر یاد رکھنے کی مہارت تو نہ تھی، پھر بھی کئی دفعہ کہہ دیتیں...... ''کیا تھا وہ فیضؔ کا شعر!''

فیضؔ کا رشتہ پنڈت جی اور اندرا جی سے بہت قریب کا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں جب فیضؔ دہلی آئے تو پنڈت جی نے پوری شام اُن کے ساتھ گزاری تھی۔ ۱۹۷۱ء کے بعد پاکستان میں حالات نے پلٹا کھایا۔ بھٹو کے دَور میں فیضؔ نیشنل آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر بنے تو دہلی آئے۔ میں اُن دنوں انفارمیشن براڈکاسٹنگ کا منسٹر تھا۔ کہنے لگے۔

''دو کام کرو۔ ایک تو شیلا بھاٹیہ کا مقبول اوپیرا ''ہیر رانجھا'' اور دوسرے اپنے

بھائی ستیش گجرال کی تصویروں کی نمائش پاکستان بھجواؤ۔"

میں نے کہا۔ "اصولاً تو اعتراض نہیں ہوسکتا لیکن ہماری بھی ایک شرط ہے۔ آپ دہلی ٹی۔وی پر اپنا پروگرام نشر کردیں۔"

فیضؔ صاحب نے تو اپنی بات پوری کردی لیکن نہ ہی شیلا بھاٹیہ کا اوپیرا اور نہ ہی ستیش گجرال کی تصاویر پاکستان جا پائیں۔ ابھی تعلقات ہی کچھ ایسے تھے اور دن بہ دن بھٹو کے اطوار بدل رہے تھے۔ فیضؔ اس سے مایوس تو ہو رہے تھے لیکن کوشش میں تھے کہ بھٹو اور ان کے مصاحب سامنے والی کھائی کو دیکھیں۔ فیضؔ اُن لوگوں میں سے تھے جو محسوس کرتے تھے کہ بھٹو اپنی غلطیوں سے صرف فوجی راج کی واپسی کی راہ ہموار کر رہے ہیں، لیکن یہ ہوکر ہی رہا۔

ہمارے ہاں بھی تاریخ ایک نیا صفحہ اُلٹ کر ایمرجنسی لے آئی۔ فیضؔ نے سوچا کہ شاید ایمرجنسی بائیں بازو کے زور کو توڑنے کے لیے لائی گئی ہے، لیکن وہ جلد ہی اس کے تیور سمجھنے لگے۔ جب ملے تو فیضؔ نے کہا۔

"یہ تم نے خوب کیا۔ پاکستان کو جمہوری راہ پر لانے کے بجائے تم لوگ خود ہی ڈھلک گئے۔"

جنرل ضیاء کا زمانہ آیا تو پھر سے ماحول میں گھٹن اور دانشوروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ فیضؔ تو کسی طرح نکل کر ماسکو آگئے لیکن ایلس اور بچوں کو بہت دیر تک اکیلے ہی مشکلوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ تب تک ایمرجنسی کے دور نے مجھے بھی ماسکو دھکیل دیا تھا۔ فیضؔ جب ملے تو انہوں نے کہا کہ......

ستم سکھلائے گا رسم وفا ایسے نہیں ہوتا

......اور اُن کی نظم "میرے دل میرے مسافر" تو بس دل میں ہی اُتر گئی۔ ہم کو تو ان کی وطن بدری کا بہت فائدہ ہوا۔ ہندوستان کا سفارت خانہ اُن کا دوسرا گھر تھا اور اکثر شام کو ہمارے ہاں نوازا کرتے تھے۔

ایک دن پرانی باتیں بسملؔ کی نظم "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" کی

ہوئیں۔ آزادی کی جدوجہد میں اس نے مجاہدوں کی صفوں کو گرما دیا تھا۔ تب فیضؔ نے بتایا کہ انہوں نے بھی اس انداز کی ایک نظم کہی ہے......

سرفروشی کے انداز بدلے گئے
دعوت قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا
لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا
فیضؔ کیا جانئے یہ کس آس پر
منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
میکشوں پہ ہوا محتسب مہرباں
دل فگاروں پہ قاتل کو پیار آ گیا

اب تو کئی دفعہ شام کو جب شعروشاعری کی مجلس جمتی تو پاکستان اور بنگلہ دیش کے ڈپلومیٹ بھی ہمیں نوازتے۔ بھارت میں موجودہ پاکستان کے سفیر ڈاکٹر ہمایوں خاں سے بھی اسی دور میں ملاقات ہوئی۔

فیضؔ کی اُردو زبان کو ایک دین یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کو بین الاقوامی زبان بنا دیا۔ روس میں ان کے بہت سے مداح تھے جن کو فیضؔ کی شاعری نے زندگی کا ایک اور ہی رُخ دکھایا ہے۔ ایک دفعہ ہماری ہندی بھاشا کے چوٹی کے کوی ''بچن جی'' ماسکو آئے۔ اس شام تو باقاعدہ مشاعرہ ہوا۔ گئی رات تک بچن جی نئی اور پرانی کویتائیں سناتے رہے۔ فیضؔ اپنی باری بھی خوبصورتی سے نبھاتے رہے۔ اس دن کا ایک ایک شعر آج بھی دماغ میں گھومتا ہے......

سہل یوں راہ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے
ہم نے دل میں سجا لیے گلشن
جب بہاروں نے بے رُخی کی ہے

زہر سے دھو لیے ہیں ہونٹ اپنے
لطف ساقی نے جب کمی کی ہے

فیضؔ کے ماسکو کے قیام کے دوران ہی ان کو عالمگیر میگزین لوٹس کی ایڈیٹری سونپی گئی۔ اس لیے ان کو زیادہ عرصہ بیروت میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ اسی اثنا میں ایلس بھی آگئیں۔ بیروت کی غارتگری کا فیضؔ کی شاعری پر گہرا اثر پڑا۔

چاند پھر آج بھی نہیں نکلا
کتنی حسرت تھی اُن کے آنے کی

...... یہ ماننا مشکل ہے کہ فیضؔ چپکے سے سو گئے ہوں گے۔ یقیناً انہوں نے فرشتہ اجل سے بھی پوچھا ہوگا......

لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

لیکن بات ختم کرنے سے پہلے ایک واقعہ کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ فیضؔ کی شاعری کو اور سوچ کو نیا موڑ دینے میں محمود الظفر اور رشید جہاں کا بہت ہاتھ تھا۔ ان دونوں نے ان کو کوئے یار سے نکال کر کوئے دار کا راستہ سمجھایا تھا۔ میں ابھی ماسکو گیا ہی تھا کہ فیضؔ کا پیغام ملا...... ''رشید جہاں کی قبر پر میری طرف سے بھی پھول چڑھا دینا۔'' دسمبر کی برفیلی سردی میں ہم دونوں میاں بیوی نے اُن کی قبر ڈھونڈ نکالی اور وہاں پہنچ کر فیضؔ صاحب اور رشید جہاں یادگاری کمیٹی کی طرف سے ہم نے ہدیہ کے پھول چڑھائے...... فیضؔ شاعر تو تھے ہی، لیکن ایک پیارے دوست اور خوبصورت انسان بھی تھے۔ یہ خلاء کبھی پورا نہ ہوگا۔

○○

<u>ایلس فیض</u>

یادوں کے سائے

یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ کسی ایسے شخص کے بارے میں معروضی بن کر بات کی جائے جو چوبیس سال تک رگِ جاں کی طرح ساتھ رہا ہے۔ ایک ایسا شخص جو میرا شوہر رہا ہے۔

فیض پر لکھتے وقت ذاتی باتیں اور مشترک تجربات کرشمہ کی طرح دامنِ دل کو کھینچتے ہیں لیکن جب انتخاب کا یہ مرحلہ آجائے کہ 'کیا لکھوں' تو وہی باتیں چننی چاہئیں جو دوسروں کی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کر سکیں۔ دوسروں کے دلوں کو یوں چھو لیں کہ ان کا لمس، تبسم اور قہقہہ کی تحریک بن سکے۔ یہی نہیں بلکہ وہ باتیں آنسوؤں کی سرحد تک پہنچا دیں۔

میں ماضی کی طرف دیکھتی ہوں — اور میری نگاہیں ناگزیر طور پر زنداں کے دروازوں سے ہو کر ماضی تک پہنچتی ہیں۔ جیل کے یہ سال ہماری باہمی زندگی میں ایک رخنہ کی طرح نظر آتے ہیں۔ مگر ان برسوں نے ہم دونوں کو وہ کچھ دیا ہے جو کسی طرح بھی ہم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ چند سال جن میں گھٹنوں چلتی ہوئی ایک بچی، چھوٹی سی لڑکی بن گئی۔ جن میں ایک لڑکی آہستہ آہستہ نوجوان خاتون بن گئی۔ جن میں زندگی کے ایک اچانک موڑ کی طرح کسی کے بالوں پر سفیدی غالب آگئی اور کسی کے چہرے پر جھریاں...... آہستہ آہستہ اپنا جال بنتی رہیں — زنداں کے دروازے ہمارے درمیان حائل تھے، لیکن ان دروازوں میں داخل ہوتے ہوئے، ان سے نکلتے ہوئے زنجیروں کی

جھنکار اور تالوں میں کنجیوں کے گھومنے کی آواز کے ساتھ زنجیر و سلاسل کے یہ ایام اپنے جلو میں مسرت سے بھرپور لمحے لے کر آئے۔ ناقابلِ یقین طور پر خوشیوں سے گل مایاں لمحے...... میں ان دنوں کے غم، بلکہ غموں کی بات نہیں کروں گی، کیونکہ موت (اور غم) نے اپنی خراشیں ہم دونوں کو دی ہیں۔ میں تو خوشی کے لمحوں کی یاد تازہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ سورج کی روشنی سے یہ بیتے ہوئے لمحات جگمگا اٹھیں۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ سائے بھی اتنے ہی عزیز ہوتے ہیں۔

جب مارچ کی ایک صبح کو فیضؔ نے مجھے اور سوتے ہوئے بچوں کو خدا حافظ کہا تو میرے سامنے سب سے پہلا اور سنگین مسئلہ یہ تھا کہ چار سو روپے ماہانہ کی آمدنی سے گھر کو کیسے چلایا جائے گا؟ بادلِ ناخواستہ ہم نے شفیع اللہ کے علاوہ دوسرے پرانے نوکروں کو الگ کر دیا۔ شفیع اللہ جواب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ فیضؔ کی سراپا اخلاص سوتیلی بہن بالی ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آ گئی تاکہ وہ بدلے ہوئے حالات میں زندگی بسر کرنے میں میری مدد کر سکے۔ پہلی ضرب ہمارے بچوں پر پڑی۔ کوئن میری کالج سے ان کا نام کٹوا کر کنیارڈ مشن اسکول میں داخل کرانا پڑا۔ مجھے تو اس بات کا اندازہ بعد میں ہوا کہ یہ فیصلہ ہماری بچیوں کے لیے کتنا سود مند ثابت ہوا۔ منیزہ اکثر مجھے برا بھلا کہتی۔ ”جب ابو یہاں تھے تو میرے پاس ایک آیا تھی۔ اسکول میں جھولے تھے چکر گھنی تھی۔ طرح طرح کے کھیل تھے......“ اپنے نئے ماحول میں اسے فرش پر بیٹھنا پڑتا۔ لیکن دُعا کے نئے طریقوں نے اس میں ایک عجیب سا ذہنی اور نفسیاتی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ میری نند کے احتجاج کے باوجود وہ رات کو سونے سے پہلے اپنے گھٹنوں پر جھک کر نیم رکوع کے سے عالم میں آسمانی باپ کی حمد، بگڑی ہوئی اور قدرے مضحک اُردو میں سناتی۔ ایک رات جب وہ اپنے خالق سے مصروفِ کلام تھی اور ہم اسے سلانے کے لیے منتظر تھے، اس نے کہا۔ ’او آسمانی باپ...... تم جو حیدر آباد جیل میں ہو، جلدی سے واپس آ جا۔“ جب ہم نے اپنی گھٹی ہوئی ہنسی پر قابو پا لیا اور منیزہ کی باقی دُعا

سن لی تو اسے بستر میں لٹا دیا۔ پھر اسے (نیم بیداری کے عالم میں) یہ کہتے ہوئے سنا، باجی — بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

جیل میں ملاقات کی اجازت مدتوں کے انتظار کے بعد ملتی اور ہر ملاقات کی یاد (اگلی ملاقات تک) ہم سینے سے لگائے رہتے۔ اگلی ملاقات تک ہر پچھلی ملاقات کی ایک ایک نگاہ، ایک ایک لفظ، ایک ایک جنبش کو ذہن و دل میں ایک متاع عزیز کی طرح محفوظ رکھتے۔ یہ ملاقاتیں دو تین مہینے میں ایک بار ہوتیں۔ ہر ملاقات کے لیے ہمیں صحرائے سندھ کی وسعتوں کو طے کرنا پڑتا۔ یہ سفر تھکا دینے والے بھی تھے اور پھر تھکن پر اخراجات کا اضافہ کیجیے۔ جیلر ہر ملاقات کی نگرانی کرتا۔ خاص طور پر میری ملاقات کی نگرانی کیونکہ مجھے ''ممکنہ'' معلومات کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم ملاقات کے ان لمحوں کو ہلکے پھلکے واقعات اور دوستوں کے پیغامات سے شیریں تر بناتے، تاکہ اُن کا بوجھ لطافت تلے دب جائے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک ملاقات کے موقع پر جب میں ایک کہانی سنا رہی تھی ہمارا جیلر اس کہانی کی دلچسپیوں میں یوں گم ہو گیا کہ جب سنتری اور جیلر کی ڈیوٹی کا وقت پورا ہو گیا تو اس نے دوسرے جیلر سے کہا۔ ''بھئی تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ میں اس کہانی کا انجام تو سن لوں۔''

دوستوں نے مجھ سے اکثر پوچھا کہ بھلا کسی غیر کی موجودگی میں باتیں کیسے ہوتی ہوں گی؟ دو دلوں کی ملاقات کے درمیان ایک تیسرا وجود۔ ہر بات سنتا ہوا آدمی، سچ پوچھیے تو ہمیں اکثر کسی اور کی موجودگی کا احساس ہی کب ہوتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی 'حجابِ درمیاں' کی موجودگی ملاقات کو آلودہ کر دیتی تھی۔ جیسے شروع شروع میں جیلر صاحب میرے اور فیضؔ کے درمیان بیٹھنے پر اصرار فرماتے تھے۔

فیضؔ کی گرفتاری اور ان کی غیر قانونی قید تنہائی (میں غیر قانونی اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ایک مقررہ مدت سے زیادہ کسی شخص کو قید تنہائی کے عذاب میں مبتلا رکھنا غیر قانونی ہے) کے تین ماہ بعد میں اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ ان سے ملنے کے لیے لائل

پور جیل گئی۔ ہمیں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ پھر اس نے ہم تینوں کو دیکھا۔ مجھے اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس لمحہ ہم بہت تنہا، مایوس و ملول اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہمارے چہرے ہماری ذہنی کیفیت اور زندگی کے آئینے بن گئے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے پوچھا۔ 'آپ کی یہی دو بچیاں ہیں؟' میں نے اسے بتایا کہ یہی بچیاں ہماری متاع ہیں۔ ہماری زندگی کا حاصل ضرب۔ اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ 'کوئی لڑکا نہیں ہے؟' میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ اس نے ایک آہ بھری۔ ایک طویل آہ۔ پھر میری طرف دیکھا اور کہا ''کیسے افسوس کی بات ہے۔ کیسی افسوسناک بات۔' اس کے لہجے سے مجھے یہ احساس ہوا جیسے اب کسی بیٹے کی ماں بننا میرے مقدر میں نہیں۔ جیسے ...... میرا سہاگ لٹ چکا ہو!...... اور جب فیضؔ کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں بچیاں دوڑتی ہوئی ان کی آغوش میں سما گئیں۔ منیزہ نے جیسے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''ابو! 'وہ' کہتے تھے کہ آپ کے ہاتھ اور پیر کاٹ ڈالے جائیں گے۔'' وہ کون تھے یہ مجھے کبھی نہیں معلوم ہو سکا لیکن اس لمحے جب ہماری (میری اور فیضؔ کی) نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو ہمیں معلوم ہوا کہ بے یقینی کے تجربے اور خوف سے ہم ہی نہیں گزرے تھے (بلکہ ہماری بچیاں بھی بے یقینی کے کرب میں مبتلا تھیں۔)

حیدر آباد تک ہمارے سفر کا مطلب تھا، زیادہ ملاقاتیں۔ ان موقعوں پر ہم سہروردی مرحوم کے ساتھ قیام پذیر ہوتے۔ جو 'ملزم' کی قانونی پیروی کر رہے تھے۔ سلیمہ اور منیزہ سہروردی صاحب سے جیسے بے ساختہ پیار کرنے لگیں، اور ان سے قریب ہوتی گئیں۔ سہروردی مرحوم بچیوں کے لیے رقص کی موسیقی کی، دھن پر والز کرتے۔ دائرہ میں رقص...... ایک دن سلیمہ نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا 'آج میں نہیں ناچوں گی' لیکن منیزہ فوراً اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ سہروردی صاحب نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور پرانی دُنیا کے آداب کی سراپا تصویر بن کر جیسے رقص کی فرمائش کرتے ہوئے قدرے جھکے۔ منیزہ نے ایک نوجوان خاتون کی طرح جھک کر اس درخواست کو قبول کر لیا۔

سہروردی صاحب کا چہرہ بشاشت سے کھل اٹھا اور وہ دونوں کمرے میں ایک آہستہ اور مدھم سے فرانسیسی انداز کے شاہانہ رقص میں مصروف ہوگئے۔ بعد میں سہروردی صاحب نے گاڑی میں دریائے سندھ تک چلنے کی تجویز پیش کی اور پھر دریا کی موجوں پر کشتی چلاتے ہوئے انہوں نے ہمیں ایک پنجابی لوک گیت سنایا جو لڑکیوں کو پہلے سے یاد تھا۔ یہ سب کچھ کس قدر پُر لطف تھا۔ لیکن جب ہم یہ سوچتے کہ یہ ذہن اور صاحبِ جوہر آدمی کل صبح حصولِ انصاف کے لیے جیل کی چار دیواری کے اندر اپنی جدو جہد پھر شروع کر دے گا۔ تو ہر بات مہمل اور بے محل معلوم ہونے لگتی ہے۔

دربارِ وطن میں جب اک دن......

یہ فیضؔ کی محبوب ترین اور مقبول ترین قوالیوں میں سے ہے۔ مجھے حیدر آباد کی ایک عید یاد ہے۔ جب بیشتر قیدیوں کے خاندان یک جا ہوگئے تھے۔ شوخ رنگوں کے رنگا رنگ اور بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے اتنے بچے وہاں جمع تھے جنہیں دیکھ کر دیکھنے والا یہ بھی بھول جاتا کہ بلا کسی استثناء کے ان سب کے باپ ایسے الزامات میں ماخوذ تھے جن کی بنا پر استغاثہ سزائے موت تک کا مطالبہ کرسکتا تھا۔

عید کی اس پارٹی میں یہ قوالی جس جوش، چاؤ اور تیز دھن میں گائی گئی، اس کا تصور بھی ایک مشکل کام ہے اور جب قوالی ختم ہوئی تو اس وقت تک تمام بچے، بیویاں اور مائیں سب ہی اس قوالی میں شریک ہوچکی تھیں۔ سب کے ہونٹوں پر صرف یہی بول تھے......

دربارِ وطن میں جب اک دن......

ہم سب نے نہایت پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا اور جب ہم 'گھر' یعنی ڈاک بنگلے واپس پہنچے تو بچیوں نے کہا...... 'ایسا کھانا تو ہم نے بہت دنوں سے نہیں کھایا تھا۔ ہے نا امی!'

کھانے کی بات پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب فیضؔ کو سزا دی جا چکی تھی اور وہ اپنی میعاد قید منٹگمری جیل میں پوری کر رہے تھے۔

منیزہ اور سلیمہ نے اپنے ابو کو خط میں لکھا۔ ''ہم آ رہے ہیں۔ آپ دو پہر کے کھانے کے لیے کوئی اچھی سی چیز ضرور پکائیے گا۔'' ہمیں ایک ساتھ دو پہر کا کھانا کھانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ جب ہم لوگ منٹگمری جیل پہنچے تو نائب سپرنٹنڈنٹ لودھی صاحب نے منیزہ سے کہا۔ 'تمہارے ابو نے یقیناً تمہارے لیے کوئی خاص چیز پکائی ہوگی۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' منیزہ نے پوچھا۔

''میں نے تمہارے خط میں پڑھا تھا۔'' لودھی صاحب نے جواب دیا۔ جیل کے اربابِ حل و عقد یقیناً خطوں کا احتساب کرتے تھے۔ منیزہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ''تو کیا تم میرے خط پڑھتے ہو؟''

''ہاں۔'' لودھی صاحب بولے۔

''اف! بدتمیز کہیں کے۔''

میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ جملہ سن کر لودھی صاحب پر کیا بیتی، لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے چہرے پر اس وقت کیسے تاثرات تھے، چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ بیچارے لودھی صاحب۔

جب ۱۹۵۹ء کے ابتدائی مہینوں میں مارشل لا کے تحت فیضؔ پھر مہمان زنداں بنے تو لاہور جیل سے وہ قلعۂ لاہور میں منتقل کر دیئے گئے۔ میں نے ان سے ملاقات کی درخواست دی۔ سی آئی ڈی کے ذمہ داروں نے دانستہ جھوٹ سے کام لیا۔ انہوں نے اس بات سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ فیضؔ لاہور جیل سے قلعہ میں منتقل کر دیئے گئے چنانچہ اس دانستہ جھوٹ کی وجہ سے میں لاہور جیل گئی، اور وہاں پتہ چلا کہ فیضؔ تو وہاں سے جا چکے ہیں اور جب میں نے ملاقات کے لیے دوبارہ درخواست دی تو میں غصہ کے مارے سچ مچ ابل پڑی تھی۔ آخرکار میں اپنی بوڑھی ساس کے ساتھ قلعہ لاہور پہنچی۔ فیضؔ کو ان کی کوٹھری سے بلایا گیا۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یا تو انہیں شیو کرنے کی اجازت نہیں دی گئی یا انہوں نے خود ہی داڑھی بنانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کے پچھلے چوبیس گھنٹے خوشگوار ہرگز نہ تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے ناشتہ کیا ہے؟'

فیضؔ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں۔''

''کیا؟'' یہ تھا میرا دوسرا سوال۔

'او...... ایک بن۔ ایک پیالی چائے۔'' فیضؔ نے جواب دیا۔

'بن' کا لفظ سنتے ہی میں جیسے بارود بن گئی۔ جیسے کسی نے بندوق کی لبلبی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میرے مزاج کی یہ کیفیت کیونکر ہوئی؟ اس کا جواب خود مجھے بھی کبھی نہ مل سکا، لیکن شاید اس وقت 'بن' ایک علامت بن گیا تھا۔ ایک اشارہ۔ ان تمام ناانصافیوں، دکھ درد، ذلت، فریب اور دروغ گوئی کا جن کا میں گزشتہ کئی ماہ سے شکار تھی۔

میں غصہ سے بے قرار ہو کر جیلر کی طرف پلٹی اور چیخ اٹھی۔ ''تم نے میرے شوہر کو بن دیا...... صرف بن۔'' جیلر کا منہ کھلا، مگر میں نے اسے ایک لفظ کہنے کا موقع نہ دیا۔ میں پھر برس پڑی۔ ''تم کیا جانو۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی بن نہیں کھایا۔ تم نے بن ہی تو کہا تھا؟ بن۔ بن۔''

بیچارہ غریب آدمی کچھ نہ بولا۔ لیکن اپنی پُر جوش خطابت کے بعد میں نے ایک عجیب سا سکون محسوس کیا۔ ایسا اطمینان جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس وحشت آمیز اور خشمناک ساعت کے ایک گھنٹہ بعد جب میں گھر گئی تو میں نے انڈوں، مکھن، ڈبل روٹی سے ایک ٹوکری بھری اور جیلر کے نام ایک پرزہ لکھ کر بھیج دیا کہ 'ناشتہ اس قسم کی چیز کو کہا جاتا ہے۔''

بعد میں 'بن' کے واقعہ پر ہم دونوں بے تحاشہ ہنسا کرتے تھے۔ ایسی ہنسی جو ختم ہونے ہی کو نہ آتی تھی، کیونکہ قلعہ لاہور کی کسی کال کوٹھری میں مقید آدمی کے لیے بن کی اہمیت ہی کیا تھی؟ لیکن شاید اس وقت اس بن کی اہمیت اس طویل اور تھکا دینے والی تنہائی اور کھوکھلے پن سے وابستہ ہوگئی تھی جو مستقبل کے دامن میں چھپا ہوا تھا۔

میری ساس نے مجھے بعد میں بتایا کہ میری پُر جوش تقریر کو سن کر وہ یہ سمجھی تھیں کہ فیضؔ کو شاید قلعہ میں اذیت پہنچائی گئی تھی جس پر میں بگڑ رہی تھی۔ فیضؔ سے (مختلف

جیلوں میں) ملنے کے لیے ہمیں اکثر ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ ہم لوگ تیسرے یا درمیانے درجے میں سفر کرتے تھے۔ اسی لیے بچیوں کو ہمسفروں سے گفتگو بھی ذرا زیادہ ہی کرنی پڑتی تھی (اونچے کلاسوں کے مسافر، توبہ کسے رایا کسے کارے بناشد) سلیمہ سے جب کوئی پوچھتا کہ اس کے والد کون ہیں اور کیا کرتے ہیں تو وہ جھجھک جاتی تھی۔ ایک ایسے موقع پر میں نے اسے یہ کہتے سنا (اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ کیونکہ اسے سفید جھوٹ سے نفرت تھی) ابو حیدر آباد میں کام کرتے ہیں۔ منیزہ اس کی طرف مڑی اور غصے میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

''چل جھوٹی کہیں کی، وہ جیل میں ہیں۔''

کچھ دن ہوئے مجھے ایک کاپی ملی۔ جس میں جیل سے فیضؔ کی واپسی کے بعد تک کے واقعات ہیں۔ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد ہمیں ایک بار پھر فیضؔ کو اپنی گھریلو زندگی کا حصہ بنانا تھا۔ ہماری گھریلو زندگی جو پدری نظام کی جگہ ایک خالص اور مضبوط مادری نظام بن گئی تھی۔ ہم اس کاپی کو 'وحدت کا منصوبہ' کہتے تھے، اور ہم میں سے ہر ایک کا نام پاکستان کے کسی سابق صوبہ کے نام پر تھا۔ اس وحدت میں ایک بھانجا بھی شامل تھا۔ ہمارا کام اور فریضہ یہ تھا کہ پرانی اور نئی عادتوں میں اور گھر کے نئے ارکان کے ساتھ اختلاف رائے کا تصفیہ کریں۔ گھریلو زندگی کو بہتر اور خوشگوار بنانے کے لیے ہم ہر ہفتے ایک جلسہ کرتے تھے۔ شکایات پیش ہوتی تھیں اور ان کے حل تلاش کیے جاتے تھے۔

اب میں اس کاپی پر نظر ڈالتی ہوں تو ایسی تحریریں اور یادداشتیں نظر آتی ہیں۔

''میں کچھ سہیلیوں کو چائے پر بلانا چاہتی ہوں؟ کیا اس کی گنجائش نکل سکتی ہے؟''

''ہمیں گھر پر سالگرہ کی پارٹی کرنی چاہیے۔''

''ابو کو بال روم ڈانسنگ سیکھنے کی مشق ضرور کرنی چاہیے۔''

''نصیر کو اپنی الماری کے خانے خود صاف کرنے چاہئیں۔''

''ابو کو ایک دن میں تیس سے زیادہ سگریٹ نہیں پھونکنے چاہئیں۔ اگر وہ نہیں مانیں گے تو میں یہ شکایت کاپی پر پانچ مرتبہ لکھوں گی۔''

''گھر پر جب کوئی دعوت ہو تو بڑوں کے ساتھ بچوں کو بھی بلایا جائے۔''

کبھی کبھی 'سرحدی علاقہ' کی طرح منیزہ ہیجان پرور بن جاتی اور شور مچاتی۔ اس کی زندگی میں یہ نئی مطابقت خاموشی کے ساتھ نہیں آئی۔ فیضؔ 'سندھ' تھے کیونکہ سلیمہ کہتی تھی۔ ابو تو سندھ سے تعلق رکھتے ہیں اور میں 'بلوچستان' تھی۔ شاید اس لیے کہ کبھی کبھی میں دوسروں کے لیے زحمت اور تکلیف کا سبب بن جاتی۔

ہمارے مالی وسائل محدود تھے اور مطالبے بڑھتے ہی جاتے تھے اور ہمیں بہت ہی اچھی چیزوں کی تحدید کرنی پڑتی تھی۔ (آسان اُردو میں راشن بندی) اور یہ تحدید اس وقت تک لازم تھی جب تک فیضؔ جیل سے لوٹ کر دوبارہ کام شروع نہ کر دیتے۔ لیکن جلد ہی ہمارا جمہوری نظام کامیاب ہوگیا۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد ہمارا گھر اس نہج پر چل رہا تھا، جیسے گھر کا سرپرست...... اس گھر سے باہر کبھی گیا ہی نہ ہو......

OO

(انگریزی سے ترجمہ: سید ابوالخیر کشفی)

حصّہ دوئم : افکار

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

''زنداں نامہ'' کا سرسری جائزہ

''زنداں نامہ'' فیض احمد صاحب فیض کی تازہ ترین غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کا سرِ آغاز سید سجاد ظہیر صاحب نے اور مقدمہ 'روداد قفس' کے عنوان سے سابق میجر محمد اسحاق صاحب نے لکھا ہے اور دونوں اپنے اپنے انداز میں خوب ہیں۔

مجھے مسرت ہے کہ میں نے جو کچھ 'دستِ صبا' کے متعلق لکھا تھا، 'زنداں نامہ' سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ ناظرین کی تفریح کے لیے دست صبا کے اقتباسات بھی بطور ضمیمہ شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ تنقید رسالۂ تحریک دہلی میں شائع ہوئی تھی۔

محمد اسحاق صاحب نے اپنے مقدمہ میں سجاد ظہیر صاحب کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں زنداں نامہ کی نظم 'ملاقات' کی بہت تعریف کی ہے۔ سجاد ظہیر صاحب کا یہ خط شگفتہ نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ......

> ''فیض کی اس نظم میں علائم کی مرصع نگاری اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرعے سے شروع ہو کر (یہ رات اس درد کا شجر ہے) نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے نازک پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں جن میں ہر ایک ایسا ہے جو اپنی جداگانہ خوشبو اور رنگ بھی رکھتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ و متوازن بھی ہے۔ پھر نظم کا بنیادی خیال پورے تخیل کے ساتھ بڑی کامیابی سے ملایا گیا ہے۔ جیسے ایک حسین اور نازک جسم میں دردمند، حساس اور لطیف روح ہو،

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ محن، غمنا کی، شدت درد اور ان سب کے باوجود بلکہ ان سب کے وسیلے سے نمودار ہونے والی 'نئی سحر' کے تصور کو گرفت میں لانے کے بعد شاعر نے اسے نظم کا جامہ پہنایا ہے بلکہ یہاں پر یہ بلند اور ہمت آور خیال کے ساتھ اور تصور جیسے شاعرانہ تصور کا ثمر ہے اور پوری نظم کے گلدستے سے دل آویز اور روح افزا رنگینیوں اور نکہتوں کے ساتھ جھلک پڑا ہے۔ تیسرے بند کے شروع کے چار مصرعے جہاں سے گریز کیا گیا ہے، اپنی فصاحت، موسیقیت، روانی اور زور کلام کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انہیں ایک بار پڑھ لو تو دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور پھر بھولتے نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اتوار کی صبح کو کسی کلیسا کی گھنٹیاں لہک لہک کر بج رہی ہوں اور ان کی مسلسل آواز صرف سامعہ میں نہیں بلکہ سارے جسم کے پوروں میں سرایت کر رہی ہو......''

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیضؔ کی نظم جو عام شاہراہ سے ہٹ کر کہی گئی ہے، جدید شاعری کا ایک سنگ میل ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ جس ہم آہنگی و توازن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی وضاحت کے ساتھ اس کے مرکزی خیال کا، جو خاص اہمیت رکھتا ہے، تعین کروں۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ پڑھنے کے بعد اجزائے نظم کی شیرازہ بندی کر سکا ہوں۔ پھر بھی اطمینان نہیں۔

پوری نظم یہ ہے......

ملاقات

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں

کے کارواں؟ کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں
یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتّے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہوگئے ہیں
اُسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے تری جبیں پر
برس کے ہیرے پرو گئے ہیں

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہر خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موج زر جو تری نظر ہے
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں کے
گلستاں میں سلگ رہا ہے
وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

الم نصیبوں جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

(۱)
دو چیزیں ہیں۔ ایک طرف نصب العین سے والہانہ وابستگی، دوسری طرف شریک حیات کی محبت، اور عہد وفا کا نباہ۔ ان دو گرویدگیوں کی باہمی کشاکش دکھا کر ان

کو متحد کیا گیا ہے اور یہ ایک عظیم کارنامہ ہے بلکہ خود فیضؔ کی مشہور نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' کی بلند تر منزل ہے۔ عاشق نے حصول مقصد میں جو مصائب اٹھائے ہیں اور اٹھا رہا ہے (اسیر زنداں ہے) ان کی بنا پر شریکِ حیات کے چہرے سے بروقت ملاقات کرب واندوہ و ملال کا اظہار ہو رہا ہے، اس سے پہلے جان کے دینے پڑ چکے ہیں۔ معمولی شخص محبوب کو اس طرح سمجھاتا اور تسلی دیتا کہ گھبراؤ نہیں میعاد اسیری ایک دن ختم ہو جائے گی اور بچھڑے مل جائیں گے مگر اس کے برخلاف عالی ظرف، بلند حوصلہ اور دھن کا پکا رہنما کہتا ہے کہ یہ مصائب اس درد (نصب العین پر جاں نثاری) کی تعمیر ہیں جو فرد سے عظیم تر ہے، میں ہوں یا تم ہو، ہماری باہمی محبت اور اخلاص بھی اس پر قربان ہیں، لاتعداد نوجوان جن سے نہ معلوم کیسی کیسی امیدیں وابستہ تھیں جو (فیضؔ کی شاعرانہ اور انوکھی مگر بانکی زبان میں مشعل بکف ستاروں کے، تابندہ وتابناک کارواں تھے) رات کی تاریکیوں میں گم ہو گئے اور اپنی پوری چمک نہ دکھا سکے، ان کا خیال کیونکر نہ کیا جائے (میں اب سمجھا کہ سجاد ظہیر صاحب نے میرا یہ شعر کیوں پسند کیا تھا اور یہ کئی برس ادھر کی بات ہے۔

آہ ان تاروں کی خوں گشتہ تمنائے نمود
جو ابھرتے ہی شفق سے تلملا کر رہ گئے

آہ ستارے ہی نہیں ہزاروں ماہتاب (کرنوں کی شکل میں) اپنا نور کھو چکے ہیں (ضمناً کرنوں سے آنسوؤں کی طرف اشارہ ہو گیا۔ اچھی شاعری کس قدر تہہ دار ہوتی ہے۔)

مگر جہاں نصب العین کی اہمیت اور پرداخت ہوتی ہے، محبوبہ یا شریک حیات سے عہد و پیمانِ وفا کا لحاظ اور اس کا دل رکھنا بھی ضروری ہے، یہ بھی جتا دینا ہے کہ تجھ سے میری محبت استوار نہ ہوتی تو نصب العین کے حصول میں بھی انہماک نہ ہوتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تیری موجودگی نے پژمردہ تمناؤں میں تازگی، توانائی و بالیدگی کی روح پھونک دی ہے اور ان زرد زرد پتوں (افسردہ تمناؤں) کو تیرے گیسوؤں کے سائے نے

لہلہا کر اور تیری عرق آلود جبیں کی شبنم نے آبیاری کر کے ہیرے کی طرح جگمگا دیا ہے۔

(۲)

ہاں سچ ہے کہ ہماری رات قبر کی طرح تیرہ و تار ہے مگر ادھر تو میں نے اسے اپنے خون سے سینچا ہے، ادھر تو نے مخالفت کیسی میرے طرز عمل کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا اور اس طرح میرے جوئے خون کو زراندوہ کر دیا ہے (تو بہ نثر میں وہ بات کہاں جو فیضؔ کے اس مصرع میں ہے: 'وہ موج زر جو تیری نظر ہے' اس پر اور ترقی کرتے اور کہتے ہیں کہ صرف تیری نظر کی موج زر ہی ضیا بار نہیں بلکہ تیری باہیں جو شاخ گل کی طرح گلستاں بکنار ہیں (اور پیار سے میرے گلے میں پڑتی تھیں) وہ موجودہ حالات میں آتش غم سے سلگ رہی ہیں، اگر کچھ دن اور یوں ہی تپتی رہیں تو دہکتے دہکتے شرر فشاں ہو جائیں گی جس کا انجام یہ ہوگا کہ دل میں ٹوٹے ہوئے اور پیوست آہوں کے تیر سینے سے نوچ (کھنچے؟) جائیں گے اور ان سے تیشے کا کام لیا جائے گا، کوہ کنی کی جائے گی، زیادہ درشتی برتی جائے گی۔

(۳)

فیضؔ اس کے خلاف ہیں (اور ان کا اختلاف بالکل بجا ہے) کہ دُنیا میں ہر قسم کی جبر و تعدی اور حقوق انسانی کی پامالی خاموشی سے برداشت کی جائے اور سزا و جزا کا فیصلہ قیامت پر اٹھا رکھا جائے۔ وہ قصہ زمیں برسر زمیں کے حامی ہیں، لہٰذا کہتے ہیں کہ بد دل نہ ہو، یہی غم کے شرارے گلزار کھلائیں گے، غم کی شب تار ختم ہو کر رنگین سحر نمودار ہوگی۔ خود بقول فیضؔ 'یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر' (نظم) 'اے دل بیتاب ٹھہر' کا مصرع ہے:

فیضؔ کی دست صبا کا ایک شعر ہے......

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اس کو میں نے ان الفاظ میں سراہا تھا......

''امریکہ کی جید مصنفہ و ناول نگار ولا کیتھر کا قول ہے کہ جو کچھ صفحۂ کتاب پر بالتخصیص مذکور نہ ہونے کے باوصف ہم محسوس کرتے ہیں اس کے متعلق یہ ادعا درست ہوگا کہ اس کی تخلیق ہوئی وہ ناقابل تشریح موجودگی ہے، اس چیز کی جس کا نام نہیں لیا گیا، وہ ماورائی لہجہ ہے جس کو کانوں نے سنا نہیں مگر بھانپ لیا، اس واقعے شئے یا فعل کی زبان بے زبانی ہے، جذبات کا ہیر ہے، جوہر لطیف ہے، جس کی وجہ سے ناول یا ڈرامے یا شاعری میں رفعت پیدا ہوتی ہے، اس کی قدر و منزلت بڑھتی ہے۔ فیضؔ کا تغزل میں ڈوبا ہوا مندرجہ بالا شعر اس مرموزی کیفیت کا آئینہ دار ہے اور خیال کی جولانی کے لیے ایک بسیط فضا مہیا کرتا ہے۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی جب زنداں نامہ میں بھی اسی قبیل کا ایک شعر ملا سنئے......

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

مجھے 'لفظ پرست' کہہ کر اس لیے مطعون کیا جاتا ہے کہ الفاظ کے صحیح اور برمحل صرف کو بھی حسن تخیل کے ساتھ ساتھ ضروری سمجھتا ہوں۔ شاعری در اصل بہترین خیالات کا بہترین الفاظ میں اظہار ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فیضؔ اس معاملے میں احتیاط نہیں برتتے۔ زنداں نامہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱۔

بادِ خزاں کا شکر کرو فیضؔ جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

ظاہر ہے کہ 'سے' کی جگہ 'کے' چاہیے: نامے کسی بہار شمائل کے آئے ہیں۔

۲۔ ایک مرصع غزل کا مصرع ہے: مقام ہے اب کوئی نہ منزل فراز دار و رسن سے پہلے صحیح نشست الفاظ یہ ہوتی: مقام اب ہے نہ کوئی منزل الخ

۳۔ کرے کوئی تیغ کا نظارا اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جان بسمل نگار ہو جسم و تن سے پہلے

پہلے مصرع میں لفظ ان کے بدلے لفظ اس چاہیے۔ قاتل کو ان کوئی نہیں کہتا۔ علاوہ بریں جسم و تن میں لفظ جسم یا تن حشو قبیح ہے اور خیال میں انتشار پیدا کرتا ہے۔ بڑی آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ: بضد ہے قاتل کہ جان بسمل فگار ہو جائے تن سے پہلے، زبان میں جسم و جان ہے یا جان و تن نہ کہ جسم و تن۔

۴۔ ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے اُدھر تقاضائے درد دل ہے
زبان سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیرِ ذکر وطن سے پہلے

لفظ تقاضا کی تکرار بدنما ہے۔ مصرع یوں ہو سکتا تھا:

مآل ہیں مصلحت ادھر ہے اُدھر تقاضا ہے درد دل کا

۵۔ ضیائے بزم جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیث شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

حدیث کرنا زبان نہیں، بار بار کی تکرار بھی مطبوع ہے

۶۔ انہیں کے فیض سے بازار عقل روشن ہے/ جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

معلوم نہیں ہوتا کہ فیض تخلص ہے یا اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ امر شاعری میں ہمیشہ معیوب سمجھا گیا ہے جب تک مومن کی طرح تخلص ذو معنین نہ لایا جائے۔

۷۔ سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بیشک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

بجا کی جگہ زیبا چاہیے۔ البتہ مصرع کی ساخت بدل دی جائے تو درست ہو جائے، مثلاً

سچ ہے کیے جو آپ کے شکوے بجا نہ تھے۔

۸۔ آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

گویا کے الف کا دبنا ذوق سماعت پر سخت گراں ہے تکرار یہ عیب دور کر دیتی: بھولے تو
یوں کہ جیسے الخ

۹۔ گر فکر زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محو مدح تیغِ ادا نہ تھے

لفظ خوبی حشو ہی نہیں بڑے بھدے طریقے سے استعمال ہوا ہے۔ محو مدح تیغِ
ادا سے مطلب پورا ہو جاتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے: کیونکہ محو مدح
خوانی تیغ ادا نہ تھے۔

۱۰۔ ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لا دوا نہ تھے

دکھوں کا بہت کم یا لا دوا ہونا کیا۔ بہت کی جگہ کوئی بہتر ہوتا۔
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے کوئی لا دوا نہ تھے

۱۱۔ لب پر ہے تلخیِ مئے ایام ورنہ فیضؔ
ہم تلخیِ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

'مے ایام' عجیب۔ کاش پہلا مصرع اس طرح ہوتا۔ لب پر ہے تلخ کامیِ ایام ورنہ فیضؔ۔

۱۲۔ جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شانِ سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

دوسری جگہ بھی جان کے نون کا اعلان ہونا چاہیے۔ دل نہیں مانتا۔
یہ جان تو آنی جانی ہے آئی کہ گئی کچھ بات نہیں

۱۳۔ دل مدعی کا حرف ملامت سے شاد ہے
اے جان جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

معشوق کا نام مدعی کا حرف ملامت۔ اس میں جو ذم کے پہلو نکلتے ہیں۔ ان کو بیان نہیں
کر سکتا اور سب کچھ جانے دیجئے مومن کے اس شعر کے بعد یہ ہرگز مجموعہ
میں شامل کرنے کے قابل نہ تھا۔

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

۱۴۔ پہر اور زہر ہم قافیہ۔ حالانکہ اُردو میں پہر بفتح اول و دوم ہے، اور زہر میں حرف دوم ساکن ہے یہ عجیب قافیہ ہے، اسی طرح او اور دو کو ہم قافیہ کیا ہے حالانکہ او بالفتح ہے اور دو بالضم۔

۱۵۔ انگار بجائے انگارا۔ لاؤ سلگاؤ کوئی جوش غضب کا انگار، میرے کان آشنا نہیں

۱۶۔ ناپید، تاکید عید وغیرہ کا قافیہ نہیں ہوسکتا۔

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

'نیا دور' کراچی میں اس کے متعلق لکھ چکا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ یہ اور اسی قبیل کے اور معمولی نقائص ہیں جن سے فیضؔ کے کلام کی مجموعی خوبی پر اثر نہیں پڑتا۔ لیکن دل چاہتا تھا کہ یہ بھی نہ ہوتے۔

○○

رشید حسن خاں

فیضؔ کی شاعری کے چند پہلو

فیضؔ نے اپنے مجموعۂ کلام دستِ تہِ سنگ کے دیباچے میں اپنے پہلے مجموعے نقش فریادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُس کے پہلے حصے میں ۲۸۔۲۹ء سے ۳۴۔۳۵ء کی تحریریں شامل ہیں، جو ہماری طالب علمی کے دن تھے۔ اس سے آغازِ شاعری کا زمانہ معلوم ہو جاتا ہے، مگر اُن کو یہ ہمہ گیر شہرت ملی ہے ۱۹۵۱ء کے بعد، یعنی پاکستان کے مشہور مقدمہ سازش کے سلسلے میں واقعۂ اسیری کے بعد، جس سے بہت سے لوگ واقف ہوں گے (اگرچہ آج تک صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس 'سازش' میں فیضؔ عملی طور پر شریک تھے یا محض خیال آرائی کے ذمے دار تھے یا صرف بعض افراد کی رفاقت کے گنہگار تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ 'سازش' اس ملک کے چند افراد کے ذہن کی پیداوار تھی' یا کسی غیر ملکی طاقت کے اشارے پر کچھ نظریاتی وفاداری رکھنے والوں نے اُس کا خاکہ بنایا تھا) اس سے پہلے وہ شاعر تھے اور ایک محدود لیکن باذوق حلقے میں اُن کی بعض نظموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ۱۹۵۱ء سے پہلے یعنی اُن کے جیل جانے سے پہلے' ترقی پسند ناقدین نے اُن کی شاعری کی طرف زیادہ التفات نہیں کیا تھا۔ لیکن جب سجاد ظہیر وغیرہ کے ساتھ وہ جیل گئے، تب سے اُن کو 'مجاہد شاعر' مان لیا گیا اور اسی زمانے سے سیاسی حلقوں نے مختلف سطحوں پر اُن کی 'مجاہدانہ شہرت' کے لیے راہیں ہموار کیں اور اُن کے کلام کو اُنھی اثرات کی روشنی میں دیکھا گیا۔ اس کے نتیجے میں یہ ہونا ہی تھا کہ شاعری کی بحث میں اضافی صفات کا عمل

دخل غالب رہے۔ شاعر کو اگر مجاہد کی حیثیت سے دیکھا جائے تو پھر اس کی ہر تحریر کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ: 'لگادی ہے خونِ دل کی کشید' اور سخن فہمی کی جگہ طرف داری کو مل جائے گی— اب اُن حادثوں کو گزرے گویا ایک مدت ہوچکی ہے، بہت سے نقش دھندلا چکے ہیں اور شاعری کو نظریاتی وابستگی کے پیمانے سے ناپنے کا کاروبار بھی کم ہوگیا ہے، یا یوں کہیے کہ اپنی نمایشی قدر و قیمت کھو چکا ہے، اس بنا پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اُن کی شاعری کے متعلق اب جو کچھ لکھا جائے گا، اُس کو سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

یہ واضح کردیا جائے کہ اس مضمون کا دائرہ وسیع نہیں۔ یہ مقصود نہیں کہ مجموعی طور پر اُن کی شاعری کا جائزہ لیا جائے اور قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔ اس تحریر میں چند ایسے اجزا پر گفتگو کی جائے گی جو اُن کی شاعری میں نہایت درجہ اہم حیثیت رکھتے ہیں، مگر جن کو عموماً نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور جس کی وجہ سے غیر متوازن اندازِ نظر کو فروغ ملا ہے۔

(۱)

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی خاص نقطۂ نظر ادبی فضا پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ اُس سے غیر متعلق رہنا دانشوری کے خلاف سمجھا جاتا ہے ('جدیدیت' کی تازہ بہ تازہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے) ترقی پسند تحریک کی شروعات اس زور شور کے ساتھ ہوئی تھی جیسے جنگل کی آگ پھیلتی ہے۔ وقت کے تقاضے بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اُن دنوں واقعتاً یہ عالم تھا کہ جو ادیب اور شاعر اس تحریک میں شامل نہیں، وہ سماجی شعور سے بے گانہ اور حقیقت پسندی سے محروم ہے۔ یہ تحریک جو بہ ظاہر ادبی تھی، دراصل عالم گیر اشتراکی تحریک کا ادبی محاذ تھی۔ ایسے ہی حالات میں فیضؔ اس تحریک کے دائرے میں آئے۔ اُن کا مزاج سراسر رومانی تھا (اور ہے) اور اس مزاج کو

پابندیاں راس نہیں آتیں اور اس طبیعت کا آدمی اپنے آپ کو بھول نہیں پاتا۔ اُن دنوں زور شور تھا انقلابی نعروں کا، لیکن فیضؔ کی شاعری کا جو حقیقی لب و لہجہ تھا اور طبیعت کا جو انداز تھا، وہ اس شوریدہ بیانی سے میل نہیں کھا سکتا تھا۔ اُن کی شاعری کے جو اچھے ٹکڑے ہیں، ان کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ طرزِ کلام کا دھیما پن ان کے اُسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ خیال اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے استعاروں کی جدت اور تشبیہوں کی ندرت کا سہارا لیتا ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں حسن اور ترنم کی رعایت کارفرما نظر آتی ہے اور ان سب اجزا سے مل کر جو لہجہ بنتا ہے، وہ نغمگی سے لب ریز اور تغزل سے معمور ہوتا ہے۔ استعاراتی انداز نظم کے ٹکڑوں میں ابہام کا دھندلکا پیدا کرتا ہے اور ایسی فضا جس میں طلسمات کا عالم ہوتا ہے۔ یہ مرصع کاری اور یہ رمزیت، مبینہ انقلابی شاعری یا یوں کہیے کہ ایجی ٹیشنل شاعری کی شہر آشوبی سے دور کی بھی نسبت نہیں رکھتی۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، فیضؔ کے لہجے میں طبعی طور پر دھیما پن ہے اور یہ اُن کا حقیقی انداز ہے اور یہی اُن کے مزاج کا تقاضا ہے۔ بنیادی طور پر وہ رومانی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے ابتدائی زمانے کے متعلق لکھا ہے......

> ''اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، جیسے یکا یک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے، بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں، دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا، اس کی صورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دُنیا ایک طرح کے پردۂ تصویر کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔
> (شامِ شہرِ یاراں ص:۱۲)

شعر خوانی اور گفتگو میں بھی اُن کی آواز اور اُن کے لہجے میں نرمی گفتگو کا گہرا رنگ شامل رہتا ہے۔ زنداں نامہ کے ایک مقدمہ نگار نے، جو جیل میں بھی فیضؔ کے ساتھ رہ چکے ہیں، جو کچھ لکھا ہے اُس سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ مزاجاً وہ سکون پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہنگامہ آرائی اور روایت شکنی سے اُن کے مزاج کو قطعاً مناسبت نہیں، وہ ان چیزوں سے دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ فیضؔ کے ایک اور عزیز

دوست اور ساتھی نے شامِ شہر یاراں کے دیباچے میں یہی بات اس طرح لکھی ہے……

"فیض ٹھنڈے مزاج کے بے حد صلح پسند آدمی ہیں۔ بات کتنی بھی اشتعال انگیز ہو، حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں، وہ نہ تو برہم ہوتے ہیں نہ مایوس' سب کچھ تحمل اور خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔"

ان کے ایک اور عزیز دوست مرزا ظفر الحسن نے لکھا ہے……

"فیض کا مزاج اب جیسا ہے طالب علمی میں بھی ویسا ہی تھا۔ نرمی، مٹھاس، کم آمیزی اور کم سخنی۔ نہ فساد کر سکیں، نہ دوسروں کے پیدا کردہ فساد میں کوئی دلچسپی لیں۔" (عمرِ گزشتہ کی کتاب، ص: ۴۹)

نظریاتی وابستگی اور مزاج میں یکسانیت نہ ہو تو کشمکش کی بنیاد ضرور پڑ جائے گی اور وقت گزرنے کے ساتھ پیچ و تاب کی گرہیں بڑھتی جائیں گی۔ فیض کے مزاج کی رومانیت اُن کو انقلابی بننے سے روکتی رہی، ہاں اُن کی انقلاب پسندی میں رومانیت کے عناصر شامل ہوتے رہے اور اس طرح وہ 'رومانی باغی' بن کر رہ گئے۔ عقیدے اور مزاج کی اس کشمکش کو اُن کے کلام میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور آج تک وہ اسی دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے۔ 'کچھ عشق کیا' کچھ کام کیا' (یہ ان کے مجموعے شامِ شہر یاراں میں شامل ہے) اس میں انہوں نے خود بھی اسی بات کو یوں کہا ہے……

هم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا' کچھ کام کیا
کام، عشق کے آڑے آتا رہا
اور کام سے عشق الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

اُن کی شاعری کا بڑا حصہ اسی 'ادھورے پن' کی آئینہ داری کرتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے' مقدمہ سازش کے سلسلے میں فیض جیل گئے تھے۔ یہ حادثۂ اسیری اُن کی

زندگی کے وسط میں اچانک رونما ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ سیاسی سطح پر کبھی نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ وہ گنہگار تھے یا بے گناہ' اس کا حال مجھے معلوم نہیں' ہاں یہ ضرور معلوم ہے کہ رہائی کے بعد پاکستان کے اربابِ اقتدار کو کم از کم اس سلسلے میں اُن سے شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سے اُن کی بودو باش ، بہ قدرِ توفیق، کسی انقلابی یا باغی کی زندگی سے مختلف اور اشرافیہ کے معیار سے قریب رہی ہے اور ان کے مزاج کی رومانیت اس ارسٹوکریسی سے پوری طرح ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ مختلف وقفوں میں پاکستان کی عوامی حکومت نے اُن کو شامل نوازشات کیا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے' وہاں تو بیش تر فوجی حکومت رہی ہے۔ رومانی باغی ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے تضادات پریشان نہیں کر پاتے۔ جوش ملیح آبادی کو بھی وہاں ایسے تضادات پریشان نہیں کر سکے اور ہندوستان میں بھی متعدد ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو بھی ایسے تضادات کبھی مبتلائے کشمکش نہیں کر سکے۔ فیض کی سیاسی زندگی جیسی بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ کسی سچے اور کھرے انقلابی کی طرح اُن کو اس کی مناسب قیمت نہیں ادا کرنا پڑی۔ اس کے برخلاف اس زندگی سے انتساب کے بعد مادی وسائل اور آسودہ زندگی کی وہ راحت بخشیاں اُن کے حصے میں آئیں جن سے بہت سے لوگ عموماً محروم رہا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس اتفاقی حادثۂ اسیری نے اُن کو عالمی شہرت کا ایسا فائدہ پہنچایا جس سے بہ صورتِ دیگر شاید وہ محروم رہتے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ان کی افتادِ طبیعت اور نظریاتی وابستگی کے تقاضوں میں ہم آہنگی نہیں۔ ایسے شاعروں کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری دو مختلف آوازوں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ شاعر جب کچھ دیر کے لیے مفروضہ پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے تو طبیعت کے جوہر چمک اٹھتے ہیں۔ پھر جب وہ ظاہری وابستگیوں کی دُنیا میں واپس آتا ہے تو شعریت کا آب و رنگ کم ہونے لگتا ہے، احساس و اظہار دونوں کا رنگ بدل جاتا ہے اور اس طرح عدمِ توازن پیدا ہوتا ہے اور شاعری میں ہمواری نہیں آپاتی۔

رومانیت فیضؔ کے مزاج کا جز ہے جیسے شعلے میں گرمی اور روشنی، اُن کی شاعری کا سفر رومانیت ہی کے زیر سایہ شروع ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اشتراکیت سے اور اس کے نتیجے میں ذہنی سطح پر سیاسی ہنگاموں سے قریب ہوتے گئے اور اُسی نسبت سے اُن کی شاعری میں ناہمواری نمایاں ہونا شروع ہوئی۔ سیاسی تصورات خواہ اُن کے خیالات کا حصہ بن گئے ہوں، ان کی طبیعت کا تقاضا نہیں بن سکے (بن بھی نہیں سکتے تھے)۔ ان کی بہت سی نظموں کا احوال یہ ہے کہ بعض ٹکڑے خالصتاً رومانیت کے آئینہ دار ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعرانہ مزاج کی لطافت نے اپنے آپ کو نمایاں کر لیا ہے اور بعض اجزا اُن سے مختلف ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ شاعرانہ وجدان اور بے خودیِ تخلیق کا عالم اچانک بدل گیا ہے۔ اس طرح کلام میں ناہمواری بری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔

فیضؔ کی شاعری کی اصل خوبی ان کا وہ پیرایۂ اظہار ہے جس میں تغزل کا رنگ وآہنگ تہہ نشیں ہوتا ہے۔ یہی طرزِ بیان ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ تعبیرات کی ندرت اور تشبیہوں کی جدت اس کے اہم اجزا ہیں۔ ان کی نظموں کے ایسے ٹکڑے جن میں یہ اجزا سلیقے کے ساتھ یک جا ہو گئے ہیں، واقعتاً بے مثال ہیں۔ بیان کی شگفتگی ایسے اجزا میں درجۂ کمال پر نظر آتی ہے اور پڑھنے والا کچھ دیر کے لیے کھو سا جاتا ہے۔ مثلاً......

یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بہ جا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے

وہ نہر خوں، جو مری صدا ہے
وہ موجِ زر، جو تری نظر ہے
تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

ان مثالیہ ٹکڑوں میں جو رچاؤ، نغمگی اور حسنِ بیان ہے وہی فیضؔ کا سرمایۂ کمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی وہ نظمیں زیادہ کامیاب ہیں جن میں حکایت دل کسی لاگ کے بغیر کہی گئی ہے، مثلاً 'تنہائی' کا شمار ان کی اچھی نظموں میں کیا جاتا ہے۔ اس میں براہِ راست کسی سیاسی اثر یا کسی نظریے سے وفاداری کی ترجمانی کو دخل نہیں، وہ محض تاثرات کی کہانی ہے جس کو مناسب پیرایۂ بیان مل گیا ہے۔ یہ نظم کسی خاص فرد کی ترجمانی نہیں کرتی، صرف احساس تنہائی ہے اور بس، اور یہ دُنیا کے بے شمار افراد کی داستانِ احساس ہوسکتی ہے۔ ایک اور نظم دیکھیے عنوان ہے 'منظر'......

رہ گذر، سایے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا آہستہ
حلقۂ بام تلے سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل، نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا کسی پتّے کا حباب
ایک پل تیرا ہے، چلا، پھوٹ گیا آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش

آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ
دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
تم نے کہا 'آہستہ'
چاند نے جھک کے کہا 'اور ذرا آہستہ'

(دستِ تہہِ سنگ)

اس نظم میں احساس کی لطافت اور اظہار کا حسن، دونوں خوبیاں یکجا ہوگئی ہیں۔ یہی فیضؔ کا انداز ہے۔ اب اس کے مقابلے میں اُن کی ایک پُر جوش نظم دیکھئے' عنوان ہے 'آج بازار میں پا بجولاں چلو'......

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو' خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکم شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرا الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو، دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

(دستِ تہہِ سنگ)

نظم میں جوش وخروش ہے، زورِ بیان بھی ہے، جو اس نظم کے موضوع کا تقاضا ہے، مگر جذبے کی پیچیدگی اور احساس کی تہہ داری سے یہی تہی داماں ہے۔ یہ اوسط درجے کی نظم ہے اور اس سطح کے پڑھنے والوں کو 'منظر'، 'تنہائی' یا ایسی بعض اور نظموں کے مقابلے میں زیادہ متاثر کرے گی۔ مگر فیضؔ نے اس سطح سے اُتر کر بھی بہت سی نظمیں کہی ہیں اور ان نظموں میں وہ بات بھی نہیں جو مندرجۂ بالا نظم یا ایسی اور نظموں میں پائی جاتی ہے۔ میں وضاحت کے لیے ایسی ہی ایک نظم کا ابتدائی حصہ نقل کرتا ہوں، عنوان ہے 'تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں'......

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اُترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی نہ کوئی علم
منتشر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دشمنوں کا پتا دے سکا
تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارا نہیں
جسم خستہ ہے، ہاتھوں میں یارا نہیں

اپنے بس کا نہیں بارِ سنگِ ستم
بارِ سنگِ ستم، بارِ کہسارِ غم
جس کو چھوکر سبھی اک طرف ہو گئے
بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

(دستِ تہہِ سنگ)

یہ نظم بالکل سپاٹ ہے، نہ حُسن ادا، نہ زورِ بیان۔ ایسی نظموں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ بات وہی ہے کہ وہ جس شدت کے ساتھ سیاسی وقائع نویسی کی طرف مائل ہوتے گئے، اسی نسبت سے اپنے آپ سے دور اور بے رنگی سے قریب ہوتے گئے ہیں۔ اُن کے ایک مجموعے 'سرِوادیٔ سینا' کا آغاز جس نظم سے ہوتا ہے' اس کا عنوان ہے 'انتساب' اس میں لکھتے ہیں......

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانے کے بھولے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں، والیٔ ماسوا، نائب اللہ فی الارض
دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکالے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اُٹھا لے گئے
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہوگئی ہیں

خاصی طویل نظم ہے' یہ محض سیاسی نعرے بازی ہے۔ ایسے مقامات پر وہ شاعر کے بجائے کم رتبہ سیاسی مقرر نظر آتے ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر شاعری میں عدمِ توازن کا نقش گہرا ہوتا رہتا ہے۔

(۲)

جب خیالات میں تنوع نہیں رہتا تو عام طور پر الفاظ کی تعداد بڑھ جاتی ہے، یعنی الفاظ کی کثرت خیالات کی کمی کا کفارہ ادا کرتی ہے۔ لفظ بہت سے، مفہوم ذرا سا۔ جوش صاحب نے ایسی لفاظ کی بے شمار مثالیں اپنے مجموعوں میں محفوظ کردی ہیں۔ فیضؔ کے یہاں اس کی بدترین مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر جس قدر بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر اس لفظی نمایش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس جھوٹی نمایش میں وہ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کو یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ خاص خاص لفظوں کا معنویت سے کچھ تعلق بھی ہے۔

فضول لفظ آرائی نے ان کے کلام میں ایک اور خرابی پیدا کی ہے کہ بہت سے مقامات پر سادہ سی بات بڑے تکلف کے ساتھ کہی گئی ہے۔ سیدھی سی سامنے کی بات ہے لیکن غیر ضروری لفظوں کے پھندوں میں اس کو کسا گیا ہے۔ یا تعبیر میں کاواک پن اس طرح درآیا ہے کہ سادگی کی جگہ تکلف نے لے لی ہے بھدے پن کے ساتھ۔ زبان و بیان کی تباہ کاری اور کلام کی بے اثری میں بہت سے اضافے اس طرح بھی ہوئے ہیں۔ تفصیل تو آگے آئے گی، یہاں پر دو چار مثالیں پیش کرنا چاہوں گا......

ہم پہ وارفتگیِ شوق کی تہمت نہ دھرو
ہم کہ رمّاز رموزِ غم پنہانی ہیں
اپنی گردن پہ بھی ہے رشتہ فگن خاطرِ دوست
ہم بھی شوقِ رہ دلدار کے زندانی ہیں

(جرسِ گل کی صدا)

پُر شور الفاظ کا ہجوم سامنے ہے۔ 'رمازِ رموزِ غم پنہانی' بڑی مرعوب کن ترکیب

ہے، مگر افسوس کہ اُردو والے اس لفظ 'رماز' سے باخبر نہیں۔ تیسرے مصرعے میں گردن پر خاطر دوست کا رشتہ فگن ہونا بھی آرائش لفظ کا دل چسپ منظر تو ہوسکتا ہے مگر یہ بھی غیر متناسب لفظوں کا مجموعہ ہے، معروف شعر ہے......

رشتہ اے در گردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

اس شعر کی بنیاد پر خاطرِ دوست کا رشتہ اپنی گردن پر ڈالا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اپنی گردن پر خاطر دوست رشتہ فگن ہے۔ کوئی حد ہے اس رعایتِ لفظی کی، بھدّے پن کی اور بہت سے لفظوں کو جمع کر دینے کے فضول شوق کی۔ اُن کی نظم 'شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں' کا ایک ٹکڑا......

شاید کہ انہی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے، جس میں کبھی
صد ناز سے اُترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

ساغر دل میں صہبائے غمِ جاناں کی پری صد ناز سے اُترا کرتی تھی، خوب! پہلے غمِ جاناں کو صہبا بنایا' پھر اس صہبا کو پری بنایا اور پھر اس پری کو دل کے ساغر میں اُتارا۔ یہ ایسا پر تکلف اندازِ بیان ہے جس کو حسن بیان سے ربط ہو ہی نہیں سکتا۔ صد ناز سے اترنا' کی بد ذوقی اس پر متزاد ہے۔ اس سے بھی زیادہ بھدی مثال......

جب بھی ابروئے درِ یار نے ارشاد کیا
جس بیاباں میں بھی ہم ہوں گے چلے آئیں گے

(جرسِ گل کی صدا)

درِ یار کو پہلے (غالباً محراب کی رعایت سے) 'ابرو' بنانا اور پھر اس ابرو سے ارشاد کرانا، کس قدر تکلف ہے اس میں! 'درِ یار کے ابرو نے ارشاد کیا' کس قدر بھدا پن ہے۔ اس جملے میں! امانت زندہ ہوتے تو 'درِ یار' کو 'ابرو' شاید وہ بھی نہ بنا پاتے۔

مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی

'مطلق الحکم' بھاری بھرکم مرکب ضرور ہے' مگر اس مصرعے میں یہ ہے بے معنی۔ بجائے خود بھی یہ کوئی لفظ نہیں۔

طیش کی آتشِ جرار کہاں سے لاؤں

'آتشِ جرار' بھی 'مطلق الحکم' کی طرح ہے۔ نظر فریب، مگر معنی سے تہی داماں 'لشکر جرار' اگر درست ہے تو اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ 'آبِ جرار' اور 'خاکِ جرار' اور 'آتش جرار' جیسے مرکبات بھی درست ہوں۔ ہر نکتہ مقامے دارد......

لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار

شوریدہ بیانی کا حق شاید ادا ہو گیا ہو، مگر انگار سلگانے کا جواز کہاں سے آئے! وہی لفظی طمطراق......

دولتِ لب سے پھر اے خسرو شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا
پھر وہی جاں بہ لبی لذتِ مے سے پہلے
پھر شبِ وصل ملاقات نہ ہونے پائی
پھر دمِ دید رہے چشم و نظر دید طلب
پھر شبِ وصل ملاقات نہ ہونے پائی

کوئی دم بادبانِ کشتیِ صہبا کو تہہ رکھو
ذرا ٹھہرو، غبارِ خاطر منزل ٹھہر جائے

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی بانہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام
(سنکیانگ)

خط کشیدہ ٹکڑے غیر مناسب آرائش لفظی کی بدترین مثالیں ہیں۔ مثلاً آخری بند میں لفظ جس طرح جمع کیے گئے ہیں وہ دیدنی ہے۔ خاص طور پر پہلے مصرعے میں 'صد شرق وغرب' یہ لفظ پسندی اور لفظ آرائی کے شوقِ فضول کا کرشمہ ہے۔ دوسرے مصرعے میں ماہِ تمام دمک رہا ہے' لیکن زبان کا مزاج شناس بول اٹھے گا کہ 'ماہِ تمام' کے لیے 'دمکنا' نہیں آسکتا۔ تیسرے مصرعے میں بیان کے تکلف نے بدذوقی کا مظاہرہ کیا ہے 'تیرے حرف لطف کی بانہیں گلے میں تنگ ہیں' خوب حرفِ لطف سے بانہیں بنانا اور پھر ان کو 'گلے میں تنگ' کرنا، یہ اُنہی سے ہوسکتا ہے۔

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر ایک روئے حسیں ہو چلا ہے بیش حسیں
ملے کچھ ایسے جدایوں ہوئے کہ فیضؔ اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا، وہ گل ہے داغ نہیں
(سنکیانگ)

ہر ایک روئے حسیں بیش حسیں ہو چلا ہے، یہ اُردو کا اندازِ بیان نہیں۔ لفظ ضرور حسین ہیں اور بہت سے ہیں۔ آخری مصرعے میں نقش، گل، داغ، کئی لفظ یکجا ہوگئے ہیں، دل بھی موجود ہے، مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تازہ وارد ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کچھ کہہ رہا ہے۔ مصرعے میں رعایتِ لفظی کی نسبت کے ساتھ کئی لفظ رکھ دیے گئے ہیں، اور مصرع بہ ظاہر بول اُٹھا ہے مگر اجنبی زبان میں۔

دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
فرقتِ درد میں بے آب ہوا تختۂ داغ

'منزلِ دل' ہی کیا کم تھی کہ اس پر 'تختۂ داغ' کا اضافہ کیا گیا اور پھر اس تختے کو

'بے آب' بنایا گیا۔

ایک بار اور مسیحائے دل دل زدگاں
کوئی وعدہ، کوئی اقرار مسیحائی کا

'مسیحائے دلِ دل زدگاں' وہی لفظی طمطراق جسے سادگی سے بیر ہوتا ہے اور تاثیر سے نفرت۔

کسی حرف پہ تونے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا
اعلانِ جنوں دل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا

اے جانِ جہاں تونے کس حرف پہ گوشۂ لب غماز کیا، بات کیا ہوئی؟ لفظوں کے ہجوم میں مفہوم کہیں کھو گیا ہے۔ 'گوشۂ لب غماز کرنا'، اس کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا۔ گوشہ، لب، حرف، غماز، جانِ جہاں، لفظوں کی دُھوم دھام بہت ہے۔ معنی کا پتا نشان نہیں ملتا۔

صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
برسے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار

صلیب و دار، سر گوشۂ منبر اور برسرِ دربار میں وہی ذوق لفظ پسندی کارفرما ہے۔ سرِ منبر اور سرِ دربار لکھتے تو فالتو لفظوں کی کھپت کیسے ہوتی۔

یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ
اسی کو مطلع ماہِ تمام کہتے ہیں

مقصود ہے فلک کا سیہ تریں گوشہ، مگر لکھا گیا کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ، وہی لفظ پسندی کا ذوقِ فضول۔ اسی طرح کی فضول پسندی شروع میں اُن کے یہاں کچھ کم تھی۔ وہ جس تیزی کے ساتھ سیاسی معاملات کو نظمانے کی طرف مائل ہوتے گئے اسی نسبت سے یہ عیب آفریں شوق بھی بڑھتا گیا اور اب وہ اس کے بے طرح اسیر ہو کر رہ گئے

ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس لفظ آرائی نے اس زمانے میں اُن کے معتقدوں اور مقلدوں کے یہاں بہت فروغ پایا ہے اور مزید ستم یہ ہوا ہے کہ محض نظریاتی اتفاق کی بنا پر لوگ ان سارے پہلوؤں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اُن کی شاعری کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔ اس غیر ادبی ستائش گری نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا خود فیضؔ کو، کہ وہ اپنی کم زوریوں سے باخبر نہیں ہو سکے۔ جو سلوک کرشن چندر نے افسانے کی زبان کے ساتھ کیا تھا کہ اُس کو لفظوں کا آرائش کدہ بنا دیا، اور افسانہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر بن کر رہ گیا، وہی سلوک کیا فیضؔ نے نظموں کی زبان کے ساتھ۔ فرق بس یہ ہے کہ کرشن چندر کو اُردو لکھنا آتا تھا۔ وہ شخص لفظوں کا مزاج شناس تھا اور زبان کا بھی مزاج شناس تھا۔ اس لیے ذہن آسانی کے ساتھ اس خطابت کو قبول کر لیا کرتا تھا۔ مگر فیضؔ اس معاملے میں 'اتائی' بلکہ اناڑی ہیں' اس لیے اُن کی لفاظی بے کیفی میں اضافے کیا کرتی ہے۔

(۳)

لفظ پسندی کے اس رجحان کی ایک اور طرح نمود ہوئی ہے اور وہ اس طرح کہ ان کی نظموں میں نامناسب صفاتی الفاظ اور اُردو کے لحاظ سے ناقابلِ قبول استعاروں کی بہتات ہے۔ ان دو خامیوں نے ان کی نظموں کے اکثر اجزا کو مسخ کر دیا ہے، کیونکہ خیال کی لطافت اور اظہار کی دِل کشی اجنبیت کے دُھندلکے میں گم ہوگئی ہے۔ صفات کے انتخاب میں موصوف سے مناسبت اور استعارے میں خاص نسبت کا لحاظ اگر نہ رکھا جائے تو پھر صفات اور تعبیرات میں ناقابلِ قبول حد تک نامانوس پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اصل میں بہت سے مقامات پر انگریزی سے براہِ راست ترجمہ کر دینے والا انداز پایا

جاتا ہے اور ایسے بیش تر ترجمے اُردو کے مزاج سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے، اجنبی اور بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں، مثلاً......

جس میٹھے نور اور کڑوی آگ سے
ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبح بغاوت کا گلشن

میٹھا نور، کڑوی آگ اور گلشن پھوٹنا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو اُردو سے اور اس کے اسالیب سے دلچسپی ہی نہیں۔ اس سہل پسندی میں لفظی ترجمہ کرنے کی بد مذاقی کارفرما ہے۔ بعض اور مثالیں......

ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک آتے ہیں
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال
آجاؤ مست ہوگئی میرے لہو کی تال
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا رقصاں ہے تو کیا

خط کشیدہ ٹکڑوں میں اجنبیت کا گہرا رنگ بھرا ہوا ہے اور 'ساغرِ ناب' تو یکسر مہمل ہے۔ ناب، شراب کی صفت تو ہوسکتی ہے، ساغر کی نہیں۔ رفتار کا سیماب در سے بہے گا اور لہو کی تال مست ہوگئی ہے؟ یہ سب بیان کی ستم ظریفیاں ہیں۔ یہی حال مشعل کے بسمل ہونے کا ہے۔ کسی قرینے کے بغیر یہ صفت مناسب سے محروم رہے گی۔

اسی طرح 'صفتِ منتقلہ' کی ان کے یہاں بہتات ہے۔ انگریزی میں ٹرانفرڈ اپی تھٹ کی جو بھی صورت ہو، اُردو میں یہ صنعت اس طرح قابلِ قبول ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اُردو میں ایک موصوف کی صفت دوسرے موصوف کی طرف منتقل ہوتی ہے استعارے کے واسطے سے، اور استعارے میں 'وجہِ جامع' یعنی نسبت خاص کی رعایت ملحوظ نہیں رکھی جائے گی تو اس استعارے میں اس قدر اجنبیت آجائے گی کہ وہ

اُردو کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ انگریزی میں ٹھیک ہے۔ لیکن اُردو میں اس کا ترجمہ 'بے چین تکیہ' بے جوڑ معلوم ہوگا۔ مثلاً فیضؔ کے اس شعر کو دیکھئے......

دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے

یہاں 'بے صبر خواب گاہوں' کی یہی صورت ہے کہ اُردو کے لیے یہ محض اجنبی ہے۔ یا مثلاً یہ مصرعہ......

آجاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال

'آنکھوں سے چھال چھیلنا' اُردو کا اندازِ بیان نہیں۔ 'غم' کو پہلے 'چھال' بنانا اور پھر اس کو آنکھوں سے متعلق کرنا بیان کا ایسا تکلف ہے جس میں بدذوقی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ذیل میں ''زنداں نامہ'' سے ایک نظم نقل کی جاتی ہے۔ اس نظم میں وہ سب معائب یک جا ہوگئے ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''دریچہ''......

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے پر
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لیے

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تاب ناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگان مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

صلیب پر مہ تاب ناک کو قتل کرنا، اس پر شاخسارِ دو نیم کا سرمست ہونا، بادِ صبا

کو ہلاک کرنا اور ابر بہار کو قربان کرنا، صلیب کا وصلِ خداوند کی امنگ لیے ہوئے ہونا، خداوندگانِ مہر و جمال کے شہید جسم، اور پھر ان شہید جسموں کا سلامت اٹھایا جانا، ان سب میں ترجمہ کر دینے والا ایسا انداز متوازن ہو کر رہ گیا ہے۔

(۲) ایک صورت یہ ہے کہ بند کا پہلا ٹکڑا (بند ہو یا شعر) ہر لحاظ سے خوب ہے اور دوسرا ٹکڑا زبان یا بیان کے ایسے عیبوں سے گراں بار ہے کہ ذہن کو اچانک جھٹکا لگتا ہے، طبیعت بے مزہ بلکہ بدمزہ ہو جاتی ہے اور تاثر دم توڑ دیتا ہے۔ مثلاً ان کی ایک مشہور نظم کا پہلا بند ہے......

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر

کسی دھوم دھام کا بند ہے! تشبیہوں کی ندرت، بندشوں کی چستی، بیان کا زور اور حسن، ہر چیز کاٹنے کی تلی ہوئی ہے۔ دوسرا بند شروع ہوتا ہے۔

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک آتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندیِ آداب ابھی

پہلے مصرعے پر نظر رکتی ہے، ذہن کچھ اُلجھتا ہے کہ دوسرے مصرعے میں 'مطلق الحکم' کی جو معنی سے بے نیاز ترکیب ہے وہ سوالیہ نشان کی صورت میں سامنے آجاتی ہے۔ اسی کے ساتھ 'ساغرِ ناب' کا مہمل پن بھی اُبھر آتا ہے اور سارا طلسم ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے۔

یا مثلاً ان کی ایک مشہور نظم ہے 'دُعا' اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے......

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم، جنھیں رسمِ دُعا یاد نہیں
ہم، جنھیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدا یاد نہیں

اُٹھان اچھی ہے۔اس کے بعد کا بند ہے......

آیئے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینی فردا بھردے
وہ جنھیں تابِ گراں باری ایام نہیں
اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کردے
جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منور کردے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
اُن کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کردے

مہر میں شیرینی بھر دینا، نہایت غیر مناسب اور نا قابلِ قبول پیرایۂ گفتار ہے۔ زہر میں شیرینی نہیں بھری جاتی، یہ مہمل بات ہے۔ مفہوم سلیقے کے ساتھ معرض بیان میں نہیں آ پایا۔ دوسرا شعر اس سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ پلکوں پہ شب و روز کا ہلکا کرنا، بہ ظاہر مفہوم سے عاری ہے اور اُردو کا اندازِ بیان بھی نہیں۔ اس شعر میں گراں باری اور ہلکا کی رعایت لفظی اور بھاری بھرکم لفظوں کے سوا اور کچھ نہیں، اگر کچھ ہے تو غلط نگاری اور بیان کا الجھاؤ ہے۔ یہی حال تیسرے شعر کا ہے۔ 'آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا نہیں' یہ مناسب طرزِ کلام نہیں۔ اسی طرح شمع منور کرنا بھی خوب نہیں۔ شمع منور نہیں کی جاسکتی راتیں منور ہو سکتی ہیں۔ چوتھے شعر میں بھی اُردو پن مرحوم ہو کر رہ گیا ہے۔ نظروں پر راہ اجاگر کرنا اُردو کا پیرایۂ اظہار نہیں' اجنبیت کے گہرے رنگ میں ڈوبا ہوا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔۔۔ پلکوں پر شب و روز کو ہلکا کرنا، نظروں پر راہ اجاگر کرنا، شمع منور

کرنا اور زہر میں شیرینی بھر دینا، ان سب غلط گفتاریوں نے پورے بند کو بے رنگ بنا دیا ہے۔ تیسرا بند ہے......

جن کا دیں پیرویِ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمت کفر ملے، جراَتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں، ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

یہ بند ہر لحاظ سے خوب ہے، بلکہ خوب تر۔ حسنِ بیان، زورِ بیان، لطف سخن، سبھی کچھ موجود ہے۔ اس کے بعد آخری بند آتا ہے......

عشق کا سرِ نہاں، جان تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرف حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

زبان کا مزاج شناس بول اٹھے گا کہ 'آج اقرار کریں ، اور آج اظہار کریں' یہ دونوں ٹکڑے چسپاں نہیں ہوتے۔ نثر یوں ہوگی: 'عشق کا سرِ نہاں...... اقرار کریں' اور 'حرفِ حق اظہار کریں' اور یہ صحیح طرزِ کلام نہیں۔ اس کے علاوہ تپش کا مٹ جانا تو کوئی اچھی بات نہیں! حرفِ حق نہ کہہ پانے کی خلش مٹ جائے (یعنی حق بات کہہ دی جائے) یہ تو ٹھیک ہے، مگر تپشِ عشق مٹ جائے، یہ آرزو تو خوب نہیں۔ تپش اور خلش کے قافیوں نے دراصل یہاں ان کو دھوکا دیا ہے اور ناخوب کو خوب بنا دیا ہے۔

(۳) کبھی یہ ہوتا ہے کہ نظم میں غیر ضروری اجزا ہوتے ہیں۔ یہ دراصل نتیجہ ہوتا ہے اس کا کہ نظم کی تشکیل اور تعمیر کے لیے جن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے اُن کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ فیضؔ کی شاعری کا بہت کمزور پہلو ہے اور ان کی بہت سی نظمیں اس خامی کا شکار ہوئی ہیں۔ میں اس کی صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ اُن کی

نظم 'دستِ تہِ سنگ' ذیل میں نقل کی جاتی ہے، یہ ان کے مجموعے دستِ تہِ سنگ میں شامل ہے۔ (شائع کردہ: مکتبہ کارواں، لاہور)

بیزار فضا، درپے آزار صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدم دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو! آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے
اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے
وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے، زہرِ ہلاہل سے سوا ہے
ہاں جام اُٹھاؤ کہ بہ یادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے
اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے
احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلا ہے
اس حسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے
ہر صبحِ گلستاں ہے ترا روئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے
ہر بھیگی ہوئی رات، تری زُلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے
ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنا ترے قدموں کی صدا ہے

تعزیرِ سیاست ہے نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے
زندانِ رہِ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے نہ کوئی بند بہ پا ہے
مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

شروع کے پانچ شعروں کو اس مجموعۂ ابیات سے نکال لیا جائے تو یہ اپنی جگہ پر مکمل قطعہ ہوگا یا مسلسل غزل (خیر، نظم کہہ لیجئے) اس ٹکڑے میں مفہوم کی تکمیل ہوگئی۔ موضوع کے لحاظ سے اس میں جوشِ بیان بھی ہے جس کا آہنگ پانچوں شعروں میں یکساں رہتا ہے مگر طوالت پسندی نے اس آہنگ اور تاثر، دونوں کو کم اثر بنانے کے لیے غیر ضروری ٹکڑوں کا اضافہ کیا۔ چھٹا شعر متفرقات کے ذیل میں آتا ہے اور اس نے تاثر کو منتشر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کیا ہے کہ اس آہنگ کو بھی مدھم کر دیا ہے۔ اس شعر کو پڑھتے ہی پچھلا تاثر اور آہنگ ٹوٹنے لگتا ہے، اتار شروع ہو جاتا ہے اور ساتواں شعر اس انتشار کی تکمیل کر دیتا ہے اور اس شعر تک آتے آتے پچھلے ٹکڑے کا آہنگ دم توڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد آٹھویں، نویں اور دسویں شعر میں ایک اور نقش ابھرتا ہے اور ابھی وہ مکمل نہیں ہو پاتا کہ گیارہویں شعر کی مختلف فضا اس نقش کو دھندلا دیتی ہے۔ یہ نظم (یا صحیح معنی میں مجموعۂ اشعار) مختلف المزاج اور مختلف الآہنگ اجزا کا مجموعہ ہے، جس کو غیر ضروری اشعار کے اضافے نے مجموعۂ بے ربطی بنا دیا ہے۔ فیضؔ اکثر نظم کی ٹھاٹ بندی (تشکیل، تعمیر، ارتقا) کی طرف توجہ نہیں کرتے، اس لیے اُن کی بہت سی نظموں میں غیر ضروری اضافے پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے نظم کا گٹھاؤ ختم ہو جاتا ہے۔ تاثر اور آہنگ کی گہرائی اور گیرائی باقی نہیں رہتی اور عدمِ توازن کو فروغ ملتا ہے۔

(۵)

فیضؔ کی شاعری کا کمزور ترین پہلو یہ ہے کہ زبان اور بیان کے مختلف قسم کے عیب اس میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ ایسی خامیاں کچھ نہ کچھ اور شاعروں کے یہاں بھی مل جاتی ہیں مگر فیضؔ کے یہاں ان کی اس قدر بہتات ہے جس قدر امانت کے یہاں ضلع جگت کی۔ شاعری اور معائب میں لازم وملزوم والی بات پیدا ہو جائے تو یہ کچھ اچھی بات نہیں۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بہت غیر محتاط ہیں۔ تشبیہوں اور استعاروں میں مناسب اور غیر مناسب پر ان کی نظر نہیں رہتی۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی تازہ وارد ہے جو زبان کے نکات سے نا آشنا اور بیان کے اسرار سے نامحرم ہے۔ عربی و فارسی کے پُرشکوہ الفاظ کھپانے کے وہ بہت شائق معلوم ہوتے ہیں، مگر اکثر اوقات وہ یہ نہیں دیکھتے کہ تقاضائے کلام کیا ہے۔ تقاضائے مفہوم کیا ہے اور تقاضائے زبان کیا ہے۔ اس پھیر میں وہ مطلق الحکم جیسی ترکیبیں وضع کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور 'ساغرِ ناب' جیسے مرکبات گھڑنے میں تکلف نہیں کرتے اور یہ زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ معنویت کی جان پر کیا ستم توڑا ہے انہوں نے، اور زبان کی کیا گت بنائی ہے۔ غزل ابتدا کرو، اور 'آپ بات کرو' جیسے اجزا ان کو اجنبی نہیں معلوم ہوتے اور 'میٹھا نور' اور 'کڑوی آگ' جیسے ٹکڑے ان کی خوش مذاقی پر گراں نہیں گزرتے۔

اس بے راہ روی کے فروغ میں ان کے مصلحت پسند ثنا خوانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ چوں کہ ان کو مجاہد کا منصب بخش دیا گیا، اس لیے ان کی ہر بات آیت و حدیث ہو کر رہ گئی۔ ان کے کلام میں زندانیت اور انقلابیت کو تلاش کیا گیا اور اسی کے گن گائے گئے۔ ان کی کمزور سے کمزور نظم اور غزل کو اُردو کی اعلا تخلیق بتایا گیا اور اس

آوازہ گری میں معقول و غیر معقول سبھی لوگ ہم آواز ہو گئے۔ اگر کبھی کسی نے زبان یا بیان کے کسی پہلو کی طرف توجہ دلائی تو اس کو لفظ پرست' روایت پرست اور رجعت پرست کہا گیا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ اگر کوئی شخص فیضؔ (یا کسی اور ترقی پسند شاعر) پر کوئی اعتراض کرتا ہے تو وہ ترقی پسندی کا مخالف ہے، مخالف ہے تو رجعت پرست ہوا اور رجعت پرستوں کی بات کیوں سنی جائے۔ اس صورتِ حال کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ زبان و بیان پر گفتگو کرنا گھٹیا درجے کا کام قرار پایا۔ اس غلط اندیشی کا خمیازہ بھگتنا پڑا ان شاعروں کو جن کو ضرورت تھی صحیح مشوروں کی۔ اس محرومی نے غلط گوئی کو بڑھاوا دیا اور شاعری معائب سے بوجھل ہو کر اپنے ظاہری حسن کو کھو بیٹھی۔ یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ فیضؔ جیسا شاعر اس اعتبار سے بہت گھاٹے میں رہا کہ اس کی شاعری میں زبان و بیان کی خامیاں اس طرح آمیز ہو گئی ہیں کہ دونوں کا تصور ایک ساتھ ذہن میں آتا ہے۔

ذیل میں پہلے ان کے مجموعۂ کلام دستِ تہِ سنگ سے ایسی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان کی حیثیت بس 'نمونۂ کلام' کی سی ہے' مگر عبرت حاصل کرنے کے لیے یہ بھی کچھ کم نہیں۔

یوں گماں ہوتا ہے، بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن، دشت و چمن کی حد ہے

(پیکنگ)

آخر کے دونوں مصرعے عجز بیانی کی مثال ہیں۔ ''میرے تن کی حد آفاق کی حد تک ہے'' یہ اُردو کا اندازِ بیان نہیں۔ اسی نظم کا دوسرا بند ہے......

میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گل گوں

میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کن فیکون

(پیکنگ)

دوسرے اور تیسرے مصرعے کے مقابلے میں پہلا مصرع غیر مناسب انداز بیان کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ آغوش میں خدائی کا پلنا اور ہاتھ میں عناں ہونا تو ٹھیک ہے، مگر ان کے مقابلے میں 'کیسے میں جلال ہونا' بے جوڑ بات ہے، جلال کو کیسے میں نہیں رکھا جاتا۔ زبان کا مزاج شناس یہ بھی نہیں کہے گا کہ معجزہ میرے مقدور میں ہے۔ اس کے علاوہ 'کن فیکون' کا تعلق معجزے سے نہیں۔

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر نہ کسی آنگن میں
وہم منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم' خوں خوار درندے کی طرح آئے گا

(سنکیانگ)

سہم کو وہم کی طرح استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کہنا کہ 'سہم نہیں آئے گا' زبان پر ظلم کرنا ہے۔

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی نہ کوئی علم
منتشر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دشمنوں کا پتا دے سکا

(تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں)

'جنگ میں کسی نے قدم نہیں رکھا' زبان کے لحاظ سے اجنبی اندازِ بیان ہے۔ چوتھے مصرعے کو اگر یوں مانا جائے کہ 'نہ کوئی صف بن پائی نہ کوئی علم بن پایا' تو یہ بھی

صحیح اندازِ بیان نہیں ہوگا۔ علم نہیں بن پایا سے یہ مراد لینا کہ جھنڈا بلند نہیں ہو پایا نا قابلِ قبول ہے۔ اگر اس ٹکڑے کو بعد والے مصرعوں سے متعلق کیا جائے، یعنی نہ کوئی علم منتشر دوستوں کو صدا دے سکا...... تو یہ اور زیادہ اجنبی اندازِ بیان ہوگا۔

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارا نہیں
جسم خستہ ہے، ہاتھوں میں یارا نہیں

(ایضاً)

ہاتھوں میں یارا نہیں، درست نہیں۔ یوں کہتے ہیں: ہم کو یارا نہیں، اُس کو یارا نہیں، وغیرہ۔

اپنے بس کا نہیں بارِ سنگِ ستم
بارِ سنگ ستم، بارِ کہسارِ غم
جس کو چھوکر سبھی اک طرف ہو گئے
بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

(ایضاً)

'بارِ سنگِ ستم اپنے بس کا نہیں' یہ کچھ اچھا پیرایۂ بیان نہیں۔ پھر یہ کہنا کہ وہ بارِ سنگ ستم جس کو چھو کر سبھی اک طرف ہو گئے۔ بد سے بدتر ہے۔ غالباً میرؔ کا شعر ہے......

ہم نے اس سنگ دل سے منہ موڑا
بھاری پتھر تھا، چوم کر چھوڑا

اور اس طرح بھی کہتے ہیں کہ: بھاری پتھر دیکھ کر چھوڑ دیا، لیکن یہ کہنا کہ وہ بارِ سنگ ستم جس کو چھوڑ کر سبھی اک طرف ہو گئے، نامناسب طرزِ کلام ہے اور نا قابلِ قبول، بارِ سنگِ ستم کو چھونا اور بارِ کہسارِ غم کو چھونا یہ وہی لفظ پسندی کی ہوس ہے جس نے تکلف پسندی کے سارے پردے اُٹھا دیے ہیں۔

دوستو! کوے جاناں کی نا مہرباں
خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار

اب نہ آئے گی کیا اب کھلے گا نہ کیا
اس کفِ نازنیں پر کوئی لالہ زار
اس حزیں خاموشی میں نہ لوٹے گا کیا
شورِ آوازِ حق، نعرۂ گیرو دار

(ایضاً)

'کوئے جاناں کی نامہرباں خاک' یہاں لفظِ 'خاک' بات کو بگاڑ رہا ہے پھر یہ کہنا کہ نامہرباں خاک پر روشن لہو کی بہار نہ آئے گی، بات کو مزید بگاڑنا ہے۔ بہار خاک پر نہیں آتی۔ روشن لہو کی بہار، میں بیان کے تکلف کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ وہی لفظ جمع کر دینے کا شوق۔ کفِ نازنیں پر لالہ زار کھلانا تو تکلف کی جان پر بھی ستم کرنا ہے۔ لالہ زار ہتھیلی پر نہیں کھلتا۔ یہاں استعارے کی خوبی خرابی میں بدل گئی۔ رنگِ حنا کے استعارے کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ بیان کی خرابی نے پورے بند کو بے رنگ بلکہ بدقوارہ بنا دیا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ 'خاموشی میں شورِ آوازِ حق کیا اب نہیں لوٹے گا' نامانوس پیرایۂ گفتار کی تکمیل ہے۔

تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ زمیں جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم
یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہ گزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مرمٹیں ہم' نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم
لو سنی گئی ہماری' یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے' وہی فصلِ گل کا ماتم

اندازِ بیان کی بدسلیقگی نے پہلے مصرعے کے مفہوم کو ابہام کے پردے میں چھپا دیا ہے۔ 'گیسوؤں کی شبنم' اس پر اضافہ ہے۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ رہ گزر میں قیامتیں گذراں ہیں' مگر اس طرح کہا نہیں جاتا۔ پانچویں مصرعے میں 'لو' اور 'یوں' اس طرح نظم ہوئے ہیں کہ مصرعے کی روانی ختم ہوگئی ہے۔

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے، تجھ کو تو خبر ہوگی

یہ اُردو کا اندازِ بیان نہیں۔ 'قامت' اور 'حشر' کی رعایت سے جس طرح مضمون آفرینی کی گئی ہے، وہ بجائے خود تکلف سے خالی نہیں۔

اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اک نظر زہر لیے، ایک نظر میں دارو

(ملاقات مری)

'میری رات اپنی تنہائی سے گویا ہوئی' اجنبی اندازِ کلام ہے۔ 'گویا' کو ہم کلام یا مخاطب کے مفہوم میں اس طرح استعمال نہیں کیا جاتا۔ آخری مصرع کا واک اندازِ بیان کا نمونہ ہے۔ 'اک نظر زہر لیے' یہ اُردو تو ہے نہیں۔ اس کے علاوہ 'زہر' کے مقابلے 'دارو' بھی کچھ مستحسن نہیں۔ 'ایک نظر میں دارو' یہ اُردو تو نہیں ہے۔

گنو سب داغ دل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پرسش ہو رہی ہے بے گناہوں کی

'شوقین' (بہ نونِ غنہ) یہاں پر بہت برا معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لفظ زائد بھی ہے۔ دل کے داغوں کے مقابلے میں نگاہوں کی حسرتیں کافی تھیں۔

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر

(ختم ہوئی بارشِ سنگ)

خورشید و قمر کا نظر کے تار سے ٹکڑے ٹکڑے ہونا رعایتِ لفظی کی بھدی مثال ہے۔ وہی لفظ پسندی کی ہوس۔ یہ بھی دیدنی ہے کہ خورشید و قمر آفاق پہ ٹکڑے ٹکڑے ہوئے ہیں۔ بدسلیقگی اور بدمذاقی کی حد ہوگئی ہے۔

ترک دُنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

(کہاں جاؤ گے)

'اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے' بے حد غیر مناسب طرزِ کلام ہے۔ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے' اس لیے ان کے دو مجموعہ ہائے کلام، سرِ وادی سینا اور دست صبا سے بس چند مثالیں اور پیش کی جائیں گی۔ اوّل الذکر مجموعے کا ہندوستانی اڈیشن میرے پاس ہے (شائع کردہ کتابی دُنیا، لکھنؤ) اسی مجموعے سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں......

کٹڑیوں اور گلیوں، محلوں کے نام
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں
کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو

(انتساب)

خاشاک سے وضو کرنا مہمل بات ہے' پھر ناپاک خاشاک سے وضو! یہ کس قسم کا وضو ہے؟ اس کے علاوہ چاند کا خاشاک سے وضو کرنا، وہی غیر شاعرانہ تکلف پسندی ہے۔ وہی لفظ پسندی اور مفہوم بیزاری۔

جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا
آنچلوں کی حنا، چوڑیوں کی کھنک' کاکلوں کی مہک (ایضاً)

چوڑیوں کی کھنک اور کاکلوں کی مہک تو جانی پہچانی چیزیں ہیں 'آنچلوں کی حنا' سے کان آشنا نہیں' نہ کبھی نظر گنہگار ہوئی ہے۔

کہیں نہیں ہے' کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں

(لہو کا سراغ)

لفظِ 'سراغ' بے محل آیا ہے 'نشان' یا ایسے ہی کسی لفظ کا محل ہے۔ 'سراغ' ملنا اور پانا جیسے صلوں کے ساتھ آتا ہے۔ اس طرح نہیں کہتے کہ یہاں سراغ ہے' یا کہیں سراغ نہیں۔

نہ صرف خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے

(ایضاً)

خدمت کے معاوضے کو 'خوں بہا' نہیں کہتے۔ دوسرے مصرعے میں بیعانہ زائد ہے۔

زنداں زنداں شورِ انا الحق محفل محفل قلقل مے
خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی' آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم ماتم شہر بہ شہر

دوسرے مصرعے میں 'دریا دریا' کی دوبار تکرار بے مزہ ہے اور دوسرے مصرعوں کے اندازِ بیان سے میل نہیں کھاتی۔ آخری مصرعے میں 'ماتم ماتم' بھی بے محل ہے کہ یہاں بیان کا تناسب ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ شہر شہر ماتم' کا محل ہے۔ قریہ قریہ' دامن دامن اور 'زنداں زنداں کی طرح قافیے کی مجبوری سے شہر شہر بھی کہا جاسکتا ہے۔ وزنِ شعر اور آسانیِ بیان کی خاطر ماتم شہر بہ شہر بھی گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن ماتم ماتم شہر بہ شہر، کسی طرح تناسب کے دائرے میں نہیں آتا۔ اس طرح تو پہلے تین مصرعوں میں بیان کا تناسب تباہ ہوجاتا ہے۔

پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے

(سرِ وادیٔ سینا)

'لوح پر پیمان اترنا' زبان کے خلاف ہے۔ مفہوم بھی پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔ 'مابین من و تو' کا ٹکڑا اس قدر بے جگہ آیا ہے کہ اس نے بے طرح اُلجھاؤ پیدا کردیا ہے......

ہر اک اولی الامر کو صدا دو کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جم سرفروشاں

پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے

'دار و رسن کے لالے پڑیں گے' یعنی دار و رسن کو بھی ترس جائیں؟ مگر یہ تو منشائے شاعر کے خلاف ہے۔

اس دل نواز شہر کے اطوار دیکھنا
بے التفات بولنا، بیزار دیکھنا

دوسرے مصرعے کے دونوں ٹکڑے 'گورا شاہی اُردو' کی یاد دلاتے ہیں۔ وہی ترجمہ کر دینے والا انداز......

کب تمہارے لہو کے دریدہ علم
فرقِ خورشید محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں ڈھل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے درد و الم، سارے جور و ستم
دور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لو
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

(خورشیدِ محشر کی لو)

بہت سے لفظ جمع کر دینے کا شوقِ فضول اور کچھ نہیں 'لہو کے دریدہ علم فرقِ خورشید محشر پر رقم ہوں گے'، کوئی پوچھے کہ بات کیا ہوئی۔ پہلے لہو کے علم بنائے (اور یہ محض ایجاد بندہ ہے) پھر وہ علم دریدہ ہوئے اور اب وہ دریدہ علم' خورشید محشر کے سر پر رقم ہوں گے۔ یہ سب طلسماتی عجائبات معلوم ہوتے ہیں' ورنہ علم کا سر پر رقم ہونا کیا معنی رکھے گا اور لہو کے علم کیسے بنیں گے۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرع بھی لفظوں کا مجموعہ ہے مگر اس کا مفہوم کم از کم میری سمجھ میں تو آیا نہیں۔ بحرِ خوں تمہارے قدم لے کر اٹھے گا' اللہ

جانے وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے بند کے شروع کے دو مصرعے یہ ہیں......

آج کا دن زبوں ہے مرے دوستو
آج کے دن تو یوں ہے مرے دوستو

دن کا زبوں ہونا بھی نئی بات ہے۔ آج کا دن زبوں ہے' اُردو زبان تو اس روز مرہ سے آشنا نہیں۔

دیوارِ شب اور عکسِ رُخِ یار سامنے
پھر دل کے آئینے سے لہو پھوٹنے لگا

پہلا مصرع بحر سے خارج ہے۔ دوسرے مصرعے میں پہلے دل کو آئینہ بنایا گیا اور پھر یہ کہا گیا کہ اس سے لہو پھوٹنے لگا۔ جب دل کو آئینہ قرار دے لیا تو پھر اس کے سارے متعلقات میں آئینے کی نسبت ملحوظ رکھنا پڑے گی اور آئینے سے لہو نہیں پھوٹتا۔

رہا نہ کچھ بھی زمانے میں جب نظر کو پسند
تری نظر سے کیا رشتۂ نظر پیوند
ترے جمال سے ہر صبح پر وضو لازم
ہر ایک شب ترے در پر سجود کی پابند
نہیں رہا حرم دل میں اک صنم باطل
ترے خیال کے لات و منات کی سوگند

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے کا اندازِ بیان درست نہیں۔ نظر سے رشتۂ نظر پیوند کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہی قدرت کلام کی کمی۔ بات کہنا چاہتے ہیں کہہ نہیں پاتے، اُلجھا دیتے ہیں۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ تیرے جمال سے ہر صبح پر وضو لازم ہے۔ بدسلیقگی نے یہاں بھی بات کو الجھا دیا ہے۔ صبح کے لیے لازم ہے کہ وہ تیرے جمال سے وضو کرے' یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ یا یہ مطلب ہے کہ تیرے جمال سے وضو کرے' یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ یا مطلب ہے کہ تیرے جمال سے یہ لازم آیا ہے کہ صبح پہلے وضو کرے اور پھر اس کا مشاہدہ کرے' اور یہ اس سے بھی زیادہ بے تکی بات

ہے۔ آخری شعر میں 'باطل' بے محل آیا ہے اور اس نے پورے شعر کو بگاڑ دیا ہے۔ دل کے حرم میں ایک صنم باطل نہیں رہا' کیا مفہوم ہوا اس کا؟

شعار کی جو مدارتِ قامتِ جاناں
کیا ہے فیضؔ درِ دل درِ فلک سے بلند

مدارت شعار کرنا بجائے خود ٹکسال باہر ہے اور قامتِ جاناں کی مدارات شعار کرنا ستم ظریفی کی انتہا ہے۔ یہاں بھی وہ لفظوں کی نظر فریبی کا شکار ہوئے ہیں۔ درِ دل کا بلند کرنا ان سب پر اضافہ ہے۔

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلا
کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا

'میلا سجنا' بھی خلاف محاورہ ہے' اور لہو کے واویلا کا لبھانا تکلف پسندی اور لفظ آرائی کی بدترین مثالوں میں سے ہے۔

اس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اے چشم تماشائی

'اے چشم تماشائی' اور 'دیکھو' میں شتر گربگی ہے۔

جس طرح بند دریچوں پہ گرے بارشِ سنگ

'بارش گرنا' زبان کے خلاف ہے۔

آخر میں دست صبا سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

برفابِ آب برف کا مقلوب ہے اور برف کے پانی جیسے جسموں کا پگھلنا بے تکی بات ہے۔ 'برفاب' کو برف کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ فیضؔ صاحب ہی نے کہا ہے......

جب خونِ جگر برفاب بنا
اور آنکھیں آہن پوش ہوئیں

یہاں 'برفاب' صحیح طور پر استعمال میں آیا ہے......

گر مرا حرفِ تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہوا بے نور دماغ

'بے نور دماغ' کا جی اٹھنا قابلِ توجہ ہے۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ تیرا بے نور دماغ منور ہو جائے تو ایک بات ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں دماغ کا جی اُٹھنا بجا ہے خود ٹھیک نہیں۔ اس کا دماغ جی اٹھا، یا میرا دماغ جی اٹھے گا' اس طرح کوئی نہیں کہتا۔

گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد سے سروِ سہی نماز کرے

جسے 'سرو نماز کرے' معلوم نہیں کہاں کی زبان ہے' یہ اُردو کا اندازِ بیان تو ہے نہیں۔

حدیث بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

'کس مصرف' فصاحتِ بیان کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

ایک تو نطق کی بخیہ گری نہیں کی جاتی۔ دوسری بات یہ کہ محاورہ ہے۔ 'ہونٹ سی دُنیا' اس کی جگہ یہ کہنا کہ وہ لب کی بخیہ گری کرتے ہیں' تکلف بلکہ غرابت سے خالی نہیں۔ نطق و لب کی بخیہ گری میں بہ ظاہر نیا پن ہے اور اسی نے ان کو بتلائے غلط اندیشی کیا ہے۔

بنی بساطِ غزل، جب ڈبو لیے دل نے
تمہارے سایہ رخسار و لب میں ساغر و جام

'جام ڈبونا' بجائے خود مبتذل ہے' اس پر ستم یہ کہ سایہ رخسار و لب میں بات صرف اتنی ہے کہ میری غزلیں تصورِ لب و رخسار کی مرہونِ منت ہیں— یہ وہی لفظی آرائش اور فضول پسندی ہے جس میں ان کی شاعری ڈوبی ہوئی ہے۔

افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر

'ایام' افسردہ نہیں ہوتے۔ نیز ترے ایام، اس سے بھی زیادہ مذموم ہے۔ اس نظم کا آخری مصرع ہے......

اس دیدۂ تر کا شکر کرو، اس ذوقِ نظر کا شکر کرو

'ترے ایام' کے بعد 'شکر کرو' کہنا ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے 'تو جاؤ'

ذرا صیقل تو ہولے تشنگی بادہ گساروں کی

'تشنگی صیقل تو ہولے' کوئی نا آشنائے زبان و بیان ہی لکھ سکتا ہے۔

گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار

زبان کا مزاج شناس اور بیان کا راز داں فوراً کہہ اٹھے گا کہ 'سرِ گوشۂ منبر' میں گوشہ بے محل ہے۔ سرِ منبر کا محل ہے اور یہی صورت 'برسرِ دربار' کی ہے کہ یہاں بھی سرِ دربار کافی تھا۔

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

'جزا لے جائیں گے' زبان کے لحاظ سے نامانوس ہے۔ دُوسرے شعر میں دریا کا تنکوں سے ٹالا جانا نامانوس تر ہے بلکہ غلط تر۔

خیر ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو

آپ بات کرو' کتابی زبان نہیں ہوسکتی۔

وہ عکس رخِ یار سے لہکے ہوئے ایام

'لہکے ہوئے ایام' صحت سے محروم ہے۔

ہر درد کو اُجیالا' ہر اک غم کو سنوارا

'درد اجیالنا' غیر مانوس طرزِ کلام ہے۔

عکسِ جاناں کو وداع کرکے اُٹھی میری نظر

اور نظریاتی وابستگی کی تفسیر میں اتنی ہمہ گیری نہیں ہوتی کہ وہ عام انسانی تصورات کی طرح وسیع الذیل بن سکے۔ ان کے یہاں جو یکسانیت ہے، وہ بالآخر ذہن کو تھکا دیتی ہے۔ انھوں نے اب محدود سیاسی اثرات کو اپنا موضوع قرار دے رکھا ہے، اس لیے ان کے کلام کا بڑا حصہ ایک فنا آمادہ جد و جہد کے بیان پر مشتمل ہو کر رہ گیا ہے (اور یہ بیانات بھی عموماً ہر طرح کی خامیوں سے گراں بار ہوتے ہیں، اس لیے کم تاثیری کو ان کا ساتھ دینے میں بہت سہولت ہوتی ہے) آج ہم ان کے وطن کے بعض سیاسی حالات سے اور ان کی سرگذشت سے کچھ نہ کچھ واقف ہیں، اس لیے پھر بھی کچھ لطف آ جاتا ہے اور بعض مقامات پر پڑھنے والے کا ذہن بھی اضافے کر لیا کرتا ہے، لیکن کچھ مدت کے بعد جب خیالات کے رخ بدل جائیں گے، ماضی کے وہ معمولی اور غیر دور رس واقعات (ان میں بعض مفروضہ معاملات بھی شامل ہوں گے) بھولی ہوئی داستان بن کر رہ جائیں گے اور نئے اہم مسائل اور دور رس حادثے ہماری توجہ کو جذب کر لیں گے، اس وقت ایسی نظموں کی دلکشی اور بھی کم ہو جائے گی۔ ہاں نظموں کے بعض حصے جن پر حسنِ بیان کی مہریں لگی ہوئی ہیں، ان کو پڑھ کر ضرور لطف حاصل کیا جا سکے گا، مگر ایک مشکل یہ ہے کہ نظم، غزل نہیں ہوتی جس کے اشعار کو دوسرے اشعار کی مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اگر دس شعر کم درجہ ہوں اور صرف ایک شعر عمدہ ہو تو وہی زندگی جاوید پا جائے۔ نظم میں تو سب اشعار مل کر فضا، مفہوم اور تاثیر کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہی نظم

کا ٹھاٹ ہے کہ بہت سی کڑیاں مل کر زنجیر بنے۔ اگر اس کے بعض حصے ناقص ہوں گے تو مجموعی طور پر نظم ناقص ہوگی۔

(۷)

فیضؔ کی غزلوں کا حال عجیب بلکہ عجیب تر ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے اور اس کو مانتے بھی سب ہیں کہ فیضؔ دراصل رومانی شاعر ہیں اور تغزل ان کے پیرایۂ اظہار کا جز ہے۔ ان کے لہجے میں جو نغمگی ہے اور طرزِ کلام میں جو نرمی ہے، وہ غزل کے کام کی چیز ہے، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ان کی نظمیں جس قدر نئے پن کی آئینہ داری کرتی ہیں، غزلیں اسی قدر روایتی اندازِ غزل گوئی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ سب سے بری بات یہ ہے کہ ان کی غزلیں تہہ داری سے خالی ہیں، اُن میں اکہرا پن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے یہاں ایسے شعر بھی ملتے ہیں......

یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے، مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ! نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

ان کی غزلوں سے ایسے اور بھی چند شعر منتخب کیے جاسکتے ہیں، مگر وہ سب اوسط درجے کے شعر ہوں گے۔ یہاں اس نکتے کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ غزل کی طاقتور اور وسیع الذیل روایت کا یہ کرشمہ ہے کہ بعض معمولی شاعر بھی دس بیس سال کی مشقِ سخن

کے بعد دو چار شعر اچھے کہہ ہی لیتے ہیں۔ فیضؔ کی نظموں کو پڑھ کر جو توقع پیدا ہوتی ہے کہ یہ شخص غزل کو بھی نئے انداز و افکار سے معمور کرے گا، وہ پوری نہیں ہوتی۔ خیر اس میں بجائے خود کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ اُن کی غزلوں پر روایتی انداز اس قدر چھایا ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور اس اختلاف یا یوں کہیے کہ تضاد کی وجہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دونوں میں اندھیرے اُجالے کا سا فرق ہے تو کیوں ہے۔

میں یہاں پر ایک ضمنی بات بھی کہنا چاہوں گا۔ فیضؔ کی غزلوں میں نغمگی ضرور موجزن رہتی ہے اور یہی نغمگی ہے جس نے غزل کے نئے گائیکوں میں ان کی غزلوں کو مقبول بنایا ہے اور خیالات و بیان کے لحاظ سے یہی اکہرا پن ہے جس کی وجہ سے مجمع عام میں سہل طلب سننے والے ان پر جھومتے ہیں۔ کسی عام بزم میں جب ایک مغنی آتش نفس اس شعر کو ادا کرے گا۔

رنگ پیراہن کا، خوشبو زُلف لہرانے کا نام

موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

تو دوسرا مصرع سنتے ہی لوگ بجا طور پر جھومنے لگیں گے۔ اسی طرح جب کسی محفل میں لوگ یہ سنیں گے کہ......

ویراں ہے مئے کدہ خم و ساغر اُداس ہیں

تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن

دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

تو خوش وقتی کی تلاش میں آئے ہوئے لوگ وجد میں آجائیں تو تعجب کی کیا بات ہے۔ یہی حال ان کی لکھی ہوئی قوالیوں کا ہے اور ان غزلوں کا بھی جو قوالی کے کام بہ خود آسکتی ہیں (مگر ہم سب جانتے ہیں کہ نغمگی، تہہ داری کا بدل نہیں بن پاتی)

ان کے مجموعے نقشِ فریادی میں جو غزلیں ہیں، ان میں ہر سطح پر کچا پن پایا جاتا ہے۔ دست صبا کی غزلوں میں کچھ ٹھہراؤ ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ بیان پر

قدرت کے آثار نمودار ہو چلے ہیں مگر اس کے بعد صورتِ حال اچانک بدل جاتی ہے۔ دست صبا تک کی غزلوں میں تغزل کی کیفیت کچھ نہ کچھ ضرور ملتی ہے۔ زنداں نامے کی غزلیں سیاسی اشاریت میں زیادہ ڈوبی ہوئی ہیں اور دستِ تہہ سنگ کی غزلوں میں مشکل پسندی، دقت طلبی، خشونت اور بے رنگی کے اثرات بے طرح کارفرما محسوس ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کی غزلوں پر مختلف زمانوں کی پرچھائیاں اس طرح پڑتی رہیں کہ کسی انداز کو فروغ پا کر تکمیل کی حدوں میں داخل ہونے کا وقفہ نہیں مل پایا۔

غزلوں کا ایک قابلِ ذکر حصہ ایسا ہے جس میں روایتی مضامین روایتی انداز سے نظم کر دیے گئے ہیں۔ ایک حصہ ایسا بھی ہے جس میں دھندلے دھندلے سیاسی اشارے بھی نظر آ جاتے ہیں، مگر ایسے اشعار میں یا تو زورِ بیان مفقود ہوتا ہے، یا پھر عدمِ قدرتِ کلام نے چستی و پرکاری نہیں پیدا ہونے دی ہے۔ میں مثال کے طور پر دست صبا سے ایک مکمل غزل نقل کرتا ہوں جس میں رسمی مضامین بھدّے پن کے ساتھ نظم کر دیے گئے ہیں......

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

بزمِ اہلِ طرب کو شرماؤ
بزمِ اصحابِ غم کی بات کرو

بامِ ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمتِ چشمِ نم کی بات کرو

ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی
تم کرم یا ستم کی بات کرو

خیر، ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
روزِ وصل صنم کی بات کرو
جان جائیں گے جاننے والے
فیضؔ فرہاد و جم کی بات کرو

اس قبیل کی دوسری غزلیں رسمیت اور سطحیت سے اس قدر لب ریز ہیں کہ اُن کو فیضؔ کی طرف منسوب کرنا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ دستِ صبا ہی سے ایک اور غزل نقل کی جاتی ہے جس کے آخری شعروں میں نمایاں سیاسی اشاریت بھی ہے، لیکن مقطعے کے سوا اور اشعار دلکشی اور شعریت سے محروم ہیں اور نتیجتاً تاثیر سے بھی......

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں
ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اَب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشم صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ! دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

زنداں نامے کی بیش تر غزلیں کیفیات زنداں کی بازگشت ہیں مگر اندازِ بیان پر قابو یافتہ نہ ہونے کے اثرات ان غزلوں پر بھی چھائے ہوئے ہیں اور بری طرح۔ سطحیت ان میں بھی بے طرح موجود ہے اور بے لطفی اور بے کیفی کی بھی کمی نہیں۔ اس ایک غزل سے اس صورتِ حال کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے کہ بہ قولِ محمد حسین آزاد 'پھسپھسے شعر' کہتے چلے گئے ہیں......

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے
کرتے ہیں جس پہ طعن، کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فضول و جراتِ ناکام ہی تو ہے
دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے
دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے
آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے
بھیگی ہے رات فیضؔ غزل ابتداء کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

فیضؔ نے کچھ غزلیں نسبتاً مشکل زمینوں میں بھی کہی ہیں۔ کسی مشکل زمین میں غزل کہنا مشاقی اور قادر الکلامی کی آمائش کرنا ہے اور یہ فیضؔ کا کمزورترین پہلو ہے۔ جس چیز کو مشاقی کہتے ہیں، اس سے انہیں دور کی نسبت ہے اور یہی احوال قدرتِ کلام کا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو غزلیں کچھ مشکل زمینوں میں ہیں، ان کا حشر سب سے زیادہ برا ہوا ہے۔ اوپر جو غزل درج کی گئی ہے اسے بھی اس نظر سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک اور غزل......

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں، چراغِ رخ ہے نہ شمعِ بادہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں، مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ، اے مہہ شبِ غم، نظر پہ کھلتا نہیں ہے اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے، کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گل سرِ شام جل گئے ہیں، وہ دل سرِشام بجھ گئے ہیں

کم مشقی اور زبان و بیان کے نکات سے کم آشنائی کا یہ کرشمہ ہے کہ ہر شعر بجھا ہوا ہے۔ پیغام بجھ گئے ہیں، نام بجھ گئے ہیں، در و بام بجھ گئے ہیں، ان بے جوڑ ٹکڑوں کے ساتھ سب کچھ بجھ کر رہ گیا ہے۔ 'چراغِ رُخ' کے ساتھ 'شمعِ بادہ' کا جوڑ لگانا تو بدذوقی کی انتہا ہے۔ ایک اور غزل......

کیسے آرزو سے پیماں، جو مآل تک نہ پہنچے
شب و روز آشنائی مہہ و سال تک نہ پہنچے

وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خدو خال تک نہ پہنچے

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

ترا لطف وجہ تسکیں نہ قرار شرحِ غم سے
کہ ہیں دل میں وہ گلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

کوئی یار جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیم یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

چلو فیضؔ دل جلائیں کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

نظر کو محیطِ حسن کرنا، شب و روزِ آشنائی کا مہہ و سال تک پہنچنا، پیاں کا مآل تک پہنچنا، دید کے وسیلوں کا خدو خال تک پہنچنا۔ غرض پوری غزل ایسے ہی ان مل بے جوڑ ٹکڑوں کا مجموعہ ہے۔ ایک شعر بھی کمال تک نہ پہنچا۔ میں اس سلسلے میں ایک مکمل غزل اور نقل کرتا ہوں تا کہ صورتِ حال وضاحت کے ساتھ اور پوری طرح سامنے آ جائے......

کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا
اعلانِ جنوں دل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو، جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں، جب ہم نے رقص آغاز کیا

بے حرص و ہوا، بے خوف و خطر، اس ہاتھ پہ سر اس کف پہ جگہ
یوں کوے صنم میں وقتِ سفر نظارہ بامِ ناز کیا

جس خاک میں مل کر خاک ہوئے، وہ سرمۂ چشم خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہم رنگ گلِ طناز کیا

لو وصل کی ساعت آ پہنچی، پھر حکمِ حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا

اس زمین میں شعر کہنے کے لیے قدرتِ کلام درکار ہے اور ہر شعر اس کی کمی کا شکوہ گزار ہے۔ پہلے' چوتھے اور آٹھویں مصرعے کو ایک بار پھر پڑھ لیجیے۔ یہ مصرعے بدقوارگی کے خاص طور پر شکار ہوئے ہیں۔ ہاں لفظوں کا ہمہمہ بہت ہے' مگر بے سُرے پن کے ساتھ۔

دوسرے شاعروں کی طرح فیضؔ نے بھی کبھی کبھی 'بہ رنگِ اساتذہ' کچھ کہا ہے۔ تقلید یوں بھی کچھ اچھی چیز نہیں' پھر میر و درد کا انداز! اور پھر اس سروساماں کے ساتھ

کہ قدرتِ کلام سے دور کی شناسائی ہو! میرؔ و دردؔ کی شاعری کی روح تو ایسے تقلیدی پیکروں میں سمانے سے رہی، یہ ضرور ہوتا ہے کہ شاعری کا اپنا اچھا برا جیسا بھی انداز ہوتا ہے، وہ بھی باقی نہیں رہتا۔ ذیل میں دو غزلیں نقل کی جاتی ہیں۔ دردؔ کے ایک شعر کی تضمین نے ایک غزل میں تقلید کا اعلان کر دیا ہے۔ دوسری غزل میں ایسی کوئی صراحت نہیں، مگر میرؔ کی تقلید چھپنے والی چیز ہی نہیں۔

کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے، کب تک یاد نہ آؤ گے

بیتا دید امید کا موسم، خاک اڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کے بادل کب برکھا برساؤ گے

عہدِ وفا یا ترکِ محبت، جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے، ان کو کیا جتلاؤ گے

فیضؔ دلوں کے بھاگ میں ہے، گھر بھرنا بھی، لٹ جانا بھی
تم اس کے اس لطف و کرم پر کتنے دن اتراؤ گے

کیسے سپاٹ مصرعے ہیں۔ 'برکھا برسانا' اور 'دلوں کے بھاگ میں ہے' کی بجوبگی مزید برآں۔ یہی صورت پانچویں مصرعے میں 'جو چاہو سو آپ کرو' کی ہے اور 'دید امید کا موسم' ان سب سے عجیب تر ہے۔

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشک بو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یار آشنا نہیں کوئی، ٹکرائیں کس سے جام
کس دل ربا کے نام پہ خالی سبو کریں

سینے پہ ہاتھ ہے نہ نظر کو تلاشِ بام

دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں
کب تک سنے گی رات۔ کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے روبہ رو کریں
ہمدم! حدیث کوے ملامت سنائیو
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں
آشفتہ سر ہیں محتسبو! منہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکرِ دل و جاں عدو کریں
'تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں'

اسے بے رنگ اشعار کا مجموعہ کہیے۔ قافیے کی ضرورت نے جس طرح سبو خالی کرایا ہے' اسے بھی نظر میں رکھیے۔ مصرعوں پر کم مشقی کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ سطحیت سے ہر شعر معمور ہے۔

فیض کی اکثر غزلیں سپاٹ اور سرسری اشعار کا مجموعہ ہیں۔ اس کے علاوہ زبان اور بیان کے ایسے معائب ان میں موجود ہیں کہ خوش مذاقی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ کہیں بندشیں ست ہیں، کہیں تعبیرات ناقص ہیں اور کہیں یہ صورت ہے کہ ایک مصرع ترشا ہوا ہے اور دوسرا مصرع اس کے برابر کا نہیں۔ ردیفیں جگہ جگہ اکھڑی اکھڑی سی ہیں اور بہت سے قافیوں کو جن پہلوؤں سے بٹھایا گیا ہے وہ زبانِ حال سے فریاد کناں ہیں۔ بہت سے اشعار میں مفرد لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال میں بے طرح بے پروائی سے کام لیا گیا ہے' جس کی وجہ سے زبان کے بڑے عیب اور بیان کے واضح اسقام نمایاں ہوگئے ہیں۔ اوپر جو مکمل غزلیں نقل کی گئی ہیں ان میں یہ سب اسقام موجود ہیں اور اسی سے صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ غزلوں میں زبان اور بیان کے جس قدر معائب ہیں ان کی مثالیں علاحدہ سے جمع کی جائیں تو بہت طویل فہرست بن جائے گی' جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ میں محض بہ طور مثال ان

کی ایک غزل کے دو شعر اور ایک غزل کے تین شعر نقل کرتا ہوں۔

وہیں لگی ہے، جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے
جگہ جگہ پہ تھے ناصح، تو کو بہ کو دلبر
انہیں پسند، اُنہیں ناپسند کیا کرتے

پہلے شعر کا دوسرا مصرع کا واک انداز بیان کا اچھا نمونہ ہے۔ 'دستِ عدو کے گزند یہ فرق کیا کرتے' وہی لکھ سکتا ہے جو زبان کی صحت اور بیان کی فصاحت کی طرف سے آنکھیں پھیر لے، یا یہ کہ ان سے اس کی شناسائی ہی نہ ہو۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں حسنِ بیان کا یہ تقاضا ہے کہ کو بہ کو کی طرح صرف جگہ جگہ ہو۔ 'جگہ جگہ پہ' نے بیان کے توازن کو اور حسن کو ختم کر دیا ہے۔

خیالِ یار کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے
ہم اپنے راز پہ نازاں تھے شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخنِ راز دار کرتے رہے
ضیائے بزم جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیث شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

'اسی متاع پہ روزگار کرتے رہے' عجزِ بیان کی نہایت اچھی مثال ہے اور بلا تکلف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ایسی مثالیں اُن کے یہاں بہ کثرت پائی جاتی ہیں، اس حد تک کہ اس کو ان کا خاص انداز بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہی احوال 'حدیث کرنے' کا ہے۔ یہ کہنا کہ ہم 'بار بار حدیثِ شعلہ رخاں کرتے رہے' اس کا اعلان کرنا ہے کہ زبان کی صحت اور بیان کی فصاحت سے ان کو مطلق دلچسپی نہیں۔ یا پھر یہ کہا جائے کہ وہ ان چیزوں سے واقف ہی نہیں۔ روز مرہ اور محاورے کی طرف سے اگر صرفِ نظر کو اس طرح روا رکھا جائے تو پھر یہی کہا جائے گا کہ ایسے شاعر کو

کلاسیکی انداز چھوڑ کر ظفر اقبال کے رنگ میں شعر کہنا چاہیے تا کہ کسی طرح حساب کتاب کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔

روز مرہ اور محاورے کا احوال فیضؔ کی شاعری میں بے طرح سقیم نظر آتا ہے اور اس کی وجہ سے کلام کی فصاحت اور بیان کا حسن دونوں تباہ ہو گئے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہی نہیں کہ محاورہ کیا ہے اور کیا نہیں، کسی لفظ کا محلِ استعمال کیا ہے، اس کی نسبت کا تقاضا کیا ہے اور یہ کہ معنویت کا تقاضا کیا ہے۔ مثلاً 'سر کرنا' ایک محاورہ ہے اور متعارف محاورہ ہے، اس کے ساتھ جو سلوک انہوں نے روا رکھا ہے اسے ملاحظہ کیجئے......

سُر کرو ساز کہ چھیڑیں کوئی پُر درد غزل
ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے کب سے

اور اس طرف مطلق توجہ نہیں کی کہ 'ساز سُر کرنا' کوئی محاورہ نہیں' اُردو والے اس طرح نہیں کہتے۔ چوں کہ 'غزل' کے لیے 'چھیڑیں' وہ لائے ہیں' اس لیے 'ساز' کے لیے کیا لاتے 'سر کرنا' لے آئے، یہ دیکھے بغیر کہ حسنِ بیان پر کیا گزر جائے گی اور زبان کی لطافت پر کیا بیت جائے گی۔ اسی قبیل کا ایک اور شعر......

بھیگی ہے رات فیضؔ! غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود درد کا ہنگام ہی تو ہے

'غزل ابتدا کرنا' بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔ تلاش اور تامل سے کام لینا جیسے اُنہیں گوارا ہی نہ ہو' جو لفظ سامنے آ گیا ہے، اسے نظم کر دیا ہے، یہ سوچے بغیر کہ مناسب اور مطابقت کا احوال کیا ہوگا۔ 'درد کا ہنگام' ان سب پر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے......

دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں! یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

'حرفِ ملامت' کی ترکیب نے 'حرف' کی معنویت کو برقرار رکھا تھا، بلکہ

کچھ اور روشن کر دیا تھا، لیکن دوسرے مصرعے میں 'یہ حرف ترا نام ہی تو ہے' کہہ کر اس پر بھی پانی پھیر دیا۔ اگر 'حرفِ ملامت' آ سکتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ 'حرف' ترکیب کے بغیر بھی ہر جگہ اسی طرح کھپ سکتا ہے۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ ہر نکتہ مقامے دارد۔

مضمون طویل ہوگیا اور اس سلسلے میں ابھی کہنے کو بہت کچھ باقی ہے کہاں تک لکھا جائے گا۔ یہ تھوڑی سی مثالیں جو پیش کی گئیں، صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے یہ بھی کچھ کم نہیں۔ کیسا افسوس ہوتا ہے کہ زبان اور بیان کے نکات و رموز کی طرف سے بے پروائی یا بے خبری نے ان کی شاعری کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور اس سے زیادہ تعجب اس پر ہوتا ہے کہ وہ شاعر جو نظموں میں اپنا خاص انداز رکھتا ہے، اس کی غزلیں رسمی اور روایتی انداز سے معمور ہیں اور زبان و بیان کی طرف سے ناقابل برداشت بے پروائی کی شکوہ گزار ہیں۔

(۸)

شاعر جس زبان میں شعر کہے' اسے اُس زبان سے واقف بھی ہونا چاہیے اور اس کا مزاج شناس بھی ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر نظم ہو یا غزل' کسی کا حق ادا نہیں ہوتا۔ شاعری میں خیال اور پیرایۂ اظہار، دونوں ایک اکائی بن کر سامنے آتے ہیں، ان کو الگ الگ کر کے دیکھنا کم نظری کی دلیل ہے۔ اچھے خیال کو بہتر پیرایۂ اظہار نہ ملے، تو اس کی قدر و قیمت کچھ نہیں۔

فیضؔ کا کلام پڑھتے ہوئے جب بھی ن۔ م۔ راشد کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ استاد اور اناڑی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ راشد کو بے پناہ قدرت حاصل تھی گفتار کے اُسلوب پر۔ وہ شخص زبان کا مزاج شناس تھا اور

لفظوں کا مزاج داں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کے خیالات اس کی نظموں میں پوری توانائی، تہہ داری اور حسنِ بیان کے ساتھ معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔ کہیں بھی محسوس نہیں ہوتا کہ زبان کی فصاحت ساتھ نہیں دے سکی ہے نئے خیالات کا، اور کسی جگہ یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ نئے پن کے لیے کج خرامی اور کٹ بگڑا پن ضروری ہے۔ راشد کی نظمیں فصیح اور بلیغ پیرایۂ اظہار کی کمی کی شکوہ گزار کہیں نہیں نظر آتیں اور بیان کا استحکام کہیں بھی معرضِ خطر میں نہیں آتا۔ خیال روشن ہے اور بیان اس روشنی سے پوری طرح معمور نظر نہیں آتا ہے۔ یہی قدرت اور صلاحیت تھی جس کے بل پر راشد نے اس زمانے میں نظم کے ایک کم متعارف فارم کو اس طرح برتا کہ پڑھنے والوں کو بیان کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا اور خیالات کی تازگی اپنی جگہ برقرار رہی۔ اگر راشؔد کا احوال فیضؔ جیسا ہوتا (کہ مصرعے لڑکھڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسقام سے گراں بار اجزا نے نظم کا احوال وہی ہوتا ہے جس کو فیضؔ نے 'داغ داغ اجالا' کہا ہے) تو اُردو شاعری اس انداز سے مانوس اس قدر جلد شاید نہ ہو پاتی۔

○○

حمید نسیم
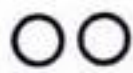
کچھ فیضؔ صاحب کے بارے میں

صہبا صاحب آپ مصر ہیں کہ میں فیضؔ صاحب کے بارے میں کچھ لکھوں۔ آپ کو 'فیضؔ نمبر' کی جامعیت کی فکر دامن گیر ہے۔ اس لیے آپ کا اصرار بے محل بھی نہیں۔ یہاں میں اس الجھن میں ہوں کہ کیا لکھوں۔ فیضؔ صاحب اس دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔ ایسے شاعر کے کلام کا جائزہ کوئی صاحب الرائے نقاد ہی لے سکتا ہے اور میں نقاد تو کیا، اس فن کا مبتدی بھی نہیں۔ ویسے یہ عجیب بات ہے کہ آج کل ہر مبتدی فیضؔ صاحب کے کلام کو تختہ مشق بنا رہا ہے۔ ادبی محفلیں ہوں کہ اخبار اور رسالے، نو بالغ اور نو مشق شاعر اور ادیب فیضؔ صاحب کی شاعری پر اس اعتماد اور جوش سے کج بحثی کرتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ جب سے فیضؔ صاحب کو لینن پرائز ملا ہے، فیضؔ صاحب کا 'جادو' توڑنے کی مہم اور تیز ہوگئی ہے، اور اس مہم میں پیش پیش وہ نوجوان ہیں کہ جو نہ دُنیا کے ادب سے واقف ہیں نہ اپنی زبان اور شعری روایت سے آگاہ۔ خیر یہ افتاد تو ہر صحیح شاعر پر پڑی ہے۔ غالب کے اکثر ہم عصر اسے 'مہمل گو' گردانتے تھے۔ 'بال جبریل' چھپی تھی تو کئی نحوی قسم کے بزرگوں نے زبان اور محاورے کی اغلاط کی طویل فہرستیں تیار کی تھیں۔ ایک بزرگ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کتاب کا نام ہی غلط ہے کیونکہ 'بال جبریل' کی ترکیب درست نہیں۔ ایک غالبؔ کے چچا اقبال کو اک بال کہہ کر خوش ہوتے تھے۔ ایسی بے تکی باتیں جو آج کل کچھ لوگ فیضؔ صاحب کے بارے میں کرتے ہیں' ہمیشہ ہوتی آئی ہیں۔ لیکن ان باتوں کا ادبی

دھارے پر اثر نہیں پڑتا اور شاعر شاعر ہی رہتا ہے۔ کیونکہ وقت خود اس کا محافظ ہوتا ہے۔

معافی چاہتا ہوں، بات کہاں سے چلی تھی کہاں آ پہنچی۔ عرض میں یہ کرنا چاہتا تھا کہ اس دور میں جن لوگوں کو فیضؔ پر لکھنے کا حق ہے اور جنہیں لکھنا چاہیے، ان میں فراق گورکھپوری اور محمد حسن عسکری صاحب کے نام میرے ذہن میں بار بار آتے ہیں۔ فراق صاحب نے تو ایک زمانے میں فیضؔ صاحب پر کچھ لکھا بھی تھا۔ امید ہے آپ انہیں دوبارہ لکھنے پر آمادہ کرسکیں گے۔ عسکری صاحب باکمال نقاد ہیں لیکن وہ 'ستارہ اور بادبان' میں فراق صاحب ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان سے کہیے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ فیضؔ صاحب بھی ان کے التفات کے حقدار ہیں۔

میں فیضؔ صاحب کی شاعری کے متعلق کچھ عرض نہیں کروں گا۔ بجز اس کے کہ میں انہیں اس دور کا بہت اہم شاعر سمجھتا ہوں۔ ہاں ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ باتیں عرض کیے دیتا ہوں۔ چند واقعات جن سے شاید انہیں جاننے اور پہچاننے میں مدد مل سکے۔

فیضؔ صاحب سے میری ملاقات ۱۹۳۳ء میں لائل پور میں ہوئی تھی۔ یہ غزل میں میری قافیہ پیمائی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ایک اتوار کی صبح میں گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ میرے بڑے بھائی کے سامنے ایک نہایت خوش شکل نوجوان بیٹھا ہے۔ بھائی نے مجھے دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''ان سے ملو یہ ہیں فیض احمد فیضؔ۔ بہت بڑے شاعر ہیں۔'' فیضؔ صاحب آخری فقرے پر کچھ شرما سے گئے۔ ان کی محجوب مسکراہٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ میں چارپائی پر فیضؔ صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ رشید بھائی نے فیضؔ صاحب سے شعر سنانے کی درخواست کی۔ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اپنی نظم 'سرود شبانہ' سنانی شروع کی۔ ان کا لہجہ ایسا نرم اور ایسا شیریں تھا کہ نظم کے مصرعے میرے دل میں اترتے چلے گئے۔ جب انہوں نے نظم ختم کی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ ساری نظم مجھے زبانی یاد ہوگئی ہے۔ فیضؔ صاحب رُخصت ہوئے تو میں نے رشید بھائی سے ان کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا گورنمنٹ کالج میں

ایم۔اے میں پڑھتے ہیں اور ملتان میں مقیم ایک لڑکی سے عشق کرتے ہیں۔ فیضؔ صاحب کی اس دور کی تمام نظموں کی محرک اور محبوب یہی خاتون تھی جو اپنے نیم خواب شبستان میں فیضؔ صاحب کا انتظار کرتی تھی۔ مخملیں باہوں والی محبوب۔

۱۹۳۴ء میں ہم لائل پور سے امرتسر آگئے ۔ ۱۹۳۵ء میں میں میٹرک پاس کر کے ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں داخل ہوا جہاں فیضؔ صاحب کچھ دن پہلے لکچرر مقرر ہوئے تھے۔ چند مہینے گزرے تو میرے استاد ڈاکٹر تاثیر مرحوم پرنسپل ہو کر آگئے۔ ان کے آنے سے ایم۔اے۔او۔ کالج ادبی اور سیاسی شعور کا مرکز بن گیا۔ اس زمانے میں وہاں بڑے بڑے اہل علم اور اہل نظر جمع تھے۔ صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر محب الحسن اور خود فیضؔ صاحب۔ کبھی کبھار حضرت حفیظ جالندھری، صوفی تبسم اور پنڈت ہری چند اختر مرحوم تاثیر صاحب سے ملنے لاہور سے تشریف لے آتے تھے۔ تاثیر صاحب کے ہاں اور ہمارے گھر میں محفلیں جمتی تھیں۔ شعر خوانی ہوتی تھی۔ نئے شعری رجحانات پر اظہار خیال ہوتا تھا۔ لطیفہ بازی بھی ہوتی تھی۔ تاثیر صاحب کی برجستہ گوئی اور فقرے بازی ان محفلوں کی جان تھی۔ امرتسر میں قیام کا زمانہ فیضؔ صاحب کی شخصیت کی تربیت اور جلا کا اہم ترین دور تھا۔ صاحبزدہ محمود الظفر اور رشید جہاں نے فیضؔ صاحب کے سیاسی شعور کو چمکایا اور تاثیر کی صحبت نے ان کی شاعری کو نکھارا۔ گرمیوں کی تعطیلات تاثیر صاحب ہمیشہ کشمیر میں گزارتے تھے، لیکن ان کے مشفقانہ مشورے جاری رہتے تھے۔ اپنے خطوں میں وہ میری غزلوں پر اصلاح اور فیضؔ صاحب کی نظموں پر اپنی رائے باقاعدگی سے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کشمیر سے ان کی واپسی پر فیضؔ صاحب اور میں ان سے ملنے گئے۔ تاثیر صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی، جس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے......

یہ بے گور و کفن لاشوں کا انبار
نشانِ راہ ہے منزل نہیں ہے

ایلس لندن سے امرتسر آئیں تو ان سے تعارف کے لیے تاثیر صاحب نے کچھ

لوگوں کو چائے پر بلایا۔ اس دعوت میں فیضؔ صاحب، میرے بھائی رشید اور میں شریک تھے۔ مجھے ایلس بہت خوبصورت لگی' دراز قد، سرخ وسفید رنگ، جاذب چہرہ اور متناسب بدن، شام کو جب ہم تاثیر صاحب کے ہاں سے واپس ہوئے تو راستے میں میں نے فیضؔ صاحب سے ایلس کے بارے پوچھا۔ کہنے لگے اچھی لڑکی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی بیوی بن جائے تو کیسا ہو۔ فیضؔ صاحب ہنس دیئے اور صرف یہ کہا کہ "تم تو پاگل ہو۔" پھر ہم سب لوگ ایلس سے گھل مل گئے۔ میں ہمیشہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیتا تھا۔ ایک شام ہم سب تاثیر صاحب کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایلس نیلے اطلس کی شلوار قمیص پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ آنکھوں میں ہلکا سا کاجل لگا رکھا تھا اور کانوں میں بڑے بڑے نگوں والے بندے سجا رکھے تھے۔ تاثیر صاحب ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے اور اس وقت ترقی پسند مصنفوں کا آدرش بیان کر رہے تھے۔ فیضؔ صاحب یکا یک نہ جانے کس خیال میں کھو گئے۔ مجھے یقین ہے تاثیر صاحب کی کوئی بات ان تک نہیں پہنچی۔ ایلس کی آمد کا یہ تاثر کچھ دنوں بعد 'موضوع سخن' میں کارفرما نظر آیا۔

۱۹۳۷ء میں تاثیر صاحب نے 'بزم سخنوران پنجاب' کے نام سے ایک مخصوص ادبی محفل کی طرح رکھی اور ہر مہینے ایک شاعر کے گھر طرحی مشاعرہ ہونے لگا۔ پہلا مشاعرہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں حفیظ جالندھری صاحب کے ہاں ہوا۔ اس مشاعرے کے لیے فیضؔ صاحب نے بھی غزل کہی تھی۔ 'دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے' باقی شاعروں کی غزلیں تو فوراً مرکھپ گئیں، لیکن فیضؔ صاحب کی غزل بجلی کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی۔ دوسرا مشاعرہ امرتسر میں فیضؔ صاحب کے مکان پر ہوا۔ طرح کی زمین تھی نظر میں ہے۔ خبر میں ہے۔ اثر میں ہے۔ فیضؔ صاحب کا مطلع حاصل مشاعرہ رہا۔

کچھ دن سے انتظار سوال دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

دونوں مشاعروں میں فیضؔ صاحب کی غزلیں دوسرے شاعروں کی غزلوں سے

میلوں آگے تھیں۔ بہر حال 'بزم سخنوران پنجاب' جلد ہی ختم ہوگئی۔

پھر جنگ چھڑ گئی۔ تاثیر صاحب سرینگر کالج کے پرنسپل ہو کر چلے گئے۔ فیضؔ لاہور میں ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی پڑھانے لگے۔ ہمارا خاندان عسرت میں گرفتار ہو کر گورداس پور منتقل ہوگیا۔ اور وہ محفل یاراں برہم ہوگئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک میں فیضؔ صاحب سے قریب قریب روزانہ ملتا رہا۔ فیضؔ صاحب کے لاہور جانے سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ۱۹۴۱ء کے بعد صرف مشاعروں یا ادبی محفلوں میں کبھی کبھار فیضؔ صاحب سے ملاقات نصیب ہوئی۔ ظاہر ہے ایسی ملاقاتوں میں دلی قربت کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔

میں ۱۹۴۳ء میں امریکہ سے واپس آتے ہوئے لندن ٹھہرا تو فیضؔ صاحب سے ایک بار پھر طویل ملاقات کا موقع ملا۔ میں فیضؔ صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوا اور نصف شب تک ان کی خدمت میں رہا۔ انہوں نے اپنی تازہ نظمیں سنائیں۔ باتوں باتوں میں میں نے فیضؔ صاحب سے کہا کہ پاکستان ان کا منتظر ہے۔ ان کی زبان صرف پاکستان ہی سمجھتا ہے اور صرف وہیں ان کو یار آشنا مل سکتے ہیں۔ فیضؔ صاحب کی آنکھوں میں یادِ یارانِ وطن سے نمی کی لکیر اُبھر آئی تھی۔ کہنے لگے...... 'میں بہت جلد پاکستان آرہا ہوں، دُنیا دیکھنی تھی سو دیکھ لی۔ اب اپنے وطن میں ہی رہوں گا۔'

میں نے کالج میں فیضؔ صاحب سے انگریزی پڑھی۔ اس اعتبار سے میں ان کا شاگرد بھی ہوں۔ لیکن وہ استاد سے زیادہ میرے دوست تھے۔ ایک ہمہ خلوص اور ہمہ مروت دوست، ان کی شخصیت بھی ان کی شاعری کی طرح شیریں، نرم اور دل آویز ہے۔ وہ فطرتاً کم گو ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان سے ملئے تو ان کی کم گوئی کے باوجود دل شگفتہ ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بہت باتیں کی ہوں۔ ویسے میں نے محرم دوستوں کی محفل میں فیضؔ صاحب کو چہکتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اب سے پچیس برس پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ امرتسر میں صوفی تبسم صاحب کے ہاں بہت سے دوست جمع تھے اور حسب دستور شعر و ادب کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک مقام پر صوفی

صاحب نے اپنے نہایت ہی معصومانہ انداز سے شکایت کی کہ ادب گروہ بندی کا شکار ہو رہا ہے۔ مولانا ماجور نجیب آبادی 'شاہکار' کی وساطت سے ایک خاص گروہ کو ادب پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ باقی لوگ بھی اس روش پر چل رہے ہیں۔ صوفی صاحب کی آواز میں ایسی رقت تھی کہ محفل پر اداسی چھانے لگی۔ فیضؔ صاحب جواب تک خاموش تھے، یکا یک بول اُٹھے...... "صوفی جی زمانہ بڑا نازک ہے۔ آپ بھی ایک آدھ آرگن ہاتھ میں لے لیجئے۔" ان کے اس فقرے سے محفل زعفران زار بن گئی۔ صوفی صاحب بھی بے ساختہ ہنس پڑے۔

میں نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ فیضؔ صاحب بڑے بامروت انسان ہیں۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جو کام وہ کر سکتے ہوں اس سے کبھی انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ بہت سے نوجوان شاعروں نے اپنے شعری مجموعوں کے دیباچے اور پیش لفظ فیضؔ صاحب سے لکھوالیے ہیں۔ فیضؔ صاحب اپنی طبعی مروت سے مجبور ان شاعروں کی ایسی تعریف کرتے ہیں اور ان کے کلام میں ایسے ایسے محاسن پیدا کرتے ہیں۔ جن کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ میں نے ایک مرتبہ فیضؔ صاحب سے اس بات کا ذکر کیا۔ پہلے تو ہنس کر بات ٹال گئے۔ میں نے بات دہرائی اور کہا کہ فیضؔ صاحب یہ بات آپ کے لیے مناسب نہیں۔ اس سے عام لوگ گمراہ ہوتے ہیں اور صاحب فہم لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ اس پر فیضؔ صاحب نے فرمایا۔ "بھئی نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بری بات نہیں۔ اگر میں غالبؔ، میرؔ اور اقبالؔ جیسے شاعروں کی پرکھ میں کوتاہی کروں تو آپ کو شکایت کا حق ہوگا۔"

جو چند واقعات فوری طور پر یاد آگئے وہ میں نے لکھ دیئے ہیں۔ دو چار دن یادوں کی ورق گردانی کروں تو اور بہت سی دلچسپ باتیں فراہم ہوسکتی ہیں، لیکن اس کی نہ مہلت ہے نہ توفیق۔ بہر حال حکم کی تعمیل ہوگئی غنیمت ہے۔

○○

ظ۔ انصاری

فیضؔ احمد فیضؔ: کچھ تذکرہ، کچھ تبصرہ

سنہ اکہتر (۱۹۷۱ء) کی بات ہے۔ فیضؔ ماسکو آنے والے تھے۔ ان سے پہلے تازہ مجموعہ کلام پہنچا ''سروادیٔ سینا'' میں تاک میں تھا کہ دیکھوں، اب کی بار وہ غالبؔ کی کون سی ترکیب اپناتے ہیں۔ 'نقشِ فریادی'، 'دستِ صبا'، 'دستِ تہہِ سنگ' کے بعد اب انہوں نے یہ نام چنا وہیں سے۔ (غالبؔ نے اپنے زنداں نامے کو 'جینہ' لکھا تھا) انتساب پر ایک ماسکوی خاتون کا نام دیکھ کر میں حیران ہوا (اور خود موصوفہ بھی) آگے اس پر دیباچہ تھا تین شعر کا، صرف تین شعر......

شاید کبھی افشا ہو نگاہوں پہ تمہاری
ہر سادہ ورق جس سخنِ کشتہ سے خوں ہے
شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سر افراز
جو آمدِ صرصر کی تمنا میں نگوں ہے
شاید کبھی اس دل کی کوئی رگ تمہیں چبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کے مانند زبوں ہے

کیا جادو تھا، ان چھ مصرعوں کا کہ میں نے آگے کے ورق کھولے بغیر کتاب رکھ دی اور ایک نظر میں یہ مصرعے آنکھوں کی راہ دل میں گڑ گئے۔ یاد رہ گئے۔ آج دس برس بعد، پھر کہیں دیکھے بغیر، جوں کے توں یاد ہیں۔ ان کی لذت، ان کی کسک، ان کی طلسمی کیفیت، ان کی دردمند مگر امید بھری فضا نہ گھٹتی ہے، نہ بڑھتی ہے، نہ ملگجی ہوتی ہے۔

ایسی کیا بات ہے اس دیباچے میں؟ میں جانوں فیضؔ کی منتخب شاعری کا منی ایچر موجود ہے یہاں۔ ورق ابھی بھرے نہیں گئے، سخن لہولہان رہا اور ورق پر اترنے سے پہلے جاں بحق ہوگیا۔ گیت محض خوشگوار آوازوں کی لہک نہ تھی، وہ ایک پرچم تھا۔ پرچم جسے آندھی کے جھونکے کھولتے، لہراتے، اڑاتے۔ اسی انتظار، اسی تمنا میں پرچم بندھا رہ گیا، سربلند نہ ہوسکا۔ دل راستے پر پڑا ہوا پتھر نہ تھا، مگر ٹھوکروں میں رہا۔ وہ نازک دل جس میں زندہ رگیں تھیں، کانٹوں کی طرح چبھنے، چونکانے والی۔ آج تک یوں ہوتا رہا۔ آگے؟ کیا ورق کو سادہ رہنے دینے والا، سخنِ کشتہ سے خوں چھوڑنے والا سخنور، گیت کے پرچم کو کھلے میدان میں بلند نہ کرسکنے والا مجاہد، نازک، نس بھرے رس بھرے دل کو کنکر پتھر کی طرح خوار وزبوں دیکھنے اور سہنے والا فنکار اس جان ہار بے بسی میں جی چھوڑ چکا؟ کیا ہر طرف درد ہی درد، خواری ہی خواری اور بے اعتباری طاری ہے؟ یوں ہی طاری رہے گی؟

فیضؔ کی دھیمی مگر مردانہ اور پر اسرار آواز کہیں دور سے سنائی دیتی ہے۔ شاید کبھی...... شاید کبھی...... شاید وہ وقت دور نہیں جب سادہ ورق، خونچکاں ورق گلرنگ ہوگا، گیت پرچم بن کر لہرائے گا اور دل اپنی رگیں چبھو کر اہلِ دل کو چونکا دے گا۔

اس 'شاید کبھی' کے سہارے ہمارے شاعر نے 'ارادے اور کوشش کے بغیر، اپنے درد کی تاثیر بڑھا دی، اسے ہمارے دل میں اتار دیا اور ہم اس شفاف شیشے میں سے خود اس کو، اس کے موڈ کو بھی پا گئے، کوئی اور ہوتا تو کہتا، دیکھنا یہ ورق سادہ نہیں، یہ گیت محض گیت نہیں۔ یہ دل پتھر کا روڑا نہیں، یہ دُنیا کو ہلا ڈالے گا اور یوں کردے گا، ووں کردے گا۔

فیضؔ کے الفاظ ہیں، پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی آواز ہے۔ نقار خانے میں بھی درویش کی صدا کی طرح سنائی دیتی ہے، پہچانی جاتی ہے۔ شاعر کا ایک تھما تھما لہجہ ہے۔ اس کا مزاج ہے۔ لفظوں اور آوازوں کی بندش ہے۔ اس میں سے آدمی جھانک کر دیکھے تو ورق، پرچم اور دل رات ڈھلے کے سناٹے میں لپٹے ہوئے، یکجا اور الگ الگ

نمایاں نظر آئیں۔ فیضؔ نے آنکھوں...... میں رات کاٹی ہوگی، آپ بیتی کے ورق ذہن کی رحل پر پھیلائے اور لپیٹے ہوں گے، دل کی رگیں چبھی ہوں گی اور جب ان مصرعوں کی پھانس سینے سے نکالی ہوگی تب وہ کیلنڈر کی اس تاریخ کا آخری سگرٹ سلگا کر بستر میں گئے ہوں گے۔

سب کہنے والے یوں شعر نہیں کہا کرتے کہ ان میں وقت، آواز، موڈ، رنگ، حرکت وسکون اور دھوئیں کے مرغولے میں سے شاعر کے تیکھے اور بجھے ہوئے خدوخال دکھائی دیں اور جو کوئی اس طرح کہہ لے، وہ کتنا ہی کم سخن کیوں نہ ہو، زبانوں پر چڑھ جاتا ہے، دلوں میں اتر جاتا ہے۔

فیضؔ کی شاعری میں تراشے ہوئے متحرک پیکر، تعمیری تصرف، اینٹ اینٹ چننے کا بے اختیار عمل اور اختتام تک آوازوں کا بہاؤ اور کیفیت کی وارفتگی تو ہے، اس کے علاوہ دھیماپن، تیکھاپن، گہراپن، خاص ہوتا ہے۔ کہیں بھی چار مصرے رکھ دو، پہچانے جائیں گے۔

آں کہ افشردی ونم گیری زمشتے بیش نیست

واں کہ خودخوں گرد دور یزد، گدازے بودہ است

(غالبؔ نے شعر کی آمد اور آورد پر کہا ہے کہ نچوڑ نچوڑ کر کچھ ٹپکالو تو یہ محض مشق سخن کا نتیجہ ہوا۔ مگر وہ جو خود خون ہو کر ٹپکے، وہ ہے گداز یعنی شعر کے نزول کی قدرتی کیفیت۔ ظ۔ا۔)

ممکن نہیں کہ فیضؔ کا کلام پڑھیں، سنیں، ان سے ملیں اور غالب یاد نہ آجائے۔ حافظ شیراز اور غالب ان کے دم کے ساتھ رہتے ہیں۔ اکثر تو سرہانے دھرے رہتے ہیں۔ تصویر یار کی طرح۔ اگر وہ خود ایک بار اس کا ثبوت نہ دے چکے ہوتے تو ان کی تراکیب اور ان کا آہنگ بتا دیتا۔ ایک بار کیا ہوا کہ......

مگر یہ قصہ اپنی باری سے سناؤں گا......

حافظ کی طرح فیضؔ بھی چھوٹا چھوٹا کہتے ہیں، بڑا بڑا نہیں کہتے۔ مثنوی لکھی

نہیں، بیانیہ ان کے ہاں ناپید ہے۔ کسی ایک کیفیت، ایک خیال، ایک لمحے کے تسلسل کو وہ طبیعت کی کڑھائی میں اتنا تپاتے، اتنا پکاتے ہیں کہ جل جلا کر چند مصرعوں میں رہ جاتا ہے۔ گنتی کے تنقیدی مضامین ('میزان' مجموعے والے، کہ کاش اس سے کئی گنا ہوتے اور تنقیدی بصیرت عام کرتے)۔ اڈی ٹوریل اور نوٹ، خطوط، جو انہوں نے نثر میں لکھے، وہ بھی عموماً مختصر ہی رہے۔ وہ خود ایک حالت، ایک پوز، ایک نشست میں دیر تک نہیں رہتے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ضبط واحتیاط کا ایسا زبردست مادہ پانے والا شاعر اتنی بے چین بوٹی ہے!

چند مناظر

'نقش فریادی' کی اشاعت کے دنوں سے فیضؔ ہمارے تخیل میں بس گئے تھے، لیکن ہم طے نہ کر پائے تھے کہ ن۔م۔ راشدؔ، میراجیؔ اور فیضؔ میں کون اپنے زمانے کا نقیب بننے والا ہے آگے چل کر۔

غلامانہ ذہن کی افتاد دیکھیے کہ ایک روز پاکستان کے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے دوران تقریر فیضؔ کی نظم (جو خونیں پیرہن آزادی پر کہی گئی تھی) کا ایک شعر پڑھا اور طنزاً کہا کہ بعض سرپھروں کو تو اب آزادی ہی نہیں دکھائی دیتی۔ اخباروں میں اس تقریر کا چھپنا تھا کہ گلی کوچے میں، گھر گھر شاعر کی اہمیت پہنچ گئی۔

دو سال بمشکل گزرے ہوں گے کہ ناگہاں ایک دن (۹ رمارچ ۱۹۵۱ء کو) جب بمبئی کے مستان تالاب میں جلسہ عام چل رہا تھا، یکایک ریڈیو نے خبر دی کے فیضؔ اور سجاد ظہیر ایک فوجی سازش کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے۔ یہ واقعہ 'راولپنڈی کانسپریسی کیس' کہلاتا ہے۔ یہیں مذمت کی تجویز پاس ہوئی اور جا بجا احتجاجی جلسے ہونے لگے۔

مختصر واقعہ یہ ہے کہ فیضؔ جو لیفٹننٹ کرنل رہ چکے تھے اور نکتہ چین پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر ہوتے ہوئے، کئی اہم فوجی افسروں سے بھی خلا ملا رکھتے تھے، پاکستان کی

بدانتظامی سے برداشتہ خاطر یہ سوچ رہے تھے کہ اگر یہاں فوج کے ترقی پسند عناصر اُٹھ کھڑے ہوں اور ملک کو ایک اعلا درجے کا عوامی جمہوری نظام دینے میں کامیاب ہوجائیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ (وہی جو بعد میں جمال عبد الناصر نے سوچا اور کیا) بات چیت ہوئی، حلقہ بڑھا۔ تدبیریں سوچی گئیں اور کم سخن، کم آمیز شاعر 'انقلابی عمل' کی رَو میں آگے تک نکل گیا۔

مگر جب خفیہ تدبیر آخری مرحلے پر پہنچنے والی تھی۔ گہری سیاسی سوجھ بوجھ اور تاریخی قوتوں کی پیکار اور صف بندی پر وسیع تر نظر رکھنے والے سرغنہ اور فیضؔ سے زیادہ کاہل اور آہستہ رو سجاد ظہیر نے بنیادی اختلاف کیا اور خفیہ بحثا بحثی کے بعد ادھ کچری سازش ناقابلِ عمل سمجھ کر دفن کر دی گئی۔

کسی بڑے عزم کے شعلے کو ہوا دینے کے بعد اگر ایک دم بھری بالٹی اس پر اوندھا دی جائے تو اکثر یہی نتیجہ نکلتا ہے اور نکلا کہ ایک دیندار بریگیڈیر نے فوراً توبہ کی اور کفارے کے طور پر سرکاری ذرائع کو خبر کر دی۔

دھڑادھڑ گرفتاریاں، جس پر بھی کمیونسٹ ہم خیال کا شبہ ہوجاتا، وہ سیدھا جیل خانے اور چارج شیٹ کے بعد مقدمہ چلا تو سرکار نے سازشیوں کے لیے سزائے موت مانگی۔

یہ پس منظر ہے اس قسم کے شعروں کا کہ......

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

......یا......

مقام، فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

یہ کہنا کہ 'مت دیکھو کس نے کہا، دیکھو کہ کیا کہا' بالکل برحق۔ لیکن بعض اقوال کہنے والے کی بایوگرافی کی بدولت معنوی اہمیت پاتے ہیں۔ یہ واقعہ تاریخی نہ ہوجاتا

اور چار برس سے اُوپر پھانسی کے سائے میں وہ جیل خانوں کی مسموم ہوا نہ کھاتے پھر تو اُن سے نہ اس وضع کے شعر ہوتے، نہ ان شعروں کی یہ معنویت، جو تمام جغرافیائی حدوں کو پھلانگ چکی ہے۔

پاکستان میں عام الیکشن ہوئے (۱۹۵۴ء)۔ یہ شہید سہروردی بانی عوامی لیگ نے، جو راولپنڈی سازش کیس کے ملزمین کی طرف سے وکیل صفائی رہے تھے، حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، قیدی بری کر دیئے گئے۔ مقدمہ واپس۔

فیضؔ صاحب کو گورنر پنجاب نواب گورمانی نے اپنے گھر چائے پر بلایا (مئی ۱۹۰۰ء) وہاں ان کی سالی حمیدہ سلطان (خواہر فخرالدین علی احمد مرحوم، صدر ہند رِپبلک) تشریف فرما تھیں۔ یہ فیضؔ کی دیرینہ قدر دانوں میں تھیں۔ جھٹ انہوں نے بیاض بڑھا دی اور کچھ دن پہلے کی ایک غزل شانِ نزول کے ساتھ لپیٹ کر مجھے دہلی بھیج دی۔ میں نے ہفتہ وار 'آئینہ' میں (جسے میں ایڈٹ کرتا تھا) بڑے طمطراق کے ساتھ چھاپ ڈالی:

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے
دِل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

پوری غزل دے کر نوٹ لکھا، جس کا مفہوم تھا کہ اب سے چھ صدی پہلے حافظ کے کلام کو یہ رتبہ نصیب ہوا تھا کہ ادھر کلام زبان سے کاغذ پر آیا۔ اُدھر دُور دُور کے دیار کو اس کی سوغات جانے لگی۔ اور آجکل فیضؔ کو 'یہ قبولِ خاطر و لطفِ سخن' ملتا جا رہا ہے۔ پھر چند الفاظ میں اس کلام کی مدح اور تفسیر تھی۔ یہ شمارہ نکلنا تھا کہ ایک سے ایک استادِ سخن اِلا اللہ کر کے مجھ غریب پر ٹوٹ پڑا۔ مرحوم حامد اللہ افسر میرٹھی (لکھنؤ یونیورسٹی) نے ایک شرانگیز مضمون لکھا کہ رسالے کو پروپیگنڈہ آرگن بنا ڈالا۔ اسی طرح کے اور شکایتی خط اور مراسلے آئے۔ (بعض چھپے بھی)

انہی دنوں آمد آمد ہوئی دہلی میں فیضؔ کی۔ ان سے پہلے سجاد ظہیر آچکے تھے۔ میں انہیں لے کے پنڈت جواہر لال کے گھر (تین مورتی) پر بھی گیا۔ (میں باہر بیٹھا رہا) وہاں انہوں نے 'کیس' کی تفصیلات پوچھیں۔ مشورہ دیا کہ اگر ہندوستانی شہریت واپس چاہو تو ہوم منسٹر گووند بلبھ پنت کو راضی کرنا ہوگا۔ سوچ لو۔ مشکل ہے! شہرہ تھا کہ دہلی کے چمیسفورڈ کلب والے مشاعرے میں فیضؔ پڑھیں گے۔ سڑک تک ہجوم۔ ایک آفت!

دوپہر کا وقت، اپریل مئی کی گرمی، میں حضرت جوش ملیح آبادی کے گنبد بردوش خس پوش دفتر میں حاضر تھا۔ یکایک وہ متوجہ ہوئے۔ "یہ بتایئے کہ وہ کیا خاص بات ہے جس پر آپ فیضؔ کے اتنے مدح سرا ہیں۔"

ان کے درباری طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب کے طالب ہوئے۔

میں نے تازہ نظم (دست صبا) 'زنداں کی ایک صبح' کے اول مصرعے سنائے۔ سنانا کیا تھا کہ آنکھوں اور ہاتھوں کی جنبش سے دکھا دیئے......

رات باقی تھی ابھی جب سر بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اُتر آئی ہے

جوشؔ سوچ میں پڑ گئے۔ عالی ظرف ہیں۔ گردن ہلائی۔ کہا، ہاں، کوئی بات ہے اس میں۔ اوّل تو اس طرح کی شاعری پہلے ہوئی نہیں تھی، یہ اضافہ ہے، دوسرے یہ کہ پوری تصویر بنتی چلی جارہی ہے۔ ہاں، صاحب ایک کیفیت ہے، فضا ہے اس کی وغیرہ۔

'زنداں کی ایک صبح' اور 'زنداں کی ایک شام' دونوں مشہور اور موثر نظمیں ہیں۔ جتنا بھی 'زندانی' ادب مختلف زبانوں میں میری نظر سے گزرا ہے، اس میں فیضؔ کا کلام انفرادی، بانکی شان رکھتا ہے۔ وہ شان جو اُداس نہیں کرتی، قوت اور حوصلہ بخشتی ہے۔ جس کی طرف خود شاعر نے اشارہ کیا ہے......

"جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے۔"

(نسخہ ہائے وفا، ص: ۲۵۹، مرتب زنداں نامہ، ص: ۶۹)

تو ایک دھج ہے ان کے زنداں نامے کی اور یہ اس میں کون کون سے حالات کے چار رنگ ملے ہوئے ہیں، یہ اسی کے دیباچے میں، الزام اور قید کے شریک میجر اسحاق نے بتا دیئے ہیں۔

وہ اگر نہ بتاتے، تب بھی فیضؔ کی 'زندانی' نظموں میں یہ دھارے مل جاتے ہیں۔ جیل کے اندر کی، باہر کی، ہمت کی، بے سمت اداسی کی، اور پھر اپنے محبوب شہر لاہور کے نزدیک جیل خانے کی یعنی وصل میں ہجر اور ہجر میں وصل کی ساری کیفیتیں سمٹ آئی ہیں۔ ہاں، ایک دھارا ہے جو سنگم کی سرسوتی ندی کی طرح صاف دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ہے اپنے بال بچوں سے عشق جتانے اور ان کی جدائی میں تڑپنے کا۔ کہیں انگلی رکھ کر بتایا نہیں جاسکتا کہ یہ رہی بیوی، یہ رہی بچی۔

غور کا مقام ہے کہ ایک شوقین اور حساس وجود کے لیے ذاتی غموں اور محرومیوں کو اس درجہ بے در و دیوار کرنے، یوں ارد گرد کے سارے درد، بے نام درد سمیٹ لینے کے لیے کیسا دل و دماغ ہونا چاہیے۔ کہنا آسان ہے، ہو نہیں پاتا۔

'نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن'، اے روشنیوں کے شہر، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، دریچہ، ہماری زبان کی امر جیت اور غیر معمولی نظمیں ہی نہیں، اُردو شاعری میں ایک گہری، بانکی اور حسن وفا کی بے پناہ دلدادہ شخصیت کا ظہور بھی ہیں۔

اندر اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ لوہے کے دروازے اور تالے بجتے ہیں، ہانک اس دیوار سے اس دیوار تک لگتی ہے۔ تالا، جنگلا، قیدی سب سلامت ہے صاحب۔ 'اندھیرے کی مہر لگتی ہے' تو کیا ہوتا ہے؟ سب کو خبر ہے کیا ہوتا ہے مگر یہاں۔

تو فیضؔ دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

اب تک شاعر نے زُلف کی سیاہی اور مانگ کی روشن لکیر دیکھی تھی، فیضؔ نے

قید خانے کی جھری میں سے باہر کا اجالا جاتے دیکھا تو خیال اپنی تنہائی اور تاریکی کا نہیں، باہر کی روشنی ملی تاریکی کا چھا گیا:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

شام ویسے ہوتی ہے، صبح ایسے ہوتی ہے، مگر کس کی مانگ؟ کس کے رخ پر؟ یادوں میں بسے ہوئے محبوب نے، شام وسحر کی آمد ورفت نے، عزیزوں، دوستوں نے، شہروں اور قریوں نے اور 'ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور' ہر ایک مانوس بستی اور مونس ہستی نے ایک ہی روپ دھار لیا۔ یہاں اکیلے فیض کا وطن نہیں رہ گیا، ہر ایک مانگ اور ہر ایک رُخ ورُخسار کا وطن ہوگیا۔ اس عاشقانہ لے کی تاثیر ایسی ہے کہ ہم فیضؔ کے وجود کو ہی بھول بیٹھتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

آج کی شب جب دیے جلائیں، اونچی رکھیں لَو

خیر سے فیضؔ دلّی آئے۔ بڑے مشاعروں کے علاوہ جگہ جگہ 'مشاعریاں' جمنے لگیں۔ ڈکشن ان کا دشوار تھا۔ کچھ پرانے لفظ، گھسے پٹے استعارے، وہی شام، شب، شبِ غم، ستارے، چاند، چمن، گلرنگ، انتظار، تنہائی، ہجر، فراق، وصال، دل، بیتاب، بیقرار، مانگ، زُلف، گیسو، لب، عارض، رخسار، آتش، دُھواں، شرار، چارہ گر، راہ، کارواں، راہگزار، قاتل، مقتل، دلربا، صبا، دارورسن، پیار، قفس، کنج، غزل، دورِ پیمانہ، جانانہ، خون، جنون۔ مگر لوگ اس شخص کو جگہ جگہ گھیرتے تھے۔ PTI کے لان میں صحافیوں نے گھیر لیا۔ کم آمیز، کم سخن فیضؔ گھوم گھوم کر قوالی سنانے لگے......

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا، ہم بھی دیکھیں گے

......تالیاں بجنے لگیں 'ہم بھی دیکھیں گے' لو صاحب، استعاروں نے، کنایوں نے،

اندھیرے میں پرانے کپڑے بدل ڈالے۔ اب جو دیکھیے تو بزم میں رزم کی سی جھنکار سنائی دینے لگی۔ کتنا اعتماد رہا ہوگا فیضؔ کو پرانی دھج کے نئے تیوروں پر، جو انہوں نے کہا۔ کیا کہا، نکتہ چینوں کو آہستہ سے جواب دیا۔

جان جائیں گے جاننے والے
فیضؔ فرہاد و جم کی بات کرو

۱۹۵۷ء کے ختم ہوتے ہوتے ماسکو کے مسلسل ابر آلود موسم سے کلیجہ منہ کو آنے لگا تو میں نے چھ مہینے بعد پھر ہندوستان کی راہ لی۔ کابل میں اتر پڑا۔ تانگہ، لاری، ٹرک، کرتا کراتا پشاور جا نکلا۔ سی آئی ڈی والوں نے ملنا جلنا مشکل کر دیا۔ رات کی گاڑی سے میں لاہور پہنچا کہ چند روز ٹھہر کر سب کی صورتیں تو دیکھ لوں۔ انتظار حسین نے ناصر کاظمی کی رفاقت سے ایک اچھی خاصی شام منا ڈالی۔ پروفیسر صفدر میر نے، کہ ہوٹل میں فروکش تھے، مجھے بھی وہیں اپنے پاس رکھ لیا۔ (بعد میں دونوں عزیزوں کی مصیبت آئی)۔ فیضؔ صاحب کے حکم سے آٹھ دس دن کا ویزا کھڑے کھڑے بن گیا۔ اب ان کے ساتھ چین سے بیٹھنے کی باری تھی۔

حمید اختر اور چند احباب پاکستان ٹائمز، امروز، لیل و نہار کے دفتر لے گئے۔ شام کے جھٹپٹے میں لے گئے تھے کہ احمد ندیم قاسمی، سبط حسن، ظہیر بابر بھی بیک وقت مل جائیں گے۔ فیضؔ صاحب نے کہا۔ ''بھئی ایسے نہیں، یہیں رہنا، پھر ہم ساتھ لے چلیں گے۔''

خیر، 'ترکیب و رکیب' کی گئی۔ پورا جھرمٹ تو آمد و رفت کے بڑے دروازے سے باہر نکلا۔ مجھ غریب الوطن کو لپیٹ کر دوسرے چور دروازے سے نکال لے گئے۔ دور نکل کر ہم فیضؔ صاحب کی گاڑی میں سوار ہوئے اور دور کے کسی بنگلے پر 'شام منانے' نکل گئے۔ وہیں رات ڈھلے تک 'یار باشی' رہی۔ کلام سنا (جو وہ خود سے کبھی نہیں سناتے)۔ باتیں سنیں، گھر کی شائستہ زندگی دیکھی، دونوں بچیاں دیکھیں۔ جی خوش ہوا کہ ایک مدت بعد انہیں یہ راحتیں میسر آئی ہوں گی جنہیں وہ

کبھی 'طبع شاعر کا وطن' کہا کرتے تھے۔

یہ بھی دیکھا کہ اُردو کے نئے ادیب، خصوصاً غیر پنجابی اہل قلم، دبی زبان میں فیض سے اپنی برہمی کا اظہار کرنے لگے تھے کہ وہ ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر اور گرم بازو دانشور ہو کر بھی 'اوپر والوں' میں ہی اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ نوجوانوں کو ان سے نہ سہارا ملتا ہے، نہ صحبت، نہ رہنمائی۔ لیکن فیض تو شروع سے ہی 'اوپر والوں' میں پلے اور بڑھے۔ وہ کس دن سڑکوں پر خاک پھانکتے پھرے تھے! عادتیں اور صحبتیں باہم دیگر جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ نظریات کی تبدیلی مشکل سے ہی آدمی کا حلیہ بگاڑتی (یا اسے Declass کرتی) ہے۔ سجاد ظہیر کو نہیں دیکھا کہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری ہو کر بھی فیروز الدین منصور یا فضل الٰہی قربان نہ بن سکے اور پھانسی کے سائے سے نکل کر آئے تو یہاں سب سے اوپر کے آدمی (نہرو) نے انہیں بھارت سیوک سماج کی آل انڈیا کونسل کا ممبر نامزد کر دیا۔

فیض صاحب فیض احمد خاں سابق لفٹنٹ کرنل بھی ہیں۔ جنرل ایوب خاں، سابق صدر پاکستان ایک وقت میں ان کے ہم پیشہ اور ہم رتبہ رہ چکے ہیں اور جب یہ کرنل صاحب لندن میں اپنے کسی پچھلے ملاقاتی انگریز سے ملنے جاتے ہیں تو وہی کرنل والا وزیٹنگ کارڈ پہنچتا ہے۔

۱۹۵۸ء کی سرد رات تھی۔ برف کے گالے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ تاشقند میں افرو ایشین ادیبوں کی دوسری کانفرنس سے ہمارا وفد آ پہنچا تھا۔ ماسکو میں ہمارے ہاں ہند پاکستان کے مہمان شعرا کی دعوت تھی۔ چودہ پندرہ مہمان اور اتنی ہی رنگ برنگی بوتلیں۔ سجاد ظہیر کا 'پگھلا نیلم' (جسے بیدی بغیر مسکرائے، نیلا پگھلم" کہتے تھے چپکے سے) شائع ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا۔ وہ اپنی بیاض سے نظمیں سنانے لگے تھے غلام ربانی تاباں کو۔ اہل دہلی کی قدر دانی سے (گمان اور یقین کے درمیان) یہ خیال ہو چلا تھا کہ فیض کے بعد وہی غزل کے سرتاج رہ گئے ہیں۔ حفیظ جالندھری تاشقند میں دھوم مچا کر، سونگ پبلسٹی کے دنوں کی مشق دکھا کر، من موہک شاعر کی حیثیت سے آئے تھے۔ پھر

راجندر سنگھ بیدی تھے جو ملک راج آنند کے برخلاف محض اپنی خاکساری کی بدولت نظروں میں چڑھ گئے تھے۔ وہاں کانفرنس میں ایک ایسا بدنما واقعہ ہو چکا تھا کہ سوویت ادیبوں کی انتظامیہ انہیں ہٹانے اور بیدی کو اس کرسی پر بٹھانے کی فکر میں تھی۔ فیضؔ اپنی دوٹوک، مختصر اور کارگر اینٹی امپریلسٹ تقریر اور تجویز کی بنا پر سبھی کے پسندیدہ شاعر اور شخص مان لیے گئے تھے۔

میزیں لگیں، ہم سب اُردو ہندی کے مقام اہلِ قلم سمیت بیٹھے۔ جام ٹکرائے، بحث چھڑی۔ غالب نے کہا ہے......

لشکرِ ہوشم بہ زور مے نہ شکستی
غمزہ ساقی نخست راہِ نظر زد

تو میرے ہوش وحواس کا لشکر آدھا تو پہلے ہی شکست کھا کے غائب ہو چکا تھا کہ ایسی ایسی قیمتی جانیں دل ونظر کے اس قدر نزدیک ہیں۔ حفیظ صاحب نے جو لہک کے سنایا (اس رات تو انہوں نے الحاج حفیظ ہونے کی لاج یوں رکھی کہ جام اٹھایا تک نہیں) میں حفیظ کے پاس بیٹھا تھا۔ فیضؔ مزے میں آگئے اور اپنی پرانی پرانی نظمیں سنانے لگے۔ خدا جانے یہ کیوں کر ہوا کہ ادھر وہ شعر پڑھیں اُدھر میں اپنی کم ظرفی کا مظاہرہ کروں بلند آواز سے......

کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

میں چیخا، 'برفاب' خوب کہا۔ برفاب تو پہلے ہی سے پگھلا ہوا تھا، گرم ہاتھوں نے کیا کیا، اور جسم کہ ہاتھوں میں آنے تک وہ برف تو کیا برفاب تھا، واہ!

انہوں نے پڑھا......

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید

ہانک لگی: 'سبیل' کہنا تھا 'کشید' کہہ گئے، اور پھر سبیل تو ہے وہ جو مفت ہو، مفت کے شربت یا پانی کو سبیل کہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ کشید کے وقت...... وغیرہ وغیرہ۔

انہوں نے پڑھا......

کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

اونچی آواز میں وہیں تابڑتوڑ اعتراض

'چراغ سرِ راہ' کہتے تو 'کچھ' کی ضرورت نہ پڑتی اور چراغِ سرِ راہ کو تو صبا آتے ہی بجھا دیتی ہے۔ وہ اس بجھنے کے لیے چشم براہ ہوتا ہے کیا؟ 'نگارِ صبا' گل یا چمن کے لیے ہوتا، چراغ سے تو اس کو عناد ہے۔

فیضؔ رُک جائیں، پھر ہم لوگوں کے اصرار پر آگے سنائیں، نہ منہ بنائیں، نہ روٹھیں، نہ ڈانٹیں۔ نجانے انہوں نے نوٹ کیا یا نہیں کہ حفیظ برابر مجھے ٹہو کے دیے جا رہے تھے کہ ہاں بیٹا، شاباش، ہاں، ذرا پھر کہنا۔ لے بھئی سن لے فیضؔ، یہ ظ انصاری کیا کہہ رہا ہے۔

یوں، وہ قاتل رات جب 'جام کے لب سے تہِ جام' پہنچنے والی تھی، اہلِ محفل میں چار سلامت بچے، تاباں، فیضؔ، حفیظ اور یہ گنہگار۔ باقی وہیں ڈھیر تھے۔ صبح کاذب کا دھندلکا بڑھا تو ہم نے شانے ہلا ہلا کر سب کو اٹھایا۔ ڈرائیوروں کو جگایا جو ہم سے بھی زیادہ دھت تھے۔ کہیں دور ایک خاتون (ریڈیو ماسکو کی ملازم)، سیم لتا رہتی تھیں۔ سوچا کہ ان کے دروازے پر اچانک دستک دیں گے اور ستار پر بھیرویں سنیں گے۔ وہ غریب ہڑبڑا کر اٹھی اور اسی پوشاک میں جو زُلفیں جھٹک کر بھیرویں کا راگ چھیڑا ہے تو بنے بھائی سرنگوں، تاباں غائب غلہ، فیضؔ دم بخود، گم شد، حفیظ رقص پر آمادہ، بیدی نے چھکوں پھکوں رونا شروع کیا۔ آنسوؤں کا سیلاب آ گیا۔ میرا نشہ اتر چکا تھا اور اب فیضؔ سے نظر چرانے کی کوشش میں آنکھیں مُوندے بیٹھا رہا۔

فیضؔ نے آج تک موقع ہی نہیں دیا کہ اور کچھ نہیں تو بطور میزبان اس رات کی معذرت طلب کرلوں، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلوں۔ البتہ حفیظ جالندھری نے دن پیئے

ہی اس رات کا نشہ لوٹا۔ اس ستمگر رات کو اعلان ہوا تھا کہ پاکستان میں مارشل لا نافذ ہوگیا اور جنرل ایوب خاں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ میں نے دیکھا کہ پاکستان سے آئے ہوئے دونوں مہمانوں نے دو متضاد طریقوں سے اس خبر کا اثر قبول کیا۔ فیضؔ تو عاشقوں اور بادشاہوں کے قبیلے سے ہیں، ایک سگرٹ آدھی چھوڑی، دوسری سلگالی، تناؤ خارج کر دیا۔ البتہ حفیظ خوش ہوئے۔

دو تین دن بعد سب کی واپسی بدی تھی۔ فیضؔ کو ان کے روسی میزبانوں نے بہتیرا سمجھایا کہ یہیں رہ جایئے، ابھی خطرہ ہے، پاکستان نہ جایئے۔ وہ چپ، آخر زبان کھولی۔ نہیں، اب جو بھی ہے۔ گھر نہیں تو جیل جا کر اتریں گے۔ ایسے وقت میں تو واپسی اور بھی لازم ہوگئی۔ جنہوں نے فیضؔ کو کسی فیصلہ کن حالات میں بولتے سنا ہوگا، وہ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ دو چار جملے انہوں نے کیسے ادا کیے ہوں گے، جیسے کوئی کھڑکی میں سے باہر کا موسم دیکھ کر یہ طے کرتا ہو کہ آج کون سا لباس مناسب رہے گا۔ افوہ رے فولادی رگ پٹھے اس سیالکوٹی کے۔

گئے تو پکڑے گئے۔ پانچ مہینے بعد چھوٹے۔ نکلتے ہی زور شور سے لکھنا اور ذمہ داریاں قبول کرنا شروع کر دیا۔ شاعری آڑ میں ہوگئی۔

۱۹۶۱ء میں مشورے ہو رہے تھے کہ اس بار فیضؔ کا نام لینن انعام کے لیے رکھا جائے۔ فیصلہ اگرچہ سوویت رائٹرز یونین کرتی ہے، لیکن اشارہ اوپر کا ہوتا ہے اور جس سرزمین کا آدمی ہو وہاں کے اوپر والے سے بھی کہہ سن لیتے ہیں۔ (سجاد ظہیر کا نام بھی در پیش تھا ۱۹۷۱ء میں لیکن یہاں والے نے ڈور کاٹ دی، جس نے کاٹی، بعد میں اسی نے یہ انعام پایا۔)

میں ہندوستان سے پھر روس واپس آ گیا تھا۔ کہا گیا کہ مضمون لکھو۔ پس منظر تیار کرو۔ چناں چہ فیضؔ کی زندگی اور کارناموں پر جتنا کچھ مال مسالہ ہاتھ لگا، جمع کر کے دیا۔ ایک ہلکا سا مضمون اور پھر دوسرا لکھا۔ جو وہیں ۵۰، ۶۰ لاکھ چھپنے والے رسالے 'اگنیوک' اور 'لترا تو رنیا گزیتا' (ادبی اخبار) میں چھپا۔ یہاں اس کا عنوان

تھا:...... شامِ انتظار کا تنہا شاعر۔

عنوان کے ان چار لفظوں میں کوشش کی تھی، فیضؔ کی شخصیت اور شاعری کو سمو لینے کی۔ فیضؔ آئے، انعام ملا، ہنگامہ رہا، بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اہل و عیال سمیت یوروپ کے طویل دورے کے پروگرام بنے۔ لمبی لمبی خریداریاں ہوئیں۔ لاکھوں کی رقم ہے، جی بھر کے اڑائی جائے۔

ایک دن وہ اور بنے بھائی ماسکو ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ میں نے ولیؔ اور سراجؔ کی لسانی اہمیت کا ذکر کیا۔ سنتے رہے۔ بنے بھائی کچھ روٹھے ہوئے تھے۔ اسی عالم میں بولے: کیوں فیضؔ، یہ آدمی بولتا ہے یا لکھتا ہے، اس کے لکھنے میں بھی جو...... (تعریف کے جملے تھے)۔

میں نے غالب کی ایک نازک اور ترچھی فارسی غزل کا (کہ مشہور بھی نہیں) حسبِ حال مقطع پڑھا......

کام نہ بخشیدہ، گنہ چہ شماری
غالبِ مسکیں بالتفات نیرزد

فیضؔ لہک اُٹھے۔ کہنے لگے، پوری غزل سنایئے، پوری یاد نہ تھی۔ اُنہوں نے اوپر کے دو ایک شعر (غالبًا) اٹک اٹک کر پڑھے۔ پھر بولے، جایئے جناب، میرے سرہانے سے کتاب اٹھا لایئے۔ اندر جا کر دیکھا تو واقعی دیوانِ حافظ اور دیوانِ غالب پہلو بہ پہلو سرہانے دھرے تھے۔ مزا آگیا۔ میں بھی تو کہوں کہ فیضؔ کے دم قدم کے ساتھ یہ دونوں اس قدر رہتے ہیں کہ صاف اُن کے سانس کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ فیضؔ کی آوازوں میں اور ان کے اندازِ فکر میں۔ یہ کیا بات۔

غالبؔ نے طیش میں آکر ایک خط لکھ دیا تھا میرے دیوان کو ذرا تو لو تو فلاں فلاں کے ساتھ حجم میں میرا کلام بھی حافظ سے کئی گنا ہے۔ (حافظ کی اصل پانچ سو غزلیں ہی ملی ہیں اب تک)

اُن دنوں (۶۳-۱۹۶۲ء) فیضؔ کو فکر تھی کہ بحروں کے موجودہ نظام سے جان

چھڑائی جائے۔ یہ بھی ایک بے جا نظر بندی ہے۔ باہر کے شاعروں اور ان کے تجربوں، آوازوں اور آہنگوں سے انھوں نے اثر لینا شروع کر دیا تھا۔ تبھی کاغذ کے پرزوں پر موٹی سی پنسل سے انھوں نے آدھی پونی نظمیں لکھیں اور اپنی ان نومولود نظموں کو دکھا سنا لیتے تھے۔

رنگ ہے دل کا مرے......

....

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت کوئی شئے
ایک جگہ پر ٹھہرے
پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگذر، راہگذر، شیشہ مے، شیشہ مے

مفہوم سے بالکل سہل، بناوٹ میں ذرا اجنبی اور دقت طلب نظم ہے، مگر اس جانب اگلا قدم، جدھر اُن جیسے موثر شاعر کو، آزادہ رو فنکار کو، اور کچھ نہیں تو اپنی زبان کی خاطر۔ بہت پہلے جانا چاہیے تھا۔

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے......

....

جس گھڑی ماتمی سنسان سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل، میرے دلدار مرے پاس رہو
یا وہ نظم 'منظر'
رہگذر، سایۂ شجر، منزل و در، حلقۂ بام

....

دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
تم نے کہا ''آہستہ''
چاند نے جھک کے کہا
......'اور ذرا آہستہ'

یہ چار پانچ نظمیں مکمل صورت میں اس قابل ہیں کہ بار بار پڑھ کر نئے شاعروں کا حوصلہ بڑھے اور نئی اُردو شاعری کا بیاؤ کھلے، جو کام ترقی پسند (باغیانہ) شاعروں کے ذمہ پچاس برس کے قرض کے بطور بقایا ہے۔ (ان میں سے کئی ایک مثلاً سردار جعفری نے قدم اٹھایا بھی تھا مگر فیضؔ اور دوسرے معاصرین کی پابند شاعری کی مقبولیت دیکھ کر ریجھ گئے اور رہ گئے۔)

یہاں جب شاعری کے تعلق سے وضعداری کا ذکر آ ہی گیا تو ڈگر سے ذرا ہٹ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم جانیں، یہ وضعداری مشق کے پختہ ہونے تک ضروری یا مناسب ہے بھی، آگے چل کر اس کمبل سے جان چھڑانے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیے۔ حافظ کو تو ہم کہہ نہیں سکتے، خسرو، غالب اور اقبال نے ضرور کی۔ فیضؔ کے مزاج اور انداز میں اس کا رچاؤ دیکھنا ہو تو اس کی انتہا بھی ملے گی اور اس سے کسی قدر انحراف بھی، جب وہ چار چار اضافتیں نتھی کر دیتے ہیں۔

کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے؟

اور اپنی تراشیدہ ترکیبیں بے ضرورت بٹھا دیتے ہیں۔ جیسے جلالِ فرقِ سرِ دار (حالاں کہ فرق اور سر ایک ہی ہے)

فیضؔ نے گیت بھی لکھے ہیں، سینریو بھی، مکالمے بھی، اڈی ٹوریل بھی، زبان کے سارے امکانات ان پر روشن ہیں۔ (عربی، فارسی، انگریزی اور ہاں پنجابی شاعری پر بھی ان کی نظر قابل رشک ہے) وہ ہیں اس پوزیشن میں اُردو شاعری کی آواز آہنگ اور ترنم کے اعتبار سے بھی کھلے۔ اب تک پوری طرح کھلی نہیں ہے۔

۱۹۷۱ء میں ہندوستان پاکستان کی کشمکش، بنگلہ دیش میں اور پھر اس کے بعد

دونوں ملکوں میں خوں ریزی۔ فیضؔ ان دنوں پاکستان میں ہی رہے۔ بنگلہ دیش کے واقعے اور اس کے ہولناک نتائج سے انہوں نے ایک آدھ نظم میں وارننگ بھی دی مگر زیادہ تر خاموشی۔ اب وہ محض شاعر نہ تھے، ممتاز سماجی شخصیت بھی تھے۔ ایرانی طلبہ پر فائرنگ اور افریقہ کی شورش نے ان جیسی نظمیں کہلوائی تھیں ویسی بھی ان دنوں برآمد نہ ہوئیں، لیکن وقت آیا جب وہ تلملا گئے۔

سوویت یونین (ان کے وطن ثانی اور قدرداں سوویت یونین) نے جب حکومت ہند کے عملی اقدام اور فوجی سرگرمی کو بے تحاشا مدد دینی شروع کی اور ظاہر ہونے لگا کہ کشمیر سے کراچی تک کوئی مقام بمباری اور تباہ کاری سے محفوظ نہیں رہنے والا' تب فیضؔ نے دو نظمیں مذمت و ملامت کے لہجے میں کہیں اور وہ ہاتھوں ہاتھ اشتراکی دُنیا میں گونج گئیں۔

ایک روز اکادمی آف سائنسز (سوویت یونین) کے سکریٹری شین بابا جان غفوروف (مرحوم) اپنے دفتر میں پریشان بیٹھے تھے۔ مجھے بلا بھیجا۔ انہوں نے خاموشی سے ان نظموں کا روسی ترجمہ میرے سامنے کر دیا اور کہا دیکھنا یہ اصل کے مطابق ہے یا نہیں۔ میں نے عرض کیا، دیکھ چکا ہوں، مطابق تو ہیں۔ مگر ترجمے میں وہ درد، وہ کراہ نہیں آسکی جو اصل اُردو میں ہے۔ بے اختیار فرمایا:

بیچارہ فیض

ذرا دیر تو میں خاموش رہا، پھر نہ رہا گیا، عرض کیا۔ اگر میں لاہور کا باشندہ اور اس کا عاشق ہوتا اور مجھ پر ایسی بپتا پڑتی تو میں اتنے ضبط سے کام نہ لے سکتا۔ فیضؔ کے ہاں تو ضبط اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ واقعی اگر ایک نہیں، دس لینن پرائز بھی فیضؔ کو ایسے وقت خاموش رکھنے میں کامیاب ہوجاتے تو ہم ان کے خلوص سے ہی جو ان کے کلام میں چھلکا پڑتا ہے...... ہمیشہ کے لیے انکار کر دیتے۔ شاعر، کتنا ہی بادلوں میں اڑتا پھرے، زمین کے انگار سے اس کے پروں کو جلنا اور اسے حسب مقدور چیخنا ہی چاہیے۔ فیضؔ تو پھر بھی کم چیخے۔ وہ چیخ پکار اور للکار کے آدمی ہیں ہی نہیں۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ سال بھر بعد اکتوبر ۷۲ء میں وسط ایشیا اور مشرقی ایشیا کی تاریخ و تہذیب کی عالمی کانفرنس ہونا طے پائی۔ مقام عشق آباد (ترکمانیہ) جو کبھی خراسان کا حصہ تھا، ہندوستان اور پاکستان سے وفد کی طلبی ہوئی۔ میں مامور ہوا کہ ایک دن کے لیے دُرگا پرشاد دھر کو، جو کسی سفارتی مشن پر ماسکو آئے ہوئے تھے، عشق آباد چلنے کے لیے راضی کروں۔ ملا۔ وہ اوپر والوں سے تین چار گھنٹے رازدارانہ گفتگو کر کے تھکے تھکائے اپنے کمرے پر لوٹے تھے اور اتنی بھی جان نہ تھی کہ کھانے کی میز پر بیٹھ جائیں۔ کچھ متفکر تھے، کچھ مضطرب۔ کہنے لگے، آج ہی بغداد چلا جاؤں گا۔ وہاں دو چار دن ٹھہر کر دہلی۔

نہ جانے کیسے، میرا ماتھ ٹھنکا کہ یہ بغداد بھی اسی غرض سے جارہے ہیں جس غرض سے ۷/اگست ۱۹۷۱ء کو اچانک ماسکو آئے تھے اور 'انڈو سوویت دوستی و ہمکاری معاہدہ طے کر کے دہلی واپس ہوئے تھے۔ عراق کو اپنے ہمسایوں (خصوصاً ایران) سے جو 'خطرات' لاحق ہوئے ہیں۔ یہ ان کا توڑ، اپنے اسی معاہدے کی کاپی لیے ہوئے بغداد جائیں گے۔ انہیں اب کسی اور 'غیر تاریخی' مصروفیت پر آمادہ کرنا ممکن نہیں۔ (بعد میں اخباروں سے اس قیاس کی تصدیق ہوگئی۔)

خیر، ہم لوگ عشق آباد کی کانفرنس میں پہنچے۔ پہلے ہی دن بنے بھائی نے فیضؔ کو ٹٹولا، کیا خیال ہے فیضؔ، ہمارا (ہندوستانی) سفیر کل سے آیا ہوا ہے، تمہارے ملک کا سفیر بھی کل تک آنے والا ہے، کیوں نہ ہم دونوں کو ملا کر ایک طرح کی گفت و شنید کی مصالحانہ فضا کا اہتمام کریں۔ پہلی بار میں نے فیضؔ کو بھڑکتے دیکھا۔ فی الوقت وہ دونوں عمر بھر کے دوست نہیں۔ 'فاتح' اور 'مفتوح' قوم کے دو ڈیلی گیٹ تھے۔

'آپ جانیں، آپ کا کام۔ ہم کون ہیں جو مصالحت کے لیے آپ کے اپنے سفیروں کو گفت و شنید پر بٹھائیں۔ یہ کام دونوں حکومتیں خود کریں۔— کر ہی لیں گی۔ ہم تو دوسرے کام سے آئے ہیں۔"

بنے بھائی پی گئے اور کئی دن رنجیدہ رہے۔ یہاں گیارہ شب و روز کا ساتھ تھا۔ پاکستان سے حیدر آباد والے مشہور ریاضی داں پروفیسر رضی الدین احمد (وائس چانسلر) اور دانی صاحب (کشمیری) بھی آئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بیزار۔ جب جام تجویز ہوتے، برادرانِ پاک و ہند کے نام لیے جاتے۔ رضی الدین احمد صاحب 'برادرانِ یوسف' کی پھبتی کستے، اور بے تعلق رہتے۔ کبھی یہاں تک کہہ جاتے۔

بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

فیضؔ صاحب کا اُدھر کے بجائے اِدھر والوں سے پرانا 'درد کا رشتہ' تھا۔ ہم میں ہی ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا۔ مقامی اہلِ قلم الگ اپنے گھروں پر دعوت کرتے اور سبحان اللہ الحمد للہ چلتا۔

ترکمان بڑی جنگی قوم ہے۔ انقلاب اکتوبر (۱۹۱۷ء) کے بعد کی خانہ جنگی یہاں چار پانچ برس جا رہی۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی ترکمان جوانوں نے روسیوں سے بڑھ کر بہادری کے اعزاز حاصل کیے (گنتی کے تناسب میں سوویت یونین کو سب قوموں سے زیادہ) اب تک ترکمان بیرم خاں (اکبر کے اتالیق) کو اپنا پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھتے ہیں اس لیے ہم لوگوں کی زیادہ مدارات ہو رہی تھی۔ ایک ہوشربا خاتون نے مجھ سے مشورہ چاہا کہ اگر آج میں فیضؔ کی راحت کا سامان کردوں تو کیسا رہے گا۔ میں نے کہا: جزاک اللہ۔

وہ جزاک اللہ لے کر فیضؔ صاحب کے پاس گئیں اور چپکے سے بتا آئیں کہ رات کو کہیں باہر نہ جانا۔

ہم ان معاملات میں جنم دن سے بدھو۔ شام ہوتے گئے اور فیضؔ صاحب پر اخلاقی دباؤ ڈال کر انہیں ہوٹل کے ایک بڑے کمرے میں (انعام الرحمٰن آف کلچرل ریلشنز کے یہاں) لے آئے۔ بنے بھائی بھی آ گئے۔ لیجیے، بیٹھک جمی۔ فیضؔ پہلو بدل رہے ہیں، کہتے کچھ نہیں۔ ہم بھی معاملے کا وہ پہلو بھول بھال گئے۔ غرض آدھی رات کے بعد کہیں رخصت ہوئے۔ صبح ۵ بجے ہم سب کو جہاز پکڑنا تھا۔ (سلطان سنجر اور

الپ ارسلان کے قلعوں کے کھنڈر دیکھنے 'مرو' جا رہے تھے۔) کار پر بیٹھے تو دیکھا کہ فیضؔ صاحب پہلے سے کمر سکے موجود۔

پوچھا: آپ اتنے سحر خیز تو نہیں ہیں، پھر یہ کیا؟

دھیمی آواز میں بولے: سوئے نہیں ہم۔ رات وہ آئے، انتظار کر کے چلے گئے۔ یہ کیا آپ نے۔

ویسے وہ ہیں سحر خیز اور جتنے کاہل نظر آتے ہیں اتنے ہی مستعد اور جتنے تن آسان دکھائی دیتے ہیں اتنے ہی دشوار پسند، اور جتنے بے پروا نظر آتے ہیں، فرض شناسی میں اتنے ہی چوکنے — مگر دیکھیے، رات آنکھوں میں کاٹ دی 'خیالِ خاطرِ احباب' کی وضعداری میں۔

وہاں سے پلٹ کے، دو تین دن کے پھیر سے، ہم لوگ ماسکو آئے۔ میں تبھی، کچھ دن پہلے مغربی یوروپ کے لمبے سفر سے لوٹا تھا۔ تازہ کتابیں ابھی میز پر بکھری پڑی تھیں۔ فیضؔ کو کھانے پر بلایا تھا۔ آئے، کتابیں الٹی پلٹیں۔ میں نے new left پر، جدید ترین تنقیدی مباحث پر دو چار کتابیں آگے بڑھائیں کہ یہ دیکھیے، آجکل یہ......

'ہاں، ہاں اس مصنف کی دو اور کتابیں بھی نکل چکی ہیں' اور واقعی انہوں نے کم سے کم لفظوں میں ہر ایک تازہ اشاعت کے بارے میں اتنا بتا دیا کہ میں انگشت بدنداں رہ گیا۔

پتہ چلا کہ فیضؔ سیاسی، علمی، ادبی مباحث سے بے خبر اور بے نیاز نہیں جیتے۔ مطالعے کے لیے، ہزار جھمیلوں کے بیچ سے، کوئی نہ کوئی سکون کا وقت نکال ہی لیتے ہیں۔

یہ معنی بھی ہیں آج کے زمانے میں 'باہمہ' اور 'بے ہمہ' زندگی کرنے کے! اور تو اور کہیں سفر میں سراج (اورنگ آبادی) کے دو چار شعر میں نے بر سبیل تذکرہ سنائے تو فیضؔ نے اس کی دوسری نا معروف غزلوں کی طرف توجہ دلائی، ردیف۔ ''کن کے اُن کے' وغیرہ۔ بعد میں ان کا کلام اول تا آخر دیکھا تو کئی غزلیں سراج کی پسندیدہ بحر میں

نکل آئیں۔ یعنی ایک ہاتھ قدیم پر ہے، دوسرا جدید پر، نظر حالات پر، سانس لو، کے جھونکے پر، اور تخیل برسات کی رِم جھم میں گم۔

فیضؔ خود جتنے بھرپور ہیں، اتنی شاعری دی کہاں ہم کو۔ جتنی کچھ کاغذ پر آئی وہ 'سخنِ کشتہ' کی آدھی ادھوری سے بھی کم ہوگی۔

ذوالفقار علی بھٹو سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ وہ ان کا احترام بھی کرتا تھا، پہچانتا بھی تھا۔ خبر اڑی کہ فیضؔ پاکستان کے سفیر بن کر روس آرہے ہیں۔ خبر میں اتنی صداقت تھی کہ پیش کش آئی مگر فیضؔ۔ وطن کی جن گلیوں پر نثار ہونے کو بیتاب رہے تھے، انھیں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہیں کیا خبر ہوگی کہ دستِ قضا میں ایک تیر اور تیار ہے۔ فیضؔ کو گھر چھوڑ کر برسوں ادھر اُدھر پھرنا پڑے گا۔

بھٹو کی گرفتاری، قید و بند کی گرم بازاری کے دنوں میں 'جنتا پارٹی' کے وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی سرکاری دورے پر پاکستان گئے تو فیضؔ کو مشاعرے کی دعوت دے ڈالی۔ مطلب یہ کہ آفت سے نکال لائے۔ بہاری اٹل کو پنجابی اٹل ملا۔ دونوں شاد ہوگئے۔ اٹل بہاری نے آجکل شاعری تو بند کر رکھی۔ شاعرنوازی سے اپنے ذوق کی تسکین کر لیتے ہیں۔ مدھیہ پردیش ان کا خاص گڑھ، چنانچہ گوالیار اور بھوپال سے فیضؔ کو دعوت دی گئی۔ میں نے سیکڑوں سے سنا ہے اور خود فیضؔ نے تصدیق کی کہ بادشاہوں کا ویسا استقبال نہ ہوا ہوگا جیسا ان کا ہوا، گوالیار اور بھوپال میں۔ پوری حکومت آگے پیچھے خدمت میں لگی ہوئی تھی اور جب حکومت کسی کو نوازنے پر آمادہ ہو تو اہلِ ذوق، بچارے ایک طرف۔ بد ذوق بڑھ چڑھ کر جاں نثاری اور خدمت گزاری دکھاتے ہیں۔

ہندوستان کی حکومت بدلی، اور اب جو آئے، اُن میں کوئی فیضؔ کا ممدوح، کوئی عاشق، کوئی ان کا غمگسار، کوئی دلنواز، کوئی شاگرد اور کوئی شاگرد پیشہ۔ اپنے پرائے سب نے پرے باندھ لیے ان کے سامنے۔

دوسرا ہوتو اس قدر دانی کے سیلاب میں زمین پر پاؤں نہ پڑے، فیضؔ ویسے کے ویسے اُداس، بے نیاز اور اپنے حال میں مگن، روس اور ہندوستان کے 'افرو ایشیائی' ٹھیکہ داروں اور غمگساروں نے طے کیا کہ جب تک پاکستان کا موسم گرم ہے، انہیں کسی ٹھنڈے مقام پر روکا جائے۔ ہلینسکی، قاہرہ، ماسکو، دہلی، بالآخر بیروت، کہ مقام دلربا، دانشوروں کا مرکز فلسطینی مجاہدوں کی آماجگاہ۔ فیضؔ کی نظر ان تینوں پہلوؤں پر گئی ہوگی کیوں کہ ان کا ووٹ بیروت کے حق میں گیا۔

lotus رسالے کی اڈیٹری اُنہیں بطور 'پروانہ راہداری' سونپی گئی۔ فیضؔ نے قبول کی اور اس کام کو آگے بڑھانے میں لگ گئے۔ لاہور سے نکلنے والے اُردو رسالے 'احتساب' کا ایک حصہ لوٹس' رسالے کے منتخب مضامین کے لیے مخصوص ہوگیا۔

۱۹۷۹ء میں، کچھ مہینے میں ماسکو رہا۔ یوروپ کے سب سے عالی شان ہوٹل 'Rossia' میں ٹھاٹ سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ملنے گیا۔ دیکھا کہ ایک آتا ہے، ایک جاتا ہے۔ پوچھا کہ کونسی شام خالی ہوگی۔ راضی ہوگئے۔ عرض کیا کہ مرزا اشفاق بیگ کو بلالیں گے اور ہم آپ ہوں گے۔ اپنے ہاتھ کا بنا ہوا پلاؤ کھلاؤں گا اور خود آکر لے جاؤں گا۔ یہ کامریڈ مرزا راول پنڈی سازش والے مقدمے کے مفرور، دُنیا بھر کی خاک چھانے ہوئے، کمیونزم کے مردِ مومن، میرے کسی زمانے کے رفیق دل و جاں ہیں اور اب 'پاکستانی' ہوگئے ہیں۔ وہ دن آیا، سہ پہر ہوئی۔ گوشت لانے ایک دوکان پر گیا۔ دوسری پر، جابجا پھرا۔ کہیں چار آدمی کے پلاؤ کے قابل گوشت نہ ملا۔ آخر ارضِ ماسکو کے افق پرستاروں کو سلام کر کے بھوکا اور خستہ اپنے گوشے میں آپڑا۔ چونکہ ایسا تجربہ پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا اور میں خیالات کے اسپوتنک سے اتر آیا تھا۔ اس لیے بدمزگی اور تلخی غضب کی تھی۔ اسی پیچ وتاب میں فیضؔ صاحب سے ملنے بھی نہ گیا اور جب رات ہوگئی تو دل کو سمجھا لیا کہ اب تو وہ کہیں کھانے پر جا چکے ہوں گے یا اپنے ہاں مجلس جما چکے ہوں گے۔

مگر وہ ایک وضعدار شخص، مرزا لینے آئے، نہ گئے۔ بلاوے آئے نہ گئے۔ غالبًا اپنا وہ شعر دہراتے رہے جو ضرب المثل بن چکا ہے۔

نجانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

دوسرے دن، جب میرا غصہ فرو ہوا، میں پہنچا تو پتہ چلا کہ رات کچھ کھایا ہی نہیں۔کمال یہ کہ غصہ بھی پی گئے۔ بولے: کل جب تنہا رہ گیا، ایک نظم ہوئی، ابھی پوری نہیں کی۔سن لیجئے۔ (حسرت رہ گئی کہ کبھی 'تم' سے خطاب کرتے) سنی۔حسبِ معمول اعتراض وارد کیا کہ صاحب، یہ کیا آپ نے تو 'مِنار' کو 'مینار' لکھا، پھر اسے مونث باندھ دیا۔ بولے ہم تو مونث کہتے ہیں پنجاب میں (مجھے کہاں یوپی اور پنجاب کا ہوش تھا، میں تو ندامت سے ڈوبا جا رہا تھا، ترنے کو یہی ایک بہانہ ملا) خیر، تھوڑی دیر بعد مان گئے۔نظم تمام ہوئی تھی میر دردؔ کے اس شعر پر......

ترے کوچے ہر بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

(نوٹ:- یہاں ظ۔انصاری صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ یہ شعر غلام ہمدانی مصحفی کا ہے اور یوں ہے...... ''ترے کوچے میں اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا/ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا''، بحوالہ ''کلیات مصحفی، جلد سوئم، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص: ۶۴ (مرتب)

نظم کیا تھی۔ بس ان چند مہینوں کی کوچہ گردی کا (جس کی حقیقت جانے بغیر افتادہ لوگ رشک کرتے ہوں گے) دکھڑا تھا۔ اس درد کی کسک تھی کہ فیضؔ جیسا اپنے وطن کا، لوگوں کا شیدا، ہر ایک درد کا شریک، صاحب نظر، ملکوں اور قوموں کے تاریخی نشیب و فراز کا جانکار، جو مشکل کے وقت کسی بڑے کاز میں کام آتا، اب اپنا مشکل کا وقت یوں گزارتا پھر رہا ہے۔'کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے......' میں کیسے بتاؤں کہ یہ 'اس' اور 'اُس' کون ہیں۔ یہ نئے قسم کی افسر شاہی کے ہرکارے اور کارندے ہیں جنہوں نے 'پرولتاریہ' کا 'کولتاریہ' سڑک پر بچھوا رکھا ہے۔ہا! اور جو کوئی ذرا ڈگر سے ہٹے وہ منافق، مرتد، بے دین۔

میں تو تین چار صفحے کا ہلکا پھلکا مضمون یادداشتوں کی چھلنی سے چھاننے چلا تھا، مگر اب میرے ذہن پر سوار ہیں اور مجھے اڑائے لیے جا رہے ہیں۔

نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ محبت سے یا طلسم کے اثر میں جو فیضؔ کے نام سے وابستہ ہے، جگہ جگہ انہیں بلاوے دے رہے ہیں۔ اہلِ سر و سرکار، اربابِ زر و اقتدار بھی اپنی سرپرستانہ شان دکھا رہے ہیں بچارے۔ فیضؔ کی پذیرائی کے سلسلے میں ذوق اور بد ذوقی، زر اور بے زری، ٹریژری بنچز (اقتدار والی پارٹی) اور اپوزیشن (مخالف پارٹی) کا امتیاز اٹھ گیا ہے۔ کوئی دو سال پہلے وہ دو بار بمبئی آئے۔ استقبالیے ہوئے۔ 'بیساکھی دا میلہ' کے اوسر پر دستار باندھی گئی اور ایک استقبالیہ تقریر میں یہ جملے بھی کہے گئے کہ وہ اُردو ادب میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے عاشقانہ، غنائیہ شاعری کی لے میں سیاسی اور سماجی خیالات کی تلخی کو گوارا بنایا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے گزشتہ استعاروں سے آئندہ کے اشاروں کا کام لیا۔ انہیں جیتے جی یہ مرتبہ نصیب ہوا 'کوئے یار' اور 'فرازِ دار' کو یکجا کر کے نصیب ہوا کہ ان کے ہم عصر شعرا انہی کے انداز اور لہجے کو اپنانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے لگے۔ غالباً فیضؔ کو بھی اس کا احساس رہا ہوگا تبھی تو انہوں نے کہا......

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

(کچھ اس سے ملتی جلتی بات فقیر صاحب تحریر نے کہی تھی) اسی مجمع میں معین احسن جذبی اور مجروح سلطان پوری بھی موجود تھے۔ (جاں نثار اختر دُنیا سے سدھار چکے تھے) دونوں کو کھٹکی۔ مجروح کہاں رکنے والے، برہم ہو گئے۔

اصل بات یہ ہے کہ غنائی شعر بلکہ غزل میں سیاسی و سماجی مسائل فیضؔ کی ولادت سے پہلے ہی شامل ہو چکے تھے۔ اقبال نے تو ان کے لیے ایک زبان بھی ڈھال دی۔ البتہ خاص معاملے میں اقبال سہیل، جمیل مظہری، جذبی اور مجروح صاف

صاف پیش رو رہے ہیں فیضؔ کے۔ 'نقش فریادی' میں 'کتے' اور 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' جیسی دو ایک نظموں کے باوجود، فیضؔ کی شاعری سیاسی اقدام کی شاعری نہیں رہی، انسانی آلام کی شاعری رہی ہے۔ جب فیضؔ کا 'دستِ صبا' نکلا (۵۴-۱۹۵۳ء) تب تک جذبی کو جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے تھے اور مجروح اپنی شاعری کا بہترین حصہ دے چکے تھے۔ اس کلام میں جتنا کچھ سیاسی اور سماجی مسائل کا اشاراتی (اور شعوری) بیان تھا، وہ زبانوں پر چڑھ چکا تھا۔ اپنے، بیگانے سبھی اُن کو اپنی اپنی مصلحت سے استعمال کرتے اور اپنے معانی دے رہے تھے، لیکن فیضؔ کے ہاں شعور کی جو رو ہے وہ کسی ایک سطح پر اور ایک سطح تک محدود نہ رہی، اور نہ بیان کا محض ایک رنگ اور صرف ایک آہنگ۔ اس میں دردِ نہاں کے ساتھ ایک ہمک بھی شروع سے تھی۔ وہ جب چاہتے، اپنے سازوں کی ترتیب اور دُھنیں بدل لیتے۔ یہی کیا۔ آج تک کر رہے ہیں۔ یہی ان کی تازگی کا، تازہ دم رہنے کا، اور اس معنی میں اوّلین ہونے کا راز ہے۔ ''دار و رسن' فیضؔ اور مجروح کے ہاں متحد المعانی ترکیب ہے۔ چلیے اسی سے کام لیتے ہیں۔ مثال:

مجروح کا شعر ہے اور بے پناہ شعر ہے.......

فرازِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

......امر ہوگیا، اور اسی کے ساتھ 'فرازِ دار' کی ترکیب والے دوسرے کئی شعر بھی۔

بے شک، اس میں کوئی لفظ، بلکہ کوئی حرف اور کوئی استعارہ (یا سمبل) بے سبب نہیں ہے، تہ کے نیچے 'شبِ ظلم' اور 'فرازِ دار' کی معنویت چل رہی ہے۔

فیضؔ کے ہاں 'دار' کئی موقعوں پر آیا، اس میں معمولی شعر بھی ہیں، غیر معمولی بھی۔ معمولی سا شعر ہوگا......

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند، کیا کرتے

معنی شخصی سطح پر بھی ہیں۔ پھانسی کی سزا تجویز ہوتی ہے۔ قیدِ تنہائی کی اذیت ملتی

ہے۔ تنہائی ختم، سزا منسوخ، شعر صاف، شخصی پس منظر نے صرف اسے سر بلند کیا بلکہ ایک عالم سطح تک بلند کر دیا۔ دوسری جگہ......

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

'دار' والا شعر چوتھے مصرعے سے مل کر آگے کے خیال کی تیاری بھی ہے اور اس کی توسیع بھی۔ زمانے نے دیکھا کہ 'تاریک راہوں' والے مصرعے نے قبول عام پایا اور اس کی بدولت پوری نظم ارتقائے خیال کے ساتھ لاکھوں آدمیوں کے ذہن نشین ہوگئی۔

پھر دیکھیے، اسی تعلق سے متحد المعانی دو شعر ہیں......

مجروحؔ کا شعر......

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

فیضؔ قطعاً یہی بات، مگر اسی بے تکلفی سے کہتے ہیں گویا شعر نہیں کہا بلکہ منہ سے نکل گیا۔

مقام فیضؔ، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اب شاید وہ نکتہ صاف ہو جائے جس پر میں توجہ چاہتا تھا۔

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے' عتاب جرمِ سخن سے پہلے
جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی، نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

پھر دوسرے سیاق و سباق میں......

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

پھر ایک اور زاویے سے......

سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

یہ اور اس کے علاوہ 'دار' یا 'دار و رسن' فیضؔ کے ہاں رنگ و لباس اس تاثیر بدل بدل کر آتے ہیں اور اکثر وہ کسی نہ کسی تاریخی ٹریجڈی کی جانب تلمیح کا، ترتیب خیال کا ایک اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے فیضؔ کا کوئی تنہا شعر 'دار' کے لفظ و معنی کو مجروح والے شعر سے آگے نہ لے جاسکا ہو، لیکن وہ مل کر، فیضؔ کی بایوگرافی کے پس منظر میں معنی کی توسیع ضرور کرتا ہے اور اس میں رنگ بھرتا ہے اور اس کو سیال بناتا ہے۔

ایک اور چھوٹی سی مثال، جو بالکل سامنے کی ہے۔ تقریباً ایک ہی وقت کی غزلیں ہیں اور ان میں یہ دو شعر نازل ہوئے ہیں۔ استعاروں، علامتوں میں متحد المعانی ہونے کے علاوہ ایک سی پر کیف فضا رکھتے ہیں......

مجروح......

جھونکے جو لگ رہے ہیں نسیمِ بہار کے
جنبش میں ہے قفس بھی اسیر چمن کے ساتھ

فیضؔ......

اہلِ قفس کی صبح چمن میں کھلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں

ان دونوں اشعار میں کہ غزل کے فرادہ شعر ہیں، دو الگ طبیعتوں نے دو مختلف آہنگ پیدا کر لیے ہیں اور ہمارے اشارے بغیر بھی اس فرق کو، اوپر کے تبصرے کی روشنی میں، محسوس کیا جاسکتا ہے۔

فیضؔ پچھلے دنوں بمبئی آئے۔ بڑی دھوم رہی۔ مدح سرائی میں ایک پر ایک سبقت لیے جاتا تھا۔ کرسی نشین بھی، حاشیہ نشین بھی۔ خاک نشینوں کو فیضؔ خود کبھی یاد نہیں کرتے۔ (شاعری میں کرتے ہیں) بہت ہی نزدیک کے لوگوں میں وہ ہمعصر بھی تھے، جن کی زبان پر فیضؔ کا نام 'خوش قسمت' کے لقب کے سوا نہیں آتا۔ (ہمیں خود بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔)

فیضؔ بڑا خوش نصیب ہے، تقسیم ہند نے اس کے طوطی کو شاخِ طوبیٰ پر بٹھا دیا۔

ورنہ میاں......

فیضؔ کو خوشحال پنجابیوں سے بھی داد ملتی ہے اور قوم پرست حلقوں سے بھی

ورنہ میاں......

فیضؔ ایسے وقت جیل گئے اور اتنے بڑے واقعے کے ضمن میں گئے کہ ان کی شخصی اہمیت......

فیضؔ پر 'افکار' (کراچی) کا نمبر تو نکل چکا ہے، مگر...... خیر، چلو ایک اور سہی!

مگر بڑے میاں جو ستر ۷۰ برس کے ہونے آئے، اپنی مدح اور دوسروں کی قدح میں کبھی ایک جملہ منہ سے نہیں نکالتے۔ چپ چاپ سنا کرتے ہیں اور سگریٹ کے مرغولوں میں سبکی ہاں اور نہیں اڑا دیتے ہیں۔ یہاں جوش کے 'شاعرِ انقلاب' ہونے پر انہوں نے ایک مختصر سا تنقیدی نوٹ لکھ دیا تھا۔ جوش نے جواب نہیں دیا۔ ہر طرف سے ان کی 'زبان تراشی' پر زبان درازیاں ہوتی رہیں۔ وہ نہیں بولے۔ وہاں لاہور میں احمد ندیم قاسمی اور قاسمی کے ہم خیالوں سے ذرا ٹھن گئی تھی۔ فیضؔ نے اس میں بھی عالی ظرفی سے کام لیا۔ انہی کی طرح ان کی شاعری بھی چھوٹی موٹی عداوتوں اور عنادوں کو، ہیچ پوچ سمجھتی ہے، زندگی کی ہر ایک مسرت اور لذت کو، عاشقانہ لَے کے ساتھ، بصیرت میں تبدیل کر لینے کا جذبہ جگاتی ہے۔ ہمارے احساس موسیقی کو اس سے نئے نئے آہنگ ملتے ہیں، گویا ہم کسی کلاسیکی کنسرٹ میں بیٹھے ہیں اور کنڈکٹر کے سر اور ہاتھوں کی جنبش کے سوا کچھ نہیں دیکھ رہے۔ مگر بن دیکھے جانتے ہیں کہ اس موسیقی کا ہر ایک سُر کنڈکٹر

کے بدن کی کسی نہ کسی رگ سے جڑا ہوا ہے۔

واقعی فیضؔ کی شاعری کا انتخاب خصوصاً 'رقیب سے' جیسے شہپارے اس قابل ہیں کہ ہماری اگلی نسل کی اخلاقی اور جمالیاتی حس کی تربیت میں کام آئیں۔ اس کلام میں حُسن اور حزن ایسے یکجان ہوئے ہیں کہ نوجوانی کے گرم خون کو دردمندی اور شرکتِ غم کی اکسیر گھول کر پلا سکتے ہیں۔ فیضؔ نے کچھ دکھاوے کے لیے اپنے رقیب سے نہیں کہا تھا۔

هم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے، کیا پایا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

لفظ سے اگر معنی کی توسیع اور انسانی برتاؤ کی تطہیر ہوتی ہو تو ایک آدھ لفظ کا' حرکت وسکون کا' ترکیب واضافت کا داغدار ہوجانا اس کے آگے کیا شے ہے؟

○○

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

زرد پتّوں کے بن میں کاسنی درد کا شاعر

فیضؔ ہماری قومی شاعری کے راستے میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چناچہ سنگ میل ہی کی طرح وہ اہم بھی ہیں اور مجبور بھی۔ مجبور یوں کہ راستہ آگے نکل جاتا ہے۔

میں فیضؔ کی شاعری سے بہت متاثر ہوں۔ خود میرے اُسلوب پر جگہ جگہ فیضؔ کے لہجہ اور اُسلوب کا عکس پڑ رہا ہے لیکن میں جنہیں زیادہ چاہتا ہوں انہیں بار بار پڑھتا ہوں، اور ہر بار انہیں نئے سرے سے دریافت کرتا ہوں اور ایسی ہر دریافت ایک نئے تجربہ کی طرح مجھے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ دولت مند بنا دیتی ہے۔ یہ یافت و بازیافت بڑی حد تک مجھے اپنے آپ کو بار بار دریافت کرنے میں بھی مدد دیتی ہے اور میرے فن کی عمر بڑھاتی ہے اور یوں فیضؔ کی شاعری میری زندگی کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

فیضؔ کو بھی میں نے بار بار پڑھا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی شاعری میں سب سے زیادہ قابلِ قدر چیز اُن کا اُسلوب ہے۔ ریگ مال کیا ہوا، جس میں کوئی ایسا کونا نہیں جو قاری کو چبھے۔ ایک مہربان دوست سا اُسلوب جو گلے میں باہیں ڈال کے بات کرتا ہے۔

تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم

گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفاف بلور
یک بہ یک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے

(مرے ہمدم مرے دوست)

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ ست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

(صبح آزادی)

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اُسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتّے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہوگئے ہیں!

(ملاقات)

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیم صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے
گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہہ تابناک کرتے ہیں

کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی سے بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

(دریچہ)

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

ہر صبحِ گلستاں ہے ترا روئے بہاراں
ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے
ہر بھیگی ہوئی رات تری یاد کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج تیرے ہونٹوں کی فضا ہے

(دستِ تہہ سنگ آمدہ)

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہم اشک لیے نشترِ الماس لیے
بین کرتی ہوئی ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے

(پاس رہو)

طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

(دستِ تہِ سنگ)

اُن کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

(آج بازار میں پابہ جولاں چلو)

پکارتا رہا بے آسرا یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت، نہ وقت ہے نہ دماغ
نہ مدعی، نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

(لہو کا سراغ)

چاند نکلے کسی جانب تری رعنائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا

میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا

اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل، آخری لمحہ تری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اُس سے بھی گزرنا چاہا

(ہارٹ اٹیک)

آؤ کریں محفل پہ زرِ زخم نمایاں
چرچا ہے بہت بے سروسامانیٔ دل کا
دیکھ آئیں چلو کوچۂ جاناں کا خرابہ
شاید کوئی ہمدم ملے ویرانیٔ دل کا

(شامِ شہریاراں)

یہ بجتا کھنکتا اور ہفت رنگی اُسلوب کسی محرومی، ویرانیٔ دل ہی کا اُسلوب ہوسکتا ہے لیکن ''نقشِ فریادی'' اور ''دستِ صبا'' سے ''شامِ شہریاراں'' تک کے لمبے اور جان لیوا سفر کا اس اُسلوب پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ نہ لفظوں کا آہنگ بدلا، نہ اداس ترکیبوں کی ہفت رنگی — دُنیا بدل گئی، فیضؔ جوان سے بوڑھے ہوگئے، پر اُسلوب وہی رہا۔ بنیادی الفاظ کے ذخیرہ میں نہ کوئی اضافہ ہوا نہ کوئی کمی۔ فنونِ لطیفہ میں اُسلوب تو فنکار کی شخصیت کی نمائندگی کرتا ہے، تو کیا ''دست صبا'' سے ''شامِ شہریاراں'' تک فیضؔ کی شخصیت میں کوئی ارتقاء ہی نہیں ہوا؟

میں اپنے آپ کو اس پیچیدہ سوال کا جواب دینے کے لائق نہیں سمجھتا، لیکن صاحبانِ نظر اور ناقدینِ ادب کو اس سوال پر غور کرنا چاہیے۔

''دستِ صبا'' کے بعد حالانکہ فیضؔ نے نیا لکھنا چھوڑ دیا، پر پرانے شعروں کی طرح اُن کے نئے شعروں کا مزہ باقی رہا۔ اُسلوب کی تازگی میں فرق نہیں آیا۔ لہجہ کی خوشبو باسی نہیں ہوئی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ شخصیت ارتقاء پذیر رہے اور اُسلوب میں کوئی ارتقاء نہ ہو؟ اور اگر اُسلوب شخصیت کا اظہار ہے تو کیا اس کا مطلب یہ تو

نہیں کہ فیضؔ کی شخصیت کا ارتقاء ''دستِ صبا'' کے بعد بالکل ہی رک گیا؟ اور اگر یہ درست ہے تو ان کی شاعری کے جادو کا راز کیا ہے؟ کیونکہ فیضؔ کی شاعری میں جادو تو ہے۔ پھولوں کی طرح کھلتا مہکتا جادو۔ دل کی طرح دھڑکتا جادو... ہر بار تازہ اور نیا لگنے والا جادو۔

فیضؔ کو جب پڑھیے، لگتا ہے کوئی پرانا دوست مل گیا ہے اور جب دو پرانے دوست ملتے ہیں تو کوئی نہ کوئی ایسی بات یاد آ ہی جاتی ہے جو اس پہلے کی ملاقاتوں میں یاد نہیں آئی تھی اور اس نئی یاد سے نئے چراغ جل اٹھتے ہیں۔ مگر بنیادی لفظ ''یاد'' ہے ''تخلیق'' نہیں۔ فیضؔ کی شاعری یادوں کی اور اُن یادوں کے تخلیقی استعمال کی شاعری ہے اور یادیں ہندوستانی ہیں۔

''پنڈی کانسپریسی کیس'' بھی دار و زنداں کے اسی سلسلے کی ایک کڑی بن جاتا ہے جو ملکۂ وکٹوریہ کے اعلان نامہ سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد بھی فیضؔ کی شاعری میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی کیونکہ وہ انہیں علامتوں کو استعمال کرتے رہے جو غلام ہندوستان میں اُردو کے ترقی پسند شعراء کے کام آ رہی تھیں۔

ہندوستان میں ۱۵ر اگست ۴۷ء کو وہ ساری علامتیں بے معنی ہو گئیں کیونکہ اُس دن ہم ''داغ داغ اجالے'' کے عہد میں داخل ہوئے تھے۔ چنانچہ ہندوستانی شعرا کو اپنا آہنگ، اپنی علامتوں کا ذخیرہ اجنبی لگنے لگا اور وہ نئے آہنگ، نئی علامتوں کی تلاش میں لگ گئے۔ اس لیے تفہیم و ترسیل کے راستوں میں رُکاوٹیں پیدا ہونے لگیں اور قاری سے وہ پرانا رشتہ ٹوٹ گیا۔ نیا رشتہ پوری طرح آج بھی نہیں بنا ہے کیونکہ ابھی تک اس نئے عہد کا آہنگ اور اس نئے عہد کی علامتیں پوری طرح ہماری گرفت میں نہیں ہیں۔

لیکن پاکستان کے بنتے بنتے ''پنڈی کانسپریسی کیس'' شروع ہو گیا اور اس کیس نے پاکستانی شاعری کے بنیادی آہنگ اور علامتوں کا مسئلہ حل کر دیا۔

چنانچہ ہمیں ہمارے اپنے شاعر تو اجنبی اجنبی سے لگتے ہیں، پر جب پاکستان کے فیض احمد فیض کا کوئی ورق ہاتھ آجاتا ہے تو ہمیں لگتا ہے کہ یہ تو ہم میں سے ایک ہیں۔ تفہیم فیض بھی کوئی مسئلہ نہیں کیونکہ وہ لہجہ، وہ آہنگ، علامتوں کا وہ ذخیرہ تو ہمارے تہذیبی ذخیرہ ہی کا ایک حصہ ہے۔ سودا، غالب، مصحفی، آتش اور فیض۔ فیض کے لب ولہجہ میں یہ چاروں مزے بھی ہیں اور فیض کا پانچواں مزا بھی۔ مجھے فیض پر کہیں کہیں مجاز کی پڑتی ہوئی پرچھائیں بھی نظر آتی ہے مگر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

لیکن جو چیز فیض کو اپنے ہم عصروں سے بالکل الگ کرتی ہے وہ انیس سے ان کی مکمل آزادی ہے۔ انیس کے اثر سے مخدوم محی الدین تک پوری طرح آزاد نہیں۔ لیکن فیض پر نہ اقبال کا اثر ہے نہ انیس کا۔ فیض کی مقبولیت کا ایک راز شاید انیس اور اقبال سے اس مکمل آزادی میں بھی ہے۔

ترقی پسند شعرا غالب، انیس اور اقبال کو اوڑھنے بچھونے کی طرح استعمال کر رہے تھے۔ غالب کو تو فیض نے بھی اپنایا پر غالب میں سودا اور مصحفی کی چٹکی پڑنے سے جو آہنگ بنا وہ ترقی پسند آہنگ سے ایک ذرا مختلف تھا۔ اس کا رنگ شوخ ہے۔ اس کی خوشبو نئی ہے اور موسیقی کا مزاج مختلف ہے۔ چنانچہ فیض تنہا نظر آئے اور ترقی پسند شعرا میں سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔

ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

یہ جو ''کج کلہی'' ہے یہ تو تمام ترقی پسند شعرا کی پہچان ہے مگر یہ جو ''گل دامنی'' ہے یہ فیض کی اپنی ہے۔ اس ''گل دامنی'' کا تعلق نہ منصور سے ہے نہ قیس سے۔ چنانچہ یہ ''گل دامنی'' منصور اور قیس کے استعاروں کا مطلب بھی یا تو بدل دیتی ہے یا مطلب میں توسیع کرتی ہے۔ چنانچہ جب فیض یہ کہتے ہیں:

یاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

تو ہمیں لگتا ہے کہ ہم جانی پہچانی دُنیا میں ہیں، لیکن کیا مقتل بالکل وہی ہے جو جلیاں والا باغ میں تھا۔ یہ مقتل اب بہت بڑا ہوگیا ہے۔ اس مقتل میں نواکھالی، کلکتہ، چھپرا، دلّی، لاہور، سیال کوٹ، پنڈی کے وہ بازار بھی شامل ہوگئے ہیں جن میں عام آدمی کا قتل عام ہوا۔ یہ مقتل پاکستان کی قانون ساز اسمبلی تک پھیل چکا تھا۔ مگر ہے یہ وہی پرانا مقتل اور اس پرانے مقتل میں تنِ تنہا کھڑے ہوئے فیضؔ جب یہ کہتے ہیں کہ......

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن، کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

تو یہ نظم ہمارے تجربات میں توسیع نہ کرنے کے باوجود ہمارے دل کی بات لگتی ہے کیونکہ ہم اس منزل سے گزر چکے ہیں۔ یہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۲ء تک کا تجربہ ہے— پھر وہی یاد!

لیکن فیضؔ نے اپنے لہجہ کی بنیادی اداسی میں بھی اپنی رجائیت کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہ رجائیت، مستقبل پر اٹل بھروسا، اشتراکی تحریک اور ترقی پسند سلیقہ کی دین ہے۔

صبا کی مست خرامی تہہ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

اس رجائیت نے فیضؔ میں ایک انکساری بھی پیدا کی جو دوسرے ترقی پسند شعراء میں بالکل نہیں ہے۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رُسوا سرِ بازار

دوسرے تمام ترقی پسند شعراء نے یہی بات کہی ہے مگر بلند آہنگی سے کہی ہے۔ اپنے کو سب سے الگ کر کے کہی ہے۔ فیضؔ نے یہ بات آہستہ سے کہی ہے اور اپنے آپ کو سب میں شامل کر کے کہی ہے اور یہ جو اپنے آپ کو سب میں شامل کرنے کی ہمت ہے یہی فیضؔ کو دوسرے تمام ترقی پسند شعراء سے زیادہ اہم بنادیتی ہے۔ فیضؔ یہ نہیں کہتے کہ......

ہر عاشق ہے سرِدار یہاں، ہر معشوقہ سلطانہ ہے

وہ یہ کہتے ہیں کہ...... اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری — لگتا ہے یہ بات کہتے ہوئے شاعر یا شہید شرمایا جارہا ہے، قاری کی طرف دیکھے بنا جلدی سے یہ بات کہہ ڈالنا چاہتا ہے کہ اس کے لیے جو گزری وہ بات اہم نہیں۔ جس کے لیے گزری یہ بات اہم ہے۔ پسِ زنداں کی تنہائی یا بازار کی رسوائی اہم نہیں۔ اہم ہے صبا کی مست خرامی، اہم ہے بہار کا موسم۔ اہم ہے فروغِ گلشن۔ اہم ہے صوتِ ہزار کا موسم اور اہم تر ہے یہ یقیں کہ......

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے

نعرہ سے ہٹنے کی اسی ادا نے فیضؔ کے لہجہ کے پاؤں میں گھنگھرو باندھ دیئے ہیں۔ جہاں نعروں کی ضرورت ہے فیضؔ وہاں بھی نعرہ نہیں لگاتے۔ فیضؔ نے نعرہ کو غزل بنادیا۔

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہیں
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے

اے ارضِ عجم اے ارضِ عجم
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیئے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی کس ہاتھ لگی

(ایرانی طلبا کے نام)

فیضؔ کی شاعری میں سیاست مہذب ہوگئی ہے......

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شب تنہائی کا

یہ ''شب تنہائی'' گھر میں نہیں ''زنداں میں آئی ہے'' کیونکہ ''فرشِ نومیدئ دیدار'' میں یہ بات صاف ہوجاتی ہے......

دیکھنے کی تو کسے تاب ہے لیکن، اب تک
جب بھی اُس راہ سے گزرے تو کسی دکھ کی کسک
ٹوکتی ہے کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی
اور اُس صحن میں ہر سو یونہی، پہلے کی طرح
فرشِ نومیدئ دیدار بچھا ہے اب بھی...

شعری تہذیب اور لہجہ کے تغزل کی ان منزلوں سے گزرنے کے بعد ہی کوئی یہ بات یوں کہہ سکتا ہے کہ......

شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رختِ دل باندھ لو، دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

یہیں ''دستِ تہہ سنگ'' کا ایک قطعہ بھی پڑھتے چلیں......

ان دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا! قسمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورتِ بربادیٔ یاراں کیا ہے

تاریخ یاد نہیں لیکن حیدرآباد کے اُردو گھر کے مشاعرہ کے لیے فیضؔ نے یہ قطعہ اپنے پیام کے طور پر بھیجا تھا۔ یعنی ''شہرِ نگاراں'' ہندوستان ہوگیا۔ اسی لیے اس قطعہ کی نرمی فیضؔ کے لہجہ کی بنیادی نرمی سے ایک ذرا مختلف ہے۔ اس قطعہ میں قرۃالعین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' سمایا ہوا ہے۔ یہیں تو شاعر، قصہ گو سے جیت جاتا ہے کہ اسے تجربہ کی تخلیص کا فن آتا ہے۔

نہ مدعی، نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

(لہو کا سراغ)

میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا

(ہارٹ اٹیک)

یہ زندگی کی للک، یہ پیار... مگر ذرا اس شاعر کی سمت دیکھیے کتنے غور سے دیکھ رہا ہے سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھلنے کا منظر اور رخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا ہنگامہ، اور وہ اتنا گم ہوگیا ہے اس منظر میں کہ اسے یہ بھی خیال نہیں آتا کہ یہ اسی کے قافلۂ شوق کی رخصت کی تیاری ہے۔ فیضؔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں مر رہا ہوں،

وہ یہ کہیں گے کہ زندگی جارہی ہے۔ رویہ کی یہ رجائیت بڑی قابلِ قدر چیز ہے۔ لہجہ کی یہ **متغزل** رجائیت بھی خاص فیضؔ کی دین ہے اور مصحفی سے فیضؔ تک آتے آتے یہ رجائیت صرف سنوری نہیں ہے نئی بھی ہوگئی ہے۔

لیکن آخر میں مَیں فیضؔ سے ایک شکایت بھی کرنا چاہتا ہوں۔ چھوٹوں کو بڑوں سے شکایت کا حق تو ہے ہی۔

مجھے فیضؔ سے شکایت یہ ہے کہ وہ اپنے لہجہ کی ہفت رنگ موسیقی میں خود کیوں اتنے محو ہوجاتے ہیں کہ نظموں کو وہاں ختم نہیں کرتے جہاں وہ ختم ہوجاتی ہیں اور کبھی کبھی اس مقام پر آنے سے پہلے نظم شروع بھی ہوجاتی ہے جہاں سے اُسے شروع ہونا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر ''ایرانی طلبا کے نام'' کو لیجیے۔ یہ نظم یہاں ختم ہوجاتی ہے......

جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبح بغاوت کا گلشن

لیکن فیضؔ نے آٹھ مصرعے اور لکھے اور ان آٹھ مصرعوں نے اس نظم کے تاثر کو مجروح کیا۔ یہی ان کی مشہور نظم ''نثار میں تری گلیوں پہ'' کا عمل بھی ہے۔ میرے خیال میں جو نظم یوں ہوتی......

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن، کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ ان کی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے خاک میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

میں نے اس نظم سے ۱۴ر مصرعے نکالے ہیں اور اب یہ نظم مجھے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ خوبصورت اور بھرپور معلوم ہو رہی ہے۔

''زنداں نامہ'' کی بے حد خوبصورت نظم ''اے روشنیوں کے شہر'' میں بھی یہی خرابی ہے۔ ۱۴ر مصرعوں کی یہ نظم اگر صرف ۶ مصرعوں کی ہوتی تو شاید اس کا شمار اُردو کی بہترین نظموں میں ہوتا۔

کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس شہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

۲۵ر مصرعوں کی نظم ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' بھی دراصل صرف ۸ مصرعوں کی نظم ہے۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے
قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

پھر ''دستِ صبا'' کی طرف چلیے۔ نظم کا عنوان ہے ''زنداں کی ایک شام'' یہ نظم ایک مصرعہ پہلے شروع ہوگئی ہے۔ اسے ''زینہ زینہ اتر رہی ہے رات'' سے شروع ہونا چاہئے تھا۔

فیضؔ کی زیادہ تر نظمیں اس کمزوری کا شکار ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ فیضؔ کو اپنا اُسلوب اپنی نظموں سے زیادہ پسند ہے۔ لیکن فیضؔ نے کچھ نظمیں ایسی بھی کہی ہیں جن میں یہ نقص نہیں، جو صحیح جگہ سے شروع ہوئیں اور صحیح جگہ پر ختم ہوجاتی ہیں اور یہی اُن کی سب سے خوبصورت نظمیں ہیں۔

مثلاً ''درد آئے گا دبے پاؤں'' یہ نظم دراصل اپنے عنوان ہی سے شروع ہوجاتی ہے۔

درد آئے گا دبے پاؤں
اور کچھ دیر میں جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آئے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
شعلۂ درد جو پہلو میں بھڑک اُٹھے گا
حلقۂ زُلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں

ہجر کا دشت کہیں، گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں
دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل، اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا
مشتعل ہو کے ابھی اُٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابہ ہوگا
جنگ ٹھہری ہے، کوئی کھیل نہیں ہے اے دل
دشمنِ جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل
لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتش جرار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی
ہو نہ ہو اپنے قبیلہ کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر
اُن کو شعلوں کے رجز اپنا پتہ تو دیں گے

خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے

دور کتنی ہے ابھی صبح

یہ ایک مکمل نظم ہے۔ ہر مصرعہ اپنے سے پہلے آنے والے مصرعہ کا ارتقاء ہے۔ اس نظم سے کوئی مصرعہ نکالا نہیں جا سکتا۔

یوں ہی ''یہ فصل امیدوں کی ہمدم''

منٹگمری جیل میں لکھی ہوئی یہ نظم بھی بڑی جیتی جاگتی اور مکمل نظم ہے۔ پہلی والی نظم سے تو شاید کچھ الفاظ نکالے بھی جا سکیں لیکن اس نظم کا ہر لفظ اپنے موضوع کی صلیب پر ٹُھنکا ہوا ہے۔

سب کاٹ دو

بسمل پودوں کو

بے آب سسکتے مت چھوڑو

سب نوچ لو

بیکل پھولوں کو

شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم

اس بار بھی غارت جائے گی

سب محنت صبحوں شاموں کی

اب کے بھی اکارت جائے گی

کھیتی کے کونوں کھدروں میں

پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو

پھر مٹی سینچو اشکوں سے

پھر اگلی رُت کی فکر کرو

جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

یہ نظم ۵۵ء کی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ۵۴-۵۵ء تک نظم کی ہیئت فیضؔ کی گرفت میں پوری طرح آ گئی تھی، لیکن فیضؔ نے تکمیل ہیئت کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ ممکن ہے پس پردہ یہ ترقی پسند نعرہ کام کر رہا ہو کہ فن صرف خیال ہے اور ہیئت کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن یہ بات بھی اتنی ہی غلط ہے جتنی یہ بات کہ فن محض ہیئت ہے اور خیال کی کوئی اہمیت نہیں۔ آدمی نہ صرف گوشت ہے نہ صرف چمڑا۔ درخت نہ صرف برگ ہے نہ صرف شاخ۔ ترقی پسند شعراء کے یہاں عام طور پر ہیئت کی طرف بے توجہی ملتی ہے اور فیضؔ کی خوبصورت شاعری بھی اسی کمزوری کا شکار ہوگئی۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر فیضؔ کے یہاں سے غالبؔ کے دو شعر نکال لیے جائیں تو فیضؔ کے یہاں کچھ نہیں بچتا۔ وہ دو شعر ہیں......

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ فیضؔ کی شاعری میں ان دونوں شعروں نے بہت جگہ گھیر رکھی ہے، لیکن یہی دو شعر لگ بھگ ساری ترقی پسند شاعری میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن فیضؔ کی شاعری سے ہم یہ دونوں شعر کیوں نکال دیں اور نکالنے کا کام شروع ہی کرنا ہے تو پھر صرف فیضؔ ہی کیوں، نکالنے کے لیے تو سبھی کے یہاں کچھ نہ

کچھ مل جائے گا۔ اگر غالبؔ کے یہاں سے بےدلؔ، نظیریؔ، عرفیؔ اور میر تقی میرؔ کو نکال دیں تو کیا بچے گا؟ اگر سردار جعفریؔ کے یہاں سے اقبالؔ، انیسؔ، جوشؔ، پیلونرودا، لوئی اراگاںؔ اور مائکافسکی کو نکال دیں تو کیا بچے گا... بچے گی غالبؔ کی آواز، بچے گا سردار جعفریؔ کا لہجہ۔ بچے گا فیضؔ کا خوشبودار اُسلوب — بچے گی زرد پتوں کے بن میں کاسنی درد کی آواز — اور یہ آواز قابلِ قدر ہے۔

○○

باقر مہدی

فیضؔ — ایک تجزیہ

جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی منائی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ایک ڈائس پر گاندھی جی اور جناح صاحب کو اکٹھا کر دیا تھا اور اسی شام کو مشاعرے میں جوشؔ، فیضؔ، فراقؔ اور ڈاکٹر تاثیر بھی موجود تھے۔ مجھے آج تک وہ منظر یاد ہے کہ جب فیضؔ نے اپنی نظم ''سیاسی لیڈر'' کے عنوان سے سنانی شروع کی۔ یہ ۴۶ء کی بات ہے۔ سیاسی ہنگامے زوروں پر تھے اور ان میں تھوڑی بہت صداقت ملتی تھی۔ ان کی سیدھی سادی آواز گونج رہی تھی۔ فیضؔ کی آواز جیسے تصنع سے خالی تھی، ویسے یہ نظم بھی ہنگامہ خیزی سے معریٰ تھی۔ وہ اپنی علامتی نظم بغیر کسی جھجک کے سنا رہے تھے۔ وہ نظم ختم کر چکے پھر بھی داد و تحسین کی آوازیں نہ گونجیں۔ کسی نے مجھ سے کہا۔

''اس سے اچھا تھا فیضؔ غزل سناتے۔''

مشاعرہ ختم ہو گیا۔ میرے ذہن میں صرف فیضؔ کی نظم ایک مدت تک گونجتی رہی۔ اصل میں فیضؔ اس وقت تک سجاد ظہیر اور سردار جعفری کے لیے اہم شاعر نہیں بنے تھے۔ یہی نہیں ۱۹۵۲ء میں لکھی گئی ایک کتاب (ترقی پسند ادب از سردار جعفری) میں ان کا ذکر بہت کم ملتا ہے اور اس میں ان کی اتنی بھی مدح نہیں جتنی کہ کیفی اعظمی کی۔ ترقی پسند نقادوں کے مجموعے ایک کے بعد ایک اٹھائیے اور دیکھیے کہ فیضؔ کا نام کم ہی نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مجتبیٰ حسین تک نے اپنے طویل مقالے میں یہ لکھنے کی بھول کی تھی۔ ''فیضؔ کی شاعری جہاں ختم ہوتی ہے وہیں سردار جعفری کی شاعری کا آغاز ہوتا

ہے۔'' غرض کہ ترقی پسندوں میں بے انتہا مقبولیت کا راز معلوم کرنا اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ آزادی کے موضوع پر نظموں کا ایک انبار ہے اور اس میں سب سے اچھی نظم فیضؔ کی ہے جس پر سردار جعفری نے وہ مشہور اعتراض کیا تھا کہ۔ ''یہ نظم جن سنگھی اور مسلم لیگی دونوں کہہ سکتے تھے۔'' (جعفری نے اپنی ان تمام غلطیوں کا ازالہ اس طرح کر دیا کہ ''لینن انعام'' فیضؔ کو دلانے میں سب سے پیش پیش وہی تھے۔)

فیضؔ راولپنڈی کیس میں گرفتار ہوئے اور ترقی پسندوں نے انہیں اپنا ہیرو بنالیا اور جیسے جیسے فیضؔ کی مقبولیت ان حلقوں میں بڑھتی گئی، ارباب ذوق میں فیضؔ کا ذکر کم ہوتا گیا اور کچھ عرصے کے بعد وزیر آغا نے ''اُردو نظم میں انجماد کی ایک مثال فیضؔ'' لکھ ڈالا۔ فیضؔ کی مقبولیت سے ان کی شاعری کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ شہرت تو سوڈا واٹر کی گیس ہے جو چند لمحوں کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ فیضؔ نے شہرت اور انعام کو غیر معمولی اہمیت دی۔ پھر بھی وہ اپنا توازن بالکل نہ کھو بیٹھے اور یہ اس ''دور ہوس'' میں کچھ کم غنیمت بات نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب فیضؔ پاکستان میں ''فیضؔ ایوبی'' کے نام سے نئے شاعروں کے حلقے میں مشہور ہیں۔ اُردو جدید شاعری کا آغاز اتنا مختلف نظر نہیں آتا جتنا کہ بعد میں ہوا۔ راشدؔ اور فیضؔ ایک دوسرے کے ہمنوا تھے۔ کرشن چندر نے ''ماورا'' پر دیباچہ لکھا تھا اور حسن عسکری (جو نہ جانے کیسے جدید شاعری کے رازداں بن گئے) ''نیا ادب'' میں افسانہ لکھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب شعر و ادب مختلف گروہوں میں تقسیم ہونے لگا تو فیضؔ کو ہر گروہ کسی نہ کسی صورت میں اپنانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہ ''نقاد ادب'' اس کو خوبی تسلیم کریں مگر میں اس بات کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ جب اچھے ادب سے زیادہ نظریے کی صحت پر زور دیا جائے تو ''نیم حکیم'' پیدا ہوتے ہیں ادیب و شاعر نہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ سردار جعفری اور حسن عسکری کے کارنامے ایک سے نظر آتے ہیں گو کہ ان کے رنگ الگ ہیں یعنی سرخ اور ہرے۔ آج مظفر علی سیّد اور فتح محمد ملک جو اسلامی نقطۂ نظر کی صحت پر زور دیتے ہیں تو یہ مقابلہ اور بھی آسان اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔

فیضؔ نے اپنے دیباچہ ''نقش فریادی'' میں یہ جملے لکھے ہیں......

''اس مجموعہ کی اشاعت ایک طرح کا اعترافِ شکست ہے۔ اس میں دو چار نظمیں قابل برداشت ہیں۔''

یہ خاکساری بھی ہے اور عین حقیقت بھی۔ اس لیے کہ فیضؔ کے ہر مختصر مجموعے میں چند ہی نظمیں اچھی ہوتی ہیں مگر یہ چند نظمیں اپنے دَور کی کامیاب نظموں میں سرِ فہرست شمار کی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ ''نقش فریادی'' ۴۲ء میں شائع ہوئی اور ایک آندھی کی طرح چھانے کے بجائے آگ کی طرح آہستہ آہستہ شعری حلقوں میں مقبول ہوئی، اتنی کہ اس زمانے کے ہر نئے شاعر پر فیضؔ کی آواز کا گمان ہوتا تھا۔

''دست صبا'' کی اشاعت تک تو فیضؔ کا ''طرزِ سخن'' اپنانا ''فن'' بن گیا تھا (افسوس کہ وقت نے یہ سارا طلسم ختم کر دیا اور نئی نسل کے شاعر ایک عرصہ سے فیضؔ کے اثر سے نکل گئے ہیں۔ مگر زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے، سردار جعفری کی بیشتر نئی نظموں پر فیضؔ کا اثر بڑھ رہا ہے جیسے ''قتل آفتاب'' وغیرہ۔ یعنی فیضؔ کے ہم عصروں پر ان کا اثر اب بھی باقی ہے۔ یہ بھی ایک بڑی بات ہے۔

راشدؔ نے ''نقش فریادی'' کے دیباچے میں لکھا ہے......

''نقش فریادی' ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔''

فیضؔ نے اس سنگم سے اپنا سلسلہ کبھی نہیں توڑا۔ ترقی پسندوں کے عروج کے زمانے میں بھی وہ بنیادی طور سے رومانی شاعر ہی رہے اور دار و رسن اور دوسرے اس طرح کے الفاظ اکثر و بیشتر استعمال کرنے لگے۔ ان کی آواز ہمیشہ ایک مغنی کی آواز رہی، ایک انقلابی کی نہیں۔ عزیز احمد نے اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں لکھا ہے کہ......

''عاشقی اور انقلاب کا خط فاصل جس کو وہ پار کرنا چاہتے ہیں کسی طرح پار نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری عشق اور انقلاب کے درمیان ایک گریزِ مسلسل بن گئی ہے۔'' (ترقی پسند ادب، صفحہ: ۷۳)

عزیز احمد کی کسی رائے کو زیادہ سنجیدگی سے قبول نہ کرنا چاہیے۔ وہ ہر رنگ میں اپنا کرتب دکھاتے ہیں۔ مگر ان کی بات خدا لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے ترقی پسند نقاد یہ چاہتے تھے کہ فیضؔ ایک جوشیلے انقلابی کا روپ دھار لیں مگر فیضؔ کے لیے یہ ممکن بھی نہ تھا اور جب انہوں نے کوشش بھی کی تو ''قوالی'' (سر مقتل) سے آگے نہ جا سکے۔ فیضؔ نے ایک سچے شاعر کی طرح ''موضوع سخن'' میں اپنا جو مرکز دریافت کیا تھا وہ اس سے بہت آگے کبھی نہ گئے اور اس طرح فیضؔ نے اپنی شاعرانہ شخصیت کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچائے رکھا۔ میں اس کو فیضؔ کا ایک کارنامہ سمجھتا ہوں کیونکہ ترقی پسند تحریک سے اتنی وابستگی کے بعد بھی اپنی جامعیت کو بچائے رکھنا بے حد مشکل تھا اور فیضؔ اس امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ وزیر آغا نے انہیں ''انجماد کی مثال'' ٹھہرا کر اپنا ہی بھرم کھویا۔ اگر وہ غیر جانبدار ہو کر فیضؔ کا مطالعہ کرتے اور انہیں ''مثالوں کے خانوں'' میں بند کرنے کی کوشش نہ کرتے تو وہ ایسے بے معنی نتیجے پر نہ پہنچتے۔ (وزیر آغا کے اس مضمون کا جواب محترمی آثرؔ لکھنوی نے دیا تھا یعنی کسی ترقی پسند نے نہیں)

فیضؔ کا کینوس خاصہ محدود رہا ہے اور یہ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے۔ وہ ہر موضوع پر کامیاب نظم نہیں لکھ سکتے اور یہ بھی کوئی خامی نہیں ہے۔ وزیر آغا کی عقلمندی کی انتہا تو یہ ہے کہ راجہ مہدی علی خاں کی تعریف اور فیضؔ کی مذمت کی۔ اسی سے ان کی ناقدانہ نظر کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کتاب یعنی ''جدید نظم کی کروٹیں'' کی تعریف رشید صاحب ایسے غزل کے رسیا اور بلراج کومل ایسے جدید شاعر بھی کرتے ہیں۔ شاید اسی دن کے لیے شاعر نے کہا تھا......

اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

مگر قصہ کچھ اور ہے۔ وزیر آغا کو فیضؔ کی شاعری نہیں اشتراکی نظریہ سے کد ہے۔ اب اس کا کیا علاج؟ فیضؔ کے یہاں رومانی باغی کی جھلکیاں ملتی ہیں نہ کہ واقعی انقلابی کی۔ مگر ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے محنت بہت کی، بصیرت سے کام نہ لیا۔

''نقش فریادی'' کو شائع ہوئے تقریباً ایک چوتھائی صدی گزر چکی ہے۔ اس کی

بیشتر نظمیں اپنی آب وتاب کھو چکی ہیں مگر وہی بات جو فیضؔ نے اپنے دیباچہ میں کہی تھی دو چار نظمیں آج بھی اپنی مذمت کو وقت کے سیلاب سے بچا سکی ہیں۔ تنہائی، موضوع سخن، رقیب سے اور ہم لوگ اب بھی مطالعے پر مجبور کرتی ہیں۔ یوں تو ''سرودِ شبانہ'' اور ایک منظر بھی دلکش ہیں۔ جاپانی ہائیکو کی طرح، اور اس میں بھی امیجری کی نازک لطافت ملتی ہے جو آگے چل کر فیضؔ کی نمایاں خصوصیت بن گئی ہے۔

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیث شوق و نیاز

فیضؔ کی مدھم، خوابناک، آہستہ سے، بالکل دھڑکنوں کی طرح بجتی، پھیلتی اور لہراتی ہوئی آواز چند لمحوں کا طلسم بنا جاتی ہے۔ یہ بات ان کی مشہور نظموں ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ''۔ ''سوچ''۔ ''چند روز اور مری جاں فقط چند ہی روز'' اور ''بول'' میں نہیں ہے۔ یہ نظمیں اپنے دور کی مقبول ترین نظموں میں شامل کی جاتی تھیں اور ترقی پسند شاعری کے تار و پود میں ان کا بڑا دخل تھا۔ مگر آج اُن کی رعنائی ختم ہو چکی ہے اور ان کی سطحیت اُبھر آئی ہے۔ یہ اب بھی کارآمد نظمیں ہیں مگر افسوس کہ ''مفید چیزیں'' جلد ہی اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہیں۔

''تنہائی'' میرے خیال میں فیضؔ کی پہلی مشہور اور اچھی نظم ہے۔ اس کی علامتی فضا آج نئے مفہوم کی ترجمانی کرتی ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں تنہائی فیضؔ کا محبوب موضوع رہا ہے اور تنہائی اس وقت بامعنی اور پر اسرار ہو جاتی ہے جب کہ کسی کا انتظار ہو۔ فیضؔ نے اب تک انتظار کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ شاید وہ اس کو امید کا دامن سمجھتے ہیں۔ یہ نو مصرعوں کی مختصر نظم ایک ایسا سحر لیے ہوئے ہے جو ہر بار کم ہو کر پھر تازہ دم ہو جاتا ہے۔ اس کو سیاسی اور عشقیہ معنوں میں سمجھا جائے یا صرف آواز کا زیر و بم جیسے موسیقی کی لے۔ اس کا اثر ہو کر ہی رہتا ہے۔ اس کی امیجری نقالی کی وجہ سے پامال

ہو چکی مگر اب بھی ایک عرصہ کے بعد یہ نظم پڑھی جائے تو اس کی خوبصورتی چمک ہی جاتی ہے۔ راشد نے ٹھیک ہی کہا تھا......

''اس نظم کی کامیابی تو اس کی مجرد تاثیر ہی میں ہے۔''
اس کے بعد تفسیر کی گنجائش نہیں رہتی۔

''موضوع سخن'' میں فیض نے بڑی معصومیت سے اپنی رومانیت کی کہانی کہی ہے۔ اس کی ابتدا آج بھی جدید شاعری کے لیے سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے:

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام

اور اس مصرع سے آخر تک نظم یوں ڈھلتی جاتی ہے جیسے صراحی سے مے پیمانے میں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اہم سوالات جو شاعر کو روز سورج کی کرنوں کے ساتھ پریشان کرتے ہیں، اپنی ضرب لگاتے جاتے ہیں۔

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جو بن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

اس کو نظم کا نقطۂ عروج کہا جاسکتا ہے۔ یہیں سے فیض نظم کو Sumup کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ نظم ہیئت کے اعتبار سے کوئی تجربہ نہیں۔ پھر بھی اس میں ابتداء عروج اور انتہا کا خاصا خیال رکھا گیا ہے۔ فیض بنیادی طور پر رومانوی ہی نہیں بلکہ ایک معنی میں روایتی بھی ہیں۔ وہ اپنے مزاج سے الگ ایک نئی شخصیت کی تشکیل کرنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ جس ماحول میں ان کی شاعری نے آنکھیں کھولی ہیں اُن میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ وہ پروان چڑھنا پسند رکھتے ہیں۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو راشد کے مجموعہ ''ماورا'' کی اہمیت نقش فریادی سے بڑھ جاتی ہے۔ فیض نے کوئی نقاب نہیں پہنی۔ اپنے پر کسی نظریے کو پورے طور سے مسلط نہیں کیا، اس لیے اُردو کی رومانوی شاعری سے ان کا گہرا رشتہ آسانی سے ڈھونڈا جاسکتا ہے بلکہ ان کی بے پناہ

مقبولیت کا ایک یہ بھی راز ہے۔

''رقیب سے'' کے بارے میں فراقؔ صاحب نے کہا تھا کہ......

''ایسی نظم دُنیا کی شاید ہی کسی زبان میں ملے'' خیر فراق صاحب کی بات تو یہ ہے کہ وہ مبالغہ کے بغیر کوئی بات ہی نہیں کہتے (حسن عسکری کو اُن کا مبالغہ تک پسند ہے) مگر اتنا صحیح ضرور ہے کہ وہ فیضؔ کی اچھی نظموں میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ البتہ اس رقیب کا تصور غالب کے رقیب سے ملتا جلتا ہے۔ وہی رقیب جو ''راز داں'' تھا اور ''دوست'' ردیف والی غزل کا پر تو ضرور اس پر نظر آتا ہے اور یوں بھی غالب کا اثر فیضؔ پر جگہ جگہ نمایاں ہے۔ خاص کر ان کی غزلوں میں کہیں کہیں تو غالبؔ کی آواز ''بازگشت'' تک کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممتاز حسین ایسا محتاط نقاد بھی بھولے سے یہ کہہ گیا کہ غالبؔ کے بعد اس انداز کی کم ہی غزلیں لکھی گئی ہیں۔

(ادب اور شعور، ص: ۲۱۲)

دیکھیے ''کم کم'' میں احتیاط کا پہلو چھپا ہے۔ مگر—

آج بھی میری نظر میں ''نقش فریادی'' کی سب سے اچھی نظم ''ہم لوگ'' ہے۔ یہ صرف مجروح، نامراد اور بے بس طبقہ کی عکاسی ہی نہیں ہے بلکہ ان باغیوں کی رومانی آواز ہے جو دُنیا کو بدلنے کا یقین لے کر اُٹھے تھے اور اب راکھ کی طرح چنگاریوں میں چھپے ہوئے اپنی سرکشی کے بکھرے ہوئے خوابوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ یہ ''ہم لوگ'' ہر دور اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں اور شاید پائے جاتے رہیں گے۔

دل کے ایواں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار

نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے

حسنِ محبوب کے سیال تصور کی طرح

اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

غایتِ سود و زیاں صورتِ آغاز وصال

وہی بے سود تجسس وہی بے کار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشت فردا سے نڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک اُلجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس چاک گریباں کی تلاش

"نقش فریادی" کی اشاعت کے بعد فیضؔ ایک عرصے تک خاموش رہے اور ادبی حلقوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ فیضؔ "محفل" سے چلے گئے۔ جیسا کہ انہوں نے دیباچہ میں کہا تھا......

"اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہو جائے، ایسی صورت میں یا ان کے اظہار کے لیے کوئی سہل راستہ پیش نظر نہ ہو یا تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہو یا طریقِ اظہار کو۔ ذوق اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورتِ حالات پیدا ہونے سے پہلے ہی شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے۔ اہلِ محفل کا شکریہ ادا کرے اور اجازت چاہے۔"

فیضؔ کی خاموشی نے نقش فریادی کی مقبولیت میں اضافہ کر دیا اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کم سخنی نے فیضؔ کی اہمیت کو بچائے رکھا ہے اور ان میں ایک ایسی جاذبیت پیدا کر دی ہے جو تبسم میں ہوتی ہے، الفاظ میں نہیں۔ ظاہر ہے یہ کسی گہری فکر کی غماز نہیں ہوتی مگر بہت سے پیدا ہونے والے عیوب کو چھپا لیتی ہے اور ایک طرح کا "رعب" رہتا ہے۔ یہ فیضؔ کی شخصیت کا مزاج ہے، کوئی سپر نہیں۔

جیسے جیسے فیضؔ کی خاموشی طول کھینچتی جا رہی تھی، یہ خیال پھیلتا جا رہا تھا کہ وہ

شاید ''محفل'' میں آنا پسند نہ کریں گے۔ سردار جعفری کی ''نئی دُنیا کو سلام'' کا اثر پھیلتا جا رہا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے کہ ندیم تک جعفری کے رنگ میں آزاد نظمیں لکھ رہے تھے۔ فیض کی ''صبح آزادی'' کافی مقبول ہو چکی تھی اور حسب دستور ساحر نے اس رنگ میں اپنی نظم ''مفاہمت'' لکھ لی تھی مگر یہ انتہا پسندی کا دور تھا اور فیض اپنی ساری دلکشی کے باوجود ترقی پسندوں کے ہراول دستے میں شامل نہیں تھے۔

فیض ۹ر مارچ ۱۹۵۱ء میں گرفتار کر لیے گئے اور یہ خبر ادبی حلقوں میں سنسنی پھیلا گئی اور فیض کے نام ترقی پسند شاعروں نے نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ سردار جعفری کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ بھی ''مداحین'' کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ فیض کی شہرت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ممتاز حسین نے اپنی کتاب ''ادبی مسائل'' کا انتساب ''دست صبا'' کے نام کیا ہے۔ اس وقت تک انہوں نے فیض پر چند جملے بھی نہیں لکھے تھے گو کہ بعد کو انہوں نے دو مختصر مضامین ''دست صبا'' ۵۴ء اور ''زندان نامے'' ۵۷ء پر لکھے جوان کی کتاب ''ادب اور شعور'' میں شامل ہیں۔

مجھے ۵۳ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس (دہلی) یاد ہے جس میں ہر طرف ''دست صبا'' کا چرچا تھا۔ گو کہ مارچ ۵۳ء میں جعفری کی ترقی پسند ادب اور مجروح کی ''غزل'' بھی شائع ہوئی تھی مگر ذکر زیادہ تر فیض ہی کا ہوتا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ امن کے موضوع پر ہر ترقی پسند شاعر کے پاس کئی کئی نظمیں ہوتی تھیں۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں استالین کی موت کی خبر آئی اور کہرام مچ گیا۔ اس رات نہ جانے کتنی نظمیں اور افسانے لکھے گئے اور فیض کا ذکر کچھ کم ہو گیا۔

''دست صبا'' میں ''نقش فریادی'' کے مقابلے میں فیض کی آواز زیادہ واضح اور پُرزور ہے۔ وہ چیخے تو کبھی نہیں، انہوں نے اپنی آواز کی لے ذرا بلند کر لی۔ ''صبح آزادی'' فیض کی سب سے کامیاب سیاسی نظم ہے۔ جس طرح یہ بڑا ملک ٹکڑے ہوا اور ''ماؤنٹ بیٹن ایوارڈ'' ۲۱ر جون ۱۹۴۷ء کے ذریعہ آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان وجود میں آئے، اس کی بڑی لمبی داستان ہے اور کافی عبرتناک۔

فیضؔ نے اپنی ''تیسری آنکھ'' سے آزادی کے گہرے معنی و مفہوم سمجھ لیے تھے۔ انہیں کسی نے پارٹی لائن نہیں سمجھائی تھی۔ اس لیے کہ تقسیم کے فوری بعد سردار جعفری نے ''جشنِ آزادی'' لکھی اور جب پارٹی لائن بدلی تو ''فریب'' لکھی اور کچھ عرصہ بعد اسی کو صحیح آزادی تسلیم کرلیا۔ غرض کہ وہ بیچارے کیا کرتے جیسا کہا جاتا تھا ''وفادار'' شاعر تھے لکھا کرتے تھے۔ مگر فیضؔ نے اشتراکیت کو اپنا کر بھی ''اپنے'' سے رشتے مستحکم رکھے اور اپنی شاعرانہ بصیرت کو کسی کے ''اشارے'' کا محتاج نہیں بنایا۔ میجر اسحاق کا دیباچہ زنداں نامہ پر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ان کی محدود شاعری پر دبے دبے لفظوں میں تنقید کی جاتی تھی۔ مگر وہ اپنے شاعرانہ مزاج سے مجبور تھے۔ کیسے مطلبی کی طرح ''ہیا ہیا'' لکھنے لگتے۔ ''صبح آزادی'' کی ابتدا بھی بڑی خوبصورت ہے۔ آج بھی امیجری اپنا رنگ و روغن کسی حد تک بچائے ہوئے ہے......

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

گو کہ اس کی اثر آفرینی کم ہوگئی ہے۔ بات بھی تو سترہ سال پرانی ہے مگر وہ داغ اب بھی دن کے اُجالے میں دونوں ملکوں میں سورج کی طرح چمک رہے ہیں اور موضوعِ سخن میں جو سوالات فیضؔ کو پریشان کرتے تھے وہ بڑی حد تک موجود ہیں۔ اس لیے کہ نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فیضؔ صاف صاف الفاظ میں کہنا نہایت غیر شاعرانہ حرکت سمجھتے ہیں۔ وہ پرانی ہی سہی مگر ان ہی تشبیہوں سے نئے معنی پیدا کرتے ہیں جو دو دھاری تلوار کی طرح ہر طرف وار کرسکتی ہیں۔ اسی لیے ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ اپنی جانبداری کا اعلان بھی کرتے ہیں تو زیرِ لب، فلک شگاف نعرہ نہیں لگاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ آہوں کا اثر ہونے تک انتظار سے گھبرا گئے تھے۔ مگر فیضؔ نے اپنا ساز نہ چھوڑا البتہ اپنی آواز میں ذرا زیادہ گرمی اور تیزی پیدا کرلی۔

''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ'' کی نظمیں فیضؔ نے مختلف جیلوں میں لکھی ہیں۔

ان کے ایسے آزاد طبع شاعر کے لیے یہ قید و بند کی صعوبتیں بہت تھیں۔ ان میں ایک طرح کا ''احساسِ عزم'' پیدا ہوگیا جو ''مجاہد'' میں ہوتا ہے۔ یہی نہیں کہ وہ اپنے کو بہت مظلوم سمجھنے لگے بلکہ انہیں عالمگیر ظلم اور ملکی بندشوں کا براہِ راست اندازہ ہوگیا۔ یہیں انہوں نے اپنی کئی مشہور غزلیں کہیں جو اتنی مقبول ہوئیں کہ مشاعروں کی طرحیں بن گئیں اور پھر قوالوں کی نذر ہوگئیں۔

ان کی غزلوں کے بارے میں محترمی رشید صاحب نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ فیضؔ ہی فراق کے بعد اس صنف سخن سے سب سے زیادہ واقف ہیں۔ مگر رشید صاحب کی رائے بھی بڑی یکطرفہ ہوتی ہے۔ وہ یگانہؔ کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ خیر تو ''دست صبا'' کی غزلوں نے اتنی شہرت اختیار کرلی کہ قرۃ العین حیدر کے ناول کی ہیروئن اس کی فرمائش کرنے لگی۔ بہرحال فیضؔ کی مقبولیت ایک فیشن بن گئی۔

''دو عشق'' میں فیضؔ نے ''موضوع سخن'' کی بات کو ذرا وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اب غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے درمیان خلیج بہت کم ہوگئی اور دونوں کا آپس میں ایک معنی میں ''وصال'' ہوگیا۔ فیضؔ کا یہ آرٹ ہے کہ وہ اندازِ بیان میں شگفتگی اور سادگی کا ایسا امتزاج پیدا کرتے ہیں کہ خوبصورتی میں کسی قسم کے تکلف کا شبہ نہیں ہوتا۔ گو کہ اپنی نظموں کو تشبیہوں سے خاصا سجاتے ہیں مگر مصرعوں کو صوتی اور معنوی اعتبار سے ایک آہنگ میں ڈھال دیتے ہیں، ایک نغماتی کشش پیدا ہوجاتی ہے۔ ''دو عشق'' آج بھی تروتازہ ہے اور ایک معنی میں ''موضوع سخن'' سے بہتر نظم ہے۔ اس کی روانی، امیجری اور جذبات ایک ''گہری فکر'' میں مربوط ہوگئے ہیں کہ ان کے اجزا کو الگ الگ کرنا نظم کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔ محبوب اور وطن کی محبتوں کا یہ اتصال بہت ہی خوب ہے مگر فیضؔ کی رومانیت نے یہاں بھی عشق کو اولیت بخشی ہے اور سرفروشی دوسرے درجے پر آتی ہے۔

فیضؔ ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ہر حلقے میں مقبول ہوگئے تھے۔ ان کے خیالات سے شدید اختلاف رکھنے والے بھی انہیں خراج عقیدت پیش کرتے تھے۔ اتنا

مرتبہ بہت کم شاعروں کو ان کی زندگی میں ملا ہے۔ ''نثار میں تری گلیوں پہ'' اس نظم میں فیضؔ نے ایک قیدی کے جذبات کو پھر بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ قید خانے کے در و دیوار سے وطن کی محبت ٹکرا کر پاش پاش نہیں ہوتی بلکہ شاعر کو روز و شب کی گردش کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کا یہ بند آج بھی دلکش ہے۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ مانگ تیری ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

فیضؔ نے ''خیر و شر'' کی اس جدوجہد کو عمومی صورت دے دی ہے اور شاید جیل میں ''تسکین کا ایک بہانہ بھی یہی تھا اور صداقت بھی''۔ ''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں'' عنوان بہت اچھا ہے مگر یہ نظم ''نقش فریادی'' کی ''سوچ'' کے لب و لہجہ میں کہی گئی۔ فیضؔ کی نظم جہاں ذرا طویل ہوئی روانی کھو بیٹھتی ہے اور بند کے بند سپاٹ چلے جاتے ہیں۔ اس نظم کے کئی بند نظر ثانی اور تنسیخ کے قابل ہیں۔ اس سلسلے کی نظموں میں ''زنداں کی ایک صبح'' بڑی خوبصورت ہے۔ بات صرف منظر نگاری کی نہیں ہے بلکہ اپنی شخصیت میں گھول کر صبح کے رنگ بکھیرے ہیں۔ یہ ذاتی تجربے اور شاعرانہ بصیرت کی آگ میں تپ کر ہی رنگ اُبھرتے ہیں۔

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہہِ جام اُتر آئی ہے

عکسِ جاناں کو وداع کرکے اُٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جابجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

یہ نظم بڑی مرصع ہے اور اس کے ایک مصرع پر بھی انگلی رکھنا محال ہے۔ اس کی امیجری بھی نئی ہے۔ زنجیر کا مچل کر رونا، تالے کے جگر میں خنجر کا اُترنا۔ یہ فیضؔ کی نازک خیالی ہی نہیں ایک مصورانہ فکر کا عینی ثبوت ہیں۔ فیضؔ کی یہ نظم ''دستِ صبا'' کی سب سے اچھی نظم کہی جاسکتی ہے۔ اس کا اختتام بھی مروجہ نظموں سے کچھ الگ ہے گوکہ ''امید'' پر ختم ہوتی ہے......

سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمن جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنات گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے ہوئے تیر

''دستِ صبا'' کی ایک نظم بہت اچھی ہے۔ اس کا موضوع نیا نہیں ہے۔ فیضؔ کے یہاں ایک خامی کا ذکر کرتا چلوں۔ ان کے یہاں تنوع نہیں ہے۔ اصل میں ان کا آرٹ میناکاری کا آرٹ ہے۔ ظاہر ہے یہ بڑے کینوس کا آرٹ نہیں ہوتا اور اس سے توقع بھی نہ رکھنی چاہیے مگر ایک ہی موضوع کو ہر بار نئے انداز سے پیش کرتے ہیں اور اس طرح ان میں ایک تازگی سی آجاتی ہے۔ شاید دیرپا نہ ہوتی ہو مگر ان کی نظم ''یاد'' تو

یادوں کا تراشا ہوا ہیرا ہے جس کا ہر مصرع ایک نئے انداز کا اظہار ہے اور اس طرح جدید شاعری میں ایک امیجری کا اضافہ ہے۔ یہ عشقیہ نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے وقیع نہ سہی مگر اثر آفرینی اور جدت طرازی کے نئے پہلو رکھتی ہے۔ فیضؔ کی ''یاد'' میری ناچیز رائے میں ان کی بہترین نظم ہے۔ محترمی اثر صاحب نے اس پر چند لغوی اعتراضات کیے تھے مگر وہ اس کی ندرت کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ ان ''خامیوں'' کے باوجود یہ ایک کامیاب نظم ہے......

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کِھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور اُفق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ'' کی فضا بڑی حد تک ایک سی ہے۔ دونوں مختصر مجموعے قید کی منظوم داستانیں لیے ہوئے ہیں مگر زنداں نامے میں غزلوں کا حصہ ہلکا ہے۔ البتہ اس میں فیضؔ کی دو تین بہت اچھی نظمیں شامل ہیں۔ جیسے ''اے روشنیوں کے

شہر''۔''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے''۔''درد آئے گا دبے پاؤں'' اور''ملاقات۔''

ان چار نظموں میں فیضؔ نے مختلف انداز اختیار کیے ہیں۔ لاہور پر فیضؔ کی یہ نظم (اے روشنیوں کے شہر) تین بندوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بڑی برق رفتاری ہے۔ یکا یک شروع ہوتی ہے اور جلدی سے بجلی کی طرح آخری سرے پر پہنچ جاتی ہے۔ شروع کے دو مصرعے اس نقاش کی لکیروں کی طرح ہیں جو ایک دو خط سفید کینوس پر یوں کھینچتا ہے کہ شہر اُبھر کر فوراً تصویر میں جگمگانے لگتا ہے......

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر

......اور آخری بند ہے......

آج میرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے منھ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لَو

یہ نظم سترہ دن میں لکھی گئی تھی۔ اس پر فیضؔ نے اپنی شاعرانہ نظر کو بڑی فنکاری سے آزمایا ہے تاکہ کوئی بھی جھول نہ رہ جائے۔ صاف، تیز مگر گہرے نقوش مرتسم کرتی جاتی ہے۔

حال ہی میں کراچی کے ایک جلسے میں فیضؔ نے ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' کو اپنی پسندیدہ نظم کہا ہے۔ یوں تو یہ ایتھلؔ اور جولیسؔ روز برگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے مگر یہ اتنی محدود نہیں ہے۔ یہ اُن ہزارہا شہیدوں کی داستان ہے جو انقلاب کی خاطر کسی نہ کسی طرح مارے گئے۔ اس عمومیت نے اس کو ایک بلندی عطا کر دی ہے مگر اس میں بھی فیضؔ کی رومانویت جا بجا ملتی ہے۔ یہ انقلاب کے شہید اپنی جانفشانی کی کہانی بلا جھجک کہہ جاتے ہیں کیونکہ ان کو ''انقلابی تصورات'' پر پورا

یقین تھا۔ اس لیے موت کو لبیک کہنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ فیضؔ نے اس نظم کی امیجری پر کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے مگر ایک المناک فضا شروع سے چھائی رہتی ہے۔ یہ اچھی نظم ہے مگر ''زنداں نامہ'' کی سب سے اچھی نظم میری رائے میں نہیں ہے۔ ایک معنی میں یہ نوحہ ہے ایک انقلابی کی قربانی کا اور اس کا سب سے اچھا مصرع اس نظم کا عنوان ہے۔

''درد آئے گا دبے پاؤں'' میں پھر تنہائی، انتظار اور درد کی مختلف کیفیتیں ہیں۔ آج یہ نظم کسی حد تک اپنی دلکشی کھو چکی ہے پھر بھی ایک قیدی شاعر کے حرمان اور عزم کی آئینہ دار ہے۔

میری رائے میں زنداں نامے کی سب سے اچھی نظم ''ملاقات'' ہے۔ اس کی امیجری بھی مربوط ہے۔ یہ فیضؔ کی خاصی طویل نظم ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ۴۳ مصرعوں کی نظم یقین کی بلند سطح تک جاتی ہے۔ یہ نظم ادبی حلقوں میں پسند کیے جانے کے باوجود زیادہ مقبول نہ ہوسکی۔ اس لیے کہ فیضؔ نے اس میں اپنی امیجری کو بالکل واضح کر کے پیش نہیں کیا ہے جو ترقی پسند شاعری کا خاصہ رہا ہے اور پوری نظم پر ایک ایسی فضا چھائی ہوئی ہے کہ جو فیضؔ کی غزلوں کا عادی ہے وہ اس سے دور ہی رہے گا۔

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھوں مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں

یہ رات زندگی کا ایک وہ دور ہے جس کی سحر یقینی ہے مگر جب تک یہ رات ہے اس کی عظمت کا اعتراف ضروری سمجھا گیا ہے۔ فیضؔ نے رات کو شجر کا سمبل بنا کر زندگی

کے آلام و مصائب کو کچھ سبک کردیا ہے تا کہ زندگی قابلِ برداشت بن جائے اور اسی میں ملاقات ایک قوت بن جاتی ہے جو درد کے رشتوں کو استوار کرتی ہے۔ اس لیے کہ خود رات تو ''اس انقلابی درد'' کی ودیعت ہے۔ یہ نظم علامتی شاعری کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس نظم میں فیضؔ کا لب و لہجہ بھی مختلف ہے اور اس نظم میں وہ رومانویت نہیں ہے جس کے بغیر فیضؔ کی آواز پہچاننا مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ اس معنی میں ایک تجربہ ہے اور کامیاب تجربہ۔

میں نے فیضؔ کی غزلوں کا تفصیلی ذکر نہیں کیا ہے اس لیے کہ فیضؔ نے نظم اور غزل کی خلیج کو بہت کم کیا ہے اور ان کی اکثر مختصر نظمیں غزلِ مسلسل معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ لب و لہجہ کا فرق کہیں کہیں نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں پر کلاسیکی اُردو شاعری کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی آواز اپنی آواز نہیں ہے۔ مگر وہی خوبیاں جو نظم میں ہیں کم و بیش غزلوں میں تغزل کے اضافے کے ساتھ آ گئی ہیں۔ یوں تو وہ اپنی آواز کی غنائیت کو ہر جگہ قائم رکھتے ہیں، صرف کہیں زیر و بم بدل دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے موضوع بھی نظموں سے ملتے جلتے ہیں۔ حرمان، تنہائی، انتظار، درد، امید اور عشق۔ فیضؔ ترقی پسندوں میں واحد شاعر ہیں جو دونوں اصناف میں کامیاب کہے جا سکتے ہیں کیونکہ فراق اپنی نظموں میں بہت بھٹک جاتے ہیں اور فیضؔ اپنا توازن چند سیاسی نظموں میں کھو بھی جائیں مگر غزلوں میں وہ مروجہ راہوں پر بڑی ثابت قدمی سے چلتے رہتے ہیں۔

''زنداں نامہ'' چھپے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ ترقی پسند تحریک اپنی انتہا پسندیوں اور تنگ نظری کا شکار ہو کر پاش پاش ہوگئی۔ پاکستان میں تو اس کی گنتی کے چند خیر منانے والے ہی بچے مگر ہندوستان میں بھی یہ بکھر گئی اور جیسے جیسے عقائد پاش پاش ہوتے گئے یقین کمزور پڑتا گیا۔ یہاں تک کہ سردار جعفری جو اَب داہنے بازو کے کمیونسٹ ہیں (یہ ستم ظریفی کی انتہا ہے) نے اپنی نظم ''ایک خواب اور'' میں آخر کار اعتراف کر ہی لیا......

در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب

فیضؔ نے پچھلے آٹھ سال میں کئی نظمیں کہی ہیں مگر پھر بھی ایک معنی میں انہوں نے خاموشی اختیار کرلی ہے۔ وہ ''ختم ہوئی بارشِ سنگ'' تک جا پہنچے ہیں۔ یہی نہیں انہیں یہ بھی احساس ہو چلا ہے......

بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے

آج ہماری نسل اور فیضؔ کے درمیان کے فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں، ایک سمندر حائل ہو چکا ہے۔ یہ وقت کی خلیج ہے جس پر پُل بنانا تو ناممکن ہے مگر اب بھی فیضؔ کی آواز کانوں کو بھلی لگتی ہے اور دل میں یادوں کا قافلہ رواں ہو جاتا ہے۔ شاید یہی ہے ایک سچے شاعر کی پہچان۔

○○

آغا سہیل

فیضؔ اور غالبؔ

خود میں نے اپنے ایک مضمون میں ضمناً فیضؔ کو غالبؔ سے قریب قرار دیا تھا تو اس سے میری مراد یہی تھی کہ غالبؔ کے تخیل میں تفکر و تعقل کا جو عنصر موجود ہے وہ فیضؔ کے فکری نظام سے زیادہ قریب ہے۔ غالبؔ نے اپنے زمانے کی مجہول روش یعنی قافیہ پیمائی اور محاورہ بندی سے پرہیز کر کے اسی راہ پر چلنا پسند کیا جو طبعاً مناسب تھی، گو انہیں طعنہ ہائے دلخراش کا سامنا رہا اور اس وقت کے نقادوں ۔نے میرؔ و مرزؔا کے علاوہ ذوقؔ تک کو جھنڈے پر چڑھایا لیکن غالبؔ کے پائے ثبات میں تزلزل نہ آیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ زندگی کا صحت مند شعور اُنہیں حاصل تھا اور اجتماعی زندگی کے فطری نشو ونما پر مرزا غالبؔ کی حکیمانہ نظر تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ زندگی کے مادی اقدار کے قدرتی ارتقاء کے عمل پر یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ تاریخی عوامل اور عمرانی محرکات کس حد تک مادی نظام انقلاب کے تابع ہوتے ہیں۔

دہلی سے لکھنؤ اور بنارس کے راستے کلکتے تک کا سفر اور کلکتے میں کچھ مدت تک قیام غالبؔ کی زندگی کا غیر معمولی واقعہ ہے، جس نے ان کی شخصیت میں انقلاب برپا کر دیا اور اسی سفر نے غالبؔ کے ذہنی اُفق میں ایسی وسعت پیدا کر دی کہ اس کے ڈانڈے ہمارے زمانے سے آملے۔ یوں تو وہ......

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا

درد کی دوا پائی درد لادوا پایا

......کہہ کرعشق کی ارضیت اور انسان کے مادی وجود کی رفعت کوتسلیم کرتے ہیں۔لیکن غور کیجئے تو بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت مغلوں کے فرسودہ جاگیردارانہ نظام کو انتہائی صدمہ پہنچا اور تجارت کا سرمایہ دارانہ نظام قائم ہونے لگا۔گوسرمایہ دارانہ نظام بجائے خودترقی پسند اقدارحیات کی نفی کرتا ہے۔اس کی بنیاد استحصال پر قائم ہوئی ہے، لیکن چونکہ مغلوں کے جاگیردارانہ نظام میں فرد کی معاشرے میں فعال حیثیت باقی نہیں رہتی اور تجارتی نظام خواہ سرمایہ دارانہ ہی کیوں نہ ہو، فرد کو فعال بنا دیتا ہے اور مزدور جنم لے لیتا ہے، لہٰذا زندگی میں تیز رفتاری آجاتی ہے۔ معاشرے میں زر کی گردش تیز ہوجاتی ہے۔ اس بنا پر افراد معاشرہ خوش حال ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ مقابلتاً اس نظام کی بہتری اور افضلیت نے غالبؔ کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کا ردعمل سرسیّد کے آثار الصّنادید پر تقریظ کی صورت میں ظاہر ہوا جسے سرسیّد نے اُسی وقت قبول کیا جب ۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد مطلع صاف ہوا۔

کلکتے کے سفرتک کے وقت غالبؔ کی عمر ۲۸۔۲۹ سال کی تھی، ٹھیک اسی زمانے میں انہوں نے شمالی ہند میں معاشی اور معاشرتی انقلاب کے دبے پیروں کی چاپ سنی اور سمجھ لیا کہ پورے کا پورا برصغیر جلد یا بدیر اس انقلاب کی لپیٹ میں آیا چاہتا ہے۔ جب ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا تو غالبؔ کی عمر ۴۵ برس کی تھی اور اس سولہ سترہ سال کی مدت میں ان کے نظریات اور بھی راسخ ہوچکے تھے۔ کیونکہ مغلیہ دَور کا جاگیردارانہ نظام بیمار ہی نہیں، انگریزوں کے صنعتی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی نظام کے مقابلہ میں جسد مردہ بن چکا تھا جس میں دوبارہ روح دوڑانا کسی بخت خاں کے اختیار میں نہ تھا اور نہ کوئی مذہبی تحریک اس کے حق میں دستِ مسیحا کا کام کرسکتی تھی۔ چنانچہ بدیہی نتائج سامنے آگئے اور سرسیّد سمیت ان کے تمام رفقاء نے مادی تفوّق کے اس نظریے سے اتفاق کرلینے کے بعد معاشرے کی اصلاحات کے لیے جو بیڑہ اُٹھایا تو

ادب کو ترسیل و تبلیغ کا وسیلہ قرار دینا پڑا۔ ادب میں مقصدیت کا تصور اجاگر کیا گیا اور ادب میں نشاۃ ثانیہ اسی مقصدیت کی منت پذیر ہے۔

غالبؔ کی عظمت یہ ہے کہ سرسیدؔ اور ان کے رفقاء کو ادبی منشور کا خام مواد انہوں نے اس خونیں انقلاب سے بہت پہلے مہیا کرنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ غالبؔ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کے پاس صنعت و سائنس ہی نہیں زیادہ ترقی یافتہ اسلحہ بھی ہے۔

فیضؔ کے بارے میں ان خطوط پر سوچنا غالباً قبل از وقت ہے لیکن ان کے ادبی اثر کو ملحوظ رکھیے اور ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیجئے تو بہت سی باتوں کا علم ہوتا ہے جنہیں رمز و کنایہ کی زبان میں سمجھنے والے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ بین السطور نثری تحاریر میں تو کسی قدر قطعیت بھی ہو سکتی ہے لیکن اشعار کے بین السطور کا مطالعہ بقدر ظرف آگہی استنباط و استخراج پر منحصر ہوتا ہے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ فیضؔ کی متدین شخصیت کا فکری رچاؤ اور اس کا دھیما مزاج قدم قدم پر راہیں مسدود کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ فنی عجز نہیں ہے بلکہ فنی حسن ہے اور اسے سمجھنے کے لیے فیضؔ کے مزاج اور ان کی فنی انفرادیت کا سمجھنا ضروری ہے۔

غالبؔ کے مزاج میں کبھی کبھار دھول دھپا بھی نظر آتا ہے۔ فیضؔ کے متعلق جس قدر معلومات فراہم ہوئے، ان میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرے۔ غالبؔ کے مزاج کی شگفتگی تو فیضؔ کے یہاں ضرور ہے، لیکن ظرافت کا وہ عنصر جو غالبؔ کی شخصیت میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے وہ فیضؔ کے یہاں مطلقاً موجود نہیں ہے۔

باعتبار شخصیات غالبؔ اور فیضؔ میں متعدد فرق ہیں۔ غالبؔ کا بچپن ناز و نعم میں گزرا اور آگرہ کے فوجی چھاؤنی ہونے کے باوجود اس شہر میں جگہ جگہ پر قمار خانے، شراب خانے وغیرہ بنے ہوئے تھے اور اخلاق باختہ فوجی سپاہیوں نے جو ماحول پیدا کر رکھا تھا غالبؔ کا ذہن اسی ماحول سے اثر پذیر ہوا۔ فیضؔ نے قرآن سے ابتداء کی اور مذہبی ماحول میں تربیت پائی، وہ شروع ہی سے بالطبع سلیم رہے۔

جبکہ غالبؔ شروع ہی سے کھلنڈرے، لا اُبالی اور لاڈ اور پیار کی افراط سے بگڑے ہوئے تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں شادی کے بعد دہلی آ گئے۔ یہ ۱۸۱۰ء یا ۱۸۱۱ء کا زمانہ ہوگا۔ دہلی ایک تو ملک کا بیت السلطنت دوسرے تہذیبی لحاظ سے بھی ملک کا مرکز، فیضؔ کا سیالکوٹ پورے سو سال بعد بھی صحیح معنوں میں بڑا شہر نہیں بن سکا تھا۔ لہٰذا عام چھوٹے چھوٹے شہروں کی طرح فیضؔ کی تعلیم بھی سیالکوٹ میں پورے روایتی انداز سے چلی اور ان کی اُٹھان عام لڑکوں کی طرح ہوئی، سوائے اس کے کہ وہ شعر کہتے تھے کہ فطری تقاضا تھا اور اس پر داد بھی ملتی تھی۔ لاہور کی حد تک بھی کوئی خاص بات بجز اس کے کہ گورنمنٹ کالج میں پہنچ گئے، رونما نہیں ہوئی۔ کالج کے کچھ نہ کچھ اساتذہ کے قریب تو انہیں آنا تھا سو وہ آئے اور یہاں ان کی ادبی تربیت ہوگئی۔ غالبؔ کی ادبی تربیت دہلی کے مشاعروں میں ہوئی۔ دلّی کے شرفاء اور ان کی رنگین صحبتوں سے غالبؔ کے مشاہدے میں وسعت اور تجربات میں اضافہ ہوا۔ ان باتوں نے ان کی فطری ذہانت پر اور بھی صیقل کر دی اور سفر کلکتہ تو سونے پر سہاگہ تھا۔

فیضؔ کو سیالکوٹ میں نہ آگرہ جیسی صحبتیں ملیں اور نہ لاہور میں دلی کا سا دم خم تھا۔ فیضؔ کو ایک چیز غالبؔ کے مقابلہ میں زیادہ ملی اور وہ ہے زمانہ، جس میں ادبی اقدار بھی واضح اور متعین شکل میں موجود تھیں اور روز بروز سمٹ سکڑ کر چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ لہٰذا ترقی پسندی کا مفہوم بھی واضح ہو چکا تھا۔ فیضؔ کو سجاد ظہیر، ملک راج آنندؔ اور رشید جہاں کی صحبتیں بھی میسر آئیں اور جذبیؔ، سردارؔ جعفری، جاں نثار اخترؔ، مجازؔ، مخدومؔ وغیرہ کا ایک تازہ دم قافلہ بھی مل گیا۔ مجنوںؔ، فراقؔ، احتشام حسین، اخترؔ حسین رائے پوری اور آل احمد سرورؔ کے سے ناقدین بھی مل گئے، لہٰذا اُن کا فکر سفر آسان تھا۔ غالبؔ اس میدان میں تن تنہا نظر آتے ہیں، نہ کوئی ہادی نہ کوئی رہبر، اگر کوئی خضر طریقت ملا بھی تو......

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

...... کہ گروہ آگے بڑھ جاتے ہیں اور اپنا راستہ خود بناتے ہیں۔ فیضؔ نے اپنا راستہ خود نہیں بنایا ہے بلکہ ایک بنے ہوئے راستے پر وہ چلے ہیں۔ فیضؔ سے لوح وقلم چھن گئی تو......

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

کیا خوب کہا اور روداد بیان کی، اور اس کیفیت کو کیسی پر تاثیر زبان عطا کر دی، لیکن غالبؔ......

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

'اشک خونیں' سے اپنے دامن پر جنوں کی حکایاتِ خونچکاں' لکھتے رہے، کیونکہ ہاتھ قلم ہو چکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فیضؔ پر بیتی ہے۔ فیضؔ نے تاریخ لکھی ہے۔ جس کا وہ خود بھی ایک جزو ہیں، جزو ہی نہیں بلکہ جزو لاینفک ہیں۔ لیکن غالبؔ کے زمانے میں جو تاریخ رقم ہوئی ہے وہ بھی غیر معمولی تاریخ ہے۔

فیضؔ کے پانچوں مجموعے میرے پیش نظر ہیں۔ نقش فریادی (۱۹۴۱ء) دست صبا (۱۹۵۳) زنداں نامہ (۱۹۵۶) دستِ تہہِ سنگ (۱۹۶۵ء) اور سروادی سینا (۱۹۷۱ء)۔ گویا یہ ۳۰ سالہ ادبی متاع ہے جسے بیک نظر دیکھنا اور پرکھنا ممکن ہے، گویا ۳۰ سال کی عمر میں پہلا اور ساٹھ سال کی عمر میں پانچواں مجموعہ چھپ کر شائع ہوا۔ یہ ۱۹۷۶ء میں ہے۔ اب فیضؔ صاحب کی عمر ۶۵ سال ہے اور کم و بیش چالیس پینتالیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی ادبی عمر تقریباً آدھی صدی کو محیط ہے۔

غالب (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹) بہتر برس جیے اور ان کی ادبی عمر بھی پچاس پچپن

سال سے کم نہ ہوگی، اُردو کا ایک مختصر دیوان اور فارسی دیوان اُن کی شاعری کی کل متاع ہے اور خود وہ اس بات کا تقاضہ کرتے تھے کہ......

فارسی خواں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ نیست

میں غالبؔ اور فیضؔ کے اُردو کلام کا موازنہ کرنے کی کوئی نیت نہیں رکھتا، صرف چند باتیں جو مجھے مشترک نظر آئی ہیں یا محسوس ہوئی ہیں، عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو انہیں سلسلہ وار اور مربوط صورت میں ملاحظہ فرمالیں۔

فیضؔ کے پہلے ہی مجموعے نے اپنا اعتبار قائم کر لیا تھا اور اس وقت کے ادبی جغادریوں نے ان کا لوہا مان لیا تھا لیکن بہت سے شاعروں نے اور نقادوں نے ناک بھوں بھی چڑھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ محض فیضؔ ہی نہیں پوری ترقی پسند تحریک اور اس کے وابستگان مطعون و مقہور ہوئے، یہ استثناء ہر زمانے میں رہا ہے۔ غالبؔ کو بھی اس کا سامنا رہا۔ فیضؔ نے اس کی پروا نہیں کی اور کبھی کسی معقول آدمی نے ایسی باتوں کی پروا نہیں کی۔ وہ زمانہ اچھا بھی تھا اور برا بھی، اچھا اس اعتبار سے کہ ترقی پسند تحریک چل کر مقبول ہو رہی تھی۔ اس وقت کے نوجوانوں نے فیضؔ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی شاعری کا پُرجوش خیر مقدم ہوا۔ علی سردار جعفری (لکھنؤ کی ایک رات، ص: ۱۹۰، مطبوعہ فیضؔ نمبر افکار، کراچی ملاحظہ ہو) جیسے فیضؔ کے دوستوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

زمانہ بُرا اس لحاظ سے تھا کہ جنگ (دوسری عالمگیر جنگ) ہو رہی تھی اور برصغیر کے لوگوں کے اعصاب اس جنگ سے بہرحال متاثر تھے۔ برصغیر میں آزادی کی جنگیں بھی جاری تھیں اور ترقی پسند تحریک بھی، مسلم لیگ اور کانگریس کی چپقلشیں بھی جاری تھیں، آزادی کا کوئی واضح اور متعین نقشہ تمام لوگوں میں یکساں طور پر عام نہ تھا، انتشار اور خلفشار کی صورت تھی۔ ترقی پسندوں میں بھی طبقات بن رہے تھے۔ اس کے باوجود فیضؔ کے اس مجموعہ کا شائع ہونا اور آناً فاناً مقبول ہو جانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس مجموعہ میں قطعات کے علاوہ نظمیں اور غزلیں بھی شامل تھیں۔ نظموں میں عام طور پر آج

کی رات، مجھ سے پہلی سی محبت، چند روز اور مری جان، کتے بول وغیرہ بے حد مقبول ہوئیں۔ بلکہ بعض نظموں کے اشعار زبان زد خلائق ہوگئے۔ مقبول غزلوں میں دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے، بھی شامل تھی۔ حقیقتاً اس مجموعے میں سرود شبانہ، انتظار، تہہِ نجوم، رقیب سے، اور تنہائی، بھی اچھی اور خوبصورت نظمیں ہیں جن سے مستقبل کے فیضؔ کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے کیا تیور ہیں اور کیا دم خم ہے۔ موضوع سخن ایک ایسی نظم ہے جو صاف صاف پتہ دے رہی ہے کہ فیضؔ کی رومانویت بعض حقائق (تلخ حقائق) کو سمجھ کر شاعروں کی توجہ اسی طرف لانا چاہتی ہے۔ وہ دعوت دیتے ہیں کہ اس خیالی طلسماتی دُنیا سے نکل کر زندگی کے سلگتے ہوئے تجربات کی بھٹی میں خود کو تپا کر کندن بنانا سیکھو۔

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی موضوع ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

لیکن آپ نے دیکھا کہ فیضؔ نے سرزنش نہیں کی بلکہ ہلکا سا طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ اسی مقام پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ فیضؔ نے کس قدر چابک دستی اور فنکارانہ طریقے سے اپنی بات کہہ دی ہے۔ فیضؔ کا خطاب نوجوان شاعر سے ہے جس کے اعصاب پر عورت سوار ہے لیکن فیضؔ نے یہ خطاب براہ راست نہیں کیا۔ غالبؔ نے جنت نگاہ اور فردوس گوش کا المناک انجام پیش کیا ہے۔ دمان، باغبان و کف و گل فروش کا المیہ دکھایا ہے کہ داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔ فیضؔ نے مستقبل کے لیے کوئی حوصلہ شکن بات نہیں کی ہے۔ لیکن جیسا میں نے کہا کہ میں یہاں دونوں کے کلام کا موازنہ نہیں کروں گا کیونکہ دونوں کے

افتادِ مزاج میں نمایاں فرق ہے البتہ دیکھنے کی چیز جو ہے وہ یہ ہے کہ غالبؔ کی طبعی شگفتگی اس المیہ میں بھی حسن اور جمال کی تازگی کو برقرار رکھتی ہے اور فیضؔ بھی اپنی اس نظم میں اول تا آخر تازہ دم اور شگفتہ رہتے ہیں۔ یہی وہ مقامات ہیں جو فیضؔ اور غالبؔ میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔

میں اس بات کو نہایت مبتدیانہ اور طفلانہ بات سمجھتا ہوں کہ فیضؔ اور غالبؔ کی زبان کی تراکیب لے کر بیٹھ جاؤں اور موازنہ شروع کردوں یا فیضؔ کے تمام مجموعہ ہائے کلام کے ناموں کے سلسلے میں غالبؔ کے دیوان کی چھان پھٹک شروع کردوں۔ میں اس بات کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا کہ آخر، آخر میں آن کر حضرت اثرؔ لکھنوی نے فیضؔ کی شاعری کو پسندیدگی کا فتویٰ دے دیا تھا۔ اس فتویٰ کے دینے نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور فیضؔ کی شاعری کی شان میں اس سے کسر نہ رہ جاتی، یہ محض وضع داری اور پاس خاطر کے سوا کچھ بھی نہیں، دوسرے یہ کہ غالبؔ کے کلام سے اثر لینا یا دیوان غالبؔ کو حرز جاں بنا کر رکھنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو شاعروں کے علاوہ غیر شاعروں میں بھی مشترک ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ دیوانِ غالبؔ کے مطالعہ کے وقت فیضؔ نے فکر غالبؔ سے اکتساب کیا ہوگا، چراغ سے چراغ جلائے ہوں گے۔

فیضؔ کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ایک ذہین آدمی کی طرح غالبؔ سے فیض اُٹھایا اور غالبؔ کے افکار و نظریات کو من و عن قبول نہیں کیا، قطع و برید کتر بیونت اور کاٹ چھانٹ سے بھی کام لیا۔

یہ تو غالبؔ کی ہمہ گیری آفاقیت اور ہمہ جہت دل آویزی ہے کہ وہ ہر نوع کے افراد کو متاثر کرتے ہیں، لیکن بیسویں صدی کے بیشتر دانشوروں نے بقدر آگہی غالبؔ سے عام طور پر اور فیضؔ نے خاص طور پر فیض اُٹھایا اور اپنے فن کو با اعتبار بنایا۔

میں یہاں پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ فیضؔ نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ دیوان غالبؔ سامنے رکھ کر ان کی زمینوں میں غزلیں لکھ ڈالیں، ان کی تراکیب اُڑا لیں، ان کی

باتوں کو اپنے انداز میں پیش کر دیا یا ان کے قافیوں پر اپنے قافیے باندھ دیئے، ظاہر ہے کہ یہی وہ مبتدیانہ افعال ہیں جن سے فیضؔ کی طبیعت کو ابا کرنا تھا سو انہوں نے کیا۔ انہوں نے غالبؔ سے تفکر و تعقل کی بنیاد پر تخیل کا خمیر اُٹھانے کا ڈھنگ سیکھا اور اپنے ڈھنگ اور اپنے فن کی مدد سے اپنے تجربات، مشاہدات اور واردات کو بیان کیا۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ وہ میرؔ سے متاثر نہیں ہوئے۔ ہوئے لیکن میرؔ کی داخلیت کو خود پر طاری نہیں کیا کہ اس طرح غزل ذات کے اندھے تہہ خانے میں اتر کر معاشرے سے اپنا ناطہ توڑ لیتی ہے اور روح عصر سے اس کا رشتہ براہ راست باقی نہیں رہتا۔ میرؔ کا روح اثر سے ناطہ رہتا بھی ہے تو دتی اور دتی کے مرثیوں کے حوالہ سے ورنہ زیادہ تر وہ تصوف میں پناہ لیتے ہیں اور ذہنی فرار اختیار کرتے ہیں۔

عصری تقاضوں سے سودا سے فیضؔ متاثر ہیں۔ لیکن مرزا سودا کی معروضیت کی وجہ سے۔ ہاں یہ درست ہے کہ اس معروضیت میں میرؔ کی داخلیت والی تاثیر نہیں ہے۔ لیکن محض تاثیر بجائے خود ہمارے زمانے میں کوئی مستحسن چیز نہیں رہی ہے۔ اس میں سوچ اور فکر کے لیے غذا بھی ہو اور مغز بھی۔ غالبؔ نے بھی میر اور سودا دونوں کو بڑا شاعر مانا لیکن دونوں میں سے کسی ایک کی پیروی نہیں کی۔

ذوقؔ روزمرہ اور محاورے پر جان چھڑکتے تھے اور ملک الشعرا بنے بیٹھے تھے۔ غالبؔ اسے بھی خاطر میں نہ لائے بلکہ اپنی راہ خود بنائی۔ یہی فیضؔ نے کیا کہ غزل کے راستے پر میر اور غالبؔ کے سے مینارۂ نور موجود تھے مگر بقدر ضرورت دونوں سے استفادہ کیا اور کسی ایک کا آنکھ بند کر کے اتباع نہیں کیا۔ سوؔدا کی معروضیت کی اُنہیں نظموں میں ضرورت تھی۔ سو وہ مزاجاً انہیں راس آئی اور اس سے انہوں نے استفادہ کیا لیکن سودا کے مزاج میں تضحیک و تمسخر کا جو مادہ ہے وہ فیضؔ کا کام نہ تھا صرف نظم کی تکنیک میں جس معروضیت کی ضرورت ہوتی ہے اسے لے لیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سودا کو فیضؔ نے (دیکھئے زنداں نامہ) ایک لمبے عرصے تک مطالعہ میں رکھا، متاثر بھی ہوئے لیکن یہ کوئی خطرناک بات نہ تھی اور نہ سودا کا کلام

چھوت کی بیماری ہے۔ سودا تو بلا وجہ میر سے موازنہ کے سلسلے میں مطعون رہے۔ آخر سودا کے کلام میں کیا کچھ نہیں ہے۔ سودا میں زبردست قوت بیان ہے اور اظہار خیال کے نادر اسالیب پر انہیں دسترس حاصل ہے۔ سودا کی نظم گوئی کے سلسلے میں طنطنہ بھی ہے، زور بھی اور شکوہ الفاظ بھی۔ ایک شاعر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جن راستوں سے اس کا پیش روگزرا ہے ان کے نشیب وفراز کو دیکھ کر اپنی راہ چلے۔ فیض نے یہی کیا ہے۔ سودا نے اپنے فن میں نہ تو روح عصر سے قطع نظر کیا اور زندگی کے اجتماعی نظام میں اقتصادی ڈھانچے کو فراموش کیا، زندگی کے مادی اقدار کو ان کے صحیح تناظر میں رکھ کر دیکھا، خواہ مخواہ کی ماورایت اختیار نہیں کی۔ غالباً یہی وہ مشترک اقدار ہیں جنہوں نے فیض کو سودا کی طرف متوجہ کرلیا۔

آیئے ایک اور ورق اُلٹ دیجے۔ ''دست صبا'' ملاحظہ کیجئے۔ قطعات سے ابتدا ہوتی ہے۔ متاع لوح وقلم والا قطعہ بھی یہاں موجود ہے جو تقریباً زبان زد خلائق ہے اور اس کی شہرت دُور دُور تک پہنچی ہے۔ اس قطعہ کی مقبولیت میں اس کے پس منظر کو بھی دخل ہے لیکن انہیں قطعات میں......

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب ترے بازو ترا کنار نہیں

......بھی شامل ہے۔ جس میں غالب کا لہجہ اور طریق اظہار چغلی کھاتا ہے اور اسی مجموعہ میں......

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہل مصر وضع تکلف تو دیکھئے
انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے بیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

......جیسے قطعات صاف غالبؔ کے اُسلوب کو آئینہ دکھا رہے ہیں۔

اسی مجموعہ میں صبح آزادی (اگست ۱۹۴۷ء) کا داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر کی روشنی جو شاعر کو نظر آئی ہے اس پر ایک طبقے نے بڑی لے دے کی ہے اور آج تک کر رہا ہے۔ میں فیضؔ کا وکیل نہیں ہوں اور نہ یہاں صفائی دینے بیٹھا ہوں۔ غالباً یہ میرا موضوع بھی نہیں ہے، لیکن مجھے اس نظم کے مزاج میں بجز اس کے کہ جن لوگوں نے صبح آزادی کی خاطر قربانیاں دیں ابھی ان کے خواب کی تعبیر باقی ہے کیونکہ......

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

......اور کوئی بات نظر نہیں آتی اور یہ وہ باتیں ہیں کہ گناہ نہیں۔ ہمارے بہت سے قائد بھی یہی کہتے ہیں کہ اس میں کوئی مضائقہ کم از کم مجھے نظر نہیں آتا، بات دور نہ جا پڑے، نظریہ کے اظہار کی آزادی ضروری ہے۔ غالبؔ نے بھی نظریہ کا کھل کر اظہار کیا اور مومنؔ خاں کے مثنوی کے جواب میں 'مثنوی درد ہا بیت' لکھ کر کسی ایک نظریہ کو رد کیا اور اپنے نظریہ کو پیش کیا۔ فیضؔ نے تو نہایت بے ضرر سی بات کہی ہے اور اپنے معصوم سے نظریہ اور معصوم سی آرزو کا اظہار کیا ہے، کون شخص ہے جو استعمار اور استحصال کو پسند کرے گا اور کون نہیں جانتا کہ ع 'منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے' اور اس کے نتائج بالآخر کیا ہوئے۔ علاوہ ازیں فیضؔ نے پاکستان کو ملحوظ نہیں رکھا۔ پورے برصغیر کو اس میں شامل کیا ہے۔ اس تناظر میں اس نظم کی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔

سرِ مقتل کے عنوان سے جو قوالی شامل کی گئی ہے وہ بھی خوب ہے۔ یہاں میں ایک بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ بعض الفاظ اور ان کی تراکیب بعض شعراء سے مخصوص ہو کر ایک خاص اہمیت حاصل کر لیتی ہیں۔ فیضؔ کو سرِ مقتل، سروادیٔ سینا وغیرہ کی طرح 'سر' کا لفظ اسی اضافت کے ساتھ استعمال کر کے ایک خاص قسم کی معنویت پیدا کرنے کا ڈھنگ معلوم ہے۔ مجھے یاد ہے سجاد ظہیر کے مرنے پر انہوں نے مرثیہ لکھا جس کا ابتدائی شعر تھا۔

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے

فیضؔ صاحب اس کی گواہی دیں گے کہ میں نے اسی 'سرِ مقتل' کی تعریف کی کیونکہ میرے نزدیک سرِ مقتل کی معنویت فیضؔ کے علاوہ سجاد ظہیر کے سلسلے میں اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا، چنانچہ اس قسم کی تراکیب جو خود فیضؔ کی وضع کردہ اور اختیار کردہ ہیں ان کی اُپج کے محرک یقیناً غالب ہیں۔ چنانچہ بجائے خود نظم تو اپنا ایک تاریخی پس منظر رکھتی ہی ہے، سرِ مقتل کا عنوان بھی اس پسِ منظر سے چسپاں ہے۔ اس مجموعے میں تمہارے حسن کے نام، نثار میں تیری گلیوں پہ، شیشوں کا مسیحا' زنداں کی ایک صبح، زنداں کی ایک شام، اور 'یاد' ایسی نظمیں ہیں جو بہ آسانی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ اس مجموعہ میں غزلیں بھی خوب ہیں اور پہلے مجموعے کے مقابلہ میں یہ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے نہ صرف بہتر ہے بلکہ موثر بھی ہے۔ غالبؔ کا یہ خیال......

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

فیضؔ کے یہاں دوسری شکل اختیار کرتا، باعتبارِ خیال بھی اور باعتبار ہست بھی۔

باقی ہے لہو دل تو ہر اک اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

......اور اسی زمین میں......

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

اس عزم کو دُعا دیجئے اور اب ذرا غالبؔ کے تیور بھی ملاحظہ کیجئے۔

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

......یہ اشعار بھی لائق ملاحظہ ہیں......

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

یہی وہ اشعار ہیں جنہیں مستقبل کے لوگ گنگنا کے اور بقول میرؔ......

گاتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

ہر بڑے شاعر کا یہی عزم ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ آج کا نہیں آئندہ کا شاعر ہے۔ چمن آرائی کا یہ عزم لائق ستائش ہے اور اس جذبے کو جس قدر استحسان کی نظر سے دیکھا جائے وہ کم ہے۔ غالبؔ کو بھی یقین تھا کہ کسی اور زمانے میں ان کی شاعری مقبول عام ہوگی، فیضؔ نے خواہ اس بات کا اظہار ابھی تک نہ کیا ہو لیکن ہمیں یقین ہے کہ......

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

......کہنے والا ہمیشہ یادگار اور محترم رہے گا۔

اسی مجموعے میں ''تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے'' بھی شامل ہے جو شہرۂ آفاق غزل ہے اور یہ شعر......

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

......تو حاصل غزل بھی ہے اور اپنے پس منظر کے سیاق و سباق سے چسپاں بھی۔

اسی مجموعے میں رنگ پیراہن کا خوشبو زُلف لہرانے کا نام، اصرار کروں یا نہ کروں، تمام کہتے ہیں۔ راحت جاں ٹھہری ہے۔ سمن عذاراں، سوا کر چکے ہیں ہم وغیرہ شامل ہیں۔ جن کے بہت سے اشعار میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور پائی جاتی ہے جو ہماری فکر کو متاثر کرتی ہے اور زبان کی جزالت غالب کے رنگ ڈھنگ یاد دلاتی ہے۔ نیز یہ احساس ہوتا ہے کہ نقش فریادی کے مقابلے میں دست صبا کی غزلوں میں شاعر بہت آگے بڑھ گیا ہے۔

زنداں نامہ میں فیضؔ کے شعور نے ارتقا کی ایک اور منزل طے کر لی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۶ء میں آج سے کوئی بیس سال قبل چھپا۔ اس کا پس منظر بھی اہل علم اور ارباب نظر کو بخوبی معلوم ہے۔ اس میں فیضؔ کے ایسے دوستوں کے تاثرات اور آرا بھی شامل ہیں جو جیل میں ان کے ہمراہ تھے۔ ان آراء کی مدد سے بہت سی معلومات اکٹھی ہوتی ہیں، لیکن یہاں تو یہ اندازہ کرنا مقصود ہے کہ فیضؔ نے غالبؔ سے کیا فیض اُٹھایا اور فکر فیضؔ کا سفر کس منزل تک پہنچا۔ لفظوں کی در و بست کا مطالعہ ضمنی سہی لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ فیضؔ کے شعوری ارتقاء میں لفظوں نے بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔

فیضؔ کے فکری نظام کی ترسیل میں ان لفظوں کے رنگوں اور عکسوں کا بھی عمل شامل ہے۔ لفظوں کا مزاج اور آہنگ فیضؔ خوب پہچانتے ہیں اور نہایت احتیاط سے ان کو استعمال کرتے ہیں، لیکن لفظوں کی خاطر شعر نہیں کہتے ہیں۔ شعر کی خاطر لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فیضؔ کے تخیل سے لفظ دبے رہتے ہیں۔ لفظوں سے تخیل نہیں بنتا، یہ بات غالبؔ نے خوب پہچانی تھی۔ مشکل سے مشکل مفاہیم غالبؔ

کے یہاں تلاش کیجئے الفاظ اس کے تابع ہوں گے، مفہوم لفظوں کے تابع نہ ہوگا۔ اے حبیب عنبر دست ملاحظہ ہو کہ کسی خاتون نے جیل میں فیضؔ کو پھولوں کا تحفہ بھیجا۔ اب شاعر کے تخیل کی پرواز دیکھئے اور سوچئے کہ غالبؔ کو چکنی ڈلی' پر زبردستی فکر سخن کرنا پڑی تھی۔ یہاں صرف اظہار تشکر و امتنان ہی نہیں کنج زنداں میں یہ تحفہ ہزار ہا خیالات سلسلہ در سلسلہ لایا ہے، سینٹرل جیل حیدرآباد میں ۲۸، اور ۲۹ اپریل ۱۹۵۳ء عین موسم بہار میں یہ ارمغان پہنچا تو شاعر کی فکر نے عمل ارتباط کی کتنی وادیاں طے کر ڈالیں......

کسی کے دست عنایت نے کنج زنداں میں
کیا ہے آج عجب دل نواز بند و بست

مہک رہی ہے فضا زُلف یار کی صورت
ہوا ہے گرمئ خوشبو سے اس طرح سرمست

ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گل بدن گویا
کہیں قریب سے گیسو بدوش غنچہ بدست

لیے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست

ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست

یہ شعر حافظ شیراز اے صبا کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیب عنبر دست

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی!
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

اسی مجموعہ میں 'ملاقات' اے روشنیوں کے شہر، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، دریچہ، درد آئے گا دبے پاؤں، بنیاد کچھ تو ہو، اور کوئی عاشق کسی محبوبہ سے، جیسی معرکتہ الآرا نظمیں شامل ہیں جن کا آج تک غلغلہ ہے۔ اسی مجموعہ میں وہ غزلیں شامل ہیں جن میں فیضؔ کی فکر ایک زینہ اور بلند ہوگئی۔

دستِ تہہ سنگ، ۱۹۶۵ء کا مجموعہ کلام ہے۔ اس میں بھی اولاً قطعات، ثانیاً منظومات اور ثالثاً غزلیات و متفرق اشعار کا التزام عمل میں آیا ہے۔ نظموں میں 'دستِ تہہ سنگ آمدہ، سفر نامہ پیکنگ سنکیانگ، آج بازار میں پابجولاں چلو، حمد، دو مرثیے، کہاں جاؤ گے، خوشا ضمانت غم، جب تیری سمندر آنکھوں میں، رنگ ہے دل کا مرے، وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں 'آج بازار میں پابجولاں چلو، ایک ایسی نظم ہے جس میں وارفتگی، سرخوشی اور سرمستی کی نغمگی اور غنائیت کا جادو جگایا گیا ہے۔ غالبؔ تو قرض کی پیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ فاقہ مستی رنگ لائے گی، لیکن یہاں تو عالم ہی کچھ اور ہے۔ لاہور جیل میں ۱۱ر فروری ۱۹۵۹ء کو رقم ہونے والی یہ نظم کیا تیور رکھتی ہے۔

چشم نم جان شوریدہ کافی نہیں
تہمت عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
دستِ افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک برسر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو

سروادی سینا ۱۹۷۱ء میں چھپی اور یہی تازہ ترین اُن کا مجموعہ کلام ہے۔ اس کا انتساب ایک ناتمام نظم ہے جس کی روانی اور تیکھا پن غضب کا ہے۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء کی کل متاع اس میں موجود ہے۔ نظمیں بھی اور غزلیں بھی۔ یہی وہ کلام ہے جو ہر اعتبار سے لائق ستائش ہے اور یہی وہ کلام ہے جس کے بارے میں اہل فکر و نظر غور و فکر کرسکتے ہیں۔ اسی کلام میں وہ نقوش تلاش کئے جاسکتے ہیں جو فکر غالبؔ

سے قریب اور آہنگ غالبؔ کی بازگشت ہیں۔ کیا نظم اور کیا غزل ہر صنف میں فیضؔ منفرد نظر آتے ہیں۔ قبل اس کے کہ آپ میرے ساتھ ساتھ اس کا مطالعہ کریں آیئے ذرا چند باتوں پر غور کر لیجئے تا کہ جن نتائج کا استخراج مجھے منظور ہے اس میں آپ بھی شریک ہو جائیں۔

اب تک چاروں مجموعوں کے انتخاب کلام میں، میں نے اسی بات پر زور دیا ہے کہ فیضؔ کے تخیل میں جو جذبہ اور ذہن کارفرما ہے اور اس تخیل کے اظہار میں خارجیت و داخلیت کا توازن تفکر پر مائل کرتا ہے وہ محض تخیل نہیں ہے بلکہ تہذیب نفس اور تربیت ذہن کا شعور ہے جو ایک انتہائی وضعدار، شریف النفس اور خود دار انسان کا قاری پر خوش گوار نقش مرتسم کرتا ہے۔ جوں جوں یہ انسان حالات کا، حادثات کا اور ہونے والے حالات کا مقابلہ کرتا ہوا چلتا ہے۔ وہ تہذیب نفس کے عمل کو جاری رکھتا ہے اور شرافت کے اقدار کو سرنگوں نہیں ہونے دیتا۔ حالانکہ اسے تختۂ دار کا سایہ اور سر مقتل قاتلوں کا بہیمانہ طرز عمل صاف نظر آتا ہے لیکن نہ تو وہ ہتھیار ڈالتا ہے اور نہ سمجھوتے کرتا ہے، بلکہ اسے اپنے نصب العین کی صداقت پر اور بھی پختہ یقین ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس مقتل میں اس کے ساتھ کروڑوں مظلوم ہیں جو سر سے کفن باندھے ہوئے استحصال و استعمار کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ ان کی زبان ہے، وہ ان کا ترجمان ہے، اس کی کوئی ذاتی منفعت نہیں ہے، البتہ ذاتی نقصانات بہت زیادہ ہیں جن کی اسے بہر حال پروا نہیں۔

واضح رہے کہ ہمارا قاری، یعنی اس دور کا قاری شاعری میں محض جذبہ اور احساس کی خوبصورت ہیئت سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ ذہن اور دماغ کو مسلسل حرکت میں رکھنے کا عادی بن چکا ہے۔ اس لحاظ سے وہ غالبؔ، اقبالؔ، فراقؔ اور فیضؔ سے قریب ہے۔ اس کے سیاسی، اقتصادی، عمرانی، نفسیاتی، تاریخی اور معاشرتی نظریات، تعصبات، احساسات، جذبات اور خیالات مسلسل تغیر پذیر ہیں اور ذہنی طور پر وہ سماج

کو بدلنے پر آمادہ ہے۔ اسے متعدد سائنسوں کا علم اور شعور ہے اس کی ذہنی تربیت کا عمل جاری ہے اور اس کے شعور میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ شعور کی اس رو کو پکڑ کر زیادہ بڑی بات کہنا، زیادہ ذہانت کی بات کہنا اور اپنا ہمنوا بنانا یا کم از کم اپنے خیالات سے ہمدردی پیدا کر لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ اگر کوئی شاعر قاری کے معیار پر پورا نہیں اُترتا یا اس کا ذہنی قد ہمارے اقدار کے لباس سے چھوٹا ہے تو وہ خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔ غالبؔ اور فیضؔ کے کلام میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو نکھار آ رہا ہے اس کی وجہ ان کی ذہانت طباعی اور وقت کی رو کو پہچان کر اپنی بات کہہ گزرنا اور منوا لینا ہے، ورنہ کتنے ہی شاعر آج مطلقاً اپیل نہیں رکھتے اور امتداد زمانہ نے ان کے رنگ کو پھیکا کر دیا ہے، یا وقت کا تیز دھارا ان کی شاعری کے خس و خاشاک کو بہائے لئے چلا جا رہا ہے۔

ابتدا ہی میں، میں نے یہ عرض کر دیا تھا کہ غالبؔ کو برصغیر میں اُنیسویں صدی کا مرتا ہوا جاگیردارانہ نظام ملا تھا۔ دیہی معیشت اور صنعت کا زوال ہو چکا تھا اور اس خلا کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجارتی اور نیم سرمایہ دارانہ نظام چلا رہا تھا۔ غالبؔ نے آنے والے نظام کو محسوس کر لیا تھا۔ فیضؔ نے یہ بھی محسوس کر لیا ہے کہ استحصالی و استعماری نظام جو سرمایہ دارانہ صنعتی نظام بھی مر رہا ہے، لیکن پوری طرح مر نہیں سکتا اور مظلوموں کو کچل رہا ہے۔ لہٰذا آنے والا دور جو معاشی ہمواریوں سے پاک ہوگا اور اس میں استحصال کی گنجائش نہیں ہوگی، ایک صحتمند سماج ہوگا جس میں انسان کی فکر کا سورج طلوع ہو جائے اور اس روشنی میں بہت کچھ نظر آئے گا۔ چنانچہ جو کچھ نظر آئے گا اس میں شاعروں، دانشوروں اور فنکاروں کی قربانیوں کی داد دی جا سکے گی اور ان قربانیوں کو محسوس کیا جائے گا۔

تاریخ کی مادی تعبیریں اور جدلیاتی نظریہ کی ان گنت باتیں ان اشعار اور ان کے فکری شعور میں جھلکیں گی۔ آیئے انہی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذرا فیضؔ کے تازہ ترین مجموعہ کلام کا مطالعہ کریں۔

'لہو کا سراغ' کا ایک ایک شعر خوب ہے۔ آخری شعر ملاحظہ ہو......

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

یہ چار مصرعے بھی قابل ملاحظہ ہیں......

زنداں زنداں شور انا الحق محفل محفل قلقل مے
خون تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رت پھولوں کی آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے ماتم ماتم شہر بہ شہر

ایوب خاں کے الیکشن کے پس منظر میں گلاب کے پھول کا نشان اور فیضؔ کی یہ کراہ کس قدر پُر معنی ہے۔ فیضؔ کی اس نادر دریافت پر بھی غور کیجئے۔

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں ناب جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

'یہاں سے شہر کو دیکھو' تو 'کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل' بے حد موثر نظم ہے۔

'غم نہ کر غم نہ کر' بلیک آؤٹ، سپاہی کا مرثیہ، ایک شہر آشوب کا آغاز، سوچنے دو، سر وادیٔ سینا، دُعا، دلدار دیکھنا، ہارٹ اٹیک، مرثیے، خورشید محشر کی لو، بالیں پہ کہیں، جرس گل کی صدا، فرش نومیدۂ دیدار، ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند، حذر کرو مرے تن سے، نہایت اہم اور یادگار نظمیں ہیں۔ داغستانی شاعر رسول حمزہ کے کلام کا ترجمہ بھی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس مضمون کا خاتمہ 'ایک شہر آشوب کا آغاز' پر ہو۔

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفہ بے طلباں ہے

گھر رہیے تو ویرانیِ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

پیوندِ رہِ کوچۂ زر چشمِ غزالاں
پابوسِ ہوس افسرِ شمشاد قداں ہے

یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں
واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپے جاں ہے

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مہر اس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

○○

ڈاکٹر مسعود حسن خاں

دھنک رنگ، لمحوں کا شاعر

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیضؔ ہماری محفلِ شعر میں ''اعترافِ شکست'' اور ''ارتکاب گناہ کی رومانی معذرت'' کے ساتھ داخل ہوا ہے۔ اس دور میں ان کی تمام تر متاع ''کھوئی ہوئی یاد''، انتظارِ بے انداز''، ''دکھتا ہوا دل'' فریاد کے ٹکڑوں'' مجبور جوانی کے داغدار ملبوس'' پر مشتمل تھی۔ یہ عنفوان شباب کی شاعری تھی۔ لیکن اس میں بھی لذت کی بجائے ایک تقدس ہے۔ وہ تقدس جو جسم کے نرم وگرم احساس اور اس کی جمالیاتی حرمت سے پیدا ہوتا ہے اور جس کا تکملہ 'سرودِ شبانہ' کے اس مصرع میں ہوتا ہے......

آرزو، خواب، ترا روئے حسین

''اداس اور معصوم'' یہ دو لفظ نوجوان فیضؔ کے دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتے ہیں۔ اداس خود اور معصوم محبوب۔ اسی اداسی اور معصومیت سے فیضؔ نے حسن کا وہ خالص رومانی تصور پیدا کیا ہے جو بیک وقت اس دُنیا کا بھی ہے اور اس دُنیا کا بھی جو موت کا محبوب نظر ہے۔ فاصلہ، دوری اور انتظار اس کا خمیازہ ہے۔ یہ لازمہ اس وقت اور حسین دکھائی دیتا ہے جب فیضؔ کسی ارضی پیکر ہی کو متصور کرتے ہیں اور رسیلے ہونٹوں، احمریں آنکھوں، مرمریں بانہوں، دراز قد اور گداز جسم کے افسانے شبِ مہتاب میں بنتے ہیں۔ ان افسانوں کا پس منظر وہ بام و در، رہ گزر اور اشجار ہیں جو کبھی

کبھی منظرِ فطرت کے طور پر اس دور کی شاعری میں جھلک اٹھتے ہیں۔

رومان کی اس سرزمین میں انجام محبت کی نشان دہی تمناؤں کے ان مزاروں سے کی جاتی ہے جن کی خراشیں شاعر کے دل میں محفوظ ہیں۔ لیکن جب یادوں کے ان مقبروں سے بھی ناصبور نگاہیں اور مخملی باہیں جھانکتی اور بلاتی ہوئی نظر آتی ہیں تو شاعر یوں پھوٹ پڑتا ہے......

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظر راہیں
وہ ہر اِس ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں
وہ انتظار کی راتیں طویل و تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں، وہ مخملی بانہیں
کہانیاں تھیں کہیں کھوگئی ہیں میرے ندیم

فیضؔ نے جب ان کہانیوں کو کھویا تو اپنے آپ کو پایا۔ خود کو اس طرح پایا کہ بھرے بازار میں کھڑے تھے۔ جہاں خاک میں لتھڑے ہوئے اور خون میں نہلائے ہوئے جسم جا بجا بک رہے تھے۔ وہ یہ زمانہ تھا جب ہمارے ادب میں نئی سماجی اقدار ڈھلنا شروع ہوگئی تھیں۔ زندگی کے نئے تقاضوں کی ترجمانی ہونے لگی تھی، اور بعض سیاسی تحریکیں ادب میں پھیل رہی تھیں۔

فیضؔ نے بھی محسوس کیا......

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے

یعنی زمانے کے دکھوں کی طرف!

''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ'' سے فیضؔ کے یہاں دو قسم کی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ رومان اور خالص جمالیاتی اقدار کے علاوہ زندگی کی دوسری قدریں بھی ان کے یہاں ابھرنے لگتی ہیں۔ دوسری یہ کہ حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر کی وجہ سے رخِ محبوب کے سیال تصوّر کی مثالیت ختم ہونے لگتی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان تبدیلیوں اور پھر انجام کار کا ذکر کریں، فیضؔ کی ابتدائی نظموں کے بارے میں یہ

کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان پر انگریزی اور اُردو کی رومانی شاعری کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے تخیل کو نئی تشبیہیں اور استعارے تر شانے کا چسکا ہے۔ جذبہ اور تخیل کا حسین توازن ہے جو کہیں کہیں پر محاورے اور زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے۔ شاعر مبتلائے واردات بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ دونوں کے درمیان ایک جمالیاتی بے تعلقی ہے جس سے نقوش جمیل تر ہو گئے ہیں۔ اجنبی دُنیا، خوَاب گاہ اور انتظار کے رومانی تصورات اور گداز جسم، دراز قد اور طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کے افسانوں نے اس دور کی شاعری کو چاندنی کی سی چھٹک بخشی ہے اور آخر میں اداس اور دُکھ کے بار بار آنے والے سادہ اور گہرے لفظ ہیں جن میں درد کی کسک اور کڑوی مٹھاس کا لطف، ہے۔

یہ سادہ دکھ سے بھرا، جمال کا پرستار، معصوم ذہن جب غم دہر کے جھگڑے میں پڑتا ہے تو محبوب کا رومانی تصور بھی بدل جاتا ہے۔ نئی سماجی اقدار کا شعور یک لخت اور پہلی بار جب ہمارے سامنے یہ نقشہ لاتا ہے کہ......

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

تو ہمارے جمالیاتی احساس کو ٹھیس سی لگتی ہے۔ اگر یہ اشعار جوش کے قلم سے ٹپکتے تو دھچکا نہ لگتا کیونکہ ان کی بغاوتوں اور جراُتوں کے ہم عادی رہے ہیں۔ لیکن فیضؔ کے یہاں غازہ و رخسار اور ضیائے تبسم کے ساتھ، خون اور پیپ کا تصور! بہت سے شاعر اور نقاد چیخ اٹھے۔ وہ تو خود ہی فیضؔ نے جب نظم کے خاتمہ پر اس کا ازالہ اس طرح کیا کہ......

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے

......تو یک گونہ تسکین ملی۔

لیکن یہیں سے فیضؔ کی یک رنگی شاعری میں دوسرے رنگ کا تار ملتا ہے۔ اس نئے شعور نے فیضؔ کا تصورِ محبت ہی بدل دیا......

تو گر میری بھی ہو جائے
دُنیا کے غم یوں ہی رہیں گے

چونکہ فیضؔ نے جمالیاتی قدر کو افادیت کے سانچے میں ڈھالنا ابھی شروع ہی کیا تھا۔ اس لیے وہ ٹیکنیک میں اس عمل کو مسلسل استعمال کرتے ہیں۔ وہ حسن کے پس منظر میں قاری کے ذہن کو بے تکے سماجی استعارات سے دھچکا پہنچاتے ہیں۔ اس کی بڑی اچھی مثال ان کی نظم 'رقیب سے' ہے جس کے ابتدائی حصے میں ساحر آنکھوں اور ان کی بے سود عبادت کا ذکر ہے۔ اس واردات کا ذکر ہے جو ان کے اور رقیب کے درمیان مشترک ہے، اور اس کے بعد اس مشترکہ سبق کا ذکر ہے جس کے سمجھنے کا صرف رقیب اہل ہے۔ نظم اپنے مضحکہ خیز منتہا کو اس وقت پہنچتی ہے جب شاعر اس شعر پر آتا ہے......

یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لیے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لیے آتا ہے

یہ ہے شاعر کا سفر جمال سے افادہ تک! ساحر آنکھوں سے توند کے سیلاب تک!! اس قسم کے رخنے ان کے کلام میں اور بھی ہیں شاید اسی لیے 'دستِ صبا' میں جا کر فیضؔ نے اس ٹیکنک کو یا تو ترک کر دیا ہے یا اس طرح گھلا ملا دیا ہے کہ آتشِ گل اور آنچ کا فرق ہی مٹا دیا ہے۔ اس قسم کی ایک اچھی مثال نقش فریادی ہی میں 'موضوعِ سخن' کے اندر مل جاتی ہے۔ جس میں جذبے کا سفر 'حسنِ دلآرا کی دھج' سے لے کر آدم و حوا کی اولاد کے تذکرے تک ہے۔ لیکن جس میں شب خون کی سی کیفیت نہیں ملتی۔ ''مرے ہمدم میرے دوست'' میں یہی جذبہ فیضؔ کے لہجے میں نرمی اور خلوص رفاقت کی وجہ سے بے نور اور اجڑے ہوئے دماغوں کی روشنی بخشتا ہے۔

فیضؔ کی اس زمانے کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں وہ 'میری جان' کے سہارے کے بغیر 'ستواں جسم' تک آ گئے ہیں۔ میری مراد ان کی نظم 'بول کہ لب آزاد

ہیں تیرے‘ سے ہے۔ جو محکوم و مجبور قوم کے لیے نئے استعاروں میں قلندرانہ للکار کا حکم رکھتی ہے۔ ’بول‘ کی للکار میں ہماری تہذیب کی صدیوں کی حق پرستی اور حق گوئی کی آواز مضمر ہے۔ اس قسم کی ایک اور اہم نظم ’’سیاسی لیڈر کے نام‘‘ ہے جس میں رات کا استعارہ اور سیاسی حقائق اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ سیاسی شاعری کا اکل کھرا پن بالکل غائب ہوگیا ہے۔ اس میں نور اور صداقت کے اُجالے کی ظلمت پر مسلسل یلغار معلوم ہوتی ہے۔

فیضؔ کی مشہور نظم ’تنہائی‘ کو میں فیضؔ کے سیاسی شعور سے بلا واسطہ منسلک کرنے کے حق میں نہیں۔ ’’سیاسی لیڈر کے نام‘‘ میں رات کا استعارہ مسلسل سیاسی پس منظر میں استعمال کیا گیا ہے، لیکن ’تنہائی‘ میں تاروں کے غبار کا بکھرنا اور ایوانوں میں خوابیدہ چراغوں کا لڑکھڑانا اس قدر عام علائم ہیں کہ ان کے معنیٰ کو محدود کرنا ستم ہوگا۔ یہ انتظار جو زندگی کے ہر گام، ہر موڑ اور ہر منزل پر آتا ہے اور اس میں شعری وجدان کے لیے ان گنت نہیں ہیں۔

پچھلی جنگ کے خاتمے سے فیضؔ کے یہاں ’دل بیتاب‘ کے معنیٰ بھی بدل جاتے ہیں۔ اس زمانے کی نظموں میں وہ ظلمت تیرگی اور رات کے الفاظ اور استعاروں سے اس دور کی اس سیاسی اور سماجی فضا کو مرتب کرتے ہیں جس کے لیے نشترِ شعاع کی ضرورت ہے۔ ظلمت اور تیرگی کو وہ اپنے نور یقین سے کم کرتے ہیں اور آمدِ صبح کے منتظر ہیں۔ ۴۷ء تک فیضؔ کو اس صبح کا انتظار رہا اور جب وہ آئی تو اس طرح......

یہ داغ داغ اجالا‘ یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

......لیکن......

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

صبح آزادی پر یہ ایک ایسے شاعر کا ردّعمل ہے جسے پارٹی لائن سے زیادہ اپنی بصیرت پر اعتماد تھا۔ اس لیے جہاں بہت سے فریب آزادی کھا گئے، فیضؔ کی نظر اُجالے کے داغوں پر رہی اور اُردو شاعروں کی بھاری اکثریت نے فیضؔ کی بصیرت کی تائید کی اور آخر اہل سیاست نے بھی اس کی صداقت پر گواہی دی۔

فیضؔ کی نظم 'صبح آزادی' کے داخلی اور رمزیہ انداز پر بھی اعتراض کئے گئے ہیں۔ یہ اعتراض ان مخصوص نقطہ نظر رکھنے والوں نے کیے ہیں جو بلا واسطہ شاعری کے قائل ہیں اور جن کی شاعری میں سرخ ستارہ' سرخ پرچم اور سرخ ہاتھ اسی طرح شعریت سے عاری استعارے بن چکے ہیں جس طرح لکھنوی شاعری میں دوپٹہ اور چوٹی، بلبل اور صیاد! یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاعری نہ تو خطاب ہوتی ہے اور نہ سیاسی خطبہ۔ یہ بارود، توپ، ٹینک اور ایٹم بم سب کی متحمل ہوسکتی ہے۔ لیکن بہ ہر رنگ اس میں ریشم کے کیڑے کی سی داخلی کڑھائی لازمی طور پر ہونی چاہیے۔ اس کے دریچے کسی مخصوص فضا اور ہوا پر بند نہیں ہوتے۔ یہ فضائے چمن پر بھی کھل سکتے ہیں اور پرشور تلاطم پر بھی لیکن ہر صورت میں فنی خم و پیچ سے شاعر کو مفر نہیں۔ اگر کچھ لوگ بزعمِ خود اپنی وقتی شاعری پر مطمئن ہوجاتے ہیں تو یہ ان کا اپنا فعل ہے' لیکن فیضؔ ہر تاثر کو اپنی شخصیت، ذہن اور مزاج کے مخصوص پیچ وخم سے گزارتے ہیں اور گزارنے کے عمل میں وہ اسے نئی تہیں حسن و جمال اور اپنی وہ بصیرت اور لہجہ عطا کرتے ہیں جو جدید شاعری میں ان کا اپنا ہے۔

یہ لہجہ 'لوح وقلم' اور 'دو آوازیں' میں قدرے تیز ہوجاتا ہے جہاں ذوقِ نظر سے زیادہ خون کی حرارت، دل کی صداقت اورنطق کی طاقت پر زور پایا جاتا ہے۔ ۴۷ء کے فوراً بعد لوح وقلم اور اس کے ناتے سے سماجی تحریکات میں ادیب کے مقام کا احساس

فیضؔ کے یہاں بہت زیادہ ملتا ہے۔ یہی زمانہ ہے جب لوح وقلم کی متاع چھین لی جاتی ہے اور زبان پر مہریں لگانے کی کوشش ہوتی ہے۔ تو ان کے یہاں طوق و دار، مقتل اور سلاسل کی علامتیں ابھرتی ہیں۔

یہاں سے شاعر نے اوکھلی میں سر دے دیا۔ یعنی وہ ہمہ تن مردانِ حر کی صف میں آگیا، اور اب فیضؔ کے ذہن کی تربیت قفس و زندان کے استعاروں میں ہو رہی ہے۔ ان کی زندان کی شاعری کے بارے میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ غالب و سودا، یعنی قدیم شعری سرمائے کے ساتھ کافی وقت گزارنے لگے ہیں۔ دوسری یہ کہ 'فراق رخِ محبوب کا غم' اور 'یاد کے زخم' بری طرح پھر ابھرنے لگے ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ ان کی غزل گوئی کا دور ہے اور اس ہیئت کا کثرت سے اختیار کرنا، اساتذہ قدیم کے مطالعے اور حدیثِ یار کے عنوان نکھرنے کے لیے ضروری بھی تھا۔ زنداں میں فیضؔ کے نطق ولب کی بخیہ گری تو نہ ہوسکی، لیکن مقتل اور خون کی حرارت کا وہ ابال جو درِ زنداں سے باہر ہوتا تھا اب کم ہوگیا ہے۔ ایک اور اہم علامت جس کا ماخذ اساتذہ قدیم کا کلام ہے اور جس کی ضرورت اس وقت محبوس فیضؔ کو بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے 'صبا' کا استعارہ ہے جس کے ہاتھ صحنِ چمن اور حسن دونوں کو سلام بھیجے جا رہے ہیں۔ قید کی تنہائی میں سایۂ رخسار ولب کا تصور اور گہرا ہوگیا ہے اور روزنِ زنداں کی اہمیت اس طرح بڑھ گئی ہے......

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہوگی

زنداں میں حسن وحیات کی دورنگی فیضؔ کے یہاں پھر شدت سے اُبھری ہے اور شاید ہی کوئی اچھی نظم ہو جہاں غمِ جہاں کے وقت وہ بے حساب یاد نہ آئے ہوں۔ یہ تارِ حریرِ دورنگ غزلوں میں بھی جلوہ گر ہے، لیکن غزلوں میں اُردو کے قدیم شعری ادب کے

مطالعہ کی وجہ سے ان کے یہاں غزل کی محدود زبان اور مخصوص علائم بھی نمایاں ہیں۔ شیخ اور ناصح، ہجر اور فراق، ستم اور کرم، دیر اور حرم، صبا اور صنم، چمن قفس، زنداں، **گلچیں** اور بلبل۔ یہ الفاظ فیضؔ نے غزلوں میں بار بار استعمال کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ مثلاً قفس، صبا، ہجر اور فراق ان کے حسب حال ہیں، لیکن بعض مثلاً شیخ، ناصح، بلبل اور گلچیں بالکل روایتی طور پر آئے ہیں اور ان سے مرتب واردات میں کوئی نیا اشارہ نہیں ملتا۔

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے
کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دین کی ہے

اُردو غزل، عرصہ ہوا ان سے آگے نکل چکی ہے اور انہیں دوبارہ زندہ کرنے میں نہ تو فیضؔ کو اپنے اُسلوبِ غزل میں کوئی مدد ملی ہے اور نہ ان سے نئے اشاروں اور نئی تفہیم کا پتہ چلتا ہے۔ فیضؔ کے ماحول سے مربوط کر کے اگر میں ان کے مفہوم میں کوئی توسیع کر سکتا ہوں تو یہی کہ پاکستان کے مخصوص مذہبی ماحول کا شاید فیضؔ کے یہاں یہ ردّ عمل مرتب ہو گیا ہے۔

یہ تھی فیضؔ کے ذہنی ارتقا کی داستان! یہ ارتقا مسلسل جمال سے افادہ کی طرف ہو رہا ہے۔ میں مقصد کے مقابلے میں افادہ کی زیادہ وسیع اصطلاح اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ آگے چل کر مجھے شاعر اور مبلغ شاعر کا فرق بتانا ہے، ترقی پسند شاعری کے ان دو گروہوں کا ذکر کرنا ہے جن میں سے ایک کی قیادت فیضؔ کر رہے ہیں جو شعر میں افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں اور خطابت میں فرق کرتے ہیں اور فنی خم و پیچ کو جوشِ تبلیغ پر قربان کر دیتے ہیں۔ ان کے فنی خم و پیچ اور رجحانات کے پیچھے فیضؔ کی وہ ستھری نظر ہے جہاں جمالیت اور افادیت کی 'نظروں کا تناقص' دور ہو جاتا ہے کیونکہ فیضؔ کے خیال میں: ''حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں، افادی فعل بھی ہے، اور یہ افادیت محض ایسی تحریروں کا اجارہ نہیں جن میں کسی دور کے خاص سیاسی یا اقتصادی

مسائل کا براہ راست تجزیہ کیا گیا ہو۔ ان کی یہ رائے بھی بساطِ شاعری کے تازہ واردان کے لیے قابلِ غور ہے کہ محض مزدور، کسان، امن یا ایسا ہی کوئی دوسرا عنوان یا مضمون دوسری خوبیوں کی غیر موجودگی میں کسی تحریر کی ترقی پسندی کا واحد ضامن نہیں ہوسکتا۔''

فیضؔ نے اپنے ان تنقیدی خیالات کا اپنی شاعری میں عملی ثبوت دے کر ترقی پسند ادب کی انتہا پسندی کو کافی حد تک معتدل کیا۔ اس کے بدلے میں یہ اعتراضات بھی سہے کہ ان کی شاعری میں شمشیر کی صفائی نہیں جس کی سیاست کے نقیبوں کو ضرورت ہوتی ہے۔

اس طرح فیضؔ اور ان کے معترضین کا اختلاف فلسفۂ حیات کی سطح پر نہیں بلکہ جمالیات کی سطح پر ہے اور اس لیے دونوں کائنات کا ایک ہی بنیادی تصور رکھتے ہوئے اور ادب اور سیاست کے رشتوں کی اہمیت کو مانتے ہوئے اپنے طریقِ شعر میں مختلف ہوجاتے ہیں۔ ایک بیشتر وقتی موضوعات پر خطیبانہ یا صحافتی انداز میں طویل نظمیں لکھنے کا عادی ہے اور دوسرا اختصار و ایجاز کے ساتھ سیاسی واقعات پر نہیں بلکہ ان سے مرتب شدہ تاثر، فنّی حجابات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ان حجاباتِ فن کے پیچھے فیضؔ کی مکمل شخصیت ہوتی ہے جو متوازی ہے، سجل ہے اور زندگی کے نرم و گرم کو عزیز رکھتی ہے۔

فیضؔ محض سیاسی انسان نہیں۔ ان کا اپنا ایک جمالیاتی وجدان ہے۔ ایک ستھری نظر ہے، جو اس عہد کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ بہت ممکن ہے ان کے معتدل اور مدھم انداز سے سیاسی تحریکوں کو اس قدر مدد نہ ملے جتنی کہ اُردو کے خطیب شاعروں کی شعلہ افشانیوں سے لیکن اس عہد کے جمالیاتی وجدان میں ان کی شاعری سے وہ غیر معمولی تبدیلیاں ضرور پیدا ہوں گی جو تہذیبی نقطۂ نظر سے زیادہ اہم ہیں۔ کسی عہد کے جمالیاتی تصور کو متاثر کرنے والے شاعر کا کارنامہ، سیکڑوں مبلغ شاعروں کے کارناموں پر بھاری ہوتا ہے۔ اس لیے فیضؔ ترقی پسند ادب کے مبلغ شاعروں کے خیال میں کمزور انقلابی ہیں جو 'دیس کے درد' کے ساتھ 'فراقِ رخِ محبوب کے غم' لے کر چلتے ہیں۔ یلغار کرنے والے مجاہدین کا یہ شیوہ نہیں ہوتا۔ یہ سیلِ تند رو کا مقام ہے، یہاں

جوئے نغمہ خواں سے بھلا کیا کام چلے گا۔ میں یہاں ادب اور سیاست کے باہمی رشتوں کی طولانی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ چند الفاظ میں صرف اس قدر وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ سیاست کی طرح ادب بھی اجتماعی زندگی کا ایک مخصوص عمل ہے اور اس کے آداب کسی سیاسی حکم کے خطِ مستقیم میں نہیں ڈھالے جاسکتے۔ اس لیے سیاسی نقطہ نظر سے جو فیضؔ کی کمزوری ہے، فنی اور جمالیاتی لحاظ سے وہی ان کی منفرد خصوصیت ہے اور ان میں ان کے ساتھ بہت سے دوسرے بھی شریک ہیں، اور ان کا اثر ترقی پسند شاعری پر بھی پڑ رہا ہے۔

ہنگامی واقعات سے متاثر ہو کر فیضؔ نے صرف ایک نظم 'ایرانی طلباء کے نام' لکھی ہے جو بہت زیادہ لائقِ اعتنا نہیں ورنہ ان کا موضوعِ سخن اور ان کی خوش نوائی کا مقام ہنگامی واقعات سے ذرا دور اور بلند مجموعی تاثر واقعات تک رہتا ہے جس میں وہ عکسِ رخِ یار اور لیلائے وطن دونوں کے درد اور غم کو اجال کر اور سنوار کر تارِ حریرِ دو رنگ کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

تکنیک کے لحاظ سے فیضؔ کا ایک اور قابلِ قدر اضافہ ایک ہی بند میں دہرے قوافی کا استعمال ہے جو براہ راست انگریزی شاعری سے لیا گیا ہے۔ مثلاً 'مجھ سے پہلی سے محبت مری محبوب نہ مانگ' کے پہلے بند کی ترتیب ملاحظہ ہو......

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے

اس قسم کا التزام 'دستِ صبا' کی نظموں تک میں پایا جاتا ہے۔ فیضؔ نے ان جدت طرازیوں سے اپنے پیرایۂ اظہار کو حسین بھی بنایا ہے اور سہولتیں بھی پیدا کی ہیں۔ مذکورہ بالا نظم میں اگر شاعر قافیوں کے اسی تلازمے کے ساتھ چلتا تو نہ معلوم اس نظم کا کیا حشر ہوتا۔ تنوع کا اندازہ کرنا ہے تو اسی نظم کے قافیوں کو اس فارمولے میں دیکھئے:

الف۔ ب۔ ج۔ ب۔ ج۔ ح۔ د۔ د۔ ر۔ س۔ ر۔ س۔ ش۔ ش۔ ص۔ ص۔
ص۔ ط۔ ط۔ الف۔

تقریباً اسی انداز کا تنوع ہمیں 'موضوع سخن'، 'سیاسی لیڈر کے نام'، 'تنہائی' ۔ یہ رات اس درد کا شجر ہے، اور ان کی دوسری نظموں میں ملتا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ جدتیں اُردو نظم میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ گو ن۔ م۔ راشد، نقش فریادی کے دیباچہ میں اسے 'کوئی قابلِ ذکر تبدیلی' نہیں تسلیم کرتے، اور آزاد نظم کا ایک رسیا یہ کرتا بھی کیسے' لیکن فیضؔ کا یہ اضافہ خود ان کے شاعرانہ ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ ان کے مدھم لہجے اور پر کار تخیل کے عین مطابق ہے۔ قدیم اصناف سخن میں تھوڑی دور چل کر شاعر اپنے آپ کو قوافی کے شکنجے میں پاتا ہے اور یہیں سے وہ اپنے عجز کو چھپانے کے لیے استادی اور خطابت سے کام لیتا ہے۔ فیضؔ خیالات اور جذبات کے کیف وکم کے ساتھ ساتھ بحر تو نہیں لیکن ہیئت کے سانچوں کو بدلتے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی نظمیں وحدتِ فکر کے لحاظ سے زیادہ مکمل ہیں۔ ان کا حسن کہیں گھٹتا ہوا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ قدم قدم پر نادر تشبیہات کی شکل میں یا تو تخیل کی اٹھکھیلیاں ملتی ہیں، یا استعارے کی ٹھنک اس طرح کہ ہر ہر مصرع میں چراغ جل اٹھتے ہیں۔

لیکن فیضؔ کی متاع ہنر اس قدر کم ہے کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں ابھی سے ہم ان کا بہت اونچا مقام متعین نہیں کر سکتے۔ ہمارے نئے شاعروں کو اس بارے میں بہت زیادہ عجلت بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ہر نئی آواز کو اپنے دور کے مذاق شعر میں اپنی جگہ خود بنانی پڑتی ہے۔ یہ عمل بڑی کاوش اور جدو جہد چاہتا ہے اور جیسا کہ 'دستِ صبا' کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے۔ فیضؔ تپسیا کے ان رموز سے واقف ہیں۔ لکھتے ہیں......

> ''طالبِ فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔''

اسی کی بدولت فیضؔ کے یہاں وہ انکسار اور حلم ملتا ہے جو ''نقش فریادی'' تا ''دست صبا'' قائم ہے اور جس کا دوسرے شاعروں کے یہاں مضحکہ خیز حد تک

فقدان پایا جاتا ہے۔

جدید تنقید نے ابتدا سے فیض کی نئی آواز کو پہچانا ہے اور تنقیدی عمل کے ردّ و قبول میں صرف فیض کا نام ہے جو پچھلے بیس سال کی تنقیدات میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ فیض کی شاعرانہ انفرادیت کے لیے کافی ضمانت ہے اور اس بات کی طرف اشارہ بھی کہ ہم ان کی شاعری پر نظر جمائے رکھیں۔

لیکن فیض اپنی اس دورنگی شاعری میں جوش کی طرح شعلہ و شبنم یا سیف و سبو کے خانوں میں بٹ کر ہمارے سامنے نہیں آتے۔ جوش کی طرح ان کی دو شخصیتیں بھی نہیں۔ ان کا شاعرانہ ادراک تارِ حریر دورنگ کو بٹ کر اپنے فن میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ صداقت، حسن اور انقلاب کی قدریں ایک دوسرے میں متھ جاتی ہیں۔ فیض کا تنقیدی شعور بھی ان کے اس شعری عمل کی گواہی دیتا ہے۔ جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ ''ادب برائے ادب کی طرح انقلاب برائے انقلاب کا عقیدہ گمراہ کن ہے۔'' اس لیے فیض کے کلام میں ایک داخلی وحدت ملتی ہے جو حق پرستی اور حسن پرستی دونوں سے عبارت ہے۔ ان کی حق پرستی انہیں 'آدم وحوا کی اولاد' سے قریب تر رکھتی ہے۔ اور ان کی حسن پرستی فنی آداب کے احترام اور اس متوازن لطیف اور معتدل انداز کی طرف انہیں کھینچتی ہے جو آج صرف ان کا ہے اور جس کی وجہ سے ان کی تخلیق میں ستھری نظر، دلآویز خطوط اور سرخی حسن پائی جاتی ہے۔ اس ستھری نظر کی بدولت ان کے یہاں لب و رخسار کی انسانی حکایتیں اور نرم وگرم احساس کی صداقتیں ملتی ہیں، جہاں ہجر سایۂ رخسار ولب کا تصور بھی ہے اور جسم کی مایوس پکار بھی۔

اس طرح فیض کی جذباتی اور تخیلی سطح جس قدر راسخ اور تہ دار بن جاتی ہے اس کی مثال کسی دوسرے نوجوان شاعر کے یہاں مشکل سے ملتی ہے۔ ان کے کلام سے مستقبل کا نقاد اس عہد کی تاریخ کے نقوش بہت ممکن ہے کہ نہ اُبھار سکے، لیکن اس میں ایک حساس نازک خیال اور نرم گو شاعر کے دل کی دھڑکن ضرور ملے گی۔ جو عمل یا عقیدے کے لحاظ سے بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا، جس نے لوح وقلم کی پرورش اپنا شعار

بنایا اور جب وہ چھین لیے گئے تو خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر یہ لکھا......

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

فیضؔ کے ذہنی ارتقا سے بحث کرتے وقت میں جا بجا ان کی فنی جدّت طرازیوں کی طرف اشارہ کرتا رہا ہوں۔ یہ فنی اختراع عام طور سے انہی شاعروں سے سرزد ہوتا ہے جو ایک سے زیادہ زبانوں کے شعری ادب پر عبور رکھتے ہوں۔ جدید شاعری میں فراق کے اُسلوب کا سارا اچھوتا پن ان کی اس واقفیت پر مبنی ہے جو انہیں ہندی شعر و ادب سے ہے۔ فیضؔ کا تمام تر اختراعی عمل اس واقفیت اور شغف پر مبنی ہے جو انہیں انگریزی شاعری سے ہے۔ درسی قسم کی واقفیت تو انگریزی شاعری سے ہم سب کو رہتی ہے، لیکن اس سے اس حد تک متاثر ہونا کہ اپنے شاعرانہ ادراک کا ایک جز بنا لیا جائے بہت کم لوگوں کے بس کی بات ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں اس قسم کے اثرات جا بجا نمایاں ہیں۔ یہ اثرات تشبیہات و استعارات تک محدود نہیں بلکہ نظموں میں بندوں کی ترتیب، قوافی کی کڑی بندشوں سے ہلکی ہلکی آزادی یا ہم وزن مصرعوں کا انگریزی شاعری کے انداز میں چھوٹا بڑا لکھنا۔ (مثلاً ان کی نظم 'بول......' دیکھئے) ان تمام جدتوں کا ماخذ انگریزی شاعری ہے۔ فیضؔ نے اپنی بہت کم نظموں میں اُردو نظم کی مروجہ ہیئتوں کو جوں کا توں استعمال کیا ہے۔ کہیں قافیہ بدل کر کہیں تخفیف مصرع کر کے، کہیں قافیے کے آہنگ کی کمی کو آلودہ خواب، نیم وا تشبیہات سے پورا کر کے انہوں نے روایت پسندوں کے مذاق شعری پر ن۔م۔ راشد کی طرح ضرب نہیں لگائی۔ اس لیے پرانوں نے بھی ذرا منہ لٹکا کر یہ کڑوا گھونٹ پی لیا۔

○○

شمس الرحمن فاروقی

فیضؔ کی غزل گوئی

فیضؔ کی غزل کا تذکرہ کرتے وقت عام طور پر جو بات سب سے پہلے کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ فیضؔ نے کلاسیکی علامات کو نئے معنی اور نئی معنویت عطا کی۔ یہ بھی کہا گیا کہ فیضؔ کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کے طریق کار میں ہے، جس کی رو سے ان کے پاؤں کلاسیکی زمین میں مضبوط جمے رہے، لیکن انہوں نے اس بنیاد پر جو عمارت قائم کی اس کی دیواریں نئے ذہن سے نئے مسائل سے مستفیض تھیں۔ میں فی الحال اس بات سے بحث نہ کروں گا کہ دار و رسن، قاتل، وعظ، کوئے یار وغیرہ قسم کے الفاظ علامت ہیں بھی کہ نہیں۔ ہماری کلاسیکی غزل علامت کے تصور سے نا آشنا تھی۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس نہیں کہ جس چیز کا تصور بھی ہماری شعریات میں نہ رہا ہو، اس کا نہ صرف وجود ہو، بلکہ ہمارے شعرا اس سے واقف بھی ہوں۔ مغربی اصطلاحات و تصورات پر مبنی کچی پکی معلومات کی روشنی میں اُردو ادب کی تفہیم و تحسین کی جو کوششیں ہمارے یہاں ہوئیں وہ اکثر نا مشکور ہی رہی ہیں۔ اُردو غزل میں علامت کا وجود ثابت کرنے کی سعی انہیں نا کام کوششوں کی فہرست میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ خیر، اس مسئلے پر مزید گفتگو نہ کر کے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فیضؔ کی غزل بے شک ان رسومیاتی الفاظ اور تلازمات سے مزین ہے جو ہماری کلاسیکی شاعری کے نمایاں وصف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا فیضؔ کی کلاسیکیت اور ان کا اجتہاد صرف اسی بات میں

ہے کہ انہوں نے کوئے یار میں رقیب اور شیخ شہر سے نبرد آزمائی کو عارفانہ جانا؟ اس سوال کی چھان بین صرف اس لیے ضروری نہیں ہے کہ فیضؔ کی شاعری یوں بھی خاصے محدود دائرے اور محور کی شاعری ہے اور ان کے مداحوں کا یہ اشارہ کہ فیضؔ کی کلاسکیت محض ان چند الفاظ و تلازمات کو نئے معنی دینے تک محدود ہے، تعریف کے پردے میں ان کی مذمت ہی ہے۔ اس سوال کی چھان بین اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ کلاسیکی غزل کے بعض بنیادی پہلوؤں پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے اور ایک بات یہ بھی ہے کہ فیضؔ کی موت کے بعد پاکستان میں بعض لوگوں نے فیضؔ کو سچا مسلمان، عاشق رسول اور اہل دل صوفی بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا عجب نہیں کہ کچھ دنوں میں فیضؔ کو کلاسیکی صوفی شاعر بھی تسلیم کر لیا جائے اور اس طرح ان کا اصلی ادبی کارنامہ صرف دار و رسن اور قیس و فرہاد کی صوفیانہ یاد تازہ رکھنے تک محدود قرار دیا جائے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شاعر قدیم الایام سے چلے آنے والے رسومیاتی الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن وہ خود جدید زمانے کا شاعر ہے تو ہم کس بنا پر یہ فیصلہ کریں گے کہ اس نے ان الفاظ کو نئے معنی دیے ہیں؟ مثال کے طور پر یہ دو شعر ہیں......

نہ سوال وصل نہ عرض غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

پہلا شعر ظاہر ہے کہ فیضؔ کا ہے اور دوسرا دردؔ کا۔ آپ کس بنا پر فیصلہ کریں گے کہ پہلے شعر میں سیاسی جبر کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے شعر میں معشوق کے جور کی طرف؟ اگر آپ یہ کہیں کہ دونوں اشعار میں سیاسی جبر کی طرف اشارہ اس لیے ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ترقی پسند تھے، انقلابی تھے وغیرہ۔ تو اس کے معنی تو پھر یہ ہوئے کہ ان رسومیاتی الفاظ کی اپنی کوئی حیثیت نہیں، ان کے معنی شاعر کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اگر شاعر شیعہ ہے تو ان کے معنی شیعی ہیں۔ اگر شاعر سنّی ہے لیکن اہل

حدیث ہے تو ان کے معنی سنی اہل حدیث ہیں وغیرہ۔ ظاہر ہے اس طرح فیضؔ کی انفرادیت پھر خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ممکن ہے اگر یہ کہا جائے کہ فیضؔ چونکہ ترقی پسند تھے اس لیے جب وہ کسی کے عہد میں دل زار کے سبھی اختیارات کے چلے جانے کی بات کرتے ہیں تو اس میں وزن ہی اور ہوتا ہے، اس میں حسن ہی اور ہوتا ہے۔ لیکن اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر شعر کی خوبی خرابی کے بارے میں فیصلہ کرنے کے پہلے ہم شاعر کے سیاسی عقائد معلوم کریں۔ ظاہر ہے کہ شعر کے وہ معنی جو شاعر کے عقائد کے بارے میں معلومات حاصل کیے بغیر آمد ہی نہ ہوسکیں۔ علی الآخر باطل ہی ٹھہریں گے۔ کیونکہ اول تو تمام شاعروں کے سیاسی عقائد کے بارے میں معلومات نہیں، بلکہ بعض اوقات تو شاعر کا نام بھی معلوم نہیں، اور دوسری بات یہ کہ اگر شعر کا حسن یا معنی ان اطلاعات پر منحصر ومبنی ٹھہرائے جائیں جو شعر کے باہر ہیں تو پھر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ خود شعر میں کوئی معنی نہیں ہوتے۔ ایسی صورت کو تسلیم کرنے کے بعد تنقید و تفہیم کے سب دروازے بند ہو جائیں گے اور خود فیضؔ کی تمام شاعری معرض خطر میں آجائے گی، کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ فیضؔ کے کلام میں فی نفسہٖ کوئی خوبی نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ چوں کہ وہ انقلابی اور ترقی پسند وغیرہ تھے۔ اس لیے ان کے کلام کو سیاسی معنی پہنانے میں ایک طرح کا لطف ہے۔ ورنہ یہی شعر انہوں نے اگر دردؔ کے زمانے میں، یا غالبؔ کے زمانے میں کہے ہوتے تو انہیں کوئی گھاس نہ ڈالتا۔

ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ فیضؔ کا بڑا کارنامہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی اصطلاحاتی الفاظ کو دوبارہ زندہ کیا اور انھیں غزل میں مقبول کیا۔ ورنہ فیضؔ کے زمانے میں یہ سب خوب صورت الفاظ یا تو ترک ہو چکے تھے، یا اپنے معنی کھو چکے تھے۔ اس جواب میں دو مشکلیں ہیں۔ یہ بیان مخدوش ہے کہ دار و رسن، قفس و نشیمن وغیرہ الفاظ کسی بھی وقت اپنے معنی کھو سکتے ہیں۔ یہ الفاظ دراصل ایک پورے رسومیاتی نظام کا حصہ ہیں اور ان پر غزل کی دُنیا کے تمام مفروضوں کا دار و مدار ہے جب تک وہ رسومیاتی نظام اور مفروضات باقی ہیں، یہ الفاظ اپنے معنی نہیں کھو سکتے۔ یہ ناممکن ہے کہ

کوئی رسومیاتی لفظ مثلاً، جور وستم، میر کے شعر میں با معنی ہو اور آج کے زمانے کے شعر میں بے معنی ہو۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جور وستم قسم کے رسومیاتی الفاظ اپنی دل کشی اور تازگی کھو چکے تھے، فیضؔ نے انہیں دوبارہ دل کشی اور تازگی عطا کی۔ پھر سوال اٹھے گا کہ فیضؔ نے یہ کارنامہ کیوں کر انجام دیا؟ آپ جواب دیں گے کہ فیضؔ نے انہیں سیاسی معنی عطا کیے۔ لیکن وہی مشکل پھر آن کھڑی ہوگی کہ فیضؔ کے شعر میں سیاسی معنی کی دریافت ان معلومات پر مبنی ہے کہ فیضؔ سیاسی اور انقلابی شخص تھے۔ یعنی اگر ہم ع ......
''پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا'' والا شعر فیضؔ کے کلیات میں پڑھتے تو اس میں سیاسی اور انقلابی معنی دریافت کرتے اور اگر اسے دردؔ کے دیوان میں پڑھتے تو اسے محض عشقیہ شعر سمجھتے۔ لہٰذا کلاسیکی رنگ و آہنگ والے الفاظ میں جو دلکشی اور تازگی ہم فیضؔ کے شعر میں دیکھتے ہیں وہ اس وجہ سے کہ ہم جانتے ہیں کہ فیضؔ کے کچھ سیاسی عقائد تھے یعنی فیضؔ نے ان میں کوئی شاعرانہ خوبی نہیں پیدا کی، یہ تو محض ان کی سیاست کا کرشمہ تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ مجھے قبول نہیں۔ اس وجہ سے قبول نہیں کہ میں اسے غلط سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کلاسیکی رنگ و آہنگ والے الفاظ ہمارے زمانے میں فیضؔ کے علاوہ دوسرے بہت سے شاعروں نے استعمال کیے ہیں اور وہ فیضؔ کے ہم خیال و ہم عقیدہ بھی تھے۔ لیکن ان کے یہاں ان الفاظ میں وہ حسن نظر نہیں آتا جو فیضؔ کے یہاں ہے۔ لہٰذا فیضؔ کی عظمت اس بنیاد پر نہیں قائم ہوسکتی کہ انہوں نے غزل کے کلاسیکی عشقیہ رسوماتی الفاظ کو سیاسی معنی دیئے۔ یہ صفت تو مخدوم، مجروح، ساحر، غلام ربانی تاباں بہتوں کے یہاں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی فیضؔ کا مد مقابل نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نئے معنی کی دریابی کے اس عمل میں فیضؔ کو اولیت حاصل ہے، تو یہ بھی درست نہیں۔ ترقی پسندوں میں سب سے پہلے مخدوم نے غزل کو باقاعدہ طور پر اختیار کیا اور سیاسی موضوعات کو غزل میں برتنے کی رسم حسرت موہانی، محمد علی جوہر اور اقبال نے قائم کی' دست تہ سنگ' کے دیباچے میں فیضؔ نے حسرت موہانی کا ذکر کیا ہے۔ اس

دیباچے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۲۸ء کے آس پاس ہوا۔ اس وقت محمد علی جوہر زندہ تھے اور ان کی سیاسی غزل ایوانِ ادب میں گونج رہی تھی۔ حسرت کا دبدبہ بطور غزل گو پوری طرح قائم ہو چکا تھا اور اقبال تمام نئے شعرا (بشمول جوش) کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ خود فیضؔ نے اقبال کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ترقی پسند شعرا کی ممتاز نظموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا فیضؔ کے سامنے غزل کی ایسی مثالیں وافر تھیں جن میں سیاسی موضوعات کو برتا گیا تھا۔

اس تجزیے کی روشنی میں کہنا پڑتا ہے کہ فیضؔ کی غزل میں کلاسیکی رنگ کی حسن و خوبی کا سراغ اس بات سے نہیں لگ سکتا کہ انہوں نے بعض رسومیاتی الفاظ کو بڑی کثرت سے برتا اور ان میں سیاسی معنی داخل کیے۔ تنقید کی دُنیا میں یہ شکل اکثر پیش آتی ہے کہ ہم خوبی کا پتہ تو لگا لیتے ہیں، لیکن اس کی وجہ دریافت کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مرے کریگر Murray Krieger نے اپنی کتاب Theory of Criticism میں اس نکتے کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے......

''اگر ہمیں کوئی ایسا تجربہ حاصل ہو جسے ہم 'جمالیاتی' کے لفظ کے ذریعہ بیان کریں تو یہ قرین قیاس ہے کہ ہم اس تجربے کی علت اس شے میں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہمیں یہ تجربہ حاصل ہوا ہے، اور پھر اس طرح ہم اس شے کو جمالیاتی قدر کا حامل بتائیں گے لیکن بطور نقاد کے ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جمالیاتی علت ہم میں ہے یا واقعی اس شئے میں ہے۔ قطعی لغوی طور پر تو یقیناً یہی کہا جائے گا کہ اس جمالیاتی تاثر کا سرچشمہ ہمارے ہی اندر ہوگا کیونکہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس شے کا سامنا کرنے پر وہ تاثر حاصل نہیں کرتے......

کیا کسی شے میں کوئی ایسی جمالیاتی خاصیت ہوتی ہے، جسے ہم محسوس کرتے ہیں (یا ہم کو جسے محسوس کرنا چاہیے) اگر ہم نے وہ جمالیاتی خاصیت دریافت کر لی ہے اس طرح کہ ہمارا تجربہ (جس حد تک وہ

جمالیاتی ہے) اس خاصیت کے تعلق سے مناسب اور صحیح تاثر ہے، تو
پھر ہمیں اس خاصیت کی وضاحت کرنے اور اس کو بیان کرنے پر
اپنے جمالیاتی تجربے کو دوسرے قارئین تک پہنچانے پر قادر ہونا
چاہیے۔''

آگے چل کر کریگر کہتا ہے کہ نقاد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ تجربے کے اندر شے object in experience اور شے کا تجربہ experience of object میں فرق کر سکے۔ یعنی وہ یہ بتا سکے کہ شعر میں جو خوبی وہ دیکھ رہا ہے، وہ اس کے دماغ کی اختراع نہیں ہے اور اس خوبی کے بیان کے ذریعہ حکم لگایا جا سکے کہ جن شعروں میں یہ خوبی ہوگی ان سے فلاں قسم کا تجربہ حاصل ہو سکے گا۔ اگر کسی نظم کے تجربے کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کے مختلف اجزا اپنی اپنی شخصیت کو برقرار رکھیں، تو پھر ان اجزا کی یہ خصوصیت مشکوک ہو جاتی ہے کہ ان کے ذریعہ ایک متحد اور خود مکتفی Unifed اور Self Enclosing تجربہ حاصل ہو سکتا ہے۔ فیضؔ کی کلاسیکیت کی تحسین کرنے والوں کی یہی مشکل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فیضؔ کی غزل میں الفاظ الگ ہیں اور ان کے سیاسی معنی جو فیضؔ کے عقائد نے ان میں داخل کیے ہیں، وہ الگ ہیں، کیونکہ انہیں الفاظ میں انہیں وہی سیاسی معنی تو مجروح اور دوسروں کے یہاں بھی ہیں لیکن فیضؔ کے علاوہ کسی میں وہ بات نہیں۔ لہٰذا وہ اس بات کو واضح کرنے میں ناکام رہتے ہیں کہ وہی نسخہ جو فیضؔ کے یہاں کارگر ہے، دوسروں کے یہاں بے فیضؔ کیوں رہ جاتا ہے؟

اس سوال کو حل کرنے کے لیے مزید دو شعروں کی روشنی میں بعض نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتا ہوں۔ پہلا شعر حافظ کا ہے اور دوسرا ظاہر ہے کہ فیضؔ کا:

عقاب جو رکشا داست بال برہمہ شہر
کمان گوشہ نشینے و تیر آ ہے نیست

بیداد گروں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

اس بات سے قطع نظر کہ حافظ کا شعر بہت اعلیٰ درجہ کا ہے اور فیضؔ کا شعر ان کے اچھے اشعار میں نہیں، پوچھنے کا سوال یہ ہے کہ ہم یہ فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں کہ حافظ کا شعر سیاسی نہیں ہے اور فیضؔ کا شعر سیاسی ہے؟ پھر؟ کیا ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فیضؔ کا شعر اگرچہ حافظ کے شعر سے بہت پست ہے، لیکن اس لیے قابل تعریف ہے کہ اس میں سیاسی پہلو بھی ہے، یعنی اور کسی پہلو کے علاوہ سیاسی پہلو بھی ہے۔ کیا سیاسی شاعری کے لیے ایسے اصول مقرر ہو سکتے ہیں جن کی روشنی میں ہم سیاسی کو غیر سیاسی شاعری سے الگ کر سکیں؟ یعنی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دکھا سکیں کہ غیر سیاسی شاعری پر مبنی رسومات کی پابندی کرتے ہوئے بھی سیاسی شاعری ہو سکتی ہے، کیوں کہ وہ رسومیات ہے؟ یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ کسی رسومیاتی نظام کو ہم پوری طرح برتیں، لیکن اس کے جو معنی نکلیں وہ غیر رسومیاتی ہوں۔

ان تمام سوالوں کے جواب مہیا کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ میں اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حافظ کا شعر سیاسی معنی کا متحمل ہو سکتا ہے، لیکن ہم اس کو سیاسی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس میں سے سیاسی معنی جو ہم برآمد کریں گے ان کا تعلق شعر کی Signification سے ہوگا، اس کے اصل معنی سے نہیں۔ اور یہ استعارے کی خوبی ہے کہ وہ Signification کے لیے دروازے کھول دیتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں جس کی رو سے ہم اس شعر کو غیر سیاسی قرار دیں لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا پیمانہ بھی نہیں ہے جس کے اعتبار سے ہم اس کو محض سیاسی قرار دیں۔ شعر کی معنویت اس کے معنی کا حصہ ہوتی ہے لیکن اس کے معنی کا دائرہ اس کی معنویت سے چھوٹا بھی ہو سکتا ہے۔ فیضؔ کا شعر حافظ کے شعر کے مقابلے میں کم کارگر ہے، اگرچہ اس میں بھی سیاسی معنویت ہے۔ کم کارگر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی معنویت جس معنی پر قائم ہے، وہ حافظ کے شعر کے معنی سے کم ہے۔ معنی کے ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ حافظ کے شعر میں چار استعارے اور چار پیکر ہیں۔ یعنی جو استعارے ہیں وہی پیکر بھی ہیں۔ عقاب جور، بال کشا، دست برہمہ شہر، کمان گوشہ نشینے و تیرا ہے۔

پھر دو چیزوں کا ہونا (جو پہلے مصرعے میں بیان ہوئی ہیں) فیضؔ کا شعر ان خوبیوں سے خالی ہے۔ فیضؔ نے جہاں کلاسیکی اُسلوب کو کامیابی سے برتا ہے وہاں کیفیت یا مضمون آفرینی کی کارفرمائی ہے، ورنہ سیاسی پہلو فلسفیانہ پہلو یا عشقیہ پہلو کسی میں کوئی ایسی خوبی فی نفسہٖ نہیں جو شاعرانہ خوبی سے ضامن ہو سکے۔ بات فیضؔ کی غزل کی ہو رہی تھی، لیکن انھوں نے اکثر نظموں میں بھی غزل کا اُسلوب اختیار کیا ہے، اس میں 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' کے پہلے دو مصرعے پیش کرتا ہوں۔ پھر فارسی کا ایک شعر جو غالباً نظیری کا ہے......

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

فارسی شاعر کہتا ہے......

در روزگار عشق تو ماہم فدا شدیم
افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نہ ماند

○○

پروفیسر گوپی چند نارنگ

فیضؔ کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام

شاعری کی اہمیت وعظمت کا اصل فیصلہ وقت کرتا ہے۔ میر و غالب اپنے عہد میں ناقدریٔ زمانہ کی برابر شکایت کرتے رہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی عظمتوں کا نقش روشن ہوتا گیا۔ اس معنی میں وقت یا زمانہ کوئی مجرد تصور نہیں، بلکہ کسی بھی معاشرے میں کسی شعری روایت سے فیضؔ یاب ہونے والے صاحب الرائے حضرات کی پسند و ناپسند کا حاصل ضرب ہے۔ اس کے ذریعے بازیافت، تحسین و تفہیم اور تعین قدر کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، اس نظر سے دیکھیے تو بیسویں صدی میں اقبال کے بعد فیضؔ واحد شخصیت ہیں جن کی اہمیت کا بالعموم اعتراف کیا گیا ہے۔ ان کے معاصرین میں دوسری اہم شخصیتیں بھی ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی نصیب نہیں ہوئی جو فیضؔ کے حصے میں آئی۔ اگرچہ مقبولیت ہی اہمیت کا واحد معیار نہیں۔ لطفِ سخن اور قبولِ عام کو خداداد کہا گیا ہے، مگر اس میں بڑا ہاتھ شاعر کے جوہر ذاتی کا ہوتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری نے اپنی حیثیت کو آہستہ آہستہ منوایا۔ 'نقش فریادی' کے بعد دوسرا مجموعہ 'دست صبا' اگرچہ ایک جست کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کے وجوہ محض سوانحی یا تاریخی نہیں، تخلیقی بھی تھے۔ تاہم اس زمانے کے تنقیدی مضامین میں فیضؔ کا نام بارہویں پندرہویں نمبر پر لیا جاتا تھا۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب فیضؔ کے شعری ابہام اور غنائی

لہجے کو ہدفِ ملامت بنایا گیا، اور کھل کر اعتراض کیے گئے لیکن اس کے باوجود فیضؔ کی اہمیت روز بروز بڑھتی گئی، اور رفتہ رفتہ یہ آواز پوری اُردو شاعری پر چھا گئی۔ دوسروں کے چراغ یا تو ماند پڑ گئے یا بجھ گئے اور فیضؔ کی آواز اپنے عہد کی آواز تسلیم کی جانے لگی......

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے
دست صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوے گُل ٹھہری، نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے
ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

تخلیق کا راستہ جس طرح پُر پیچ اور پر اسرار ہے، اسی طرح تنقید میں بھی شعری اہمیت کی گرہیں کھولنا نہایت دشوار اور وقت طلب ہے۔ ہر بڑی شاعری در اصل اپنا پیمانہ خود ہوتی ہے۔ بڑا شاعر یا تو کسی روایت کا خاتم ہوتا ہے یا کسی طرزِ نو کا موجد ہوتا ہے۔ وہ بہرحال باغی ہوتا ہے۔ فرسودہ روایات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ اظہار کے لیے نئے پیمانے تراشتا ہے، اور نئی شعری گرامر خلق کرتا ہے۔ وہ یا تو اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے یا اپنے عہد کے 'درد و داغ و سوز و ساز و جستجو و آرزو' کی ایسی ترجمانی کرتا ہے کہ اپنے وقت کی آواز بن جاتا ہے۔ فیضؔ کا کارنامہ کیا ہے؟ فیضؔ کی شاعری کو اس تناظر میں دیکھیں تو کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا وہ باغی شاعر تھے؟ شاید نہیں۔ کیا وہ اپنے وقت سے آگے تھے؟ اس کا جواب بھی اثبات میں نہیں ملے گا۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہو چکی تھی۔ خود فیضؔ نے کئی جگہ کہا ہے کہ انہیں اس راہ پر ڈاکٹر رشید جہاں نے لگایا۔ جہاں تک ڈکشن کا تعلق ہے، فیضؔ کا ڈکشن غالب اور اقبال کے ڈکشن کی توسیع ہے۔ فیضؔ کی تمام لفظیات فارسی

اور کلاسیکی شعری روایت کی لفظیات سے مستعار ہے، یا پھر اس کا ایک حصہ ایسا ہے جو تمام ترقی پسند شاعروں کے تصرف میں رہا ہے جس میں فیضؔ کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں۔ یہ سب باتیں جتنی صحیح ہیں، اتنا ہی یہ بھی صحیح ہے کہ فیضؔ کی شاعری میں کچھ ایسی نرمی اور دل آویزی، کچھ ایسی کشش اور جاذبیت، کچھ ایسا لطف و اثر، کچھ ایسی دردمندی اور دل آسائی اور کچھ ایسی قوتِ شفا ہے، جو ان کے معاصرین میں کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟ سماجی سیاسی احساس، سامراج دشمنی، عوام کے دکھ درد کی ترجمانی، سرمایہ داری کے خلاف نبرد آزمائی، جبر و استبداد، استحصال اور ظلم و بے انصافی کے خلاف احتجاج، امنِ عالم، بہتر معاشرے کی آرزو مندی، یہ سب ایسے موضوعات ہیں جن پر کسی کا اجارہ نہیں۔ یہ عالمی موضوعات ہیں اور سرمایہ داری اور نو آبادیت کے خلاف دُنیا بھر کی عوامی تحریکوں میں ان کا ذکر عام ہے۔ اُردو ہی میں دیکھئے تو سب ترقی پسند شعراء کے یہاں یہ موضوعات قدرِ مشترک کے طور پر ملیں گے۔ فیضؔ کا نظریۂ حیات اور ان کی فکر وہی ہے جو دوسرے ترقی پسند شعراء کی ہے، یعنی ان کے موضوعات دوسرے ترقی پسند شعراء کے موضوعات سے الگ نہیں، تو پھر فیضؔ کی انفرادیت اور اہمیت کس بات میں ہے؟ یعنی فکری یا موضوعاتی سطح پر اگر ان میں کوئی ایسی خاص بات نہیں، جو ان کو دوسروں سے ممیز اور ممتاز کر سکے تو پھر وہ شعری طور پر دوسروں سے الگ اور ان سے ممتاز کیوں کر ہوئے، اس سوال کے جواب کی ایک صورت یہ ہے کہ شاعری میں نظریاتی یا فکری یکسانیت در اصل شعری یکسانیت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ فکری یکسانیت اور تخلیقی یا معنیاتی یکسانیت میں فرق ہے۔ کسی بھی شاعر کا معنیاتی نظام کوئی مجرد وجود نہیں رکھتا۔ یہ اپنے اظہار کے لیے زبان کا محتاج ہوتا ہے۔ ہر بڑا شاعر اس معنی میں نئی زبان خلق کرتا ہے، کہ خواہ وہ نئے لفظ بڑی تعداد میں ایجاد نہ کرے، اور تمام اظہاری سانچے کلاسیکی روایت سے مستعار لے تاہم اگر وہ ان کو ایک نئی لذت اور کیفیت سے سرشار کر دیتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں وہ ان میں نئی

معنیاتی شان پیدا کر دیتا ہے تو اس کا اُسلوبیاتی امتیاز ثابت ہے۔ چنانچہ اُسلوبیاتی امتیاز ثابت ہے تو معنیاتی امتیاز بھی لازم ہے کیونکہ اُسلوب مجرد ہیئت نہیں۔ جو حضرات ایسا سمجھتے ہیں، وہ اُسلوب کو محدود طور پر لیتے ہیں اور اس کی صحیح تعبیر نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اُسلوبیاتی خصائص معنیاتی خصائص کے مظہر ہیں، ان سے الگ نہیں۔ پس اگر شعری اظہارات الگ ہیں تو معنیاتی نظام بھی دوسرے سے الگ ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے نئے اظہاری پیرایے وضع کیے، اور سینکڑوں ہزاروں لفظوں، ترکیبوں، اور اظہاری سانچوں کو ان کے صدیوں پرانے مفاہیم سے ہٹا کر بالکل نئے معنیاتی نظام کے لیے برتا، اور یہ اظہاری پیرایے اور ان سے پیدا ہونے والا معنیاتی نظام بڑی حد تک فیضؔ کا اپنا ہے۔ اگر اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں تو فیضؔ کی انفرادیت اور اہمیت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ فیضؔ نے کلاسیکی شعری روایت کے سرچشمۂ فیضان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ ان کی لفظیات کلاسیکی روایت کی لفظیات ہے، لیکن اپنی تخلیقیت کے جادوئی لمس سے وہ کس طرح نئے معنی کی تخلیق کرتے ہیں، یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ تنقید جو صرف نظریے یا موضوع پر انحصار کرتی ہے، اور فنی استعداد، تازہ کارانہ احساس، اور اظہاری کمالات پر نظر نہیں رکھتی، فیضؔ کے لطفِ سخن کے رازوں کو نہیں پا سکتی ہے۔ آیئے اس بات کی وضاحت کے لیے 'زنداں نامہ' کی ایک اچھی نظم 'ملاقات' پر نظر ڈالیں......

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے

میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں
یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

اس نظم کی بنیاد جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے رات اور صبح کے تصورات پر ہے۔ رات، درد وغم یا ظلم و بے انصافی کا استعارہ ہے اور صبح کا روشن افق فتح مندی کی نشانی ہے۔ تاریکی اور روشنی کا یہ تلازمہ اور اس کا سماجی سیاسی مفہوم فکری اعتبار سے کوئی انوکھی بات نہیں۔ رات اور صبح کا سماجی سیاسی تصور دُنیا بھر کی شاعری میں ملتا ہے اور معنیاتی اعتبار سے غیر معمولی نہیں۔ لیکن شاید ہی کسی کو اس بات سے انکار ہو کہ فیضؔ کی یہ نظم معمولی نہیں ہے۔ یہ لطف و اثر کا مرقع ہے۔ اگرچہ ان علائم میں جن پر اس نظم کی بنیاد ہے کوئی ندرت نہیں، لیکن نظم کے اظہاری پیرایے اور معنیاتی نظام میں ندرت ہے۔ ظاہر ہے اس ندرت تک ہماری رسائی ان اظہاری پیرایوں ہی کے ذریعے ہوسکتی ہے جو شاعر نے استعمال کیے ہیں۔ شاعر نے 'رات' کو 'درد کا شجر' کہا ہے جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے۔ عظیم تر اس لیے کہ اس کی شاخوں میں لاکھوں مشعل بکف ستاروں کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں۔ نیز ہزاروں مہتاب اس کے سائے میں اپنا سب نور رو گئے ہیں۔ رات، درد اور شجر پرانے لفظ ہیں لیکن رات کو درد کا شجر کہنا نادر پیرایۂ اظہار ہے۔ چنانچہ رات کا شجر، ستاروں کے کارواں، اور مہتاب سے مل کر جو امیجری مرتب ہوتی ہے، وہ حد درجہ پر تاثیر ہے۔ نیز ستاروں کے کاروانوں کا کھو جانا یا مہتابوں کا اپنا نور رو جانا استعاراتی پیرایۂ اظہار ہے جو درد کی کیفیت کو راسخ کر دیتا ہے۔ درد کو مجھ سے تجھ سے عظیم تر کہنا ذاتی، نوعیت کا تجربہ نہیں بلکہ اس کا تعلق پوری انسانیت سے ہے— دوسرے بند میں فیضؔ نظم کو معنیاتی موڑ دیتے ہیں......

مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے

گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

لمحوں کو زرد پتے کہنا واضح طور پر مغربی شاعری کا اثر ہے جو فیضؔ کی امیجری میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے، لیکن گیسو، گلنار، شبنم، قطرے، جبیں، ہیرے سب کے سب اُردو کی کلاسیکی روایت سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے، پہلے بند کی امیجری کو دوسرے بند کی امیجری سے آمیز کر کے فیضؔ نے جس معنیاتی فضا کی تخلیق کی ہے، کیا وہ ذہن کو نئی جمالیاتی کیفیت سے سرشار نہیں کرتی؟ فیضؔ کے کمالِ فن کا ایک سامنے کا پہلو یہ ہے کہ وہ انقلابی فکر کو جمالیاتی احساس سے اور جمالیاتی احساس کو انقلابی فکر سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ اپنے تخلیقی لمس سے دونوں کو آمیز کر کے ایک ایسی شعری لذت اور کیفیت کو خلق کرتے ہیں جو مخصوص جمالیاتی شان رکھتی ہے، اور جس کی نظیر عہدِ حاضر کی اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔

نظم کے دوسرے حصے میں یہی جمالیاتی کیفیت جاری رہتی ہے۔ درد کی رات بہت سیہ ہے، لیکن محبوب کی نظر جس کو موجِ زر کہا ہے، اس کے سائے میں نور گر ہے۔ کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو رات کے بعد صبح کے تصور کو سطحی رجائیت میں بدل کے رکھ دیتا۔

نظم کے پورے معنیاتی نظام اور ہر ہر مصرعے سے فیضؔ کی ذہنی سطح اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے الگ نظر آتی ہے۔ آخری حصے میں شاعر، سحر کے عام رومانی تصور کو رد کرتا ہے کہ الم نصیبوں، جگر فگاروں کی صبح افلاک پر نہیں ہوتی' بلکہ......

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں!

فیضؔ کا انفراد نظم اور غزل دونوں میں ثابت ہے۔ نظم کے بعد اب ایک نظم نما غزل 'طوق و دار کا موسم' سے یہ اشعار دیکھئے......

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

انتظار کی کیفیت فیضؔ کی بنیادی تخلیقی کیفیات میں سے ایک ہے جس کا ذکر

آگے آئے گا۔ یہاں صرف بعض کلیدی الفاظ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ روش، بہار، موسم، دل کے داغ، ہجرانِ یار، جبر و اختیار، جنوں، طوق و دار، قفس، چمن، آتشِ گل، فروغِ گلشن، صوتِ ہزار، صبا کی مست خرامی، یہ سب کے سب الفاظ، تراکیب اور تصورات، غزلیہ شاعری کی یاد دلاتے ہیں، لیکن یہاں انتظار کا موسم، یا بہار کا موسم، رومانی شاعری سے ہٹ کر، ایک الگ سماجی سیاسی معنیاتی نظام رکھتے ہیں۔ طوق و دار کی رعایت سے اب جنوں، حب الوطنی، سامراج دشمنی یا عوام دوستی کی ترجمانی کرتا ہے۔ جبر و اختیار کے معنی کی بھی تقلیب ہوگئی ہے۔ اب قفس کی کوٹھری یا زنداں ہے۔ یہی وطنی قومی احساس، فروغ گلشن، صبا کی مست خرامی اور چمن میں آتشِ گل کے نکھار کی معنیاتی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ واضح سماجی سیاسی مفاہیم کے لیے ان اُسلوبیاتی سانچوں کے استعمال پر اب تقریباً چار دہائیاں گزر چکی ہیں، اور ان کا معنیاتی نظام، سامنے کی بات معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس معنیات کی تشکیل کے اس سفر میں اُردو شاعری نے خاصا زمانہ صرف کیا ہے، اور بعض لوگوں نے تو عمریں کھپائی ہیں۔ 'دستِ صبا' ہی سے یہ قطعہ ملاحظہ ہو......

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

صاف ظاہر ہے کہ کلاسیکی روایت کے بنیادی علائم ایک نیا معنیاتی چولا بدل رہے ہیں، عبائے شیخ، قبائے امیر و تاج شہی، اب مخصوص لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوئے، بلکہ اپنے ایمائی رشتوں کی بدولت استحصالی قوتوں کے استعارے بن کر آئے ہیں۔ یہی معاملہ گل دامنی و کج کلہی کا ہے۔ سنتِ منصور و قیس بھی اہلِ جنوں سے اسی لیے زندہ ہے کہ موجودہ دور میں حق گوئی و ایثار و قربانی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا

تقاضا اہل جنوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

(۲)

راقم الحروف نے چند برس پہلے فیضؔ کی شاعری کے بارے میں اپنے مضمون

TRADITION & INNOVATION IN URDU POETRY:

FIRAQ GORAKHPURI & FAIZ AHMAD FAIZ

(IN POETRY & RENAISSANCE, MADRAS 1974)

...... میں جو کچھ لکھا تھا اس میں فیضؔ کی شاعری کے معنیاتی نظام کی ساختیاتی بنیادوں پر بھی غور کیا تھا۔ یہ مضمون چونکہ انگریزی میں تھا اور بالعموم اُردو والوں کی نظر سے نہیں گزرا، اس لیے اس امر کی وضاحت نا مناسب معلوم نہیں ہوتی کہ اس میں میرا بنیادی معروضہ یہ تھا کہ ساختیاتی اعتبار سے اُردو کی شعری روایت میں اظہاری پیرایوں کی ایک یا دو سطحیں نہیں، بلکہ تین خاص سطحیں ملتی ہیں۔ کلاسیکی غزل کی لفظیات جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ دراصل وجود میں آئی تھی، جسم و جمال کے تذکرے اور عشق و عاشقی کے مضامین کے لیے۔ لیکن چند صدیوں کے ارتقائی عمل میں اس لفظیات میں ایک نئی روحانی، متصوفانہ، سطح کا اضافہ ہوا اور مزید تہ داری پیدا ہوگئی۔ فارسی اور اُردو غزل کی مثالی آزاد خیالی، وسیع المشربی، کٹرپن کی مخالفت اور انسان دوستی کے تصورات کی آبیاری میں، اس روحانی متصوفانہ معنیاتی سطح کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یعنی عشق و سرمستی و رندی و رسوائی، شیخ و شراب، گل و بلبل، شمع و پروانہ اور ایسے سینکڑوں اظہارات مابعد الطبیعاتی ماورائی معنی میں استعمال ہونے لگے۔ ان دو سطحوں کے ساتھ ساتھ تیسری سطح کا اضافہ اس وقت ہوا جب اُردو شاعری سیاسی و قومی شعور کی بیداری کے دور میں داخل ہونے لگی۔ کلاسیکی شعری لفظیات کی اس تیسری سطح کو سماجی سیاسی احساس کی سطح کہا جا سکتا ہے۔ یوں تو اُردو میں اس کا پہلا بھرپور اظہار، راجہ رام نرائن موزوں کے اس شعر میں ملتا

ہے جو سراج الدولہ کے قتل پر کہا گیا تھا، لیکن میر و سودا، مصحفی، و جرأت، غالب و مومن، تمام کلاسیکی شعراء کے یہاں غزل کے پیرائے میں اس نوع کے اظہار کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ خواجہ منظور حسین نے تو غزل کی اس معنیاتی جہت پر پوری کتاب اُردو غزل کا خارجی روپ بہروپ لکھ دی ہے۔ بہر حال بیسویں صدی میں حسرت، جوہر، اقبال، جگر، فراق اور بعد میں ترقی پسند شعراء کے یہاں سیاسی سماجی احساس کی یہ سطح عام طور پر ملنے لگتی ہے۔ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ عاشقانہ شاعری کی بنیاد معنیاتی تثلیث پر ہے، یعنی عاشق معشوق اور رقیب دو عناصر میں باہمی ربط اور تیسرے عنصر سے تضاد کا رشتہ جو تخلیقی اظہار میں تناؤ پیدا کرتا ہے اور جان ڈالتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس تثلیث کا معنیاتی تفاعل شعری روایت کے ساختیاتی نظام کی تینوں سطحوں پر ملتا ہے، یعنی عاشقانہ سطح پر، متصوفانہ سطح پر، اور سماجی سیاسی سطح پر بھی — اس تہہ در تہہ معنیاتی نظام کے بنیادی ساختیے، راقم الحروف کے نزدیک اٹھارہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فیضؔ کی شاعری کے تناظر میں عاشقانہ اور متصوفانہ یعنی پہلے دو معنیاتی نظام کے سیاسی سماجی یعنی تیسرے معنیاتی نظام میں منقلب ہونے کے ارتقائی عمل کو دکھانے کے لیے ان ساختیوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ چھ بنیادی سٹ جن میں سے ہر ایک تثلیث کی شان رکھتا ہے، نیچے درج کیے گئے ہیں۔ پہلی سطر میں عام معنی دیے گئے ہیں، ان کے نیچے سماجی سیاسی توسیعی معنی قوسین میں درج کیے گئے ہیں۔ یہ محض اشاراتی ہیں، تمام معنیاتی ابعاد انہیں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر افقی سطر ایک سٹ ہے۔ یعنی ہر معنی پورے معنیاتی نظام میں اپنے وجود کے مفہوم کے لیے دوسرے تمام معنیاتی عناصر سے اپنے تضاد اور ربط کے رشتے کا محتاج ہے، اور بالذات یعنی محض اپنے طور پر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اُردو میں ساختیے کے معنی بالعموم غلط لیے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ اسٹرکچرازم کی وہ شاخ ہے جو تخلیقی اظہار کی اوپری سطح یعنی محض زبان یا ہیئت سے نہیں، بلکہ اس کی داخلی سطح یعنی معنیاتی نظام انتہائی مبہم اور گرفت میں نہ آنے والی چیز ہے۔ بحث و مباحثہ کی سہولت کے لیے اسے چند الفاظ میں مقید تو کیا جاسکتا ہے لیکن تمام معنیاتی کیفیات کا احاطہ نہیں کیا

جاسکتا۔ اس بحث میں الفاظ کو محض اشاریہ سمجھنا چاہیے اس کلی معنیاتی نظام کا جوان گنت استعاراتی اور ایمائی رشتوں سے عبارت ہے، اور لامحدود امکانات رکھتا ہے، جنہیں تخلیقی طور پر محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن منطقی طور پر دو اور دو چار کی زبان میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ فیضؔ کے معنیاتی نظام کے بنیادی ساختیے درج ذیل ہیں۔ بعض حضرات یہ سن کر چیں بہ جبیں ہوں گے مگر یہ حقیقت ہے کہ فیضؔ کی شاعری کا کوئی مفہوم یا معنی کی کوئی پرت ان اٹھارہ ساختیوں سے باہر نہیں ہے۔ پورے معنیاتی نظام کے ساختیوں کو ان چھ سطروں میں سمیٹا جاسکتا ہے۔ البتہ ان کے شاعرانہ اظہار کی ان گنت شکلیں اور پرایے ہیں۔ ساختیہ کی بنیادی پہچان یہ ہے کہ کوئی ساختیہ بالذات کوئی معنی نہیں رکھتا۔ معنی کا تصور تضاد سے پیدا ہوتا ہے۔ تضاد نہ ہو تو مختلف معنی قائم ہی نہیں ہوسکتے۔ لیکن یہ تضاد بھی مجرد یا بالذات نہیں کیونکہ یہ زبان کے کلی نظام (یہاں پر شاعری کے کلی نظام) کے تحت رونما ہوتا ہے۔ اس نظام میں ہر عنصر دوسرے عنصر سے متضاد ہے اس لیے مختلف ہے۔ تاہم چونکہ ایک نظام کے تحت ہے اس لیے ربط و تضاد کے باہمی رشتوں کی عمل آوری سے پیدا ہوتے ہیں یعنی کوئی لفظ بالذات بامعنی نہیں ہے، چنانچہ کسی لفظ کی مجرد تعریف ممکن نہیں۔ ذیل میں ہر سطر کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ ان میں جو نئے نئے معنیاتی امکانات پیدا ہوتے ہیں، وہ شاعر کے ذہن کی خلاقی کا کارنامہ ہیں :

۱۔ عاشق	معشوق	رقیب
(مجاہد/ انقلابی)	(وطن/عوام)	(سامراج/ سرمایہ داری)
۲۔ عشق	وصل	ہجر، فراق
(انقلابی ولولہ/ جذبۂ حریت)	(انقلاب، آزادی، حریت، سماجی تبدیلی)	(جبر/ظلم/ استحصال کی حالت/ یا انقلاب سے دوری)
۳۔ رند	شراب، میخانہ، پیالہ ساقی	محتسب، شیخ
(مجاہد، انقلابی، باغی)	(سماجی اور سیاسی بیداری کے ذرائع)	(سامراجی نظام/ سرمایہ دارانہ ریاست/عوام دشمن حکومت)

چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں

نظم میں رات کے پس منظر میں انتہائی موضوعی ذہنی کیفیت کا بیان ہے۔ پوری نظم امیجری کا شاہ کار ہے۔ یہ امیجری بھی شب اور نیم شب کی موضوعی کیفیتوں سے جڑی ہوئی ہے۔ نیم شب، چاند، بزمِ انجمن، آبشارِ سکوت، چاندنی کی تھکی ہوئی آواز کا گھنے درختوں پر سونا، کہکشاں کا نیم وا نگاہوں سے حدیثِ شوق نیاز کہنا، ساز دل کے خموش تاروں سے خمار کیف آگیں کا چھننا، اور روئے حسیں کی آرزو کا سلسلۂ جاریہ۔ یہ ہے وہ امیجری جو پوری نظم کو لطف و اثر کی ایسی سطح عطا کرتی ہے جو اعلیٰ شاعری کی پہلی شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ فیضؔ کے جمالیاتی احساس کو شب اور نیم شب کے احساسات اور ان سے جڑی ہوئی کیفیات سے ایک خاص مناسبت ہے۔ اس سے پہلے جو نظم 'ملاقات' پیش کی گئی تھی اس میں رات کی امیجری سیاسی سماجی ابعاد بھی رکھتی تھی۔ 'سرود شبانہ' خالص شخصی موضوعی نظم ہے، تاہم پہلی نظم کی طرح یہ بھی اعلیٰ درجے کی نظم ہے۔ ظاہر ہے کہ فیضؔ کے یہاں سماجی سیاسی احساس کی شاعری بھی ہے اور شخصی اظہار کی بھی، لیکن یہاں اس کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ فیضؔ کے یہاں سماجی سیاسی اظہار دراصل گہرے جمالیاتی احساس سے جڑا ہوا ہے۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی دیکھتے چلیے کہ امیجری میں دو طرح کے عناصر بالمقابل ہیں۔ مرئی اور غیر مرئی، نیم شب اور چاند مرئی ہیں خود فراموشی اور محفلِ ہست و بود کا ویران ہونا غیر مرئی— بزم انجم مرئی ہے، اور خاموشی کا پیکر التجا ہونا غیر مرئی۔ اسی طرح آبشارِ سکوت مرئی ہے اور چارسو بیخودی سی طاری ہے، غیر مرئی، یہ سلسلہ نظم کے آخر تک چلا گیا ہے، زندگی اور سراب کے مقابلے میں چاندنی کی تھکی ہوئی آواز، یا کہکشاں کے مقابلے میں حدیثِ شوق نیاز، یا سازِ دل کے مقابلے میں خمار کیف آگیں— امیجری کی یہ بافت اگرچہ بڑی حد تک غیر شعوری ہے، لیکن جمالیاتی احساس سے خود بخود ایک ڈیزائن بنتا چلا گیا ہے۔ آخری مصرعے سے اس کی مزید توثیق ہو جاتی ہے، یعنی

آرزو اور خواب غیر مرئی ہیں اور محبوب کا روئے حسیں مرئی ہے۔ ہوسکتا ہے بعض حضرات اس نظم کی تعریف میں کہنا چاہیں کہ شاعر فطرت سے ہم کلام ہے یا اس میں روحِ کائنات بول رہی ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن حقیقتاً یہ منظریہ شاعری نہیں۔ اس کو یوں دیکھنا چاہیے کہ اس میں ایک شدید جمالیاتی کیفیت کا اظہار ہوا ہے، جو فیضؔ کے رومانی ذہن کو سمجھنے کے لیے کلید کا درجہ رکھتی ہے۔ اس نوع کی شدید حسن کارانہ امیجری فیضؔ کی شاعری کا امتیازی نشان ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں شام، رات، شب، نیم شب، چاندنی، روئے حسیں، محض پیکر نہیں ہیں، یہ شدید نوعیت کے تخلیقی محرکات ہیں جو ایک خاص جمالیاتی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ گھنے درختوں پر چاندنی کی تھکی ہوئی آواز سو رہی ہے، کہکشاں نیم وا نگاہوں سے حدیثِ شوقِ نیاز سنا رہی ہے، سازِ دل کے خموش تاروں سے خمار کیف آگیں چھن رہا ہے، اور روئے حسین کی آرزو اس پوری کیفیت کا منتہا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بنیادی جمالیاتی کیفیت شروع میں تو نمایاں ہے، نقش فریادی کے بعد جب انقلابیت کا اثر بڑھنے لگا تو جمالیاتی کیفیت دب گئی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس کا سلسلہ نقش فریادی، دستِ صبا اور 'زنداں نامہ' سے ہوتا ہوا آخری مجموعوں تک چلا گیا ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ بات واضح ہوجائے گی۔

نقش فریادی

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

ان کا آنچل ہے کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زُلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں
آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رُخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
اپنے افکار کی اشعار کی دُنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنی ہے یہی

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دل آویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں
(موضوعِ سخن)

تہہِ نجوم، کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجومِ شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی

ضیائے مہہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نسیم
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بُن مو سے
رواں، ہو برگِ گلِ تر سے جیسے سیل شمیم
دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے
اُداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں

(تہہ نجوم)

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

(آج کی رات)

چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی!
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں

(ایک نظر)

اس سلسلے کی ایک اہم نظم 'تنہائی' ہے۔ یہ بھی اگر چہ شدید طور پر ذہنی موضوعی نظم ہے، لیکن اس میں بھی ایک ذاتی انفرادی تجربہ، ایک وسیع تر انسانی آفاقی کیفیت میں ڈھل جاتا ہے، اور ذہن و روح کو اپنی حزنیہ کیفیت سے شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار

لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

دلِ زار، راہرو، تارے، خوابیدہ چراغ، رہ گزار، قدموں کے سراغ، یا شمع و مے و مینا وایاغ، غزل کی شاعری کے پرانے الفاظ ہیں جن میں کوئی تازگی نہیں۔ لیکن دیکھیے کہ فیضؔ کی تخلیقی حس نے ان ہی پرانے الفاظ کی مدد سے کیسی تازہ کارانہ جمالیاتی اور معنیاتی فضا تخلیق کی ہے اور کلاسیکی روایت کے ان ہی فرسودہ عناصر کو کیسی تازگی اور لطافت سے سرشار کر دیا ہے۔ اس تخلیقی تقلیب کے جمالیاتی لطف و اثر سے کوئی بھی صاحبِ ذوق انکار نہیں کرسکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ جمالیاتی کیفیت فیضؔ زیادہ تر اپنی امیجری سے پیدا کرتے ہیں، ڈھلتی ہوئی رات میں تاروں کا غبار بکھرنے لگا ہے اور ایوانوں میں خوابیدہ چراغ لڑکھڑاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ 'رہ گزار' اک معمولی لفظ ہے، لیکن راستہ تک تک کے ہر اک رہگزار کا سو جانا کچھ اور ہی لطف رکھتا ہے۔ اسی طرح خاک کو اجنبی کہنا اور اس اجنبی خاک کا قدموں کے سراغ کو دھندلا دینا، یا کواڑوں کو بے خواب کہنا، یا شمعوں کو گل کر کے مے و مینا وایاغ کو بڑھا دینا، پرانے علائم کی مدد سے نئی امیجری کا جادو جگانا ہے۔ فیضؔ کی امیجری نہ صرف انتہائی حسن کارانہ ہے بلکہ طاقت ور بھی ہے۔ چند مصرعوں کی مدد سے فیضؔ ایسی رنگیں بساط بچھا دیتے ہیں کہ حواس اس کے طلسم میں کھو جاتے ہیں۔ زیرِ نظر نظم 'تنہائی' کی اس توجیہ سے، جو فیضؔ کے مترجم وکٹر کیرنن نے پیش کی ہے، میرے معروضات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ جن اظہاری بنیادوں کی طرف خاکسار نے اشارہ کیا ہے، ان کو ذہن نشیں کر لیا جائے تو کیرنن کی یہ تعبیر زیادہ معنی خیز معلوم ہوتی

ہے کہ یہ نظم شاید فرسودہ کلچر، یا بکھرتے ہوئے سماجی ڈھانچے کے زوال کا اشاریہ ہے/ سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار/ بقول کیرنن کے ان ناکامیوں کا نوحہ ہے، جن سے برصغیر کی تحریک آزادی اس وقت دو چار تھی۔ 'اجنبی خاک' سے مراد نو آبادیاتی نظام ہے۔ نظم امید سے شروع ہوتی ہے/ پھر کوئی آیا دلِ زار...... لیکن مایوسی پر ختم ہوتی ہے/ اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا/ گویا نظم اس یاس انگیز موڈ کو پیش کرتی ہے جو چوتھی دہائی میں ملک میں پایا جاتا تھا۔

اس موضوعی موڈ کو جو ہلکی ہلکی اُداسی، آرزوئے شوق، شام، ستارۂ شام، نجوم، تہہِ نجوم، چشمہ مُہتاب، بیتی ہوئی راتوں کی کسک، شب، نیم شب وغیرہ سے عبارت ہے، میں نے فیضؔ کے بنیادی تخلیقی موڈ کا نام دیا ہے۔ اس کی مزید شکلیں 'نقش فریادی' کے بعد کے مجموعوں سے دیکھئے اور ان کلیدی الفاظ پر غور کیجئے جن کا ذکر کیا جا رہا ہے:

دستِ صبا

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے
کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

'زنداں کی ایک شام' اور 'زنداں کی ایک صبح' دونوں سیاسی نظمیں ہیں۔ ان میں بھی اسی بنیادی جمالیاتی کیفیت اور اس سے جڑی ہوئی امیجری کو دیکھیے اور غور کیجئے کہ اس کی بدولت نظم کس قدر حسین ہوگئی ہے اور اس کی اثر انگیزی اور لطافت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے:

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں،
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے!
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے!
کامراں ہوسکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

موضوع کی رعایت سے یہاں فیضؔ نے رات کے حوالے سے چاند کے استعارے کو مرکزیت دی ہے/ شانۂ بام پر دمکتا ہے، مہرباں چاندنی کا دست جمیل/ چاند روشنی کی قندیل ہے اور روشنی زندگی کا استعارہ ہے/ ظلم کا زہر گھولنے والے،

چاند کو گل کریں تو ہم جانیں/ ظاہر ہے کہ آخری بند کی معنویت اور لطافت، شروع کے بند کے ان مصرعوں سے جڑی ہوئی ہے جن کا محرک وہ جمالیاتی سرشاری ہے جسے میں نے فیضؔ کی بنیادی تخلیق قوت کہا ہے...... 'زنداں کی ایک صبح' بھی 'زنداں کی ایک شام' کی طرح واضح طور پر سیاسی نظم ہے، لیکن دیکھیے، فیضؔ کا تخلیقی احساس کیا کیفیتیں پیدا کرتا ہے:

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا 'جاگ سحر آئی ہے'
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اتر آئی ہے'
عکسِ جاناں کو وداع کر کے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے ، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

مجھے یقین ہے بہت سے صاحبانِ ذوق اس بند کا شمار فیضؔ کے بہترین شعری پاروں میں کرتے ہوں گے۔ 'زنداں نامہ' سے یہ انتہائی پر لطف غزل دیکھیے:

زنداں نامہ

شام فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

دستِ تہِ سنگ

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے...... الخ

(شام)

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کی شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں
وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی...... الخ

سرِ وادیٔ سینا

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا
یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے
یا شمع پگھل رہی ہے

پہلو میں کوئی چیز جل رہی ہے
تم ہو کہ مری جاں نکل رہی ہے

شامِ شہر یاراں

اے شام مہرباں ہو
اے شام شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو...... الخ

مرے دل مرے مسافر

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخر شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخر شب

(۴)

جیسا کہ وضاحت کی گئی رات کی معنیاتی کیفیات سے وابستہ امیجری فیضؔ کے بنیادی تخلیق موڈ کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ ان حوالوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس تو ہوا ہوگا کہ یہ کیفیات رات کے بطن سے پیدا ہونے والی دوسری موضوعی ذہنی کیفیات مثلاً انتظار اور یاد کی کیفیات سے گھل مل گئی ہیں۔ مندرجہ بالا حوالوں میں کہیں کہیں تو یہ ربط خاصا واضح ہے، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ رات کی امیجری ان کیفیتوں سے اور یہ کیفیتیں، شب یا نیم شب کی بنیادی کیفیتوں سے جمالیاتی معنی خیزی کا رس حاصل کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں فیضؔ کی ایک اور شاہ کار نظم 'یاد' کلیدی درجہ رکھتی ہے، اور جس کی داد اس زمانے میں اثرؔ لکھنوی نے بھی دی تھی۔ غزلوں میں اسی کیفیت کی بہترین

ترجمانی 'تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے' یا 'رنگ پیراہن کا خوشبو زُلف لہرانے کا نام' کرتی ہیں، لیکن انھیں پر موقوف نہیں۔ یاد کی ٹیس یا انتظار کی کسک فیضؔ کا مستقل موضوع ہے جس کا اظہار طرح طرح سے ہوا ہے۔ بیسیوں نظموں اور غزلوں میں یاد اور انتظار کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور حسن کاری کے عمل کو شدید سے شدید تر بناتی ہیں۔ پہلے 'یاد' پر نظر ڈال لیجیے:

دشتِ تنہائی میں، اے جانِ جہاں، لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب
اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے، اے جانِ جہاں، رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

اس سلسلے میں مزید دیکھیے:

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے...... الخ

(قطعہ) دستِ صبا

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی...... الخ

(قطعہ) دست صبا

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں...... الخ

(قطعہ دست صبا)

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

(غزل) دستِ صبا

(۵)

یہاں تک آتے آتے رات، انتظار اور یاد کی ان بنیادی کیفیات سے ملی ہوئی ایک اور کیفیت کی طرف بھی ذہن ضرور راجع ہوا ہوگا۔ فیضؔ کی شاعری کی جمالیاتی فضا میں بعض کیفیتیں اتنی ملی جلی اور ایک دوسرے میں پیوست ہیں کہ تانے بانے میں ان کو الگ الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ رات، آرزو، انتظار اور یاد سے ملی ہوئی یہ کیفیت دھیمے دھیمے سلگتے ہوئے درد کی ہے جس نے پوری شاعری کو ایک مدھم حزنیہ لے عطا کردی ہے۔ یہ کیفیت نظم 'ملاقات' میں جس کا اس مضمون میں سب سے پہلے ذکر کیا گیا تھا، رات کی امیجری سے گندھی ہوئی موجود ہے، اور بعد کے تمام حوالوں میں بھی دھیمے دھیمے سلگتے ہوئے درد کی یہ کیفیت موجِ تہہ نشیں کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہ رات اس درد کا شجر ہے، میں درد ہی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی نظموں سے اگر درد کے تصور کو خارج کردیں تو ان کا پورا معنیاتی نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ یہ کیفیت، فیضؔ کی کم و بیش تمام شاعری میں پائی جاتی ہے۔ اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ فیضؔ کے یہاں درد کا احساس بھی ایک شدید تخلیقی محرک ہے۔ دھیمی دھیمی آنچ یا سلگنے کی کیفیت جس نے پوری شاعری میں سوگواری کی کیفیت پیدا کردی ہے، اور جو رات، یاد، اور انتظار کی حسن کارانہ امیجری کے ساتھ مل کر انتہائی پرکشش ہوجاتی ہے اور تاثیر کا

جادو جگاتی ہے۔ اس سلسلے میں نظم 'درد آئے گا دبے پاؤں' کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے' (غبار خاطر محفل) یا 'مرے درد کو جو زباں ملے' جیسی نظموں کو بھی دیکھ لیا جائے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ درد کی یہ کیفیت کلاسیکی غزل کے رسمی فراق یا رسمی ہجر کی کیفیت سے ملتی جلتی ہے یا اس سے الگ ہے۔ میرا خیال ہے مزاجاً یہ اس سے بالکل مختلف ہے اور کچھ اور ہی کیفیت ہے......

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سرِ رہ گزار چلے گئے
نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے
نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

یہ درد ایک لذت ہے، یہ تخلیقی خلش بھی ہے اور قوت بھی، کیونکہ گناہ گاروں کو جرم عشق پر ناز ہے، اور محرومی اور رسوائی لائقِ فخر ہے۔ گویا یہ شوق کی فراوانی اور آرزوئے روئے جمیل کا لازمہ بھی ہے۔ یہ انداز اگرچہ کلاسیکی روایت میں بھی ملتا ہے لیکن فیضؔ کا موقف قدرے مختلف ہے، وہ یہ کہ غم کی شام اگرچہ لمبی ہے، مگر شام ہی تو ہے۔ یعنی گزر جائے گی۔ جی جلانے یا دل برا کرنے کی ضرورت نہیں۔ غم کی شام کے ساتھ جینا بھی لازمۂ جہدِ حیات ہے۔ غرض فیضؔ کے یہاں درد کا جو تصور ہے وہ کوئی محدود شخصی درد نہیں بلکہ ایک شدید تخلیقی قوت ہے جو وسیع انسانی آفاقی ابعاد رکھتی ہے۔ یہ دردِ محبت ہی دراصل وہ بیچ کی ارتقائی کڑی ہے جو فرسودہ عاشقانہ علائم کا رخ عالم گیر سماجی یا سیاسی مفاہیم کے تازہ کارانہ جمالیاتی اظہار کی طرف موڑ

دیتی ہے۔ یہ بیچ کی کڑی نہ ہوتو اوپر جو ساختیے پیش کیے گئے تھے، ان سے رمزیہ اور استعاراتی سطح پر جو ہمہ گیر سماجی سیاسی، معنیاتی نظام پیدا ہوتا ہے وہ تخلیق ہی نہ کیا جاسکے۔ ذرا ان اشعار کو دیکھئے......

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

مطلع خالص عاشقانہ ہے، لیکن دوسرے شعر ہی سے غزل کی سماجی معنویت کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ یہ کون 'دیدۂ تر' ہے جس کی شنوائی کی بات کی جارہی ہے، یا یہ کس گھڑی کا انتظار ہے جب جان لہو ہوگی جب اشک گہر ہوگا۔ یا شاعر کیسے شہر کا ذکر کر رہا ہے جس میں/ واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے، نہ قاتل ہے/ ان علائم کے معنی کی جو تقلیب ہوئی ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مقطع دیکھیے یہ کس قامت جانانہ کا ذکر ہے جس کی راہ دیکھی جارہی ہے۔ یہ بات معمولی قاری بھی جانتا ہے کہ یہاں قامتِ جانانہ سے گوشت پوست کا محبوب مراد نہیں:

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

(۶)

اس شاعری کی جمالیاتی کشش اور لطف و اثر کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں اگرچہ قامتِ جانانہ، 'حشر' دیدۂ تر، وغیرہ علائم کے معنی کی تقلیب ہوجاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذہن وشعور یا دوسرے لفظوں میں ذوق سلیم، اس نوع کے رمزیہ اشعار کی لطافت سے صرف ایک معنیاتی سطح پر متاثر نہیں ہوتا۔ اگر ایسا سمجھا جاتا ہے تو یہ سادہ لوحی ہے۔ شاعری یا آرٹ سے لطف اندوزی کے مراحل میں بہت سے نفسیاتی امور ابھی تک علوم انسانیہ کی زد میں نہیں آئے، تاہم اتنا معلوم ہے کہ ذہن وشعور معنیاتی طور پر کئی کئی سطحوں سے بیک وقت متاثر ہوتی ہیں۔ گویا قامتِ جانانہ، گوشت پوست کا محبوب بھی ہوسکتا ہے جو حسن و جمال، رنگینی و رعنائی کا مرقع ہے اور ذہن وشعور میں ایک روشن نقطہ بن کر چمکتا ہے۔ نیز بیک وقت وطن وقوم کا یا آزادی و انقلاب کا وہ تصور بھی ہوسکتا ہے جو ولولہ انگیز ہے اور سنگین حالات کا مقابلہ کرنے کی بشارت دیتا ہے۔

فیضؔ نے ایک جگہ کہا ہے/ ہم نے شب شعر میں سنوارے تھے، ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے/ شعر میں سنوارنے کا عمل دراصل تقلیب کا عمل ہے۔ یہ تقلیب اعلیٰ شاعری کا بنیادی جوہر ہے/ ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے/ میں اشارہ دراصل گفتگو سے زیادہ سماعت کی طرف ہے، جو ذہنی تخلیقی عمل کی پہلی سیڑھی ہے۔ لیکن فیضؔ کی شاعری میں بات صرف اتنی نہیں کہ خطاب محبوب کی جانب سے ہو یا وطن وقوم کی جانب سے، اور فن کی سطح پر اس کی شعری تقلیب ہوئی ہو، بلکہ یہ خطاب فن کار کی جانب سے بھی ہے، بنامِ محبوب اور بنامِ وطن یا انسان۔ اصل خوبی یہی ہے کہ یہ دونوں معنیاتی سطحیں ایک تخلیقی وحدت میں ڈھل جاتی ہیں، اور ذہن وشعور کو ایک ساتھ مل کر سرشار کرتی ہیں۔ فیضؔ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ ان کے یہاں عاشقانہ سطح محض

عاشقانہ سطح نہیں اور انقلابی سطح محض انقلابی سطح نہیں۔ فیضؔ کی تمام شاہ کار نظموں یا غزلوں میں یہ امتیاز موجود ہے......

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے...... الخ

رنگ پیراہن کا ، خوشبو زُلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام...... الخ

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا...... الخ

قطع نظر ان نہایت عمدہ غزلوں کے اس سلسلے کی بہترین نظم 'نثار میں تری گلیوں کے' ہے۔ اس کا سماجی سیاسی احساس اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے، لیکن دیکھیے کہ وطنی وقومی احساس کو فیضؔ کس طرح عاشقانہ اظہار عطا کرتے ہیں، اور عام فرسودہ عاشقانہ علائم کو کس طرح سماجی سیاسی درد سے سرشار کر کے ایک ہمہ گیر جمالیاتی کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔ یہ بات دیکھنے سے زیادہ محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس جمالیاتی سرشاری کی اکا دکا مثالیں فیضؔ کے معاصرین کے یہاں بھی مل جاتی ہیں، لیکن یہ تقلیب کسی دوسرے کے یہاں اتنے بڑے پیمانے پر، اتنے ترفع اور جمایاتی رچاؤ کے ساتھ رونما نہیں ہوئی جیسی کہ فیضؔ کے یہاں ہوئی ہے۔ فیضؔ کے یہاں یہ تخلیقی تقلیب دوطرف ہے۔ غور طلب ہے کہ دونوں طرف اس کی آمد و رفت کس آسانی اور سہولت سے جاری رہتی ہے، گویا یہ فیضؔ کے شعری عمل کی وحدت کا ناگزیر حصہ ہے:

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

طواف، جسم و جاں، اہلِ جنوں، اہلِ ہوس، مدعی، منصف، سب کلاسیکی روایت کے گھسے پٹے الفاظ ہیں، لیکن فیضؔ نے انہیں کی مدد سے نئی شعری فضا خلق کی ہے، اور کیسے اچھوتے پیرایے میں اپنی بات کہی ہے......

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

مخاطب کی شان محبوبی تو پہلے بند ہی سے ظاہر ہے، لیکن تیسرے بند تک پہنچتے پہنچتے یہ تصور اور بھی نکھر کے سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد آگ میں پھول کھلانا، یا ان کی ہار اور اپنی جیت کی بشارت دینا، فلک کا گلہ نہ کرنا، یا فراقِ یار میں دل برا نہ کرنا اسی

جمالیاتی رچاؤ کی توسیعی شکلیں ہیں۔ فیضؔ اپنے فنی رچاؤ اور جمالیاتی احساس کے معاملے میں غیر معمولی طور پر حساس تھے۔ فن ان کے نزدیک ایک مسلسل کوشش تھی۔ دستِ صبا کے دیباچے میں غالب کے اس خیال سے کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی، دیدۂ بینا نہیں، بچوں کا کھیل ہے، بحث کرتے ہوئے فیضؔ نے فن کے بارے میں لکھا ہے...... 'طالب فن کے مجاہدے کا زوال نہیں۔ فن ایک دائمی کوشش ہے، ایک مستقل کاوش......' فیضؔ کے یہاں فن کو ایک دائمی کوشش کے طور پر برتنے کا تخلیقی رویہ خاصا نمایاں ہے تبھی تو ان کے یہاں وہ رچاؤ اور کشش پیدا ہوسکی جو دلوں کو مسحور کرتی ہے۔

(۷)

آخر میں یہ سوال اُٹھانا بھی بہت ضروری ہے کہ یہ شاعری چونکہ تاریخ کی ایک لہر کے ساتھ پیدا ہوئی ہے، اور اس کے معنیاتی نظام کی سماجی سیاسی جہت یقیناً اپنے عصر سے نظریاتی غذا حاصل کرتی ہے تو کیا یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'وقتیا' سکتی ہے۔ یعنی dated ہوسکتی ہے۔ ہنگامی شاعری کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا اثر بڑی حد تک زائل ہوجاتا ہے۔ وطنی قومی شاعری کا ایک حصہ طاقِ نسیاں کی نذر اسی لیے ہوجاتا ہے کہ وقت کی دیمک رفتہ رفتہ اسے چاٹ لیتی ہے۔ شاعری اور آرٹ میں ہر وہ چیز جو صرف تاریخی شعور یا صرف سماجی معنی یا محض موضوع کے زور پر پروان چڑھتی ہے، یا زندہ رہنے کا دعویٰ کرتی ہے، اور فن پارے میں اپنا کوئی تخلیقی جوہر نہیں ہوتا تو وہ وقت کے ساتھ ساتھ کالعدم قرار پاتی ہے۔ البتہ اگر فن کار نے اپنے درجۂ کمال سے اس میں کوئی جمالیاتی شان پیدا کردی ہے، یا دوسرے لفظوں میں خونِ جگر کی آمیزش کی ہے، اپنے فنی اخلاص سے کچھ ایسی مہر لگادی ہے جو لطف و اثر کا سامان رکھتی ہے، تو ایسا فن پارہ زندہ رہنے کا امکان رکھتا ہے۔ یہ

بات ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ شام شہرِ یاراں میں، جو آخری دور کا کلام ہے، پانچ شعر کی ایک مختصر سی غزل ہے، ملاقاتوں کے بعد، برساتوں کے بعد، فیضؔ نے اسے نظمیہ عنوان دیا ہے۔ 'ڈھاکہ سے واپسی پر' اس عنوان کی بدولت اس غزل کا تاریخی تناظر ذہن پر ثبت ہو جاتا ہے۔ اگر یہ عنوان نہ ہوتا تو مطلع خالص تغزل کا رنگ لیے ہوئے تھا، لیکن عنوان قائم ہو جانے کی وجہ سے تمام اشعار تاریخ کے محور پر سانس لینے لگتے ہیں۔ دوسرے شعر میں بے داغ سبزے کی بہار اور 'خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد' سے درد کی لہر واضح ہو جاتی ہے......

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
اُن سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیجئے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

مہرباں راتیں، بے مہر صبحیں، شکستِ دل، گلے شکوے، جاں صدقہ کرنا اور اصل بات کا اَن کہا رہ جانا، کون کہہ سکتا ہے یہ سب اظہارات شدید جمالیاتی رچاؤ نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ فیضؔ نے ایک خالص تاریخی سانحے کو جذبات کاری سے انتہائی ارفع اور ہمہ گیر جمالیاتی احساس میں ڈھال دیا ہے۔ فیضؔ کے یہاں تاریخی شعور، یا سماجی احساس، یا انقلابی فکر، کوئی محدود اور وقتی چیز نہیں، بلکہ یہ جمالیاتی اظہار کی راہ پاکر ایک عام انسانی آفاقی کیفیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

فیض کی فکر انقلابی ہے، لیکن ان کا شعری آہنگ انقلابی نہیں۔ وہ اس معنی میں باغی شاعر نہیں کہ وہ رجز خوانی نہیں کرتے، ان کے فن میں سخن سنجی اور نرم آہنگ نغمہ خوانی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ وہ اس درجۂ کمال کے شاعر ہیں جہاں 'برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است'، شعری ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کا لہجہ غنائی ہے۔ ان کا دل دردِ محبت سے چور ہے۔ ان کا شعری وجود اک روشن الاؤ کی طرح ہے جس میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی ہے۔ اس کے سوزِ دروں میں سب ہنگامی آلائشیں پگھل جاتی ہیں، اور جمالیاتی حسن کاری کی آنچ سے تپ کر تخلیقی جوہر تابندہ و روشن ہو اٹھتا ہے۔ فیض نے اپنے تخلیقی احساس سے ایسی شعری وحدت کی تخلیق کی جس کی حسن کاری، لطافت اور دل آویزی تو احساسِ جمال کی دین ہے، لیکن جس کی دردمندی اور دل آسائی سماجی احساس سے آئی ہے۔ انہیں سب عناصر نے مل کر فیض کی شاعری میں وہ کیفیت پیدا کی ہے جسے قوتِ شفا کہتے ہیں۔ فیض کی شاعری کا نقش دلوں پر گہرا ہے۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا کچھ حصہ دھندلا جائے گا۔ تاہم اس کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی تابندگی کم نہیں ہوگی، بلکہ اس کا امکان ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا نقش اور روشن ہوتا جائے گا......

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

○○

کلیم الدین احمد

فیضؔ کی نظم نگاری

فیضؔ کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے۔ 'نقش فریادی' اور 'دستِ صبا' کی دو پتلی جلدیں اور بس۔ ان دونوں مجموعوں میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ مجھے صرف فیضؔ کی نظموں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ فیضؔ میں دو چیزیں ہیں جو دوسرے ترقی پسند شاعروں میں نہیں ملتیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ فیضؔ کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور وہ ان فنی تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ترقی پسند شعراء کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس نہیں اور یہی کمی ان کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ دوسری چیز جو فیضؔ میں ملتی ہے وہ ایک قسم کی خود ضبطی ہے۔ وہ اپنے کو لیے دیئے رہتے ہیں اور دوسرے باغی شاعروں کی طرح اپنے نعروں سے آسمان کو نہیں ہلاتے۔ وہ ترقی پسندی کا یہ مطلب نہیں سمجھتے کہ بیدار ہو، بیدار ہو کا شور مچایا جائے۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائیں 'تلوار اٹھا تلوار اٹھا'، 'مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم'، 'ایشیا چھوڑ دو! ایشیا چھوڑ دو'، 'بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا' اور اسی قسم کی چیزوں کی یلغار کو بہترین سمجھا جاتا ہے۔ ان کی آواز دھیمی ہے، وہ دبی زبان سے باتیں کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ افکار و جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتے۔ افکار و جذبات پر ضبط کی مہریں لگاتے ہیں۔

دوسرے شاعروں کی طرح پہلے فیضؔ بھی رومانی تجربوں سے کھیلتے ہیں۔ ذہنی

کشاکش میں مبتلا ہوتے ہیں اور رومان کی دُنیا چھوڑ کر حقیقت کی دُنیا میں جا رہے ہیں لیکن وہ رومان کی دُنیا میں رہیں یا حقیقت کی دُنیا میں، فنی تقاضوں کو نہیں بھولتے اور خود ضبطی سے برابر کام لیتے ہیں۔

آخری خط

وہ وقت مری جان بہت دُور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گزر جائے گا اندوہ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دل معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے
شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی
شاید مری بے سود وفاؤں پہ ہنسو گی
اس وضعِ کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہوگا
لیکن دلِ ناکام کو احساس نہ ہوگا
القصہ مآلِ غم اُلفت پہ ہنسو تم
یا اشک بہاتی رہو فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ الفت

اس نظم میں کوئی خاص بات نہیں ہے اسی لیے اس کا شمار فیضؔ کی اچھی نظموں میں نہیں۔ لیکن یہاں بھی باتوں میں ربط ہے، تسلسل ہے، ارتقائے خیال ہے۔ لب و لہجہ ایسا ہے کہ گویا باتیں کی جا رہی ہیں۔ شاعر اپنے رومانی جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتا، بلکہ اپنے خیالات اور جذبات کو نظم کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ کوشش کامیاب ہوتی ہے اور ناکامیاب بھی، لیکن یہ کوشش بڑی بات ہے اور یہ فیضؔ کو دوسرے ترقی پسند شاعروں سے ممتاز کرتی ہے اور ایک امتیازی خصوصیت یہ احساس بھی ہے کہ 'نوجوانی کے تجربات کی جڑیں بہت گہری نہیں ہوتیں' اس لیے فیضؔ اپنے نوجوان تجربوں کو نادر و نایاب نہیں سمجھتے اور انہیں ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں۔

'نوجوانی کے تجربات کی جڑیں بہت گہری نہیں ہوتیں' اس کا یہ احساس دوسرے ترقی پسند شاعروں کو بھی ہوتا ہے۔ یہی احساس فیضؔ کے شعور کی ترقی کی اصل وجہ ہے۔ یہ شعور کی ترقی اس قسم کی نہیں جس کی مثال علی سردار جعفری کی ان دو نظموں میں ملتی ہے۔

وقت کی پلکوں پہ اک آنسو چمکتا ہے مگر
تھرتھرا سکتا ہے عارض پہ ٹپک سکتا نہیں
ایک انگارا چھپا ہے زندگی کی راکھ میں
راکھ کے نیچے سلگتا ہے دہک سکتا نہیں

اب کوئی اڑتے شرارے کو دبا سکتا نہیں
کوئی بادل سرخ تارے کو چھپا سکتا نہیں
ایک ہی ہلکے سے جھٹکے میں کلائی موڑ دے
اے مجاہد سامراجی انگلیوں کو توڑ دے

ان دو مثالوں سے نہ تو شعور کی ترقی کا پتہ چلتا ہے اور نہ فن کی ترقی کا، شعور اور فن ایک ہی جگہ پر ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے شعور کی تیزی اور گہرائی کے اعتبار سے یہاں کوئی ترقی نہیں۔ فیضؔ کے شعور میں واقعی ترقی ہوئی ہے اور اس ترقی کی وجہ سے

ان کی شخصیت اور ان کے فن دونوں میں گہرائی آگئی ہے جس شعوری ترقی کی طرف یہاں اشارہ ہے اس کا تعلق رومان سے ہے، انقلاب کی منزل طے کرنے سے نہیں۔

ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ فیضؔ کی دو نظمیں ہیں۔ 'انتظار' اور 'تنہائی'۔

انتظار

گزر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں
ریاض زیست ہے آزردۂ بہار ابھی
مرے خیال کی دُنیا ہے سوگوار ابھی
جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
بہارِ حسن، یہ پابندیٔ جفا کب تک
یہ آزمائش صبر گریز پا کب تک
قسم تمہاری بہت دکھ اٹھا چکا ہوں میں
اُداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں
غلط تھا دعویٰ صبر و شکیب آجاؤ
قرار خاطرِ بیتاب، تھک گیا ہوں میں

تنہائی

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں، کوئی نہیں
راہ رو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار

لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر

'انتظار' میں ایک نوجوان کا تجربہ ہے، اس میں کوئی گہرائی نہیں، انفرادی شان نہیں۔ پائیداری نہیں۔ لیکن اسی نوجوان کے تجربے پر اگر اختر شیرانی نظم لکھتے تو نتیجہ ایک لمبی رومانی نظم ہوتی جس میں ربط صرف ظاہری قسم کا ہوتا ہے یعنی لمبی مسلسل غزل ہوتی جس میں رومانی جذبات، رومانی تشبیہیں اور استعارے رومانی ترنم، اور استعارے، یہ سب چیزیں ہوتیں اور ان سب چیزوں کی زیادتی ہوتی، لیکن انتظار میں اس قسم کی زیادتی نہیں، اس میں اچھے خاصے غزل کے شعر ہیں۔

ریاضِ زیست ہے آزردۂ بہار ابھی
میرے خیال کی دُنیا ہے سوگوار ابھی
بہارِ حسن پہ پابندیٔ جفا کب تک
یہ آزمائشِ صبر گریز پا کب تک

اختر شیرانی کی نظم میں سب شعر اسی قسم کے ہوتے تھے اور اگر کسی بند کا استعمال ہوتا ہے تو بند پیائی حسبِ معمول ہوتی۔ 'انتظار' غزل نہیں اور اس میں جو بند پیائی ہے، اس میں جو خیال کی ترقی ہے، جو لب و لہجہ کا اُتار چڑھاؤ ہے، جو مصرعوں میں ربط ہے، غرض جو 'پیٹرن' ہے وہ اسی قسم کا ہے جو نظم میں ملتا ہے لیکن یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ 'مرے خیال کی دُنیا ہے سوگوار ابھی'، 'اداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں' یہاں خیال کی سوگواری، آنکھوں کی اداسی، دل کی تھکن کو خارجی چیزوں کی مدد سے دکھایا گیا ہے۔

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں کے خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے چراغ

خیال کی سوگواری، آنکھوں کی اداسی، دل کی تھکن کا اس سے زیادہ خوب

صورت بیان ممکن نہیں' یہ کہنے سے کہ خیال سوگوار ہے، آنکھیں اداس ہیں، خیال سوگوار نہیں ہوجاتا، آنکھیں اداس نہیں ہوجاتیں، چند خارجی تصویریں ہیں لیکن ان سے سوگواری اور اداسی کی شدت ٹپکتی ہے اور اس شدت کے باوجود ضبط ہے اور انتہائی شدت یاس میں انتہائی ضبط ممکن ہے اس لیے کہ شاعر نے ذاتی احساس کو خارجی صورت میں ڈھال دیا ہے۔ اس بالواسطہ طریق کار سے احساس کی شدت بھی رہتی اور اس پر قابو بھی رہتا ہے۔ اُردو شعرا اس گر سے واقف نہیں۔

اوتھر سائنس کی ایک نظم ہے 'دی بروکن ٹرسٹ'۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ فیضؔ نے اس نظم سے شعوری طور پر استفادہ کیا ہے۔ اس کا ایک حصہ ہے......

''میں نے اپنے دل کو تنبیہ کی اور کہا 'بے قرار نہ ہو وہ آرہی ہے، دیکھو، ابھی ابھی وہ آتی ہے، لو اس کے پیروں کی چاپ میں سن رہا ہوں۔ دیکھو وہ آ پہنچی پھر کوئی عورت گزر گئی، گھنٹیوں کے بجنے کی بھاری آواز فضا میں گونجی۔ کوئی امید باقی نہیں تھی، میں کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ سوچنے سے یاس میں زیادتی ہوتی۔''

مشابہت ظاہر ہے، مرکزی خیال ایک ہی ہے اور یہی مرکزی خیال ہارڈی کی نظم 'دی بروکن اپوائنمنٹ' میں بھی ملتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ فیضؔ نے ان نظموں سے استفادہ کیا ہے یا نہیں اگر استفادہ کیا بھی ہو تو انہوں نے اس مرکزی خیال کو اپنا لیا ہے اور اس کے بیان میں انفرادی شان پیدا کی ہے۔

میں نے کہا ہے کہ 'انتظار' میں وزن کے زیر و بم سے ایک 'پیٹرن' بنایا گیا ہے، لیکن وہ 'پیٹرن' کچھ معمولی سا ہے۔ اس میں وہ ندرت نہیں' وہ انفرادی امتیاز نہیں' احساس اور وزن کے زیر و بم میں وہ حسین میل نہیں جو 'تنہائی' میں ہے۔ 'تنہائی' میں اُردو نظم نے غزل سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ 'تنہائی' فیضؔ کی بہترین نظم ہے، اُردو شاعری میں کافی اہمیت رکھتی ہے لیکن ہارڈی کی 'دی بروکن اپوائنمنٹ' سے بہت پیچھے ہے۔

فیضؔ کی ایک نظم ہے 'بول'......

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کر آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہو کہہ لے

یہ نظم رومانی نہیں انقلابی ہے، لیکن عام انقلابی نظموں سے ذرا مختلف ہے۔ یہاں تفصیل سے نہیں اشارے سے کام لیا گیا ہے۔

دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

بس اسی قدر دوسری نظموں میں بھی احتیاط ہے۔

جا بجا بکتے ہوئے کوچۂ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

یعنی ترقی پسندی کی زبان میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے واقفیت ہے لیکن اشتہار نہیں۔ یہ وہی ضبط احتیاط ہے جو فیضؔ کی دوسری نظموں میں بھی ملتی ہے، لیکن

دوسری ترقی پسند نظموں کے چناؤ میں اور وزن کے اُتار چڑھاؤ سے غنیمت ہے۔ یہاں بھی فیضؔ نظموں کے چناؤ اور وزن کے اُتار چڑھاؤ سے ایک خاص پیٹرن بناتے ہیں، نئی قسم کا، جس میں انفرادی حسن کاری ہے۔ عام ترقی پسند نظموں کی ڈگر سے بالکل الگ ایک چیز ہے۔ ''بکارے حشر چکان وسنہیب صورفروش'' کی عام بازاری میں یہ نظم صحتمند لطائف کی دیوی معلوم ہوتی ہے۔ فیضؔ کو اس نکتہ کی خبر ہے کہ ہر تجربہ اپنا سانچہ آپ بناتا ہے اور پھر اس سانچہ میں آپ ڈھل جاتا ہے۔ فیضؔ کی ہر نظم میں ایک نیا سانچہ ملتا ہے۔ 'تنہائی' اور 'بول' دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں میں فن کی حسن کاری ہے لیکن 'تنہائی' کی تکنک زیادہ حسین ہے۔ شاید اس لیے کہ تجربہ میں زیادہ گہرائی ہے۔ 'بول' میں کچھ خطابت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بول کی تکرار کامیاب ہے لیکن یہ کامیابی خطابت کی دُنیا میں بستی ہے۔

میں نے کہا ہے کہ فیضؔ کے شعور نے ترقی کی ہے اور اس ترقی کی وجہ سے ان کی شخصیت اور ان کے فن میں گہرائی آگئی ہے۔ 'انتظار' ایک طرف اور 'تنہائی' اور 'بول' دوسری طرف۔ ان نظموں کے تجزیے سے یہ بات تو ثابت ہوگئی ہوگی۔ یہ ترقی ایسا معلوم پڑتا ہے کہ ایک نقطہ پر پہنچ کر رُک گئی ہے۔ 'دستِ صبا' کی نظموں میں فیضؔ کے شعور کی مزید کوئی ترقی نہیں پائی جاتی ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کے فن میں بھی کوئی مزید گہرائی نہیں آئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فیضؔ اپنی ذہنی اُلجھنوں کو سلجھا نہیں سکے ہیں۔ رومان سے انقلاب کی منزلیں طے کرنے میں وہ سخت الجھنوں میں پھنس جاتے ہیں۔ یوں کہنے کو تو ہر ترقی پسند رومان سے انقلاب کی منزل طے کرتا ہے، لیکن یہ سفر عموماً ذہنی سفر نہیں ہوتا، صرف موضوع سخن بدل جاتا ہے۔ ذہنی ترقی اور ذہنی اُلجھن کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔ فیضؔ کی واقعی شعوری ترقی ہوئی ہے اور یہ ذہنی اُلجھنیں بھی واقعی ہیں۔ دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح انہوں نے بھی موضوع سخن پر نظم لکھی ہے۔ ایک طرف چشمہ مہتاب ہے، ان کا آنچل ہے، زُلف کی موہوم گھنی چھاؤں ہے، اور دوسری جانب شہروں کی فراواں مخلوق ہے۔ جو مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے۔

حسین کھیت ہیں جن میں بھوک اگا کرتی ہے۔ پر اسرار کڑی دیواریں ہیں جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ جل بجھے ہیں۔ دونوں قسم کے مضمون انہیں بلاتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف انہوں نے 'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' اور 'چند روز اور مری جان' میں بھی اشارہ کیا ہے۔

اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

'موضوع سخن' میں کہتے ہیں......

لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں

یہ ذہنی اُلجھن خیالی نہیں، واقعی ہے اور وہ اس الجھن سے نجات نہیں پا سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعور کی ترقی رک گئی ہے اور ان کی شاعری کے چشمہ کا پانی کچھ خشک ہو گیا ہے۔

غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کشمکش میں فیض کا غیر شعوری جھکاؤ کس طرف ہے۔ وہ کہتے تو ہیں زمانہ میں محبت کے سوا اور بھی دکھ ہیں اور وصل کی راحت کے سوا اور بھی راحتیں ہیں اور یہ ان کی شعوری پہچان ہے۔ لیکن غیر شعوری طور پر ان کا دامنِ دل اور کسی طرف کھنچتا ہے۔ 'موضوعِ سخن' میں دو ٹکڑے ہیں۔

آج پھر حسن دلآرا کی وہی سج دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر

رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

یہ ہر اک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

ان دونوں ٹکڑوں کو غور سے پڑھیے۔ پہلی مثال میں شعریت کا خون وہ ہلکا ہی سہی' دوڑتا ہے، دوسری مثال میں یہ بات نہیں۔ فیضؔ شعوری طور پر ترقی پسند ہیں۔ مارکسی خیالات کو اپناتے ہیں۔ کہتے ہیں: 'حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدو جہد کا ادراک اور اس جدو جہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے، فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جد و جہد کا ایک پہلو ہے۔' فیضؔ نے اس جدو جہد میں' حسب توفیق شرکت کی ہے۔ لیکن یہ شرکت فن کا تقاضا نہیں اور اس شرکت کی وجہ سے ان کے فن میں کوئی گہرائی نہیں آئی ہے۔ ان کے فن پر کوئی جلا نہیں ہے۔ مشکل یہی آپڑی ہے کہ فیضؔ شعوری طور پر مارکسی شاعر بنا چاہتے ہیں اور غیر شعوری طور پر بہاؤ انہیں کسی دوسری سمت لے جاتا ہے۔ ان کے شعور اور تحت الشعور میں ایک قسم کا تصادم ہوا ہے اور اس تصادم کا اثر ان کی شاعری پر اچھا نہیں پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری 'گھٹ کر' جوئے کم آب' سی ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'دست صبا' کی نظموں میں کچھ کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ 'مرے ہمدم مرے دوست' دو آوازیں، نثار میں تیری گلیوں پہ' میں اچھی نظم بننے کے امکانات تھے۔ بعض بعض ٹکڑے اچھے بھی ہیں۔ لیکن پوری نظم میں کچھ کمی سی رہ جاتی ہے۔ مثلاً مرے ہمدم مرے دوست' اچھی طرح شروع ہوتی ہے۔

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم مرے دوست
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن

تیری آنکھوں کی اداسی، ترے سینے کی جلن
میری دل جوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
لیکن اچھی نہیں رہتی......

گر مرا حرف تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے ڈھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے

ان شعروں میں خون نہیں دوڑتا۔ استعارے بھی خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ حرف تسلی خیر دوا تو ہوسکتا ہے، جس سے بیمار جوانی کو شفا ہو جائے۔ لیکن اسی دوا سے تذلیل کے داغ بھی ڈھل جاتے ہیں۔ اجڑا ہوا دماغ لہلہا اٹھتا ہے اور بے نور دماغ منور ہو جاتا ہے۔ دوا ایک استعارہ ہے۔ اجڑا بے نور، داغ دوسرے استعارے ہیں، اور یہ سب بری طرح خلط ملط ہو جاتے ہیں:

'نقش فریادی' کے دیباچہ میں فیضؔ نے اعتراف کیا تھا۔ 'اب مضامین کے لیے تجسس کرنا پڑتا ہے۔ 'دست صبا' میں یہ تجسس کی شکل صاف ابھر آتی ہے۔ ایرانی طلبا کے نام' ہے جس میں ترقی پسند موضوع ڈھونڈا گیا ہے اور اس میں فیضؔ نے بڑی کاوش کی ہے اور ٹکنک کی خوبیاں بہم پہنچائی ہیں۔ اس لیے ایک ظاہری لفظ حسن تو آ گیا ہے لیکن ان لفظوں میں زندگی کی شاعری کی گرمی نہیں، حسین لیکن سرد اور بے جان سی چیز ہے۔

اے ارض عجم، اے ارض عجم
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟

پھر کچھ کہنے کی خواہش۔ ایسی باتیں جو ترقی پسند حلقے میں تحسین کی نظروں سے

دیکھی جائیں۔ اچھی خاصی نظم کو بھی خراب کر دیتی ہیں۔ 'شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں' اچھی پاکیزہ نظم ہو سکتی تھی۔ اگر وہ اسی قدر ہوتی۔

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ در
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہیں ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغر مے ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اترا کرتی ہے
صہبائے غم جاناں کی پری
یہ رنگین ریزے ہیں شاید
ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے
یا شاید ان ذروں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزت کا
وہ جس سے تمہاری عجز پہ بھی

شمشاد قدوں نے رشک کیا
یہ ساغر شیشے لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

لیکن فیض کو یہ بھی کہنا ہے کہ کچھ لوگ اس دولت پر پردے لگاتے پھرتے ہیں اور کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر یہ پردے نوچ گراتے ہیں۔ ان دونوں میں رن پڑتا ہے۔ بستی بستی نگر نگر رن پڑتا ہے۔ سب ساغر شیشے لعل و گہر اس بازی میں بدل جاتے ہیں اور آخر نظم میں یہ تلقین ہے......

اُٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آئے

لڈو بھرے اور خالی ہاتھوں کی جنگ کے ذکر سے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہوتا اور ایک اچھی خاصی نظم سیاست کا میدان بن جاتی ہے۔

یہ ذہنی اُلجھن کا نتیجہ ہے کہ جب رن کی بات اٹھائی جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی رکاوٹ ہے، ایسی زبردست رکاوٹ ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں۔ اس لیے باتیں اکھڑی اکھڑی ہوتی ہیں۔ آواز دبی دبی ہوتی ہے جیسے کوئی بھاری پتھر سینہ پر رکھا ہوا ہو' زنداں کی ایک شام' اور' زنداں کی ایک صبح' کو پڑھیے۔ اسی اندرونی رکاوٹ کا احساس ہوتا ہے، گویا سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنات گراں اپنے چنگل سے شعر کی نازک پریوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور شعوری طور پر زور لگانا

پڑتا ہے کہ اس چنگل کے دباؤ سے چھٹکارہ ہو، یہ رکاوٹ دور ہو جائے، اسی شعوری کوشش، زور کی وجہ سے شعریت کا رس خطابت کی جھاگ سے بدل جاتا ہے۔

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

اپنے شہپر کی رہ دیکھ رہی ہے یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امیدوں کے جلتے ہوئے تیر

لیکن جب وہ رن کے بلاوے کو وقتی طور پر بھول جاتے ہیں یا 'ناز و غمزہ'، 'خنجر' کی زبان میں بولتے ہیں تو یہ اندرونی رُکاوٹ...... نہیں پہنچاتی۔ ایک نظم ہے، تمہارے حسن کے نام، یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں لیکن اس میں احساس کی گرمی اور تیزی ہے، شعریت کا رس ہے......

تمہارے ہات پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریٔ سخن جب تک
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات' سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیِ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

حسن اور انقلاب میں کوئی تضاد نہیں۔ دائمی مخاصمت اور تصادم نہیں۔ اگر انقلاب حسن بن جائے تو ذہنی اُلجھن سلجھ جاتی ہے۔ اندرونی رکاوٹ دور ہو سکتی ہے اور 'جوئے کم آب' میں پانی کی فراوانی ہو سکتی ہے۔

OO

احتشام حسین

فیضؔ کی انفرادیت

بعض مخلص اور دیانتدار لوگوں کے اظہار عقائد میں بھی ایک ایسی منزل آتی ہے، جہاں ''زاہد تنگ نظر'' کفر کا فتویٰ لگاتا ہے اور کافر ''مسلمان'' قرار دے کر ان سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ یا پھر وہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کچھ دل موہ لینے والی ادائیں اپنا کام کر جاتی ہیں اور کفر و اسلام کی چھان بین کرنے کے بجائے گبر اور مسلمان دونوں ان کا ہاتھ چومنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ جب مسلمان دوسروں سے اپنی علاحدگی ظاہر کرنے کے لیے ان میں صرف کفر تلاش کرتا ہے اور 'کافر' ساری انسانی خصوصیات کو نظر انداز کر کے اپنی بیزاری کے جواز کے لیے دوسروں میں صرف اسلام کی جستجو کرتا ہے تو چاہے حقیقت کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے، اندھے جذبۂ منافرت کی تسکین ضرور ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت میں صرف چند مشترک پہلوؤں پر نظر رکھ کر کفر میں اسلام اور اسلام میں کفر کا جلوہ دیکھ لینے کی آسودگی حاصل ہو جاتی ہے۔ دونوں نقطۂ نظر جذباتی ہیں، لیکن پہلے سے منافرت اور دوسرے سے روا داری کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ شعر و ادب سے لطف اندوز ہونے میں غالباً دوسری شکل زیادہ مفید ہے کیوں کہ اس میں کم سے کم ناانصافی اور بیزاری کی صورت نہیں پیدا ہوتی، بلکہ لطف اندوزی اور ہمدردانہ تنقید کے لیے زمین ہموار ہوتی ہے۔

فیضؔ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے وقت تمہید کے طور پر یہ چند سطریں بے اختیار قلم سے نکل گئیں، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی شاعری پر تنقید کے لیے قلم اٹھانے

والوں میں سے اکثر کا کفر ٹوٹا ہے اور ترقی پسندی کو آنکھ بند کر کے کوسنے والوں نے بھی کسی نہ کسی حیثیت سے ان کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ان لوگوں کا ذکر نہیں جنھیں صرف تذکیر اور تانیث، واحد اور جمع، روزمرہ اور محاورہ وغیرہ کی چند غلطیاں ڈھونڈ نکالنے کے بعد فیضؔ کے اشعار کی ساری معنوی سحر کاری اور باطنی گیرائی ہیچ نظر آتی ہے کیونکہ ایسے لوگ قابلِ معافی ہیں۔ ان میں سے بعض زبان کے تخلیقی استعمال اور اظہار کے پر پیچ آہنگ سے واقف ہی نہیں ہیں لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اکثر ناقدوں نے بہت سے عیوب نکالنے کے بعد بھی فیضؔ کے ہنر سینہ کاری کی داد دی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ پڑھنے والے کس بات سے متاثر ہوتے ہیں اور فیضؔ کی غزلوں یا نظموں میں انھیں کیا ملتا ہے؟ کچھ خاص خیالات؟ خاص طرز اظہار؟ خاص قسم کے اشارات اور علامات؟ کوئی ایسا نیا پن جو متوجہ کرتا ہے؟ کوئی ایسی جذباتی فضا جو ہم آہنگی کے دائرے میں داخل کرتی ہے؟ کوئی ذہنی یگانگی جو ہم خیالی اور ہم سفری کا احساس پیدا کرتی ہے؟ یہ باتیں بھی ہوسکتی ہیں اور ایسی ادبی اور فنی قدریں بھی جو احساس مسرت پیدا کر کے آسودگی بخشتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ساری باتیں مل کر کیف اندوزی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ لیکن کوئی ان میں سے کسی ایک ہی بات کو پا کر مطمئن ہو جاتا ہے کیونکہ شاعری کا اصل مقصد اس کے لیے وہی ہوتا ہے اور دوسرا دوسری بات دیکھ کر خوش ہوتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں شاعری کا بنیادی کام اسی بات کی تکمیل ہے جو اسے پسند ہے۔ اس طرح ذوق کی انفرادیت، شاعری کے اصل مقصد کے مطابق ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر اور شاعر کی ذات سے نجی تعلق کی بنیادوں پر پسندیدگی اور عام پسندیدگی کا معیار قائم ہو جاتا ہے۔ اسے محض ذوق کے ابتدائی نقوش سمجھنا درست نہیں، کیونکہ اکثر تنقید فن کے اعلیٰ اصول بھی انھیں تعصّبات کی پشت پناہی کے لیے توجیہ اور تاویل کا کام دیتے ہیں۔ بہت اعلیٰ پایہ کے تنقیدی شعور سے بس یہ ہو جاتا ہے کہ نگاہ میں تھوڑی سی معروضیت اور فلسفیانہ پرکھ اور اصول و روایات فن کی روشنی میں اظہار اور ترسیل کی صلاحیت کو جانچنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اسی سے تعصّبات اور تاویلات کا سلسلہ

شروع ہو جاتا ہے، اور اگر وہ ان کی ایک بات کو ناپسند کرتا ہے تو دوسری بات کو پسند کرتا ہے۔ اگر ایک خیال سے اختلاف ہوتا ہے تو دوسرا اپنے ذہن اور دل کی آواز معلوم ہونے لگتا ہے۔ اگر کہیں ایک ادبی یا لسانی سقم نظر آتا ہے تو دو ایسی خوبصورت ترکیبیں سامعہ پر چھا جاتی ہیں جن سے پہلی غلطی کا وزن بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح فیض کی پسندیدگی کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے اور ان کا شعور فن شعر و ادب سے مختلف قسم کے مطالبات کرنے والوں کو بہ یک وقت متوجہ اور متاثر کرتا ہے۔

ویسے تو کسی شاعر کو عام طور سے پسند کرنے میں متعدد منفی اور مثبت اثرات کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ذوق کی اضافیت پسندیدگی کے مدارج قائم کرسکتی ہے، لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا وجود ذوق اور فکر کی مختلف سطحوں کو یکساں طور پر نہ سہی پھر بھی ہموار کرتا ہے، اور کچھ ایسی بنیادی قدریں پیش نگاہ کر دیتا ہے جن سے احساس جمال اور احساس سود و زیاں دونوں کی تسکین ہوتی ہے۔ میرے خیال میں فیض کی شاعری یہی صورت فراہم کرتی ہے۔ اس لیے مختلف الخیال نقاد اور قاری انہیں شاعرانہ اور فکری دونوں حیثیتوں سے کہیں اپنے سے قریب ہی پاتے ہیں۔ انفرادیت سے جنم لینے کے باوجود یہ وہ خاص قسم کی آفاقیت اور ہمہ گیری ہے جو فن اور زندگی کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے سے وجود میں آتی ہے۔ فن کے تقاضے روایت اور بغاوت، کلاسیکیت اور رومانیت، طرز اظہار کی مانوس فضا اور نئے پن کی آمیزش چاہتے ہیں، اور زندگی کے تقاضے انفرادیت اور اجتماعیت، ہنگامی انقلاب اور دائمی انسانی ارتقاء حقائق اور خواب، آزادی اور ضبط و نظم کے درمیان ایسا توازن چاہتے ہیں جو انسانی اور تہذیبی اقدار کو درہم برہم نہ کردے اور اگر کر بھی لے تو اس جدو جہد کا منظر بن کر جو بہتری اور برتری کی جانب رہنمائی کرتا ہے فیض کی شاعری کے ہیئت اور مواد میں آفاقیت کے یہی عناصر ہیں اور یہ مختصر مضمون انہیں کی نشاندہی کی کوشش ہے۔

فیض ہی کا نہیں ہر شاعر کا مطالعہ کرنے والا سب سے پہلے یہ چاہتا ہے کہ وہ جب شعر پڑھ رہا ہو تو اسے شعر ہی ملیں۔ ایسے شعر جو محض الفاظ کا ذخیرہ نہ ہوں، محض

عروض کی واقف کاری سے وجود میں نہ آگئے ہوں۔ محض مترنم مصرعے یا بامعنی بول نہ ہوں بلکہ اس احساس اور ادراک کی ترسیل کرتے ہوں جو شاعر اور قاری کے درمیان کوئی داخلی اور اسی کے اندر سے ہو کر خارجی، رشتہ اور رابطہ قائم کردے۔ یہ رشتہ جتنا قوی اور جتنے زیادہ لوگوں سے ہوگا، شاعر اتنا ہی ہر دلعزیز ہوگا۔ فیضؔ کی شاعری انہیں حیثیتوں سے شاعرانہ ہے۔ بالکل ابتدائی تخلیقات کو چھوڑ کر جن میں اکثر و بیشتر پر یا تو انگریزی رومانی شاعری کا اثر نمایاں ہے یا روایتی غزل سرائی کا انداز پیدا ہوگیا ہے ان کا مختصر سرمایہ شاعری خیال اور اظہار، جذبہ اور ذہن، خارجیت اور داخلیت کے توازن کی حیرت انگیز مثال پیش کرتا ہے۔ یہ ریاض مشقِ سخن سے نہیں، تہذیب نفس سے پیدا ہوتا ہے اس کا سراغ مجھے نقش فریادی کے دیباچہ میں ملا۔ اس کے بعض حصے اس لیے نقل کردیتا ہوں کہ فیضؔ کی بعد کی شاعری اسی اجمال کی تفصیل اور اسی خیال کی تکمیل ہے۔

''آج سے کچھ برس پہلے (یہ الفاظ آخر ۱۹۴۱ء میں لکھے گئے ہوں گے) ایک معین جذبے کے زیر اثر اشعار خود وارد ہوتے تھے لیکن اب مضامین کے لیے تجسس کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ان نوجوانی کے تجربات کی جڑیں بہت گہری نہیں ہوتیں، ہر تجربہ زندگی کے بقیہ نظام سے الگ کیا جاسکتا ہے اور ایک کیمیاوی مرکب کی طرح اس کی ہر ہیئت مطالعہ کی جاسکتی ہے۔ اس منفرد اور معین تجربہ کے لیے کوئی موزوں پیرایہ بیان وضع یا اختیار کر لینا بھی آسان ہے لیکن اب یہ تمام عمل مشکل بھی دکھائی دیتا ہے اور بیکار بھی۔ اوّل تو تجربات ایسے خلط ملط ہوگئے ہیں کہ انہیں علاحدہ علاحدہ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے، پھر ان کی پیچیدگی کو دیانتداری سے ادا کرنے کے لیے کوئی تسلی بخش پیرایہ بیان نہیں ملتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تجربات کا قصور نہیں، شاعر کے ذہن کا عجز ہے، ایک کامل اور قادرالکلام شاعر کی طبیعت ان مشکلات کو آسانی سے سر کرلیتی ہے، اسے یا اظہار کے نئے اسالیب ہاتھ آجاتے ہیں یا وہ پرانے اسالیب کو کھینچ تان کر اپنے مطالب پر موزوں کرلیتی ہے لیکن ایسے

شعرا کی تعداد بہت محدود ہے۔ ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی محرک کی دست نگر رہتی ہے اور اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہوجائے یا ان کے اظہار کے لیے کوئی سہل راستہ پیش نظر نہ ہو تو یا تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہے یا طریق اظہار کو، ذوق اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورت حالات پیدا ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے، اہل محفل کا شکریہ ادا کرے اور اجازت چاہے۔

...... پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانے کی نظمیں ہیں، انہیں حذف نہ کرنے کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ ان نظموں میں جس کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ اپنی سطحیت کے باوجود عالمگیر ہے۔ ایک خاص عمر میں ہر کوئی یہی کچھ محسوس کرتا ہے اور اسی انداز سے سوچتا ہے، لیکن عام طور سے ان تجربات کا خلوص تمام عمر قائم نہیں رہتا۔ کچھ عرصے کے بعد انسان اپنی ذات کو مرکز دو عالم سمجھنا چھوڑ دیتا ہے اور اسے عالمگیر ظلم اور بے انصافی کے پیش نظر اپنی ذرا ذرا سی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اب اُسے تجربات کی نئی تراکیب اور اظہار کے نئے فارمولے تلاش کرنے پڑتے ہیں اور یہی وہ وقت ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں...... ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا، بحور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا تصرف ہے اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے۔ اور بس......"

میں نے تقریباً پورا دیباچہ نقل کر دیا لیکن فیضؔ کی انفرادیت کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری تھا، شاید ہی اُردو کے کسی اور شاعر نے اتنی کم جگہ میں اور اتنی سادگی سے اپنے نظریہ شاعری کو ایسے خوبصورت اعتراف کی شکل میں پیش کیا ہو۔ اس میں فیضؔ کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ بھی مل جاتا ہے اور خیال و بیان کی ان پیچیدہ تہوں کا راز بھی معلوم ہوجاتا ہے، جو زندگی کا شعور حاصل ہوجانے اور انہیں فن کے سانچے

میں پیش کرنے سے وجود میں آتی ہیں۔

'دستِ صبا' کے دیباچے میں یہ شعور اور گہرا اور واضح اور زیادہ توانا ہوگیا ہے لیکن اس کی بنیاد 'نقشِ فریادی' کی اشاعت ہی کے وقت پڑ چکی تھی۔ یہ بات فطری تھی کہ بدلتے ہوئے حالات سے ان کے مشاہدہ، تصورات اور عقائد میں زیادہ توانائی، گہرائی، قوت اور بصیرت پیدا ہوتی، چنانچہ اس کا مظاہرہ دست صبا اور زندان نامہ کی فنی اور فکری پختگی سے ہوتا ہے لیکن چونکہ حالات بدلنے کے باوجود بنیادی طور پر ان کے خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکے تھے اس لیے ان کا مجاہدہ جاری رہا اور امید وبیم کی ان منزلوں سے گزرتا رہا جو اُن کی اور اُن کے نصب العین کی راہ میں آئیں۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

موجودہ دور کے قاری کے لیے شاعری بہ یک وقت جذباتی اور ذہنی عمل بن گئی ہے اور وہ ہر شاعر کے یہاں اپنے جذبات، اپنے تعصبات، اپنے خیالات اور اپنی دُنیا تلاش کرنے لگتا ہے۔ ایک ایسے سماج میں جس کو سیاسی، تہذیبی اور جذباتی وحدت نصیب نہیں جس کے افراد بنیادی مسائل حیات سے ناواقف اور انتخاب اقدار کے معاملے میں کورانہ تقلید کے عادی ہیں، جن کے ماضی اور حال میں رابطہ ٹوٹ رہا ہے اور مستقبل کی تصویر ٹھیک سے بن نہیں پا رہی ہے۔ ایسے سماج میں شاعر اور قاری کی اندرونی اور بیرونی دُنیا میں ہم آہنگی کا پیدا ہونا معجزہ سے کم نہیں، تاہم فیضؔ نے زندگی اور فن کی طرف جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اس ہم آہنگی کو ڈھونڈ نکالنے کی ایک مخلصانہ کوشش معلوم ہوتی ہے۔

یہی بات انہوں نے اپنے دونوں دیباچوں اور بعض نثری مضامین میں ظاہر کی ہے۔ انہوں نے اپنے اندر اور باہر کی دُنیا کو حالات اور انقلابات کے گہرے شعور کی وساطت سے فطری طور پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے کے لیے چھوڑ دیا ہے اور قلب و دماغ کی اس دوئی کو مٹانے کی سعی کی ہے جو غیر فطری مطالبے کرتی ہے۔ انسان کے اندر جو جذباتی کائنات آباد ہے نہ تو وہ غیر حقیقت ہے اور نہ وہ نظام عقل جو بے نتیجہ داخلیت اور طفلانہ جذباتیت سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ فیضؔ نے مادی زندگی

کے پر پیچ روابط پر نظر رکھ کر اپنے شعور کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ فن کے دائرے میں موضوع اور معروض کا فرق کم سے کم رہ گیا ہے۔ فرد کے جذبات سماج کے صحت مند جذبات بن گئے ہیں اور فرد کا شعور سماج کا شعور نظر آنے لگا ہے۔ یہاں نہ تو کسی کو یہ شکایت ہوسکتی ہے کہ انفرادی جذبات اور تجربات کو نظر انداز کیا گیا ہے اور نہ یہ کہ شعور کے دروازے بند کر کے صرف اعصاب کی پکار پر کان لگا دیئے گئے ہیں۔ فیضؔ کی اسی خصوصیت نے معتدل، متوازن اور تعقل پسند ذہنوں اور دلوں کی دھڑکنوں اور کریدوں کو فن کے مانوس لیکن خلوص فکر کی وجہ سے تازہ اور شگفتہ اسالیب میں قید کر لیا ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا ہے کہ بہت سی ذہنی اور جذباتی اُلجھنوں میں گرفتار ہونے کے باوجود نہ تو وہ خود کسی قسم کے اختلال کا شکار ہوئے ہیں، نہ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والا کسی ایسے ردّ عمل سے دو چار ہوتا ہے، جو غیر فطری ہو۔ فیضؔ نے موجودہ عہد کے بعض دوسرے شعراء کی ہیئت اور اُسلوب میں غیر معمولی تجربے کر کے وہ انوکھا پن نہیں پیدا کیا ہے جس سے اکثر شعریت کے فقدان یا نقص کی تلافی کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے خیالات اور انداز بیان دونوں میں اتنی شعریت موجود ہوتی ہے کہ انہیں تجربوں کے ذریعہ سے اپنے موضوع یا ہیئت کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ایسا نہیں کہ وہ تجربہ کی اہمیت یا اس کے فنکارانہ حق کے منکر ہیں کیونکہ جن نظموں میں انہوں نے مروجہ اسالیب سے انحراف کیا ہے وہاں بھی اکثر پڑھنے والے کی توجہ اس تجربہ، انحراف یا اُسلوب پر نہیں ہوتی بلکہ موضوع اور اُسلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہونے والے تاثر کا جادو اپنا کام کرتا رہتا ہے اور قاری غیر محسوس طور پر اس تجربہ یا انحراف کو اظہار کا ناگزیر جز سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ ان کے کلام سے وہی شخص غیر متاثر رہ سکتا ہے، جو شاعری کو بڑے محدود اور منفرد انداز میں دیکھتا ہے۔ جو ہیئت اور اُسلوب کے تجربوں کو محض تجربہ ہونے کی حیثیت سے اوّلیت دیتا ہے، جو اُن تمام ذہنی اور جذباتی موضوعات سے نفرت کرتی ہے جنہیں بالعموم صحتمند انسان پسند کرتے رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ زندگی بڑی پیچیدہ ہوگئی ہے اور کتنا ہی بڑا شاعر کیوں نہ

ہو، وہ زندگی کے تمام مظاہر کو اس کی پیچیدگیوں کے ساتھ یکساں حسن کاری سے پیش نہیں کرسکتا۔ شاعر کا یہ کام بھی نہیں ہے، اسے تو انہیں باتوں کو پیش کرنا چاہیے' جو انفرادی طور پر اس کے تصوّرِ حیات میں کسی قدر کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اپنی ذات، اپنے جذبات، اپنے ذہن، اپنے ضمیر سے سچائی برتنے اور اپنے قارئین کو ان راہوں میں بھٹکنے سے بچانے کے لیے جنہیں وہ ٹھیک نہیں سمجھتا، شاعر کو مظاہر حیات میں سے انفرادی اور سماجی پہلوؤں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ فیضؔ نے دیانتداری سے یہی کیا ہے۔ اپنی عملی زندگی اور اپنی ادبی اور شاعرانہ کاوشوں میں انہوں نے تہذیب اور زندگی کی جن قدروں کو اپنایا ہے وہ ان کے شعوری انتخاب کا نتیجہ ہیں اور انہیں فیضؔ نے اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کرلیا ہے۔ جہاں یہ صورت پیدا ہوتی ہے وہاں فن اور زندگی ایک ہوجاتے ہیں اور شاعری تبلیغ کی منزل سے بہت آگے نکل جاتی ہے اور اسے تبلیغ کہنے والا دور سے دیکھتا رہ جاتا ہے۔

میں نے اس مختصر مضمون میں فیضؔ کی شاعری کے بعض بنیادی پہلوؤں کی طرف اشارتاً متوجہ کیا ہے۔ اس لیے مثالیں نہیں دی ہیں۔ لیکن اب مطلب واضح کرنے کے لیے میں ان کی دو مختصر نظمیں مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان کی انفرادیت کا وہ پہلو نمایاں ہوسکے جس پر میں زور دے رہا ہوں۔ ایک نظم یاد ہے اور دوسری ایک غزل نما نظم جو کسی مجموعہ میں نہیں ہے، کہیں بغیر عنوان کے شائع ہوئی تھی' میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی ہے۔

دشتِ تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں
تیری رفتار کے سائے تیرے قدموں کے سراب
دشتِ تنہائی میں یادوں کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

آ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دور افق پار چمکتی ہوئی، قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

دوسری نظم جسے شاید کچھ لوگ غزل مسلسل کہیں، یہ ہے......

یک بیک شورش فغاں کی طرح
فصلِ گل آئی امتحاں کی طرح

صحن گلشن میں بہر مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح
پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پر ہوا جام ارغواں کی طرح
یاد آیا جنونِ گم گشتہ
بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

•

جانے کس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگ ناگہاں کی طرح
ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

جو شخص اُردو شاعری کی روایات، اشاریت اور بلیغ ایمائیت سے کچھ بھی

واقفیت رکھتا ہے وہ بڑی آسانی سے یہ سمجھ لے گا کہ پہلی نظم دوسری نظم سے مختلف ہے۔ وضاحت کے طور پر پہلی کو عشقیہ اور دوسری کو سیاسی کہا جا سکتا ہے۔ دونوں کے محرکات بالکل مختلف ہیں، دونوں کی دُنیائیں الگ الگ ہیں۔ یہی ہونا بھی چاہیے تھا، ایک کا موضوع خالصتاً داخلی ہے، دوسرے کا قطعاً خارجی، لیکن فیضؔ نے کیا کیا ہے۔ پہلی نظم کے لمحہ حال کو ماضی اور مستقبل میں اس طرح پھیلایا ہے کہ ہجر کی بکھری ہوئی کڑیاں خیال کے ایک لمحہ میں مرکوز ہوگئی ہیں۔ ایک ایسے لمحے میں جو ابھی وجود میں نہیں آیا ہے لیکن جسے شاعر کی قوتِ تخیل نے موجود کر دیا ہے۔ شاید یہ ہر محبت کرنے والے کی داستان ہے جس میں واقعات کے خراجی عمل سے وہ داخلیت جنم لیتی ہے جو پورے وجود کا احاطہ کر لیتی ہے۔ علامات اور استعارات کی بلاغت نے ایک دُنیا کی تخلیق کی ہے، جس میں گزرے ہوئے وصل اور قربت کے مناظر بھی ہیں اور وقفے بھی جن میں کھو کر یہ مناظر سائے اور سراب کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ فیضؔ کا ذاتی تجربہ محبت کا آفاقی تجربہ ہے اور نجی ہونے کے باوجود وسیع المعنیٰ اشعاروں میں بیان ہوا ہے۔ اس لیے اظہار کی انفرادیت میں بھی جامعتی اور آفاقیت ہے۔

دوسری نظم وقت کی شاہراہ پر صرف دو منزلوں یعنی ماضی اور حال کا سفر کرتی ہے۔ دیکھنے میں مختصر ہے لیکن درحقیقت اسی کے اندر کئی جگ بیت جاتے ہیں جن میں تجربوں کے بہت سے نقش بنے اور مٹے ہیں۔ یہ انفرادی تجربوں ہی کی کہانی ہے۔ داخلی کم اور خارجی زیادہ، لیکن سب شعور اور فن کی بھٹی میں پگھل کر ایک عظیم الشان نقش میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ اس کہانی کو پھیلایا جائے تو ایک داستان بن سکتی ہے، جس کا نتیجہ ابھی مستقبل میں ہے۔ مختصراً کچھ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک دیوانہ شوق جس نے ماضی میں بڑی آشفتہ سری دکھائی تھی، بہت سے زخم کھائے اور بہت سے داغوں کا سودا کیا تھا، آج پھر اچانک فصلِ گل کی آمد محسوس کر رہا ہے۔ گزرے زمانے میں اس کے بہت سے ساتھی تھے اور سب مل کر غموں کی شراب پی لیا کرتے تھے۔ آج وہ اچھی خاصی تنہائی محسوس کر رہا ہے۔ فصل گل کا جو دام بچھایا جا رہا ہے یا جس کا وہ مشتاق ہے اس

کے حاصل کرنے کے لیے پھر اسی جنون گم گشتہ کی ضرورت ہے۔ طریق کار کیا ہو، بہار کے قاتلوں (یا صرف ایک قاتل) سے کس طرح نمٹا جائے۔ یہ بات واضح نہیں ہے کیونکہ قاتل مطلق العنان اور خود مختار ہے۔ اس کی محبت اور مہربانی بھی جان لیوا ہوسکتی ہے۔ اس کی آزردگی بے سبب وقت اور انصاف کی پابند نہیں، نہ جانے اس کے جاسوس اسے کیا خبر دیں اور کس طرح دیں۔ ایسی کڑی نگرانی ہے کہ زبان تو زبان دل کے دھڑکنے کی صدا بھی وہاں تک پہنچا دی جاتی ہے۔ بڑی ہوشیاری بڑی سوجھ بوجھ اور بڑے ضبط سے کام لینے کی ضرورت ہے...... یہ کس کی داستان ہے اور کس عہد کی، یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ نفس کے در پر کئی بار آہٹ ہوئی مگر در نہیں کھلا۔ سحر کی روشنی کئی بار دکھائی دی، لیکن اجالا داغ تھا، پھر بھی وہ وارفتہ شوق فصل گل کا منتظر ہے۔ فیضؔ نے یہی کہانی بارہ مصرعوں میں کہی ہے اور کیسی بلیغ اشاریت کے ساتھ، کیسی ایمائی ندرت کے ساتھ، لفظوں میں وہ توانائی ہے، جسے جوہری کہہ سکتے ہیں، اظہار میں وہ انفرادیت ہے جس کے اندر سے فیضؔ کا شعور بول رہا ہے، باہر کی دُنیا اور دل کی دُنیا میں مکمل ہم آہنگی ہے اور تغزل نے اس میں ایسی نشریت پیدا کردی ہے کہ ہر فصل گل کا تمنائی اس کی چبھن محسوس کرسکتا ہے۔ یہی فیضؔ کا فن ہے اور یہی ان کا شعور، یہی ان کے کلام کی انفرادیت ہے اور یہی آفاقیت۔ یہ شاعری کسی کی نقل نہیں ہے۔ یہ شعور حیات وشعور ذات کا نتیجہ ہے۔ یہ طرزِ اظہار تخلیقی کرب سے وجود میں آیا ہے۔ یہاں اظہار کو خیال سے الگ کرنا پھول سے اس کی خوشبو اور رنگ کا الگ کرنا ہوگا۔

فیضؔ نے اپنے انسان دوست خیالات، زندگی میں نا انصافی اور عدم توازن کے خلاف اپنے صحت مند ردعمل اور انفرادی تجربات کو ایسے حسین شعری پیکر میں پیش کیا ہے کہ جو لوگ ان کے نصب العین کے مخالف ہیں وہ بھی آسانی سے اس کے اثر اور جادو کی گرفت سے باہر نکل سکیں گے۔

○○

ڈاکٹر شوکت سبزواری

شاعر حیات و کائنات

فیضؔ اُردو کے جدید شاعر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جدید شعرائے اُردو میں ان کا کیا مقام ہے؟ میرا خیال ہے کہ اُردو کے جدید شعرا کے، جن میں نظم نگار اور غزل گو دونوں ہی شامل ہیں دو بڑے حلقے ہیں۔ پہلا حلقہ ان شاعروں کا ہے جو جدید ہونے کے ساتھ ساتھ ماضی سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں اور قدیم کلاسیکی اُردو شعراء کے کسی نہ کسی سلسلے سے ان کا فنی اور جذباتی تعلق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تعلق جامد نہیں متحرک اور آب جاری کی طرح ترقی پذیر ہے۔ نت نئے تجربوں کی مدد سے اس نے شعری روایت کو روکا نہیں برابر آگے بڑھایا ہے۔

'ٹھہرے نہیں موسم گل کے قدم' قائم جمالِ شمس و قمر' کی سی کیفیت ہے۔

فیضؔ اسی حلقے کے شاعر ہیں۔ ان کا تعلق قدیم اُردو شعراء میں سے خصوصیت کے ساتھ غالب سے ہے۔ اقبال کے وسیلے سے غالب تک پہنچے۔ غالب و اقبال دونوں کی روایت کو انہوں نے آگے بڑھایا۔ وہ اس سلسلے کی تیسری کڑی ہیں جس کا آغاز غالب سے ہوا۔ فیضؔ کی شاعری اقبال کی شاعری کا پہلا قدم ہے لیکن رخ کسی قدر بدلا ہوا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ غالب فکر و فن دونوں اعتبار سے اُردو کا انقلابی شاعر ہے۔ اس کے فکر کی بنیاد 'دیدۂ بینا' پر ہے جسے قطرے میں دجلہ نظر آیا اور اس کا فن دل گداختہ کا رہین منت ہے۔ جس نے فروغ شمع سخن کو حسن کی کرنوں میں جگمگایا۔ غالب

کے فکر وفن کے اس انوکھے مزاج نے غالب کے لیے حیات و کائنات کا کوئی حجاب حجاب نہ رکھا پردۂ ساز بنا دیا۔ غالب نے قطرے میں دجلہ کو جلوہ گر دیکھا۔ اقبال نے قطرے میں دجلہ کا مشاہدہ کرایا۔ غالب نے ذوق نظر سے کام لیا۔ اقبال نے ذوق نظر کے ساتھ ساتھ دقتِ نظر کو بھی کارفرما رکھا۔ غالب کا فن حسن کاری ہے۔ اقبال کا فن جہاں بینی اور کار آگاہی۔ غالب کی آواز میں لوچ اور شیرینی ہے۔ اقبال نے ذوقِ نغمہ تیز تر کرنے کے لیے لے کو کسی قدر کرخت اور تلخ کر دیا ہے۔ غالب کے یہاں مشاہدے کی لے بڑھی ہوئی ہے اور اقبال کے یہاں مجاہدے کی، اور یہ وہ مقام ہے جہاں اقبال غالب سے آگے بڑھ کر ضرب کلیمی سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ غالب اور اقبال کا تقابل اس وقت پیش نظر نہیں۔ ان دو بڑے فنکاروں کے ذہنی اور فنی ارتقا کے ان نقوش اور منزلوں کو اجاگر کرنا مقصود ہے جن سے گزر کر فیضؔ اپنے موجودہ مقام تک پہنچے۔

غالب اور اقبال کی طرح فیضؔ کی شاعری کے مزاج کی تعمیر بھی دیدۂ بینا اور دل گداختہ کے عناصر سے ہوئی ہے۔ اس لیے ان کے یہاں حسن کاری کے پہلو بہ پہلو جہاں بینی بھی ہے اور کار آگہی بھی، شیریں بیانی بھی ہے اور تلخ نوائی بھی۔ غالب واقبال کی طرح ہر چند فیضؔ نے مشاہدہ و مجاہدہ دونوں سے یکساں کام لیا ہے، لیکن انہوں نے اپنی نظر کو حیات و کائنات یا انفس و آفاق کے مناظر و مظاہر تک محدود نہیں رکھا۔ اس سے آگے انسانی زندگی کی انجمن آرائی بھی دیکھی اور اس کے ہنگاموں میں شرکت بھی کی۔ غالب نے تماشائی کی طرح قطرے میں دجلہ کا مشاہدہ کیا تھا۔ اقبال نے اہلِ نظر کو ذرے کے دل میں خورشید کا لہو اور پھول کی پنکھڑیوں میں حسن حقیقی کے جلوے تڑپتے دکھائے۔ ہر چند اقبال نے کہا تھا۔

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز ست
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز ست

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے ساحل زندگی پر بزم آرائی کی اور دیار کی موجوں سے گتھ جانے کی انہیں کبھی ہمت نہ ہوئی۔ انسانی اجتماع یا معاشرے کی اجتماعی جدو جہد سے آخر تک وہ الگ تھلگ رہے۔

فیضؔ نے اس جدو جہد میں عملاً حصہ لیا اور اپنی اس زندگی کے تجربات کو شاعری میں ڈھال کر پیش کیا۔ فیضؔ کی شاعری کا آغاز ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ ہوا۔ اس زمانے میں سیاسی تحریکوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ملک سیاسی اور معاشی بحران سے گزر رہا تھا۔ فیضؔ جیسا حساس شاعر اپنے زمانے کے سیاسی انتشار اور معاشرے کے بحران سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا، لیکن سیاسی اور سماجی فضا سے زیادہ فیضؔ نے اُردو شعرا سے اثر لیا اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ شاعر شاعر کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ فیضؔ نے حسرت، جوش، اختر اور حفیظ کی تقلید کی۔ اوّل اوّل حسن سے لو لگائی اور عشق و محبت کے گیت گائے۔ وہ ابھی عشق کی اوّلین منزل ہی میں تھے اور جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے......

''اس دور کی ایک جھلک بھی اچھی طرح دیکھ نہ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد۔''

فیضؔ کی شاعری کا یہ پہلا رومانی دور ہے جو اس کی شاعری کے لیے ایک نقش پا کی حیثیت رکھتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری کا اگلا نیا موڑ غالباً ۱۹۳۵ء کے بعد اس وقت آیا جب ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی۔ اس سے پہلے مزدور تحریکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم رشید جہاں کی رفاقت نے فیضؔ کو ترقی پسند تحریک سے قریب تر کیا اور ترقی پسند تحریک نے فیضؔ کو شدت کے ساتھ یہ احساس دلایا کہ وہ انسانی معاشرے کے ایک فرد اور دجلہ کے ان گنت قطروں میں سے ایک قطرہ ہیں۔ اس احساس نے فیضؔ کی دُنیا بدل دی۔ اب تک وہ ایک ناظر کی حیثیت سے قطرے میں دریا کا مشاہدہ کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد قطرہ بن کر اقبال کے لفظوں میں دریا میں ڈوب کر انہوں نے دریا کی اور اس کی بے چین لہروں کی سیر کی۔ اس وقت تک انہوں نے محبت کے گیت گائے تھے۔ خواب اور رومان کی اپنی الگ دُنیا

بسا کر محبوب سے کہا تھا......

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب
آ کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم
آسماں پر اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم!
زندگی زر نگار کر لیں ہم!

اجتماعی شعور کے بیدار ہوتے ہی فیضؔ کو محبوب سے یہ کہہ کر معذرت کرنی پڑی۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی، گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اس نظم کا مصرعہ......

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

......فیضؔ کی شاعری کے مزاج کی غمازی کرتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری حسن و حقیقت کے معتدلانہ اور حکیمانہ امتزاج کا دلکش مرقع ہے جس میں حسن کی دلکشی بھی ہے اور حقیقت کی سنگین روح فرسا تلخی بھی۔ کائنات کے حسین و جمیل مناظر دیکھتے دیکھتے فیضؔ کی نظر یک بیک معاشرے کے دلدوز اور بھیانک مناظر کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ وہ ان کی تصویر کشی کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری ان سے گھنیاتا اور ان کی اصلاح کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ قدیم اُردو شاعری کا مزاج تھا ''جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا۔'' غم جاناں اُردو کے کلاسیکی شعرا کے لیے درد دوراں کا گویا ایک درمان تھا......

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

اُردو کی جدید انقلابی شاعری کا مزاج ہے 'کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں' فیضؔ کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں جیسا کہ انہوں نے لکھا بھی ہے ایک تجربے کے دو پہلو ہیں۔ ان کی شاعری میں دونوں کی جھلک ہے۔ انہوں نے زندگی کے دونوں پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے لیکن گھلا ملا کر ایک جان و یک قالب بنا کر۔

فیضؔ کی شاعری میں قوس قزح کی سی رنگینی ہے۔ اس میں کئی رنگ گھل مل کر ایک ہوگئے ہیں۔ فیضؔ کے لہجے میں دھیما پن غالباً ان گوناگوں رنگوں کی آنکھ مچولی کی وجہ سے ہے جس نے ایک گہری لطیف، نازک ایمائیت یا اشاریت کو جنم دیا ہے۔ فیضؔ جو کہنا چاہتے ہیں صراحتاً اس کا ذکر نہیں کرتے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

فیضؔ کے انداز بیان کی دلکشی، نشریت، رچاؤ اور لوچ نتیجہ ہے ان کے گہرے جذبات کے خلوص، فکر کی روشنی، نظر کی بے باکی، خیالات کی پختگی اور فنی ریاض کا۔ فیضؔ نے محبت کر کے اوّل اوّل اپنے دل کو گداز' خیالات کو پختہ' جذبات کو حسن معصوم کی طرح پاک اور لطیف بنایا اور آخر آخر وطن اور اہل وطن کا دکھ درد اپنا کر رسوا سرِ بازار

ہوئے۔ فکر وفن کے ریاض و مجاہدہ کی یہ داستان فیضؔ کی حسین نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں"، میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ اس کے تین موڑ ذکر کے قابل ہیں۔ اوّلاً میں کسی کی محبت کی شمع روشن ہوتی ہے......

شائد کہ انہیں ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

دُنیا والے ساغرِ دل لے کر توڑ دیتے ہیں اور صہبائے غم جاناں مٹی میں مل جاتی ہے تو دل کو یادِ یار سے جگمگایا جاتا ہے......

یہ رنگین ریزے ہیں شاید
ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

تیسرے موڑ میں سنگین حقائق کا شیشۂ دل پر پتھراؤ کرتا ہے......

ناداری بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

ریاض ان تین منزلوں سے گزر کر فیضؔ کے فن میں رچاؤ، فکر میں پختگی، جذبے میں گہرائی، احساس میں شدت اور خیالات میں استواری آئی۔ فیضؔ کی قادر الکلامی اور صنعت کاری کے نمونے ان کے کلام میں آبدار موتی کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ میں ایک نظم کے صرف دو بندوں کے اقتباس پر اکتفا کروں گا......

یہ کون سخی ہیں

جن کے لہو کی اشرفیاں، چھن چھن چھن چھن

دھرتی کی پیم پیاسی

کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں

کشکول کو بھرتی جاتی ہیں

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم

یہ لکھ لٹ

جن کے جسموں کی

بھرپور جوانی کا کندن

اے ارضِ عجم اے ارض عجم

کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے

ان آنکھوں نے اپنے نیلم

ان ہونٹوں نے اپنے مرجان

ان ہاتھوں کی بے کل چاندی

کس کام آئی کس ہاتھ لگی؟

ان بندوں کی موسیقی اور لفظوں کی ترنگ شعر کی روح یعنی خیال سے کس درجہ ہم آہنگ ہے۔

فیضؔ کی شاعری محبت کی شاعری ہے۔ اس کا فن سوز محبت کا فن ہے۔ ''جان جہاں'' یعنی وطن سے بھی اسے ویسی ہی محبت ہے جیسے کبھی جوانی میں 'جان جہاں' سے تھی۔ لیلائے وطن پر اس نے اپنا تن من دھن سب کچھ نثار کر دیا ہے۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آرائش منزل
رُخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں
اس جان جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی کبھی رو رو کے پکارا
پورے کئے سب حرفِ تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اجیالا ہر اک غم کو سنوارا

درد کو اجالنے اور غم کو سنوارنے کا اثر ہے کہ فیضؔ کے لہجے میں غم وغصہ کی لہر ہے نہ اس کی شاعری میں اداسی، تلخی اور دُنیا سے بیزاری کا احساس ملتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری ایمان وعرفان کی شاعری ہے۔ عرفان حیات وکائنات کا ہے اور ایمان انسان کے روشن مستقبل پر۔ فیضؔ یاس کا شاعر نہیں آس کا شاعر ہے۔ وہ رونا جھینکنا، منہ بسورنا نہیں جانتا، سختیوں میں مسکرانا ہر حال میں خوش نظر آنا اور حال کو سدھار کر مستقبل کے خواب دکھانا اس کی فطرت ہے۔ وہ کسی کی یاد سے تلخی ایام کو شیریں بناتا ہے۔

اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں ایام
تمہاری یاد سے شیریں ہیں تلخیٔ ایام

اور موجودہ زندگی کی ناہمواری کو ناپائیدار ٹھہرا کر انسان کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگاتا اور اس کی ہمت کو للکارتا ہے۔

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورش بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبل و قیصرو کے

یہ شام سحر یہ شمس و قمر یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم یہ طبل و علم یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

OO

محمد حمید شاھد

فیضؔ کی شاعری اور نیا عصری ہنگامہ

Faiz Ahmad Faiz (1914-1984) one of the foremost Urdu poets was born in an educated family of Sialkot (Pakistan). He studied philosophy and English Literature. For writing poetry that always challenges the ruling calss and feudal values, like a rebelloous writers Faiz had to go to jail. He was inspired by the Marxist ideology. The article aims to study his poetry in the changed scenario and to identify the areas of relevancy of his poetry under current circumstances. It discuss also that how the poetry of Faiz exhibits a strong sense of commitment to lower-class people even now a days when world is going to be changed sharply. At the end it has been concluded that the poetry of Faiz always maintains a unique beauty nourished by the long, rich tradition of Urdu literature.

یہ ان دنوں کا قصہ ہے کہ گزشتہ صدی اپنی آخری سانسوں پر تھی اور لوگ اسے ''دی موسٹ وائیلنٹ سنچری'' کے نام سے موسوم کرنے لگے تھے، اور اب، جبکہ اس صدی کے ابتدائی سال ہم پر بیت رہے ہیں، کہنے والے صاف صاف کہنے لگے ہیں کہ صاحب یہ انسان اور انسانی اقدار کی سربلندی کا نہیں، یہ تو دہشت کا زمانہ ہے۔

دہشت کے اس زمانی عرصے میں ہمارے یقین اور ایقان کو بے یقینی اور وسوسوں کی پھپھوندی لگ چکی ہے۔

ایسے اوندھا کر رکھ دینے والے زمانے میں یقین کی دولت سے مالا مال اور

اپنے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر شعر کہنے والے فیضؔ کو ہم یاد کرتے ہیں اور نئے حوالوں سے یاد کرتے ہیں تو دل امنگوں اور جذبوں سے کناروں تک بھر جاتا ہے۔

پہلے تو یہ بات کیا کم اہم ہوگی کہ عین اس عہد میں کہ جب انفارمیشن ٹیکنالوجی کے نام پر گاربیج انفارمیشن سے آج کے انسانی ذہن کو لاد کرنا کارہ کیا جا رہا ہے اور ڈس انفارمیشن کے حیلے سے ظالم حق پر اور مظلوم دہشت گرد ثابت ہو رہا ہے، ہم ایک شاعر کو یاد کر رہے ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ الٹی گنگا بہانے کی کوشش لگتی ہے۔

ایک ایسی کوشش جس کی مادّے کی منڈی میں کوئی قیمت نہیں ہے۔

آج کل تو دہشت کھیلنے کا زمانہ چل رہا ہے کہ اس کی آڑ میں نئی نئی منڈیاں تلاش ہو رہی ہیں، یوں دہشت منڈی کی چیز ہو کر بہت اہم ہوگئی ہے۔ لہٰذا دوسروں کے قومی وسائل اور توانائی کے سرچشموں پر دھونس دھاندلی اور طاقت سے قبضہ کرنا جائز ہوا۔ جہاں حملہ کرنا اور افواج بھیجنا بوجوہ موقوف کرنا پڑا ہے وہاں روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے دل خوش کن نعرے کی سنہری زنجیر آدمی کے گلے میں ڈالی جا رہی ہے۔ سو صاحبو! عجب زمانہ آ لگا ہے کہ جس میں اپنی تہذیبی اقدار کا سوال قدامت پسندی اور کسی مربوط فکر اور نظریے کی بات کرنا ٹیکنالوجی کی برکات کا انکار اور بے وقت کی راگنی ہوگیا ہے۔ ایسے میں فیضؔ کو یاد کرنا اور اس کی اس شاعری کو یاد کرنا جو سامراج پر کاری ضرب لگاتی ہے، کسی کی بھی پروا کیے بغیر، واقعی بڑے حوصلے کی بات ہے۔ حوصلے کا یہ قرینہ تو لگ بھگ فیضؔ کے اس کہے پر چلنے کی کوشش سا ہوگیا ہے کہ......

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

نئے وقت کے تناظر میں فیضؔ کی شاعری کا مطالعہ میرے لیے بہت پُر لطف رہا ہے۔ دیکھئے ایک طرف نام نہاد روشن خیالی اور مجہول اعتدال پسندی کے پُر فریب نغمے گونج رہے ہیں اور ادھر فیضؔ کی شاعری ہے جس میں درِ زنداں پر صبا کی دستک کی بات

ہوتی ہے۔ ایک طرف استعمار کے لاڈلے اپنے محبوب کی ہر قاتلانہ کروٹ پر سبحان اللہ اور ہر ٹھوکر پر حسبی اللہ کہتے نہیں تھک رہے اور دوسری طرف فیضؔ کا فرمانا ہے......

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دُکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہیں آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

فیضؔ کا معاملہ یہ تھا کہ اس کے ہاں جسم کی موت اور زبان کی موت دو الگ الگ کیفیتیں تھیں جب کہ اس نئے عہد کے جملہ وارثان کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے لیے زبان کی موت سرے سے کوئی حادثہ ہی نہیں ہے اور اس پر ایک اور سانحہ یہ گزرا ہے کہ ایسے میں ہمیں سمجھایا جا رہا ہے کہ زبانیں اہم ہوتی ہیں نہ ان کے بولنے والے، کہ اب صرف منڈی کی زبان اور منڈی کے آدمی کا چلن ہوگا۔ ہمیں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ کسی نظامِ فکر کی بات کرنا یا کسی نظام حیات سے وابستہ ہونا سب لایعنی اور فرسودہ باتیں ہیں۔ ایسے میں فیضؔ کو پڑھنا اور اس انسان کی بابت سوچنا جو مادے اور منڈی کے اس زمانے میں کائنات کے مرکز سے دھکیل کر حاشیے پر بھیج دیا گیا ہے اور ان افکار کی بابت سوچنا جس میں آدمی کا آدمی سے جڑنا اہم ہو جاتا ہے۔ آدمی جو فرد بھی ہے اور اجتماع سے جڑ کر انسانیت بھی تشکیل دیتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری ہمیں اسی انسانیت پر حملہ آور ہونے والے سامراج کے خلاف بغاوت پر اکساتی ہے۔ یہ شاعری بتاتی ہے کہ

سامراجیت کی اک سیاہ شاخ کی کماں سے جتنے بھی تیر چلائے گئے وہ سب انسانیت کے جگر میں پیوست ہو کر ٹوٹے ہیں۔ تاہم زندہ معاشروں کا یہ چلن رہا ہے کہ انہوں نے لن تیروں کو اپنے جگر سے نوچ کر تیشہ بنالیا ہے۔

ماننا پڑے گا کہ فیضؔ اپنے دھیمے مزاج اور خود ضبطی کو چلن بنا لینے کی وجہ سے ان ترقی پسندوں سے بہت مختلف ہو گئے تھے جو اپنے بلند آہنگ شاعری سے فلک میں شگاف ڈالنے اور اپنی تدبیروں سے اسی آسمان میں **تھیگلی** لگانے کے جتن کرتے کرتے ہلکان ہوئے۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ فیض کو رومانی رویہ عزیز رہا مگر اس سے کون منکر ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شاعری میں مسلسل زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف لپکتے رہے ہیں اور اسی لپک کی للک کو اپنے تخلیقی وجود کا حصہ بناتے رہے ہیں۔ اسی علاقے سے انہوں نے اپنی شاعری کے لیے جمالیاتی قرینے اخذ کیے اور یہ ایسے قرینے ہیں کہ ہم جیسے فیضؔ کے ہاں دو آوازیں الگ سے شناخت کرنے والے بھی ان کی شاعری کے کشتگاں میں شامل ہو گئے ہیں۔ فیضؔ نے آہنگ کے دیباچے میں مجاز کو انقلاب کا مطرب کہا تھا اور کسی نے خوب کہا ہے کہ انقلاب کے مطرب تو خود فیضؔ تھے۔ ایک نئی طرز فغاں ایجاد کرنے والے اور ایک ایسے انقلابی شاعر کہ جس کی شاعری پڑھتے ہوئے دل جھوم جھوم اٹھتا ہے اور قدموں میں مقتل کی طرف اُٹھنے کا حوصلہ آجاتا ہے……

رختِ دل باندھ لو، دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں، یارو چلو

……یا پھر……

شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

یہیں بتاتا چلوں کہ رات فیضؔ کی شاعری کا ایک مرکزی استعارے کی صورت ظاہر ہوتی ہے جس کے مقابل وہ صبح اور طلوع سحر کو لے کر آتے رہے ہیں......

رات باقی تھی ابھی سر بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا، جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب، جو مئے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہہ جام اُتر آئی ہے

ہاں تو میں فیضؔ کی شاعری کی جمالیاتی سلطنت کی بات کر رہا تھا اور اسی باب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ فیضؔ نے اپنی تہذیبی روایت سے ملنے والی زبان اور تمثالوں کو نئی معنویت کی مہک اور تاثیر کی کرامت عطا کی تھی۔ میں مانتا ہوں کہ کسی بھی فرد کی شاعری میں مضامین کی تکرار بہت کھٹکتی ہے۔ فیضؔ کے ناقدین اس جانب انگشت نمائی کرتے آئے ہیں، مگر میرا کہنا یہ ہے کہ فیضؔ نے اپنے جمالیاتی سیلوں سے دہرائے ہوئے مضامین کو الفاظ کے تخلیقی استعمال اور لہجے کو گداز رکھ کر اتنا مختلف بنا لیا تھا کہ پڑھنے والے کے سیدھا دل پر ہاتھ پڑتا ہے۔ فیضؔ کے اسی ہنر کا قرینہ ہے کہ روایت کے خزینے سے وہ اپنی محبوبہ کے لیے رسوا ہوتے عاشق کو نکالتے ہیں اور اسے انقلابی بنا دیتے ہیں۔ یہاں گوشت پوست کی محبوبہ بھی اپنا منصب بدل کر انقلاب کی ساعت سعید ہو جاتی ہے۔ ایک طرف فیضؔ کے ہاں رقیب روسیاہ، سامراجیت کی علامت بنا، محتسب اور شیخ جی جیسے سامراج کے ہرکارے ٹھہرے، جنوں سماجی انصاف کی للک ہوا، عقل عیار عسکری نظام سے سمجھوتے کا نشان بن گئی اور وصل کے معنی انقلاب ہو گئے تو دوسری طرف فیضؔ کے ہاں یہ قرینہ بھی ملتا ہے کہ وہ ایسا کرتے ہوئے ان معنوں اور کیفیات کو سرے سے تلف نہیں ہونے دیتے جو ہماری تہذیبی اور شعری روایت کے اندر ان الفاظ اور تراکیب سے وابستہ چلے آتے ہیں۔

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
تیرے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

فیضؔ کی شاعری کا فیضان یہ بھی ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے ایک عجب طرح کے درد کی لذت عطا ہوتی ہے۔ وہ وجود جو لمحہ لمحہ منہدم ہو رہے ہوتے ہیں، توانائی اور قوت کی مئے سے مست ہو کر جھومنے لگتے ہیں۔ اس مئے کی مستی میں کوئی بھی محرومی یا نارسائی و رسوائی یا دل شکستگی کا سامان نہیں ہوتی، عزم اور حوصلے کا نشان ہو جاتی ہے۔ اسی شاعری کا اعجاز ہے کہ زنداں کا پھاٹک محبوب کے آستان کا دروازہ بن جاتا ہے اور احترامِ آدمیت کی منزل، وصل جیسے لطف کا بدل ٹھہرتی ہے۔ میں نے کہا نا کہ فیضؔ کی شاعری میں ظلم، ظالم، اہل جنوں، اہل ہوس، مدعی، منصفی، طواف، جسم و جان، فلک، فراق جیسے بظاہر روایتی الفاظ آئے ہی چلے جاتے ہیں اور یہ بھی کہہ آیا ہوں کہ فیضؔ کا سوز دروں اور مزاج کی نرمی پا کر یہ الفاظ ایک نفاست اور خاص تخلیقی قرینے سے متن کا حصہ ہوتے ہیں جو صرف فیضؔ ہی سے مختص ہے۔ یہاں اپنی بات دہرا کر یہ اضافہ کرنا مقصود ہے کہ اس تخلیقی قرینے نے فیضؔ کی شاعری میں اپنی تہذیبی زندگی کے بھید کو بھی ایک معنیاتی پرت کے طور پر محفوظ کر دیا ہے۔

فیضؔ کے ہاں موضوعِ سخن ہو جانے والی زنداں کی ایک شام ہو یا زنداں کی ایک صبح، مجھے کسی نہ کسی حوالے سے آج کے عہد سے جڑی ہوئی لگتی ہے۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ زینہ زینہ شام اتر چکی ہے۔ ہمارے روشن تہذیبی وجود کو لمحہ لمحہ قدم جمانے والی رات نگل لینے کے جتن کر رہی ہے۔ ہمارا تہذیبی وجود کیا خود انسانیت کو منڈی کی معیشت چرکے پر چرکا لگا رہی ہے۔ تہذیبی مکالمے کا فلسفہ مات کھا رہا ہے اور تہذیبی تصادم کی تھیوری کا الاؤ خوب خوب دہکایا جا رہا ہے۔ ایسے میں فیض کی شاعری کے ساتھ جڑنا ایک لحاظ سے سیاہ رات کی لمبی سرنگ کے دوسرے کنارے پر موجود اس روشن صبح کی امید سے جڑنا ہے جسے بہر حال ایک نہ ایک روز انسانیت کے بخت کا مقدر ہونا ہے۔

فی الاصل فیضؔ اپنی زندگی میں ہی ان شاعروں میں پہچانے جاتے تھے جو اپنے بخت کا مقدر پا لینے کے لیے جہد مسلسل پر یقین رکھتے تھے، تاہم وہ ان شاعروں سے

الگ پہچانے جانے لگے تھے جن کے ہاں تجربہ اور حقیقت سامنے کی چیزیں ہیں۔ فیضؔ کا قرینہ یہ رہا ہے کہ وہ اسے اپنے دھیمے رومانی مزاج کے معطر پانیوں سے دھو کر اور اپنے جذبوں کی نرم نرم مگر مسلسل آنچ سے تپا کر یوں چمکا لیا کرتے تھے کہ مصرعے کی تاثیر بدل جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ سحر، رات، ظلمت، سویرا، مہتاب، ستارے، نور، افلاک جیسے عام سے الفاظ کا ذخیرہ فیضؔ کی شاعری میں عام نہیں رہتا، اپنی الگ جمالیاتی قدر بنا لینے کی وجہ سے بہت اہم ہو جاتا ہے۔ یہی لطیف جمالیاتی قدر، اجتماعی فرد سے جڑت اور انسانیت کش سامراج سے شدید نفرت اُردو شاعری کے باب میں فیضؔ کی عطا ہے اور یہ ایسی عطا ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

○○

ڈاکٹر سلیم اختر

معتدل گرمیٔ گفتار کا غزل گو ـــ فیضؔ

ہے فقط مرغِ غزل خواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمیٔ گفتار کروں یا نہ کروں

حالی نے پہلی مرتبہ غزل میں طرح نو ڈالتے ہوئے اسے عشق و عاشقی کے مخصوص تصورات کے طلسم ہوشربا سے نکال کر قومی شعور اور ملی درد سے آشنا کیا۔ گو اکثر گاہک بے خبر تھے، لیکن حالی کو مال کی نایابی کا احساس تھا اور یہ بھی کہ شہر میں حالی نے کھولی ہے دُکاں سب سے الگ۔ آج حالی کی ان غزلوں کی اور کسی وجہ سے اہمیت ہو یا نہ ہو، وہ کم از کم اس بنا پر اہم ہیں کہ ان کی غزلوں کی صورت میں اُردو غزل بے مقصد ماورائیت سے نکل کر پہلی مرتبہ مقصد پسندی کی طرف مائل پرواز نظر آتی ہے۔ حالی کی ان غزلوں کی اہمیت اس بنا پر اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اقبال نے غزل کے اس روپ کو پسند کیا اور یوں اسے قوم کے نام پیغام اور ملّی فلسفے کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس سے وابستہ شعراء نے بھی غزل کے اس پہلو کی طرف زیادہ توجہ دی۔ بعض حضرات کی دانست میں مقصدیت سے غزل میں تغزل نہیں رہتا، لیکن یہ اعتراض اتنا وزنی نہیں کیوں کہ تغزل موضوع کی نہیں اظہار کی خصوصیت ہے اور اچھے شاعروں نے ان دونوں کے نقطۂ توازن کو فن کارانہ شعور سے برقرار رکھا ہے۔

حالی کے بعد سے عام عاشقانہ روش کے ساتھ ساتھ اُردو غزل ایک نئے راستے

کی طرف گامزن نظر آتی ہے۔ ایک راستہ اقبال کا تھا جس پر وہ یقیناً گامزن نظر آتا ہے تو دوسرا ترقی پسند ادب کی تحریک کا۔ اساسی لحاظ سے دونوں میں فرق نہ تھا کہ دونوں صورتوں میں غزل مقصدِ خاص کے ابلاغ کا وسیلہ بنتی ہے۔ گو نقطۂ نظر کے فرق سے بعض اوقات اقبال کی غزل اور ترقی پسندانہ غزل جداگانہ نظر آتی ہے، لیکن یہ فروعی ہے اور اصل بات یہ ہے کہ دونوں کے ہاں غزل پرانی کینچلی اتار کر بے معنی عشق کی گراں خوابی سے بیدار ہوتی نظر آتی ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں یہ وہ تناظر ہے جس میں فیضؔ کی غزل کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ فیضؔ نے زمانہ طالب علمی ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ چنانچہ فیضؔ کے اپنے الفاظ میں......

> ''شعر گوئی کا سوال واحد عذرِ گناہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اس میں بچپن فضائے گردو پیش میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگن سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ نقش فریادی کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں ۲۹۔۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کی تحریریں شامل ہیں جو ہماری طالب علمی کے دن تھے۔ یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو ایک ہی حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔''

(دست تہہ سنگ، ص:۱۶)

زمانۂ طالب علمی میں شعر گوئی کی تحریک کسی جذباتی حادثے کے باعث تھی یا اس حادثہ کی یادگار ایک نظم ''نذر'' (مطبوعہ 'راوی' نمبر ۱۹۳۲ء) ملتی ہے جس پر مدیر 'راوی' نے حاشیہ میں یہ نوٹ لکھا...... ''جی چاہتا ہے ایک نام لکھ دوں۔'' یہ نظم 'نقش فریادی' میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے تاریخی دلچسپی ریکارڈ اور فیضؔ کی یاد دہانی کے لیے درج کرتا ہوں۔

طرب زار تخیل شوق، رنگین کار کی دُنیا
مرے افکار کی جنت مرے اشعار کی دُنیا

شب مہتاب کی سحر آفریں مدہوش موسیقی
تمہاری دل نشیں آواز میں آرام کرتی ہے
بہار آغوش میں لپٹی ہوئی رنگینیاں لے کر
تمہارے خندہ گل ریز کو بدنام کرتی ہے
تمہاری عنبریں زُلفوں میں لاکھوں فتنے آوارہ
تمہاری ہر نظر سے سینکڑوں ساغر چھلکتے ہیں
تمہارا دل حسیں، جذبوں سے یوں آباد ہو گویا
شفق زار جوانی میں فرشتے رقص کرتے ہیں
جہانِ آرزو پر بے رُخی دیکھی نہیں جاتی

فطری شاعر سے جہانِ آرزو پر بے رُخی دیکھی نہیں جاتی تو ہر لحاظ سے اظہار کرتی ہی ہے۔ وجہ جو بھی ہو لیکن یہ ہے کہ فیضؔ نے بھی غالب اور اقبال کی مانند کم عمری سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ان کے بچپن کا کلام تو دستیاب نہیں البتہ گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ 'راوی' کے ۳۴، ۱۹۳۹ء کے پرچے دیکھنے پر فیضؔ کی ابتدائی شعری کاوشوں کے نقوش مل جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نظمیں اور غزلیں 'نقش فریادی' میں شامل ہیں۔ باقی متروک کلام ان پرچوں میں محفوظ ہو گیا ہے۔ چنانچہ سالِ سوم میں فیضؔ ایسے اشعار کہہ رہے تھے......

مے تنہائی دل افروز ہو میں ہوں تو ہو
چاندنی رات ہو، خاموش کنار جو ہو
ایک ہو جائیں خموشی میں ہماری روحیں
جیسے دو پھول ہوں اور ایک ہی خوشبو ہو
مرے نالوں سے شب پوچھتی تھی ان کی معصومی
کوئی کیوں رات کی خاموشیوں میں اٹھ کے روتا ہو

اس کے بعد کے متروک اشعار ملاحظہ ہوں......

فضائے دل پہ اداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے
موت؟ مجبورِ تمنا کی بہشت آرزو!!
زندگی دُکھے دِلوں کی دُکھ بھری فریاد ہے
یاد ہے وہ سر کہ جس میں اب ترا سودا نہیں
عشرت جاوید وہ دل جس میں تیری یاد ہے

''راوی'' (اکتوبر ۱۹۳۲ء) کے شمارے میں فیضؔ کی دو غزلیں چھپی ہیں جن میں سے یہ غزل 'نقش فریادی' میں ہے......

ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

......اور یہ غزل شامل نہیں ہے......

شباب کو مئے الفت کی احتیاج سہی
بساطِ دہر پہ جور و ستم کا راج سہی
یہ مانا نگہ طلب سرفراز دہر نہیں
اک آرزو ہے سو شرمندۂ امید نہیں
ٹھہر ٹھہر دل بے تاب آخرش کب تک
کبھی تو سوختہ جانوں کو نیند آئے گی

شاید ان طالب علمانہ شعری کاوشوں کی اس زمانے میں اتنی اہمیت نہ ہوگی، لیکن آج یہ اور اس نوع کے دیگر اشعار اس بنا پر اہم ہوجاتے ہیں کہ مشقِ سخن کے ابتدائی دور میں فیضؔ میں فنی پختگی پیدا ہوچکی تھی۔ فنی پختگی بذات خود کوئی اہم خصوصیت نہیں۔ کم از کم فیضؔ ایسے شاعر کے لیے یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں سے محض

فنی پختگی کی بنا پر ہی ممتاز نہیں ہوئے۔ اس دور کے یہ اشعار آج اس لیے اہم ہیں کہ ان میں وہ مخصوص لہجہ ملتا ہے جس نے بعد میں ان کی غزل میں فنی نکھار کے بعد اپنا منفرد رنگ پیدا کیا، اسی لیے یہ اشعار محض 'نوادرات' کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہر چند کہ فیضؔ کا ان میں گھٹنوں چلنا محسوس ہوتا ہے۔ ویسے بھی بی اے کے بعد کے فیضؔ آج کے فیضؔ کے ہم سبق نظر آتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس دور میں فیضؔ یہ نظمیں لکھ چکے تھے۔ ''خدا وہ وقت نہ لائے'' (۱۹۳۶ء) 'سرود شبانہ'' ۱۹۳۳، اقبال ۱۹۳۱، اور 'اعتراف' (۱۹۳۴ء) 'نقش فریادی' میں درج یہ شعر ۱۹۳۱ کا ہے......

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہگار نظر کو حجاب آتا ہے

ابتدائی شاعری کی ان کاوشوں کے فنی منصب سے قطع نظر یہ ہے کہ فیضؔ نے نسبتاً کم تعداد میں غزلیں لکھ کر بھی اپنے لیے بحیثیت غزل گو وہ منفرد مقام بنایا کہ پاک و ہند کے صاحبِ طرزِ غزل گو شعراء میں شمار ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے مخصوص اُسلوب اور طرزِ ادا سے انہوں نے ہم عصر غزل کے امکانات میں اضافہ بھی کیا۔ لیکن ایک بات ہے کہ ترقی پسند غزل سے وابستہ مخصوص علامات اور اسالیب کے تناظر میں فیضؔ کی غزل اپنی تمام خوبیوں اور تغزل کے باوجود ترقی پسند غزل کے مخصوص مزاج سے عاری نظر آتی ہے۔ یہ خوبی ہوسکتی ہے اور خامی بھی۔ اس کا انحصار دیکھنے والے کی نگاہ پر ہوگا۔ اسے یوں سمجھئے گا کہ غالب کے مشہور شعر......

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند ہاتھ اس میں ہمارے قلم ہوئے

پڑھ کر کیا ذہن فیضؔ کے اس شعر کی طرف نہیں جاتا؟

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

سوال یہ ہے کہ غالب نے فیضؔ کو Anticipate کیا یا فیضؔ نے غالب کی

پیروی کی؟ یہ صرف ایک شعر کی بات نہیں بلکہ ایک جذبے کی مشابہت کا مسئلہ ہے۔ اگر دونوں ایک خاص صورتِ حال میں ایک طرح سے سوچ سکتے ہیں تو یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ اگر غالب ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ ہوتا؟ یا فیضؔ سسکتی مغل حکومت کے سربراہ کے 'استادِ شاہ' ہوتے تو کیا رنگ سخن اپناتے؟ اسے محض، ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ عصری سوچ کو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے یا اپنی انفرادیت کے اظہار یا پھر عدم اظہار کا مسئلہ ہے۔

فیضؔ کے ضمن میں یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اپنی تمام انقلابی سوچ اور انقلابی افکار کے باوصف انہوں نے غزل کے کلاسیکی اُسلوب کو ترک نہیں کیا بلکہ فارسی تراکیب اور کسی حد تک مفرس ڈکشن کی بنا پر وہ غالب کی طرزِ ادا کے خاصے قریب نظر آتے ہیں۔ وہ کلاسیکی اُسلوب کے اس حد تک رسیا ہیں کہ نظمیں بعض اوقات غزل اور وہ بھی غالب کی غزل معلوم ہوتی ہیں۔ فیضؔ کا یہ مصرع......

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

بالکل غالب کی زبان کا حامل ہے (یہ محض مثال کے لیے ہے اسی انداز سے فیضؔ کا مطالعہ ایک جداگانہ مضمون کا متقاضی ہے۔) جس عہد میں فیضؔ کے ادبی شعور نے آنکھیں کھولیں اس میں اقبال کی قومی شاعری اور معرّب اُسلوب کے ساتھ ساتھ اختر شیرانی کی گیت نما نظموں اور عذرا اور سلمیٰ کا چرچا تھا۔ اس عہد کے نوجوان شعراء کے لیے ایک طرف 'شاعرِ اسلام' اور دوسری طرف 'شاعر رومان' کی صورت میں دو قوی مقناطیس موجود تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ فیضؔ نے شعوری طور سے خود کو دونوں اثرات سے بچائے رکھا۔ اختر شیرانی کی سطحی رومانیت کی کشش عارضی تھی اور اقبال تو اپنی ذات میں نظم اور کسی حد تک غزل کے تمام امکانات کو یوں جمع کر چکے تھے کہ ان کا تتبع سود مند ثابت نہ ہوسکتا تھا۔ اسی لیے ان کی زندگی میں 'اقبال' پر نظم لکھنے کے باوجود وہ موضوعات اور اسالیب دونوں کے لحاظ سے ان سے غیر متاثر نظر آتے ہیں۔

''نقش فریادی'' کی غزلوں میں فیضؔ نے خود کو غزل کے عام موضوعات تک

محدود رکھا۔ چند مثالیں پیش ہیں......

حسن مرہون جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز

تیری رنجش کی انتہا معلوم
حسرتوں کا مری شمار نہیں

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیضؔ
کاش افشائے راز ہو جائے

چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

یہ عہد ترکِ محبت ہے کس لیے آخر
سکون قلب ادھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے!

یہ اور اسی انداز کے اشعار کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ غزل میں چند استثنائی اشعار سے قطع نظر فیضؔ ایک روایتی غزل گو کی مانند معاملاتِ حسن و عشق اور واردات قلب کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ جب اسی مجموعے میں ان کی یہ نظمیں بھی شامل ہیں......

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

'چند روز اور مری جان، کتے، بول' اور 'موضوعِ سخن' ۔ ان نظموں میں فن کی اساس مقصدیت پر استوار ہے۔ یہ نظمیں اس عہد کے مرّوج ترقی پسند شعری نظریے کی زندہ تفسیریں ہیں۔

نقش فریادی میں فیضؔ کی غزل اور نظم کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھنے سے یہ احساس

ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے ان دونوں کی صورت میں اپنی تخلیقی شخصیت کو دولخت کر لیا۔ اس حد تک کہ نظم گو فیضؔ اور غزل گو فیضؔ ایک ندی کے دو کناروں پر ایک دوسرے سے دور دور کھڑے نظر آتے ہیں۔ بعض مواقع پر اُسلوب ان دونوں کناروں پر پل کا کام کر جاتا ہے ورنہ دونوں اپنی اپنی حیثیت میں منفرد نظر آتے ہیں۔ نظم کو انہوں نے خارجی دُنیا کے غم والم اور اجتماعی دکھ درد کے لیے وقف رکھا ہے تو غزل ذات کے اظہار اور دل کی دُنیا کے لیے مخصوص رہی۔ ترقی پسند ادب کی تحریک میں جس شدو مد کے ساتھ خارجیت پر زور دیا جاتا رہا ہے اور داخلیت جس طرح قابلِ مذمت گردانی گئی ہے اسے ملحوظ رکھ کر فیضؔ کی غزل دیکھیں۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ انہوں نے اپنی تمام نظمیں 'دوسروں' کے لیے وقف کر دینے کے باوجود غزل کی صورت میں ایک گوشہ اپنے دل کے لیے بھی محفوظ رکھا۔ فیضؔ نے 'دستِ صبا' کے ابتدائیہ میں لکھا ہے......

''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد وپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا، اس کی فنی دسترس پر اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلاحیت اور لہو کی حرارت پر۔ اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدو جہد چاہتے ہیں۔ حیات انسانی کی اجتماعی جدو جہد کا ادراک اور اس جدو جہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدو جہد اسی جدو جہد کا ایک پہلو ہے۔''

یہ خاص ترقی پسندانہ سوچ ہے اور ان کی بیشتر نظموں کی تفہیم کے لیے روشنی کا ماخذ۔ لیکن غزلوں میں فیضؔ نے نظموں کی مانند واشگاف انداز اپنانے کے برعکس انہیں غزل کے کلاسیکی آہنگ اور مخصوص اُسلوب میں یوں بیان کیا، بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ یوں چھپایا کہ شعر میں معنی کی تہہ داری پیدا ہوگئی۔ یہ انداز غیر محسوس کن طور پر ان کی غزلوں میں نمایاں ہے اور نمایاں تر ہوتا گیا ہے۔ دست صبا کی غزلوں سے اشعار میں معانی کی ان دو جہات کا رنگ گہرا ہونا شروع ہوتا ہے اور بعد کے مجموعوں میں یہ مزید پختگی پکڑتا

جاتا ہے جس کے نتیجے میں نقش فریادی کی نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے جذبے کی جس دو رنگی کا احساس ہوتا تھا وہ یک رنگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دست تہ سنگ اور زنداں نامہ میں فیض کی غزل بھی اسی جذبے میں رنگی ہوئی ملتی ہے جس نے نظموں میں اظہار پایا۔ 'دست صبا' کے یہ اشعار اس میں بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

یہ ضد ہے یاد حریفانِ بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابر آئے

عجز اہل ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

جوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

ان اشعار میں فیض نے خارجی زندگی کی تلخیوں کی شدت کو تغزل سے کم کرنے

کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے لیے بعض اور ہمعصروں کی مانند فیضؔ نے بھی غزل کے مخصوص علائم سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ قدیم اُردو غزل نے آج کے جدید غزل گو کو اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو، اتنا ضرور ہے کو گل و بلبل، کنج و قفس، مجنوں وصحرا اور رقیب اور محتسب وغیرہ ایسے الفاظ اور ان سے وابستہ تلازمات کے جو سلسلے ملتے ہیں ان کی بنا پر ان الفاظ کے استعمال سے ہر نوع کے معانی کی جہات کے در وا کیے جاسکتے ہیں۔ فیضؔ نے بھی غزل کے اظہار کی اس صورت سے ہر ممکن طریقے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ فیضؔ اور بعض دیگر غزل گو ترقی پسند شعرا کی غزلوں سے یہ نکتہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ جہاں اپنے پیغام کی ترسیل اور ابلاغ مقاصد کے لیے نظموں میں نئی علامات اور اشارات وضع کیے گئے وہاں غزل میں پرانی علامات اور مقبول اشارات سے بھی کام چلایا۔ چنانچہ فیضؔ نے ایام اسیری کی غزلیات میں غزل کے اس مخصوص اظہار سے وابستہ سہولتوں سے ہر ممکن طریقے سے فائدہ اُٹھایا اور فیضؔ کے لیے یہ مشکل بھی نہ تھا کہ ان کا فن شعور غزل کی کلاسیکی روایات میں یوں رنگا ہے کہ اظہار کی ہر منزل ان کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ فیضؔ کے اشعار ہیں اور جیل میں لکھے گئے تھے تو انہیں کسی بھی کلاسیکی استاد کا کلام سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً......

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب، جرمِ سخن سے پہلے

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

نہیں شکایت ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار رکھتے ہیں

در وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی

یہ سب مثالیں زنداں نامہ سے لی گئی ہیں اور ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ دستِ تہ سنگ میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں۔ ان کے اشعار کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ فیضؔ کی غزل کی اساسِ صنعت ان کا انقلابی نعرہ نہیں بلکہ وہ شاعرانہ لہجہ ہے جس سے وہ انقلابی نعرہ کو کیموفلاج کرتے ہیں اور تغزل کا وہ آہنگ ہے جس سے وہ تلخ حقائق کی کرختگی کو ملائم کرتے ہیں۔ عشق کی طرح انقلاب بھی ایک بخار بلکہ بعض صورتوں یہ تو ایسا متعدی بخار ہوتا ہے کہ یہ اظہار نہ پائے تو فرو اندر ہی اندر سلگتا ہے، لیکن اظہار پانے پر ہر نوع کے پیرائے اظہار اپنانے پر بھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ یہ احساس زیادہ شدید ہو تو اعصاب کے جنون پر منتج ہوتا ہے۔ اسی سے عام صلاحیتوں اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں والے فن گروں میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ عام شاعر جذبے کے جس سیلاب میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے، اعلیٰ فنکار اپنے تخلیقی شعور سے ہجر سے جذبے کو گویا پابہ زنجیر کر دیتا ہے۔ اسے یوں سمجھئے گویا بند باندھ کر پانی کا ذخیرہ کر لیا اور پھر حسب منشا اس سے کام لیتے رہے۔

اس کے نتیجے میں اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل فنکار میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی اس کے ہنگاموں سے منقطع بھی نہیں ہوتا، لیکن یہ اس کی تخلیقی شخصیت کا اعجاز ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے بھنور میں ہونے کے باوجود 'طوفان کی آنکھ' کی مانند اپنے گرد سکون کا ایک دائرہ بنائے رکھتا ہے۔ سکون کا یہ دائرہ اس کے فن سے تشکیل پاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں مصاف زیست میں شامل ہونے کے ساتھ وہ خود کو اس پیکار سے بلند تر محسوس کرتے ہوئے جس تجربے سے خود گزر رہا ہوتا ہے اپنی بلند سطح سے وہ 'دوسرے آدمی' کی طرح اسی کا ادراک اور پھر تجزیہ بھی کرتا جاتا ہے۔ فیضؔ کی غزل میں یہی خوبی نظر آتی ہے اور طوفان بداماں ہونے کے باوجود ان میں 'طوفان کی آنکھ' ایسا سکون پایا جاتا ہے۔

○○

ساقی فاروقی

فیضؔ، میراؔجی اور راشدؔ

نئی نسل کو بہکانے اور اُردو نظم کی نمو میں رخنہ ڈالنے میں فیضؔ کی شاعری پیش پیش رہی ہے۔ ان کا خوابناک انداز، غنائی لہجہ، سجل اور ترشے ہوئے الفاظ، انوکھی اور اچھوتی تشبیہوں پر محبوبانہ دسترس اور سب سے بڑھ کر ان کی شخصیت کی نرمی اور مٹھاس— یہ تمام چیزیں اپنے قاری پر جادو کیے بغیر نہیں رہتیں۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے بار بار مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ میں ایک ایسے طلسمی قصر میں داخل ہو رہا ہوں جہاں کچھ دیر کے لیے سوچنے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور باصرہ اور شامہ کے علاوہ باقی تمام حسیات مفلوج ہو جاتی ہیں۔ بس دیکھتے رہئے اور خوشبو نفس در نفس آپ کی رگوں میں اترتی چلی جائے گی۔

ابھی فضا میں اقبال کے ''سلسلہ روز و شب'' کی گونج باقی تھی اور اختر شیرانی کی سلمیٰ دلوں میں کچا کچا درد بکھیر رہی تھی کہ فیضؔ نے لکھنا شروع کیا۔ نئے لکھنے والے ایک دوراہے پر کھڑے تھے۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ دل میں سلمیٰ جیسی محبوبہ کے لیے لہو ہلکورے لے رہا ہوگا اور ذہن اقبال کی فکری رو کا ساتھ دینا چاہتا ہوگا۔ فیضؔ، اقبال کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا۔

کنار رحمت حق میں اسے سلاتی ہے
سکوت شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی

اور اقبال کی معیت میں وہ ان کے استاد داغؔ تک جا پہنچتے تھے......

ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

دوسری طرف اختر شیرانی کی آواز سے آواز ملانے کی کوشش جاری تھی......

آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

یا

مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دُعائیں

یہی ابتدا کرنے کا Genuine طریقہ بھی ہے۔ نیا لکھنے والا تھوڑی دور تک اپنے دور کی بڑی آوازوں اور پچھلوں کے نقش قدم پر چلتا ہے اور اگر اس میں جان ہے تو رفتہ رفتہ اپنی راہ الگ کر لیتا ہے ورنہ دوسری صورت میں دھیرے دھیرے ادب خود اسے اپنی راہ سے الگ کر دیتا ہے۔ یہ ادب کا کچھ ایسا فطری عمل ہے کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اور اس کی ساری عمر کی محنت ادبی تاریخ کے جوہڑ میں پڑی سڑتی رہتی ہے۔

فیضؔ کے یہاں کبھی اقبال کا مصرع ''یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے'' پیروڈی ہو کر ''یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے'' بن جاتا ہے کبھی غالبؔ کے مصرعے گونجتے ہیں......

تو ہے اور اک تغافل پیہم
میں ہوں اور انتظار بے انداز

......اور کبھی غالبؔ کے لہجے کی دھمک سنائی دیتی ہے......

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

(میرا خیال ہے یہ شعر plagiarism کی سرحدوں کو چھوتا ہوا گزرتا ہے) اور کبھی سوداؔ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فیضؔ سودائی نظر آتے ہیں......

ہے فقط مرغ غزل خواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمی گفتار کروں یا نہ کروں

ان تمام باتوں کے باوجود یہ امر مسلم ہے کہ فیض نے جہاں کہیں سے بھی کسب نور کیا ہے اس میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اور ایسا شامل کر دیا ہے کہ وہ فیض ہی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کا لہجہ اتنا سبک اور الگ ہے کہ اُردو کے کسی شاعر کے لہجے سے لگا نہیں کھاتا۔

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

غالباً پہلا شعر ہے جہاں سے فیض نے اپنی آواز الگ کرنی شروع کر دی تھی۔ یہ لہجے کی نرمی اور مٹھاس فیض نے سالہا سال کی ریاضت کے بعد حاصل کی ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر کہنے سے زیادہ لہجہ بنانے اور آواز منفرد کرنے میں مصروف رہے۔ بعض اوقات تو الفاظ کی تراش خراش اور کاری گری اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ اصل جذبہ ماند پڑ جاتا ہے اور ایک خوبصورت عنوان کے ساتھ ایک بجی سجائی نظم صفحہ قرطاس پر ندامت سے سر جھکائے ہوئے سسکتی رہتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ دل کے رُخسار پر اس وقت تری یاد نے ہا۔ لاحول ولا قوۃ A good poet should feel as hamed after executing a line like that.

فیض کے کلام کا ایک اور نمایاں جوہر ہے تکرار— بلکہ کبھی کبھی تو میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ مکھی پر مکھی مارے ہوئے جذبات اور اپنی ہی جگالی کیے ہوئے خیالات کو ان کے یہاں سے نکال دوں تو کیا فیض کا کل کلام دس بارہ صفحات میں نہیں سمٹ آئے گا۔ ایک بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ فیض کا معاملہ ان سے کہیں چھوٹے شاعر مجاز سے ذرا جدا ہے۔ مجاز کے یہاں تکرار کی وجہ علم اور مشاہدے کی کمی ہے جبکہ فیض کے یہاں تکرار کا باعث صحیح یا غلط آدرش ہے۔

'موضوع سخن' فیض کی اصل آواز تھی، لیکن ابھی وہ آہستہ سے کھلتے ہوئے

ہونٹوں اور جسم کے دلآویز خطوط کو پوری طرح محسوس بھی نہ کرپائے تھے کہ ترقی پسندی کے اژدھے نے سانس لینی شروع کر دی اور دوسرے لاتعداد شاعروں کی طرح وہ بھی اس بھوکے اژدھے کے کھلے ہوئے سرخ جبڑوں کی طرف کھنچنا شروع ہوگئے۔ ساری مخلوق، کنکر پتھر، اوبڑ کھابڑ، سب کی منزل ایک تھی، اژدھے کا پیٹ — انجام؟ مکمل تباہی! تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ نیاز حیدر اور کیفی اعظمی بھی وہی کہہ رہے تھے جو فیض کہہ رہے تھے اور فیض بھی وہی کہہ رہے تھے جو سردار اور مخدوم کہہ رہے تھے اور سردار اور مخدوم بھی وہی کہہ رہے تھے جو پارٹی کہلانا چاہتی تھی۔ اور تو اور 'ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا تو چراغ راہ میں جل گئے'' اور ''رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ'' جیسے مصرعے کہنے والی مہذب آواز ''مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح'' جیسے بے رس اور اخباری مصرعے گنگنانے لگی تھی۔

ان سب کی اپنی آواز میں اپنا احساس اور اپنا جذبہ غائب ہوگیا تھا۔ یہ انسان پرست قوم اور یہ قوم سدھار ٹیم شعر و ادب کو چھوڑ کر اتنا آگے نکل آئی تھی کہ واپسی کا امکان بس اسی صورت میں باقی رہ گیا تھا کہ یہ اژدھا سانس لینے کے لیے دوبارہ منہ کھولے — جو صرف اس طرح ممکن تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ اس اژدھے کی دیوار نما پیٹھ کے نیچے آگ روشن کرے تاکہ یہ کالی بلا گھبرا کر کروٹ بدلے اور تکلیف سے چنگھاڑنے لگے۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ آگ روشن کرنے کا خوشگوار فریضہ کس نے ادا کیا، فی الحال یہ دیکھئے کہ اس دیوار کے نیچے دب کر فیض کا کیا حشر ہوا۔

فیض کو پڑھ کر سب سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس انبوہ کثیر میں خلط ملط ہو کر بھی انہوں نے شاعری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور درآمد شدہ خیالات کے ساتھ ساتھ شعریت کی ایک بے قرار لہر بھی ان کے لہجے سے الجھی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ حشر کے میدان میں وہ واحد ترقی پسند شاعر ہیں جو ذرا سر اٹھا کر چل سکتے ہیں حالانکہ کج کلاہی انہیں بھی زیب نہیں دیتی۔ ان کے دوسرے ساتھی ادھر اُدھر کنی کاٹتے ہوئے بھاگے پھر رہے ہیں اور جائے امان نہیں۔ حق ہے، وتعزمن تشاء وتذل من تشاء۔

ترقی پسندوں میں مل کر سب سے پہلے تو فیضؔ نے اپنی محبوبہ کو رخصت کیا، اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ شاعر کو کیسے کیسے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اگر محبت اپنی فلمی محبت کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتی ہے تو یہ بات تو فیضؔ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبت کے سوا دُنیا میں اور کوئی غم سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور باقی تمام شاخیں اسی چھتنار درخت سے پھوٹتی ہیں۔ نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور۔

فیضؔ کے رقیب کی ایک زمانے میں بڑی دھوم تھی۔ یہ نظم مجھے بیسویں مصرعے تک بہت پسند ہے۔ اتنی کہ میں نے فیضؔ صاحب سے فرمائش کر کے بار بار سنی ہے۔ میں انہیں ہمیشہ 'جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں'' پر روک دیتا ہوں۔ وہ بھلے آدمی ہیں رُک جاتے ہیں۔ یہ ان کی بڑائی ہے۔ میرے خیال میں اگر نظم اس مصرعے پر ختم ہو جاتی تو اپنا بڑا گہرا اثر چھوڑتی۔ باقی 12 مصرعے پیوند ہیں۔ نام نہاد غم دوراں کو غم جاناں کے ساتھ جوڑنے کا پیوند۔ ایک سچ کو دوسرے جھوٹ کے ساتھ جوڑنے کا پیوند۔ اور اس انمل، بے جوڑ پیوند کا سلسلہ فیضؔ کی اکثر نظموں میں پھیلا ہوا ہے۔ اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا' یوں عمر بسر کب ہوتی ہے؟ فیضؔ صاحب کا ایک مصرع ہے۔ اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل۔ حالانکہ آواز کی کپکپی بتا رہی ہے کہ ایک عشق پر دل نادم ضرور ہے اور اگر فیضؔ کا دل نادم نہیں تو قاری کو ندامت ضرور ہے۔ اس کے علاوہ فیضؔ کے یہاں ایک چیز اور رہ جاتی ہے۔ صلیب و زنداں سے گزرنے کا عزم اور سحر کا انتظار۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ مسئلے نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں۔ far from it جن مسئلوں سے شاعر دو چار ہوا ہے اگر وہ اس کے دل پر اپنا اثر نہیں چھوڑیں گے تو اس کا دور اس کے کلام میں کیسے دھڑکے گا۔ لیکن زندگی کے صرف ایک ہی گوشے کی عکاسی اچھے شاعر کا شیوہ نہیں۔ حد بندی فن کار کا دم گھونٹ دیتی ہے اور وہ اپنے ہی کلیشے میں ساری عمر ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے۔ میں شاعری میں Commitment کا شدید قائل ہوں مگر شاعر کی پہلی commitment شاعری سے ہے، نہ کہ journalism سے۔

یہاں میں سارتر کے مضمون کمٹمنٹ کا حوالہ نہیں دینا چاہتا ورنہ بات بہت بڑھ جائے گی کہ میں فیضؔ ہی کے آس پاس رہنا چاہتا ہوں۔

طوق و سلاسل اور دار و رسن کو فیضؔ نے اتنا دہرایا ہے کہ اب وہ شاید خود بھی سمجھنے لگے ہیں کہ ان کی یہی آواز سچی آواز ہے۔ اگر آپ اپنے ہاتھ کی کسی انگلی کا ناخن بار بار اپنے دانتوں سے کاٹتے رہیں تو وہ حرکت آپ کی عادت ثانیہ بن جائے گی۔ عادت جو جبلت کی زرخرید کنیز ہے۔ یہاں تک کہ اگر آپ اس عادت بد کو چھوڑنا چاہیں تو بھی نہیں چھوڑ سکتے، اور آپ کو اس عادت سے ایک طرح کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ دلچسپی رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ یوں آپ پہلے اپنا ناخن چبا جاتے ہیں اور پھر اپنی انگلی زخمی کرتے رہتے ہیں حالانکہ آپ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ دار سے فیضؔ کا کچھ ایسا سمبندھ ہو گیا کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ تنگ آ کر وہ دار ہی کو کاندھے پر لاد کر اٹھا لائے۔ شاید اس طرح وہ اسے دیکھ کر inspire ہونا چاہتے ہیں۔

ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا
لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا

فیضؔ میں بڑے امکانات تھے اور وہ چلے بھی ٹھیک ہی تھے لیکن ادب کا معاملہ تو بھول بھلیوں کا سا ہے۔ اگر ہاتھ میں چراغ نہیں ہے یا اس چراغ پر گرفت مضبوط نہیں ہے تو نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ فیضؔ نے بھٹک کر ہماری نظم کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اور اب اس کی تلافی کا کوئی امکان نہیں رہا۔ پھر بھی، ان تمام چیزوں کے باوجود فیضؔ واحد زندہ شاعر ہیں جن کی تقریباً تمام نظمیں ان کے مخالفین اور معتقدین دونوں پر یکساں اثر کرتی ہیں۔ نقش فریادی کی ۷ نظمیں: میرے ندیم، مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، رقیب سے، تنہائی، بول، موضوعِ سخن، اور ہم لوگ، دست صبا کی ۵ نظمیں: صبح آزادی، شورش بربط و نے، نوحہ ایرانی طلبہ کے نام اور شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں...... زنداں نامہ کی دو نظمیں: دریچہ اور روشنیوں کا شہر...... دست تہ سنگ کی دو نظمیں: پاس

رہو اور منظر، اپنے اُسلوب اور احساس دونوں لحاظ سے اظہار اور بیان کی جدید تر راہیں دکھاتی ہیں اور نظم کے نئے اور اچھوتے زاویہ ہائے نظر کے امکانات روشن کرتی ہیں۔ اُردو نظم میں فیضؔ کا یہی اضافہ ہے جس کے بغیر اُسلوب اور خیال دونوں کا رشتہ ماضی سے کٹ جائے گا۔ (فیضؔ کی غزل چونکہ میرے موضوع کے احاطے سے باہر ہے اس لیے اس پر گفتگو نہیں کی گئی۔)

○○

اختر شاہجہاں پوری

فیضؔ کی شاعری

شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ فیضؔ کا بڑا کارنامہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی اصطلاحاتی الفاظ کو دوبارہ زندہ کیا اور انہیں غزل میں مقبول کیا، ورنہ فیض کے زمانے میں یہ سب خوبصورت الفاظ یا تو ترک ہو چکے تھے یا اپنے معنی کھو چکے تھے۔ اس کے جواب میں دو شکلیں ہیں۔ یہ بیان مخدوش ہے کہ دار و رسن، قفس و نشیمن وغیرہ الفاظ کسی بھی وقت اپنے معنیٰ کھو سکتے ہیں۔ یہ الفاظ دراصل ایک پورے رسومیاتی نظام کا حصہ ہیں اور ان پر غزل کی دنیا کے تمام مفروضوں کا دارومدار ہے۔ جب تک وہ رسومیاتی نظام اور مفروضات باقی ہیں یہ الفاظ اپنے معنی نہیں کھو سکتے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی رسومیاتی لفظ مثلاً جور وستم میرؔ کے شعر میں بامعنیٰ ہو، اور آج کے زمانے کے شعر میں بے معنیٰ ہو۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جور وستم قسم کے الفاظ اپنی دل کشی اور تازگی کھو چکے تھے۔ فیضؔ نے انہیں دوبارہ دل کشی اور تازگی عطا کی۔ پھر سوال اٹھے گا کہ فیضؔ نے یہ کارنامہ کیوں کر انجام دیا۔ آپ جواب دیں گے کہ فیضؔ نے انہیں سیاسی معنی عطا کیے۔ لیکن پھر وہی مشکل آن کھڑی ہوگی کہ فیض کے شعر میں سیاسی معنی کی دریافت ان معلومات پر مبنی ہے کہ فیضؔ سیاسی اور انقلابی شخص تھے۔ لہٰذا کلاسیکی رنگ وآہنگ والے الفاظ میں جو دل کشی اور تازگی ہم فیضؔ کے شعر میں دیکھتے ہیں وہ اس وجہ سے کہ ہم جانتے ہیں کہ فیضؔ کے کچھ سیاسی عقائد تھے۔ یعنی فیضؔ نے ان میں کوئی شاعرانہ خوبی نہیں پیدا کی، یہ تو محض ان کی سیاست کا کرشمہ تھا۔

فیضؔ کی شاعری میں چند غزلوں اور نظموں کو چھوڑ کر سب کی سب سیاست گزیدہ محسوس ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ فیضؔ کے یہاں فکری تضاد ملتا ہے۔

فیضؔ مزاجاً رومانی شاعر تھے لیکن فیضؔ نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں اس میں سامراجی طاقتیں کمزور اور پسماندہ ممالک پر تسلط جمائے ہوئے تھیں اور ان کا طرح طرح سے استحصال کر رہی تھیں۔ فیضؔ چونکہ ایک حساس ذہن کے مالک تھے اس لیے ان کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اس وقت کے مسائل کا شدت سے ذکر کیا۔ عوام کو انقلاب برپا کرنے کی ترغیب دی اور تسلط جمائے ہوئے لوگوں کو غیر انسانی حرکتیں کرنے پر بہت کچھ کہہ ڈالا لیکن یہ بات سچ ہے کہ اگر فیضؔ کی شاعری پر انقلاب کے وقتی اثرات نہ ہوتے تو ان کی شاعری اس صدی کی بہترین شاعری کہی جاسکتی تھی۔ فیضؔ نے جہاں نعرے بازی سے اجتناب کیا ہے وہاں ان کی شاعری زیادہ طاقتور دکھائی دیتی ہے۔

فیضؔ چونکہ ایک خاص نظریے کے علمبردار تھے اس لیے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی نظریے کے زیر اثر معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں پرشکوہ الفاظ کی بھرمار ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی، نرمی اور نزاکت جو اچھی شاعری کا خاصہ سمجھی جاتی ہے، غزلوں میں تو نظر آتی ہے، نظموں میں نہیں۔

اس معاملے میں فیضؔ دوسروں کے مقابلے میں خوش قسمت ثابت ہوئے کہ ان کے ہمعصروں نے ان کی شاعری کے روشن پہلوؤں پر ہی لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی، خامیوں کی نشاندہی نہیں کی، جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی میں بڑے شاعر کی حیثیت سے ہی جانے گئے لیکن اب ان کے کلام کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیا جارہا ہے اور اس کے اسقام کو بھی منظر عام پر لایا جارہا ہے۔ یہ اس لیے اور بھی کہ جن حالات میں وہ شاعری کی گئی تھی وہ حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔

فیضؔ دل سے رومانی شاعر تھے لیکن ذہنی طور پر اشتراکیت پسند تھے۔ ان کی

اشتراکیت پسندی نے ان کو شہرت، عزت اور دولت سے تو نوازا لیکن ان کو عظیم شاعر نہیں ہونے دیا۔ اس لیے کہ فیضؔ نہ تو رومانی شاعر ہو پائے اور نہ باغی۔ ذہن و دل کے اسی تضاد نے انہیں بہت نقصان پہنچایا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری کم رتبہ ہے بلکہ ان کی شاعری میں اچھی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں، خاص طور سے غزلوں میں۔ چند شعر مثال کے طور پر پیش ہیں......

نقش فریادی

منت چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گزر بھی نہیں

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حد نظر سے

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

دست صبا

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دُکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ چمن
تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں
ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے
ان کی نظر میں، کیا کریں پھیکا ہے اَب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم

زنداں نامہ

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی
شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں
دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے

لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر دیکھو تو

نقش فریادی۔ دستِ تہہ سنگ۔ دستِ صبا۔ زنداں نامہ اور سرِ وادیٔ سینا کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ فیضؔ کی نظمیں غزلوں کے مقابلے میں زیادہ بلند آہنگ ہیں، اور وہ نظموں کے لہجے میں توازن بھی برقرار نہیں رکھ سکے۔ مثال کے طور پر نظموں کے کچھ بند پیش کرتا ہوں......

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں
تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اترا نہ میداں میں دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی نہ کوئی علم
تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں
جسم خستہ ہے ہاتھوں میں یارا نہیں

انتساب

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانے کے بھولے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں والی ماسوا۔ نائب اللہ فی الارض

دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے پر
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لیے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسارِ دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

خورشیدِ محشر کی لَو

کب تمہارے لہو کے دریدہ علم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں ڈھل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے درد و الم، سارے جور و ستم
دور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لو
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

مندرجہ بالا نظموں کے علاوہ اور بھی بہت سی نظمیں ہیں جنہیں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً: دعا۔ دست تہہ سنگ۔ پیکنگ۔ سنکیانگ وغیرہ۔

یہاں فیضؔ کی شاعری سے متعلق چند اہم لوگوں کی رائے لکھنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ فیضؔ کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ کلیم الدین احمد فیضؔ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ملاحظہ ہو......

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلاویز خطوط

آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن اِن کے سوا اور نہیں

''یہ ذہنی الجھن خیالی نہیں واقعی ہے اور وہ اس الجھن سے نجات نہیں پا سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعور کی ترقی رُک گئی اور اُن کی شاعری کے چشمہ کا پانی خشک ہو گیا ہے۔''

ممتاز حسین پطرس بخاری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دیکھیں جدید شاعری کی شمع ن۔م۔راشد کے سامنے رکھی جاتی ہے یا فیضؔ کے۔

ڈاکٹر وزیر آغا: میں جب فیضؔ کی لفظیات یعنی ان کے جسمانی جن کے سحر سے نکلا تو میں نے ان نظموں کے معنوی اَوصاف کی طرف توجہ کی اور معاً مجھے محسوس ہوا کہ فیضؔ کے پاس چند بندھے ٹکے مضامین ہیں جنہیں وہ دہراتے نہیں تھکتے۔ فیضؔ میرا

محبوب شاعر تھا جب مجھے فیضؔ کی تنگ دامانی اور اس کی بے وجہ تکرار کا احساس ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہے۔

رشید حسن خاں: فیضؔ کے مزاج کی رومانیت ان کو انقلابی بننے سے روکتی رہی۔ ہاں ان کی انقلاب پسندی میں رومانیت کے عناصر شامل ہوتے رہے اور اس طرح وہ رومانی باغی بن کر رہ گئے۔ عقیدے اور مزاج کی اس کشمکش کو ان کے کلام میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے اور وہ آج تک اسی دوراہے پر کھڑے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اسی ادھورے پن کی آئینہ داری کرتا ہے۔

مندرجہ بالا اسناد سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ فیضؔ کی شاعری میں ذہن و دل کی کشمکش نمایاں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ عظیم شاعر نہیں بن سکے۔

○○

حصه سوم : متفرقات

احمد ندیم قاسمی

فیض احمد فیض

فیض احمد فیضؔ کے ساتھ میرے تعلقات کی نوعیت عجیب و غریب تھی کہ ان میں قرب و بعد کی کیفیتیں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں۔ ہم ایک ہی ادبی تحریک سے متعلق تھے اور صحافت کے ایک ہی ادارے میں برسوں ایک ساتھ کام کیا مگر میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ میں فیض صاحب سے ذرا فاصلے پر ہوں یا فیض صاحب مجھ سے ذرا فاصلے پر ہیں۔ میں نے اس صورت حال کا جب بھی تجزیہ کیا، یہی نتیجہ نکلا ہے کہ......

☆ ہمارے درمیان طبقاتی تفاوت تھا۔

☆ پینے پلانے کی محفلوں میں میری عدم شرکت اس درمیانی فاصلے کا ایک اور اہم سبب ہے۔

ان کے علاوہ کوئی سبب میری سمجھ میں نہیں آیا اور اگر کوئی اور سبب سر اُٹھاتا بھی ہے تو میں اُسے رد کر دیتا ہوں کہ اگر میں اُسے رد نہیں کروں گا تو فیض صاحب سے میری نیازمندی داغ دار ہو جائے گی۔

فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات مولانا عبدالمجید سالک صاحب کے ہاں کسی شادی کے موقعہ پر مسلم ٹاؤن میں سالک صاحب کے مکان پر ہوئی تھی۔ مولانا سالک صاحب یا ڈاکٹر تاثیر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا جو مصافحے سے آگے نہ بڑھا کیونکہ فیض صاحب کے ساتھ ان کے احباب کا جو ہجوم تھا، وہ انہیں دور کھینچ لے گیا۔ اس کے بعد ان سے میری ملاقات دہلی میں ہوئی۔ آل انڈیا ریڈیو نے

''جدید شعرائے اُردو'' کا ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا تھا اور مجھے بھی بلا بھیجا تھا۔ میں سال یاد رکھنے کے سلسلے میں نہایت درجہ کوتاہ ہوں مگر بہر حال اس مشاعرے کا انعقاد ۱۹۴۰ء ۔۱۹۴۱ء میں کسی تاریخ کو ہوا تھا۔ میں ملتان میں سب انسپکٹر محکمہ آبکاری متعین تھا۔ وہاں سے دہلی آیا۔ اپنے عزیز دوست سعادت حسن منٹو کے ہاں قیام کیا۔ منٹو اس زمانے میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے بحیثیت سکرپٹ رائٹر منسلک تھے۔ مشاعرے کے سب شرکا کے نام تو یاد نہیں، مگر جو یاد ہیں، وہ یہ ہیں......

فیض احمد فیض، ایم۔ ڈی۔ تاثیر، تصدق حسین خالد، حفیظ جالندھری، ن۔م۔ راشد، روش صدیقی، میراجی، اسرار الحق مجاز وغیرہ۔ میں عمر میں ان سب شعراء سے چھوٹا تھا، مگر جب مشاعرہ ختم ہوا تو منٹو نے ان بڑے شعراء کے ہجوم میں اعلان کیا کہ ندیم کی نظم آپ سب شعراء سے بہتر تھی۔ یہ کہہ کر منٹو نے سراسر زیادتی کی تھی مگر اسے اپنی بات کہنے سے کون روکتا۔ ہر شاعر کا اپنا اپنا ردِعمل تھا۔ فیض صاحب منٹو کا یہ اعلان سن کر مسکراتے رہے اور ن۔م۔ راشد یہ کہہ کر رہ گئے کہ یہ شخص کسی بھی مقام پر شرارت سے باز نہیں آتا۔

اُن دنوں اُردو ہندی کا لسانی جھگڑا عروج پر تھا۔ منٹو کو ایک عجیب شرارت سوجھی۔ اس نے سب شعراء کو جمع کر کے کہا کہ آپ لوگ ایک ایک ایسی نظم لکھئے جو نہ اُردو میں ہو نہ ہندی میں۔ بلکہ کسی بھی زبان میں نہ ہو۔ آپ لوگوں کا لہجہ اور اسلوب بولے۔ بے معنی گھڑے ہوئے لفظوں کے آہنگ ہی سے سامعین اندازہ لگالیں گے کہ یہ فیض کی نظم ہے اور یہ راشد کی اور یہ اُپندر ناتھ اشک کی۔ سب تو نہیں البتہ فیض صاحب نے، اشک نے اور شاید راشد نے بھی، بے معنی الفاظ کی نظمیں کہیں۔ ایک نظم میں نے بھی گھڑی۔ عنوان تھا 'بھنورا'' ...... اور بھنورے کے پروں کی آواز کے سے الفاظ گھڑ کر چھ سات اشعار کی نظم لکھ ڈالی۔ پھر ان نظموں کی ریکارڈنگ کا مرحلہ آیا۔ سب نے اپنی نظمیں ریکارڈ کرائیں مگر فیض صاحب جب بھی ریکارڈنگ کے لیے اسٹوڈیو میں داخل ہوئے، بے تحاشہ ہنستے ہوئے باہر بھاگ آئے۔ کرشن چندر اور اوپندر

ناتھ اشک انہیں پکڑ کر پھر سے اسٹوڈیو کے اندر لے گئے مگر وہ پھر بھاگ لیے۔ ان کی ہنسی رکتی ہی نہیں تھی۔ کہتے تھے، منٹو نے ہم سب کو خوب فول بنایا ہے اور منٹو پکارتا رہا کہ میں اس پروگرام کو نشر کرکے اُردو ہندی کا جھگڑا کرنے والوں کو فول بناؤں گا۔ آخر کار فیض اپنی بے معنی نظم ریکارڈ کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے بعد میں سنا کہ یہ نظمیں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئیں تو بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے بھی سنیں اور کوئی غلط اثر لینے کی بجائے وہ بے حد محظوظ ہوئے۔

میں دہلی ہی میں تھا جب فیض صاحب ایم۔اے۔او۔ کالج، امرتسر کے طلباء کی ایک ٹیم کو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لے جاتے ہوئے دہلی میں رُکے۔ میرے عزیز دوست اور میزبان سعادت حسن منٹو نے ان کے اعزاز میں ایک ہوٹل میں ڈرنک پارٹی کا اہتمام کیا۔ میں نے اس دعوت کی تفصیل منٹو سے متعلق اپنے مضمون میں درج کر دی ہے جس میں غزل اور نظم کے مسئلے پر، عالم سرخوشی میں مولانا چراغ حسن حسرت اور سعادت حسن منٹو میں دلچسپ تکرار ہوئی تھی۔ اس دوران فیض مسلسل مسکراتے رہے تھے جیسے اس تنازعے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ان ہی دنوں مجھے کرشن چندر نے بتایا کہ فیض آج کل ڈاکٹر تاثیر کی انگریز بیگم کی چھوٹی بہن ایلس کے ساتھ شادی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

قیام پاکستان کے موقعہ پر میں پشاور ریڈیو سے متعلق تھا۔ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں لکھنؤ سے میری عزیز منہ بولی بہنیں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اپنے جملہ عزیزوں کے ہمراہ لاہور آ چکی تھیں۔ میں نے پشاور سے لاہور آ کر انہیں متروکہ مکان الاٹ کرانے میں مدد دی اور پھر میں پشاور کی ملازمت سے مستعفی ہو کر لاہور آ گیا۔ لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مجھے فوراً انجمن کی پنجاب شاخ کا سیکریٹری بنا دیا گیا۔ میں نے ان ہی دنوں بہن ہاجرہ مسرور کی معیت میں رسالہ ''نقوش'' جاری کیا جس میں دیگر معروف اہل قلم کے علاوہ فیض صاحب کی نگارشات بھی شامل رہیں۔ انجمن کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔

میں نے ایک اجلاس میں علامہ اقبال پر ایک مفصل مضمون پڑھا جس میں علامہ کی سامراج دشمنی، ملائیت دشمنی اور جاگیردارانہ معیشت کی واضح مخالفت کے اعتراف وتحسین کے ساتھ ہی علامہ کے بعض پہلوؤں پر گرفت بھی کی تھی۔ اتفاق سے فیض اس اجلاس میں موجود تھے۔ میرے مضمون کے ختم ہوتے ہی وہ ناگواری بلکہ غصے کے واضح تیوروں کے ساتھ بولے اور میرے مضمون کے اس حصے کی شدید مخالفت کی جس میں، میں نے علامہ کی بعض سرگرمیوں پر گرفت کی تھی۔ ان کی مخالفت تو مبارک تھی مگر مجھے عمر بھر یہ افسوس رہا کہ فیض صاحب نے میرے دو تین اعتراضات کا کوئی جواب دینے کی زحمت نہ کی بلکہ زیادہ زور اس نکتے پر دیتے رہے کہ شعر وادب کی بڑی شخصیتوں کی مثبت کارکردگی کے اعتراف کے بعد ان کی بعض منفی سرگرمیوں کو نظرانداز کر دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ یہ ساری بحث کسی رسالے یا اخبار میں شائع بھی ہوئی تھی مگر افسوس کہ مجھے اس رسالے یا اخبار کا نام یاد نہیں۔ علامہ کے بارے میں میرے اس مقالے کے خلاف روزنامہ ''احسان'' کے مدیر ابوسعید بزمی (مرحوم) نے دو روز تک طول طویل اداریے لکھے تھے اور مجھے بہت بُری طرح گردن زدنی قرار دیا تھا۔

فیض انجمن کے ہفتہ وار اجلاسوں میں کبھی کبھار شرکت کر لیتے تھے مگر ان کی تشریف آوری میں وہ باقاعدگی نہیں تھی جیسے ابن انشا، ابراہیم جلیس، حمید اختر، عبداللہ ملک، عارف عبدالمتین، ظہیر کاشمیری، احمد راہی اور دوسرے کئی ترقی پسند مصنّفین نے مدتوں اختیار کیے رکھی۔ دراصل فیض صاحب بورژوا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور ان ہی کی صحبت میں خوش رہتے تھے۔

نومبر ۱۹۴۹ء کی کل پاکستان ترقی پسند مصنّفین کانفرنس منعقدہ لاہور کو تحریک میں ''لینڈ مارک'' کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں شرکت کے لیے ہم نے روس کے علاوہ برطانیہ اور امریکہ کے ترقی پسند مصنّفین کو بھی مدعو کیا مگر صرف روسی اہل قلم کا ایک چہار رکنی وفد لاہور آسکا اور وہ بھی کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد پہنچا، مگر ان چاروں اصحاب کی آمد اور لاہور میں ان کا چند روز قیام ادبی تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ یہ اہل قلم

پاکستانی ادباء وشعراء کے لیے روس میں شائع ہونے والی ادبی کتابوں کے تحائف لائے تھے جو میں نے انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے، برکت علی محمڈن ہال (بیرون موچی دروازہ) کے ایک جلسۂ عام میں وصول کیے اور پشکن، دوستووسکی، طالسطائی، چیخوف، گوگول، گورگی، مایاکوفسکی، ایلیا اهرن برگ وغیرہ وغیرہ کی تخلیقات کے یہ انگریزی تراجم میں نے انجمن کے دفتر پہنچا دیے جنہیں دوسرے ہی دن پولیس دفتر پر چھاپے کے پردے میں سمیٹ کر لے گئی۔ میں نے اس ظلم کے خلاف فیض صاحب سے درخواست کی کہ وہ علم وادب کا یہ خزانہ انجمن کو واپس دلوا دیں کیونکہ قریب قریب ہر دور میں ارباب حکومت سے ان کے خاصے تعلقات ہوتے تھے۔ انہوں نے یقیناً کسی سے کہا بھی ہوگا مگر خدا ہی جانے کہ ادب کا یہ خزانہ کہاں دفن کر دیا گیا۔

فیض صاحب کی ترقی پسندی تو کسی بھی شک وشبہ سے بالا تھی مگر ترقی پسندوں کی سرگرمیوں میں وہ بھرپور دلچسپی کم ہی لیتے تھے جس کی ان سے توقع کی جاتی تھی۔ جب نومبر ۱۹۴۹ء کی کانفرنس کے سلسلے میں انجمن کے نئے منشور اور کانفرنس میں پیش کی جانے والی قراردادوں پر بحث مباحثے کے لیے ترقی پسند مصنّفین مل بیٹھتے تھے تو فیض صاحب ان محفلوں میں شاذ ہی شرکت کرتے تھے۔ اسی کانفرنس میں اس قرارداد کو بھی پیش ہونا تھا جس کا مضمون غیر ترقی پسند ادیبوں کے بائیکاٹ پر مشتمل تھا، اور وہ مفصل منشور بھی منظور ہونا تھا جو انتہا پسندی کا شاہکار تھا، مگر فیض صاحب نے ان میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ البتہ جب کانفرنس کے اجلاسوں کے لیے کسی ایک صدر کی بجائے ایک ''پریزیڈیم'' کا فیصلہ ہوا تو فیض صاحب مان گئے اور وہ کانفرنس کی سب نشستوں میں مطلبی فریدآبادی، ممتاز حسین، فارغ بخاری، ریاض روفی اور میرے پہلو بہ پہلو بیٹھتے رہے۔ جب کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنّفین کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا اور مجھے جنرل سکریٹری قرار دیا گیا تو میں نے احتجاج کیا کہ فیض صاحب اور مطلبی صاحب کے سینئر حضرات کی موجودگی میں مجھے اس عہدے کے لیے نامزد نہ کیا جائے۔ مگر اکثریت نے میری گزارشات پر توجہ نہ دی۔ البتہ میں نے اعلان کیا کہ ''ہم فیض صاحب کو

بھاگنے نہیں دیں گے۔" چنانچہ انہیں انجمن کا وہ "خزانچی" منتخب کیا گیا جس کی تحویل میں انجمن کا نہ صرف ایک روپیہ تک نہیں تھا بلکہ قرضہ ہی قرضہ تھا۔

گرمیوں کا آغاز تھا۔ میں نسبت روڈ کے مکان کی تیسری منزل کی چھت پر پڑا سو رہا تھا جب گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ ان دنوں پولیس خانہ تلاشیوں اور گرفتاریوں میں بہت مصروف رہتی تھی۔ میں نے سوچا ایسا ہی کوئی سانحہ ہونے کو ہے۔ نیچے جاکر دروازہ کھولا تو فیض صاحب، سبط حسن صاحب (امپیریل الیکٹرک کمپنی کے) رحمٰن صاحب (اور شاید حمید اختر صاحب بھی) موجود تھے۔ میں نے سب سے مصافحہ کیا اور بیٹھک کا دروازہ کھولنے لگا تو فیض صاحب بولے۔ "نہیں ندیم صاحب، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو آپ کو صرف جگانے آئے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ہم آدھی رات کو بھی سڑکوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں اور آپ مزے سے سو رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ سو آپ کو جگانے...... صرف جگانے کا فیصلہ ہوا۔ آپ جاگ گئے۔ بس ہم چلتے ہیں۔" وہ سب ہنستے ہوئے پلٹ گئے اور مجھے یہ کہنے کا موقع ہی نہ دیا کہ سارا قصور تو آپ لوگوں کی شب بیداریوں کا ہے۔

نسبت روڈ کے مکان کی یہ بیٹھک (جو اب خالد احمد کی تحویل میں ہے) ادبا وشعرا کا خاص مرکز رہ چکی ہے۔ فیض صاحب یہاں تین چار بار تشریف لائے۔ بیشتر خدیجہ بہن کے افسانوں کے مجموعے کا دیباچہ لکھنے آتے، سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے اور لکھتے چلے جاتے۔ ایک بار جب ہم لوگوں نے جگر اور مجاز کی آمد پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال میں مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو فیض صاحب شعرا کی فہرست مرتب کرکے لے آئے۔ سب نام ٹھیک تھے مگر ظہیر کاشمیری کا نام درج نہیں تھا۔ میں نے اس فروگزاشت کا ذکر کیا تو فیض صاحب نے کہا۔ "نہیں، ظہیر کو اس مشاعرے میں شامل نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ "کیوں نہیں کریں گے؟ ظہیر تو ترقی پسند مصنفین کا ایک بہت اہم اور سینئر شاعر ہے۔" فیض صاحب نے خاصی ناگواری سے کہا۔ "کچھ بھی ہو، ظہیر اس مشاعرے میں شامل نہیں ہوگا۔" میں فیض صاحب کی یہ ضد دیکھ کر

حیرت زدہ رہ گیا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ جوایم۔اے۔او۔ کالج، امرتسر میں فیض اور ظہیر کے درمیان کسی نکتے پر چپقلش کی افواہ سنی تھی، تو اس میں کچھ سچائی بھی تھی۔ مگر میں سوچ تک نہیں سکتا تھا کہ فیض اتنی کم حوصلگی کا مظاہرہ کریں گے۔ آخر میرے اصرار پر وہ مان تو گئے مگر یہ شرط رکھی کہ ظہیر کو مدعو کرتے ہوئے کسی صورت میں ان کا نام نہ آئے! میں فیض کے اس تعصب کو آج تک ہضم نہیں کر پایا۔

سوا برس بعد فیض صاحب (اور سید سجاد ظہیر وغیرہ) راولپنڈی سازش کیس کے تحت گرفتار کر لیے گئے اور مئی ۱۹۵۱ء میں ملک کے دونوں حصوں سے کتنے ہی ترقی پسند مصنّفین کو محض احتیاطاً نظر بند کر دیا گیا اور انجمن بے ٹھکانا ہو کر رہ گئی۔ نظر بندی کے دنوں میں جب ہم مل بیٹھتے تھے تو سوچتے رہ جاتے تھے کہ فیض صاحب کا سا نرم مزاج شاعر فوجی طاقت کے ساتھ حکومت کا تختہ الٹنے کا اقدام کیسے کر سکتا ہے۔

نومبر ۱۹۵۱ء میں رہا ہو کر میں نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ایک اور کل پاکستان کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اس دوران میں نے پورے ملک کی شاخوں کی تائید کے ساتھ وہ انتہا پسندانہ قرارداد واپس لے لی جس میں بڑے بڑے اہلِ قلم کا بائیکاٹ کیا گیا تھا۔ کل پاکستان کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی۔ اس میں نہ صرف متذکرہ قرارداد باقاعدہ واپس لی گئی بلکہ منشور پر بھی نظرِ ثانی کی گئی اور قریب قریب وہی منشور منظور ہوا جو انجمن کے آغاز میں مرتب ہوا تھا۔ اس کانفرنس کے تین اجلاس تھے جن کی صدارت بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، مولانا عبدالمجید سالک صاحب اور پیر حسام الدین راشدی صاحب نے کی۔ اس کانفرنس میں بھی مجھے ہی جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا جبکہ میں نے ظہیر کاشمیری کا نام تجویز کیا تھا، مگر ظہیر نے معذرت کر لی تھی۔

ان ہی دنوں فیض صاحب کا مجموعہ کلام ''دستِ صبا'' جیل سے مرتب ہو کر ناشر تک پہنچا۔ فیض صاحب نے مجھے لکھا کہ میں مسودے پر ایک نظر ڈال لوں۔ میں نے بعض مقامات کے سلسلے میں شبہے کا اظہار کیا۔ فیض صاحب نے میرے بعض شبہات

دور کر دیے اور بعض مقامات کو برقرار رکھا۔ کتاب شائع ہوئی تو اس کی افتتاحی تقریب کی صدارت مصور مشرق محترم عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے فرمائی۔ میں نے فیض کی شاعری پر ایک مقالہ پیش کیا اور اپنی وہ نظم بھی پیش کی جس کا ایک شعر یہ تھا......

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ، بجز اذن کلام

ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

اس دوران فیض صاحب کے ساتھ خط و کتابت جاری رہی۔ دوستوں اور عزیزوں کو ان کا وہ حبسیہ کلام جیل سے موصول ہوتا رہا جس کے بنیادی موضوع نے ان کے اس شعر میں تجسیم پائی......

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

جب فیض اور سجاد ظہیر کی بے گناہی ثابت ہونے پر انہیں رہا کیا گیا تو مختلف تقریبوں اور دعوتوں میں ان کا بھرپور خیر مقدم ہوا۔ مجھے بطور خاص وہ بڑی دعوت یاد ہے جو نوابزادہ لیاقت علی خاں کے برادر نسبتی نوابزادہ امتیاز علی خان نے اپنی کوٹھی واقع لارنس روڈ پر برپا کی تھی۔ کھانے سے پہلے شراب کا دور چلا جس میں سب بلانوش خوب چہکے۔ انگریزی کے معروف استاد اور کمیونسٹ پارٹی کے دماغ پروفیسر ایرک سپرین کی توجہ میری طرف منعطف ہوگئی اور انہوں نے شراب سے میری محرومی کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔ نشے یا نیم نشے میں حاضرین یقیناً محظوظ ہوتے رہے مگر میں تادیر پروفیسر صاحب کا یہ ارشاد برداشت نہ کر سکا کہ...... ''مسٹر ندیم! اگر آپ وہسکی نہیں پیتے تو مجھے حکم دیجیے، میں آپ کے لیے نلکے کا پانی لے آؤں۔'' پروفیسر ایرک سپرین نہایت شائستہ اور کلچرڈ دانشور تھے مگر شراب ایسی کافر چیز ہے کہ بڑے بڑوں کے قدم اکھیڑ دیتی ہے۔ ہر بار جب وہ مجھے نلکے کے پانی کی پیش کش کرتے تھے تو پورا مجمع قہقہوں سے گونج اُٹھتا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ پروفیسر صاحب نے جب پھر سے میرے لیے نلکے کا پانی لانے کی پیش کش کی تو میں نے انہیں بازو سے پکڑا اور یہ کہتا ہوا باہر لے آیا کہ مجھے لان میں نصب نلکے کا پانی

پسند ہے۔تشریف لائیے اور پلائیے۔اور جب لان میں صرف میں اور پروفیسر صاحب رہ گئے تو میں نے گستاخانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے گھڑک کر کہا کہ اگر اب آپ نے نلکے کے پانی کی پیش کش کی تو میں آپ کے دانت توڑ دوں گا! نشے میں دھت شرابیوں پر اس طرح کی دھمکی کوئی اثر نہیں کرتی مگر پروفیسر ایک دم متاثر ہو گئے اور ایسی چپ سادھ لی کہ فیض صاحب سویرے نسبت روڈ پر میرے غریب خانے میں تشریف لے آئے اور مجھ سے گزشتہ رات کی زیادتی کی معافی مانگی۔ میں نے انہیں سینے سے لگا لیا کہ بنیادی طور پر وہ ایک پیاری شخصیت تھے۔ نہ جانے انہیں یہ کیسے یاد رہ گیا کہ رات انہوں نے غلط حرکت کی تھی۔

میں ۱۹۵۳ء کے آغاز میں روزنامہ ''امروز'' کا مدیر مقرر ہوا اور جب فیض صاحب رہا ہوئے تو انہوں نے پھر سے ''پاکستان ٹائمز'' کی ایڈیٹری سنبھالی۔ ''امروز'' نے اپنی زندگی کے دس برس پورے کر لیے تھے اس لیے اس کا ''دہ سالہ نمبر'' نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ اس سلسلے میں فیض صاحب نے اور میں نے ظہیر بابر، حمید اختر، حمید جہلمی اور عبداللہ ملک کے مشوروں سے ایک منصوبہ بنایا اور ایسا یادگار نمبر مرتب کیا کہ بعض باذوق قارئین کے پاس اب تک محفوظ چلا آتا ہے۔

ان ہی دنوں جب مجھے معلوم ہوا اور فیض صاحب نے خود بھی اعتراف کیا کہ وہ پنجاب کے گورنر میاں مشتاق احمد گورمانی کی تقریریں لکھتے رہے ہیں تو سچی بات ہے، مجھے باقاعدہ صدمہ پہنچا۔ اس سے پہلے انہوں نے برصغیر کی تاریخ کے سفاک ولین، برطانیہ کی فوج میں کرنل کا عہدہ قبول کر کے اپنے چاہنے والوں پر ستم ڈھایا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہی تھا کہ فیض صاحب ملک کے حاکم انگریز کی فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں، مگر مجھے اس وقت شدید صدمہ پہنچا جب میں انہیں فوج کے پتے پر خط لکھنے بیٹھا۔ میں نے ان کا یہ پتہ اپنے نہایت عزیز دوست (اور ہفت روزہ ''شیرازہ'' کے مدیر) محمد فاضل صاحب سے حاصل کیا تھا۔ فیض صاحب کا پتہ یہ تھا......

کرنل فیض احمد فیض......ایم۔بی۔ای۔

ڈپٹی ڈائریکٹر مورال ڈائریکٹوریٹ

جنرل ایڈجوٹنٹ برانچ، جنرل ہیڈکوارٹرز، نئی دہلی۔

فیض صاحب کے اس عجیب وغریب پتے نے مجھے دنوں تک اُداس رکھا۔ میری وہی کیفیت ہوگئی جو دہلی میں جارج پنجم کے جشن تاجپوشی پر علامہ اقبال کے تہنیتی اشعار پڑھ کر مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر علامہ اقبال اس زمانے کے سب سے بڑے فرنگی کے حق میں وہ اشعار نہ لکھتے اور فیض صاحب ملک کو محکوم رکھنے والے غیر ملکی حکمران کے ساتھ تعاون نہ فرماتے تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑتا!

پھر جب قیام پاکستان کے برسوں بعد میں نے اپنی پاکستانی فوج کے ایک بڑے افسر، جنرل کے۔ ایم۔ عارف کے شعری مجموعے کی افتتاحی تقریب کی صدارت کی تھی تو فیض صاحب نے اس پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیوں مناسب سمجھا! جبکہ ادب کا تخلیق کار نہ فوجی ہوتا ہے نہ غیر فوجی...... وہ صرف تخلیق کار ہوتا ہے۔

مگر اس سلسلے میں تنہا فیض صاحب گنہگار نہیں تھے۔ ہمارے بہت سے نامور اہل قلم انگریز کے چکر میں آگئے تھے۔ن۔ م۔ راشد تک کیپٹن راشد کہلانے لگے تھے۔ میں اس زمانے میں ماہنامہ ''ادب لطیف'' کا ایڈیٹر تھا۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے مجھے رسالے میں اشاعت کے لیے ایک نظم بھیجی جس کا عنوان تھا ''چند روز اور مری جان''۔ یہ فیض صاحب کی ایک نظم کے ایک مصرع کا ٹکڑا ہے جسے جوش صاحب نے اپنے مفہوم میں استعمال کیا تھا۔ اس نظم میں فیض صاحب کے علاوہ تاثیر صاحب اور راشد صاحب وغیرہ کو، جو انگریز کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے، نشانۂ تضحیک بنایا گیا تھا۔ میں نے یہ نظم پڑھی تو سوچا کہ اگر یہ چھاپ دوں تو میرے یہ سب محترم دوست خفا ہو جائیں گے۔ سو میں نے اس نظم کی نقول تیار کیں اور سب کو بھجوا دیں، کہ اگر آپ اس ضمن میں کچھ کہنا پسند کریں تو میں نظم کے ساتھ انہیں بھی شائع کر دوں گا۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی جواب کی ہمت نہ کی اور یہ نظم میرے دور ادارت میں شائع نہ ہو سکی۔ (سنا ہے بعد میں شائع کر دی گئی تھی) نظم کا موضوع یہ تھا کہ شاعر کی بیوی اپنے میاں کو غیرت دلاتی ہے کہ آپ کے سب دوست انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر مزے اُڑا رہے ہیں اور......

بیویاں اُن کی لونڈر میں بسی رہتی ہیں
شمپین پیتی ہیں، صوفوں میں دھنسی رہتی ہیں
ان کی زلفیں ہی نہیں مست و معطر پیارے
ان کے گالوں پہ بھی چربی کے ہیں چکر پیارے

......اور شاعر بیوی کو تسلی دیتا ہے کہ......

چند روز اور مری جان، فقط چند ہی روز

......نظم کے آخر میں شاعر اپنی بیوی کو سر عبدالقادر کی برپا کی ہوئی ایک دعوت میں شامل ہونے کا کہتا ہے......

اُٹھ کھڑی ہو کہ ہے دعوت کا یہ موقع نادر
راستہ دیکھ رہے ہوں گے سر عبدالقادر

......اور ''سر عبدالقادر'' پر نشان لگا کر جوش صاحب نے نیچے یہ مختصر نوٹ درج کیا تھا......

''اس زمانے میں جب بڑی بڑی شخصیتیں مقام اعتبار سے گر رہی ہیں، سر عبدالقادر کی ''عین'' کا گرنا کوئی اتنا بڑا حادثہ نہیں ہے۔''

میں نے بعد میں فیض صاحب کو جوش صاحب کی یہ نظم یاد دلائی مگر وہ طرح دے جاتے رہے اور صرف مسکراتے رہے۔

کبھی کبھی جب کوئی گمبھیر سیاسی مسئلہ درپیش ہوتا تھا اور میاں افتخار الدین بھی ملک سے باہر ہوتے تھے تو فیض صاحب اس مسئلے پر اداریہ لکھنے کے سلسلے میں مجھے مشورہ دینے آتے تھے۔ وہ مسئلے سے متعلق اداریے میں ایک خاص حکمت عملی اختیار کرنے کے سلسلے میں اپنا نقطہ نظر واضح کرتے تھے مگر اتنا آہستہ بولتے تھے کہ صرف ان کے ہونٹوں کی ہلکی ہلکی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ فیض صاحب ذرا اونچا بولیے۔ وہ دو چار الفاظ اونچے بول کر پھر وہی انداز اختیار کر لیتے تھے۔ میں اداریہ لکھ کر کاتب کے حوالے کر دیتا تھا۔ دوسرے روز فیض صاحب میرا اداریہ پڑھنے کے بعد تشریف لاتے تو شکایت کرتے کہ مسئلے کے

بارے میں انہوں نے جو موقف بیان کیا تھا، وہ تو اداریے میں ہے ہی نہیں۔ تب میں عرض کرتا تھا کہ فیض صاحب، آپ کا موقف کس کافر کے کانوں تک پہنچا ہے۔ آپ تو ہونٹوں ہونٹوں میں کچھ کہہ جاتے ہیں۔ کچھ پلّے پڑتا نہیں، اس لیے میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اداریہ لکھ دیتا ہوں۔

فیض صاحب اپنی جگہ پریشان تھے کہ نئے نئے شعرا ان کی شاگردی اختیار کرنے اور ان سے اصلاح لینے آنکلتے ہیں۔ ادھر میں بھی اسی وجہ سے پریشان تھا۔ چنانچہ جب بھی کوئی نوجوان میرے پاس اس نیت سے آتا تھا، میں اسے فیض صاحب کے پاس بھیج دیتا تھا کہ وہ مجھ سے سینئر بھی ہیں اور دفتر میں عموماً فارغ ہی بیٹھے ہوتے ہیں کیونکہ سال میں پاکستان ٹائمز کے دو چار ہی ایڈیٹورل لکھتے ہیں۔ فیض صاحب بھی ان نوجوانوں کو یہ کہتے ہوئے میرے دفتر کا راستہ دکھا دیتے تھے کہ میں تو انگریزی اخبار کا ایڈیٹر ہوں اور انگریزی ہی میں سوچنے لگا ہوں۔ ندیم کے پاس جایئے کہ اُردو اخبار کا ایڈیٹر ہے اور اس لیے اُردو میں سوچتا ہے۔ جب ہم دونوں پر یہ راز کھلا کہ وہ نوجوانوں کو میری طرف اور میں انہیں فیض صاحب کی طرف روانہ کر دیتا ہوں تو ایک روز ہم دونوں نے مل کر ایک تجویز سوچی۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب تازہ تازہ ریٹائر ہوئے تھے اور سنت نگر میں رہائش پذیر تھے۔ طے پایا کہ شاگردی اور مشورے کے طالبان کو صوفی صاحب کے ہاں بھجوایا جانا شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ ضرورت مندوں کو ہم نے صوفی صاحب کے گھر کا راستہ دکھانا شروع کر دیا۔ تین چار ماہ کے بعد ایک بار ہم دونوں کسی تقریب میں شامل ہونے پہنچے تو صوفی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سلام و آداب کے بعد میں نے پوچھا کہ قبلہ ریٹائرمنٹ کے بعد کا وقت کیسا گزر رہا ہے؟ بولے، ''ویسے تو کچھ ادھورے ادبی کام مکمل کرنے کا وقت مل گیا ہے مگر ایک پریشانی بہت شدید ہے۔ نوجوان اپنی کچی کچی غزلیں لے کر میرے پاس قطار اندر قطار آنے لگے ہیں اور ایک پل بھی چین نہیں لینے دیتے۔'' فیض صاحب کو تو صوفی صاحب کے یہ الفاظ سن کر بے تحاشہ ہنسی آگئی اور وہ قہقہے لگاتے بلکہ قہقہوں پر قابو پانے کی

کوشش میں پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دور چلے گئے مگر میں چند لمحے ضبط کیے کھڑا رہا۔ پھر فیض صاحب کو ہنسی سے بے چین دیکھ کر میں بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا اور ہنسنے لگا۔ صوفی صاحب پریشان ہوکر کبھی دور جاتے فیض صاحب کو دیکھتے تھے، کبھی مجھے گھورتے تھے اور آخر فرمایا۔ ''کیوں بھئی کیا بات ہے؟ کیا میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنایا ہے کہ کھی کھی کیے جا رہے ہو؟'' تب تک فیض صاحب بھی واپس آ گئے تھے اور میں نے بھی ضبط کر لیا تھا اور جب ہم نے صوفی صاحب کو بتایا کہ ہم ہی یہ افواج قاہرہ آپ کی طرف بھیجتے ہیں، تو اب ہم تینوں میں طے پایا کہ ان نوجوانوں کو عابد علی عابد صاحب کے گھر کا پتہ بتا کر کہنا چاہیے کہ وہ بالکل فارغ ہیں، ان کے پاس مشورہ دینے کا وافر وقت ہے۔ اب اس کے بعد عابد صاحب پر کیا گزری...... یہ الگ قصہ ہے۔

اُن دنوں روزنامہ ''امروز'' کراچی سے بھی نکلتا تھا مگر اس کی سرکولیشن آٹھ دس ہزار سے آگے بڑھتی ہی نہیں تھی۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کو اس کی وجہ سے خاصا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لیے میاں افتخار الدین صاحب اور سید امیر حسین شاہ صاحب (مینجنگ ڈائریکٹر) نے فیض صاحب کو اور مجھے ''امروز'' کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے کراچی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ دفتر کی طرف سے ہم دونوں کے لیے ریلوے کی فرسٹ کلاس ایئر کنڈیشنڈ سیٹیں بک ہوگئیں۔ فیض صاحب نے تو خیر اس طرح کے کئی سفر کیے ہوں گے مگر ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں سفر کرنے کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ جب ہم اپنے ڈبے میں پہنچے تو دیکھا کہ اس میں دو سیٹیں آمنے سامنے کی ہیں اور دو اوپر کی ہیں۔ سامنے کی نیچے اور اوپر کی سیٹ فلمی دنیا کے دو مشہور اصحاب، آغا گل صاحب اور چودھری عید محمد صاحب کے لیے بک تھیں اور دو ہم دونوں کے لیے۔ رات کا وقت تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سونے سے کچھ دیر پہلے ہم چاروں اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ جب ڈبے کا دروازہ کھلا اور ملک فیروز خاں نون اندر تشریف لائے۔ وہ آتے ہی فیض صاحب سے ''فیضی فیضی'' کہتے ہوئے لپٹ گئے اور بولے۔ ''مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ تم بھی اسی ٹرین میں کراچی جا رہے ہو۔

مجھے پہلے معلوم ہوتا تو تمہارے ساتھ کی سیٹ بک کرا لیتا مگر بہر حال یہی بہت ہے کہ ہم دونوں ہمسفر تو ہیں، اور ہاں فیضی، ایک محفل میں تمہاری تازہ غزل کے تین شعر تمہارے ایک عقیدت مند نے سنائے تو لطف آ گیا۔ میں نے یہ تینوں شعر نوٹ کر لیے۔ اب بھی میری جیب میں ہیں۔'' یہ کہہ کر ملک صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور فیض صاحب کو ان کے شعر سنانے لگے۔ انہوں نے تینوں کے تینوں شعر غلط پڑھے۔ پھر جب وہ کاغذ تہہ کر کے اور اسے کوٹ کی جیب میں منتقل کر کے چلے گئے تو میں نے فیض صاحب سے عرض کیا۔ ''اس دنیا میں آپ کا کیسا کیسا عقیدت مند موجود ہے فیض صاحب!'' وہ میرے طنز کو سمجھ گئے اور بولے۔ ''ہمارے سیاستداں شعر کے معاملے میں عموماً جاہل ہوتے ہیں۔''

اب سونے کا وقت آیا تو فیض صاحب نے نیچے کی برتھ پسند کی اور میں نے اوپر کی۔ شدید گرمی کے موسم میں ڈبے کی یخ فضا باقی تینوں کے لیے تو معمول کا درجہ رکھتی تھی، مگر میرے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ میں اوپر کی سیٹ پر ایک آسودگی کے احساس کے ساتھ لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سو بھی گیا، مگر زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ میں سردی سے کانپنے لگا۔ نیچے جھانکا تو فیض صاحب بیڈ لائٹ جلائے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا...... ''فیض صاحب مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ اوڑھنے کے لیے کوئی موٹا کپڑا ہوگا آپ کے پاس؟'' فیض صاحب مسکراتے ہوئے اُٹھے اور اپنی اٹیچی میں سے ایک بڑا سا تولیہ نکال کر مجھے دیا اور ساتھ ہی فرمایا۔ ''وہ ضرب المثل تو آپ نے ضرور سنی ہوگی۔ وہی کہ...... گھی ہضم نہیں ہوتا!'' اس پر ہم دونوں نے قہقہہ لگایا تو دونوں فلمی شخصیتوں نے جیسے ڈسٹرب ہو کر کروٹ بدلی۔

میں یہ بڑا سا تولیہ اوڑھ کر سو گیا مگر آدھ پون گھنٹے کے بعد آنکھ کھل گئی۔ شدید ٹھنڈک تولیے کو پار کر کے میری ہڈیوں تک میں اُتری جا رہی تھی۔ گھبرا کر میں نے نیچے والی سیٹ پر فیض صاحب کو دیکھا تو وہ اپنے گھٹنے سینے سے لگائے ایک گٹھری سی بنے پڑے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''فیض صاحب!'' ان کی آواز آئی۔ ''جی۔''

اور میں نے عرض کیا۔ ''ہاضمہ آپ کا بھی خراب ہی معلوم ہوتا ہے۔'' اس پر ہم دونوں اس زور سے ہنسے کہ آغا گل صاحب اور عید محمد صاحب بیدار ہو گئے اور ہم سے ہمارے قہقہوں کا سبب پوچھا، اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم دونوں سردی سے کپکپا رہے ہیں اور اس کپکپی کو قہقہوں سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو وہ بہت محظوظ ہوئے۔ مگر وہ آئے دن لاہور سے کراچی کا ایئر کنڈیشنڈ سفر کرتے رہتے تھے۔ اس لیے دونوں کے پاس فالتو کمبل بھی تھے، سو دونوں نے ایک ایک کمبل ہمارے حوالے کیا اور تب ہم سکون سے سو سکے۔

ان دنوں ملک کے مشہور ماہر موسیقی رفیق غزنوی کراچی ہی میں مقیم تھے۔ انہوں نے فیض صاحب کی اور میری آمد کا سنا تو ہمیں اپنے گھر لے آئے۔ وہ ادھیڑ عمر میں بھی ایک خوبصورت انسان تھے مگر جب انہوں نے اپنی نئی بیوی سے ہمیں متعارف کرایا تو مجھے افسوس سا ہوا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بیس بائیس برس کی لڑکی لگتی تھیں اور رفیق صاحب ان سے تیس پینتیس برس بڑے ہوں گے، مگر بہر حال یہ ان کا سراسر ذاتی مسئلہ تھا۔

رفیق صاحب نے بیئر سے فیض صاحب کی مدارت شروع کی۔ ایک گلاس میرے سامنے بھی رکھا، مگر فیض صاحب نے میری مدد کی اور رفیق صاحب کو مطلع کیا کہ ''یہ نہیں پیتے۔''

''کیا آپ بیئر جیسی غیر نشہ آور چیز بھی نہیں پیتے؟'' رفیق صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ تو ایسی ہی ہے جیسے آپ سڑک کنارے گنے کے رس کا ایک گلاس پی لیں۔''

میں نے کہا۔ ''مگر میرے اور آپ کے دوست سعادت حسن منٹو نے تو بیئر کے سلسلے میں آپ کے متعلق کچھ اور بتایا تھا۔''

رفیق صاحب بولے۔ ''کیا بکواس کی تھی اس کشمیریے نے؟''

میں نے کہا۔ ''منٹو کہتے تھے کہ رفیق غزنوی کا سا مضبوط جثے کا آدمی بھی بیئر کی دو بوتلیں پی لیتا ہے تو اس سے ایک خاص لفظ ٹھیک سے نہیں بولا جاتا...... اس کی زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ اسے نشہ ہو جاتا ہے۔''

رفیق صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نے بتایا تھا نا کہ منٹو فضول بک بک بہت کرتا تھا۔ اس نے آپ کو کون سا لفظ بتایا تھا۔''

فیض صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔ ''رفیق دو بوتل بیئر چڑھا لے تو پھر بتایئے گا۔''

فیض صاحب تو جیسے تاک میں تھے۔ جب رفیق صاحب نے دوسری بوتل کا آخری گھونٹ بھی پی لیا تو فیض صاحب بولے۔ ''اب بتایئے، منٹو نے کس لفظ کی بات کی تھی۔''

رفیق صاحب نے بھی کہا۔ ''جی ہاں، دو بوتلیں تو میں نے پی لیں۔ اب بتایئے وہ کون سا لفظ ہے جو میں ٹھیک سے نہیں بول سکوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''ذرا بول کر دکھایئے...... 'ٹمبکٹو' بولئے۔''

رفیق صاحب بولے۔ ''**ٹکٹمبو**۔''

فیض صاحب نے زور کا ایک قہقہہ لگایا۔ میں نے کہا۔ ''ٹمبکٹو...... ٹمبکٹو بولیے۔''

رفیق صاحب نے کہا۔ ''بول تو رہا ہوں...... **ٹکٹمبو**...... **ٹکٹمبو**......''

فیض صاحب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا مگر رفیق صاحب کہتے رہے۔ ''ہنس کیوں رہے ہیں فیض صاحب؟ کہہ تو رہا ہوں۔ **ٹکٹمبو**...... **ٹکٹمبو**...... منٹو شرارت کرتا تھا۔''

اور فیض صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''منٹو یقیناً شرارت ہی کرتا تھا۔ اس کا ثبوت مل گیا ہے۔''

جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں فیض صاحب لاہور آرٹس کونسل کے سکریٹری (یا ریزیڈینٹ ڈائریکٹر) تھے۔ ایک روز میں کسی کام سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر راوی روڈ پر چغتائی صاحب کے ہاں لے چلے۔ نسبت روڈ پر سے گزرے تو انہیں سڑک کے کنارے ''قاسمی پریس'' کا ایک بڑا سا بورڈ دکھائی دیا۔ مجھے معلوم نہیں یہ کن صاحب کا پریس تھا، مگر بہرحال قاسمی پریس کا بورڈ موجود تھا۔ فیض صاحب کہنے لگے۔ ''آپ چپکے چپکے اتنا بڑا کاروبار چلا رہے

ہیں؟'' اس پر ہم دونوں ہنسے۔ تھوڑا آگے گئے تو میو ہسپتال کے قریب مجھے ایک بورڈ دکھائی دیا۔ میں نے کہا۔ ''فیض صاحب، کاروبار تو آپ نے بھی بہت پھیلا رکھا ہے۔ وہ بورڈ دیکھیے۔'' بورڈ پر ''فیض ہیئر کٹنگ سیلون'' کے الفاظ درج تھے۔ فیض صاحب اتنا ہنسے کہ انہیں کار سڑک کے ایک طرف روک لینا پڑی۔

ہم دونوں کے درمیان اس طرح کی بے ضرر چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی۔ ایک روز میں لاہور آرٹس کونسل میں ان کے پاس گیا تو وہ بولے۔ ''چلئے جا کر کافی پیتے ہیں۔'' باہر جا کر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس زمانے میں مال روڈ وغیرہ پر ٹریفک سگنل نہیں نصب ہوئے تھے بلکہ چوکوں میں پولیس کے سپاہی ٹریفک کنٹرول کرتے تھے اور پیدل چلنے والوں کے لیے دونوں طرف دو دو تین تین فٹ اونچے سیمنٹ کے کھمبے سے رکھے ہوئے تھے۔ فیض صاحب کی ڈرائیونگ کا معیار ہم سب دوستوں کا خاص موضوع تھا۔ میں نے کہا۔ ''فیض صاحب احتیاط کیجئے گا۔ گاڑی ان کھمبوں میں نہ دے ماریے گا۔'' فیض صاحب بولے۔ ''آپ لوگوں نے میری ڈرائیونگ کے بارے میں غلط......'' اور انہوں نے گاڑی ٹھاہ سے سیمنٹ کے کھمبے میں دے ماری۔ ہنسنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔ فیض صاحب نے گاڑی وہیں چھوڑی اور فیروز سنز میں آ کر اپنے دفتر فون کیا کہ ڈرائیور آئے اور ہماری گاڑی لے جائے۔

ہم لوگوں نے فیض صاحب کی ڈرائیونگ کے بارے میں یہ تک مشہور کر رکھا تھا کہ وہ کار کو روکنا جانتے ہی نہیں، اس لیے انہوں نے پٹرول کا ایک خاص پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس پیمانے کے مطابق پٹرول پاکستان ٹائمز کے دفتر کے سامنے ختم ہو جاتا ہے اور گاڑی خود بخود رُک جاتی ہے۔

اور یہ تو خیر واقعہ ہے کہ میں بھی فیض صاحب کی گاڑی میں موجود تھا۔ دو اور لوگ بھی تھے۔ اب یاد نہیں کہ کون کون تھے۔ بہرحال گاڑی پاکستان ٹائمز کے دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ فیض صاحب نے ایک مقام پر گاڑی کا گیئر بدلا۔ ٹھیک اُسی وقت قریب سے گزرنے والے ایک ٹرک میں بھی گیئر بدلا گیا جس میں سے گھرر کی ایک

خوفناک آواز آئی۔ فیض صاحب سمجھے یہ آواز ان کی گاڑی کے گیئر سے آرہی ہے۔ چنانچہ بریک لگائی اور بولے۔ ''لو بھئی قصہ تو ختم ہوگیا۔ گیئر ٹوٹ گیا ہے۔'' تب ہم نے عرض کی کہ یہ آواز ٹرک کے گیئر کی تھی، آپ کی کار کے گیئر کی نہیں تھی اور پھر سب مسافر جی کھول کر ہنسے۔

لائل پور کاٹن ملز، دلی کلاتھ ملز کا ذیلی ادارہ تھا جہاں ہر سال پاکستان و ہند کے منتخب شعرا جمع ہوتے تھے اور دو مشاعرے منعقد ہوتے تھے...... ایک خاص مشاعرہ...... دوسرا عام مشاعرہ...... ان مشاعروں میں شعراء کو نقد معاوضے کے علاوہ کاٹن ملز کی بعض مصنوعات کا بنڈل بھی پیش کیا جاتا تھا اور جب شعراء صبح کو واپس جانے کے لیے سڑکوں پر نکلتے تھے تو انگلیاں اُٹھتی تھیں اور تضحیک کے انداز میں کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ طے کیا گیا کہ مل کے منتظمین سے کہا جائے کہ وہ کپڑے کے بنڈل دینے کی بجائے ہر شاعر کے معاوضے میں کچھ اضافہ کر دیا کریں کیونکہ یہ بنڈل تو شعرا کی بدنامی کا باعث ہو رہے ہیں۔ منتظمین مان گئے۔ اگلے سال شعرا ان بنڈلوں سے محفوظ رہے۔ لائل پور سے واپسی پر میں ''امروز'' کے دفتر میں بیٹھا تھا جب بیگم ایلس فیض تشریف لائیں اور مجھ سے پوچھا کہ تمہیں لائل پور میں کیا معاوضہ ملا۔ میں نے رقم بتائی تو وہ بولیں۔ ''اور کپڑوں کا بنڈل؟'' میں نے عرض کیا کہ ہم شعراء نے یہ سلسلہ رُکوا دیا۔ اس پر وہ مسکرائیں اور بولیں۔ ''اچھا، تو فیض نے تمہیں بھی سمجھا بجھا دیا ہے!'' اور تشریف لے گئیں، اور میں سوچتا رہا کہ بیوی چاہے پاکستان کی ہو، چاہے انگلستان کی، آخر گھر کی مالکن ہوتی ہے۔ اس لیے اسے بستر کی چادروں، میز پوشوں اور تولیوں وغیرہ کی ضرورت تو رہتی ہی ہے۔

اسی طرح کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے فیض صاحب اور میں لائل پور براستہ جڑانوالہ جا رہے تھے جب لائل پور سے چند میل اِدھر ہی ہم نے دیکھا کہ سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ ڈرائیور گھبرایا کہ شاید ڈاکے کا معاملہ ہے، مگر میں نے یہ کہہ کر اسے بے فکر کر دیا کہ شعرا پر ڈاکہ صرف اُس وقت نتیجہ خیز ہوتا ہے جب وہ

مشاعرے سے واپس آ رہے ہوں۔ اس لیے یہ رکاوٹ کسی اور بات کا شاخسانہ ہے۔

جب ہماری کار رکاوٹ کے پاس رکی تو قریب کی ایک سلک ملز کے گیٹ میں سے بہت سے لوگ ہنستے ہوئے نکلے، بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ انہیں ہمارے یہاں سے گزرنے کا علم تھا، اس لیے انہوں نے ہمیں یہاں روکنے کے لیے سڑک پر رُکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ انہوں نے ہماری خاطر ایک ٹی پارٹی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''چائے پیجئے، اندر سے مل دیکھئے اور پھر بخوشی لائل پور تشریف لے جایئے۔''

تیس چالیس حضرات کے ہجوم میں ہم نے پرتکلف چائے پی۔ پھر مل مالک ہمیں مل کے اندر لے گئے۔ ریشمی کپڑا تیار ہو رہا تھا اور مشینوں میں سے یوں نکل رہا تھا جیسے آبشار گر رہا ہے۔ اس معائنے سے محظوظ ہونے کے بعد ہمیں اس سے ''مستفید'' ہونے کا انتظار رہا کہ مل مالک سلک کا ایک ایک تھان تو ضرور ہماری نذر کریں گے، مگر انہوں نے صرف خدا حافظ کہنے پر اکتفا کیا۔ مجھ سے کہا کہ آپ ''امروز'' میں ''حرف و حکایت'' کا کالم لکھتے ہیں، اب کے ہم غریبوں کے بارے میں بھی کچھ لکھ ڈالیے گا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ غریب کیسے ہو گئے محترم؟''

وہ بولے۔ ''دیکھئے نا اسی لائل پور میں ایک کاٹن مل ایسی بھی ہے جس کا مالک ایک لاکھ روپیہ روزانہ منافع کماتا ہے۔ ہم اپنی اس مل سے صرف تیس پینتیس ہزار روزانہ کما پاتے ہیں، اس صورت میں ہم غریب نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس صورت میں تو آپ صرف غریب ہی نہیں، کنگلے قلاش ہیں۔ میں واپس جا کر آپ کے ارشادات کی روشنی میں ایسا کالم لکھوں گا کہ آپ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔''

میں نے موعودہ کالم لکھا اور پھر مل مالک صاحب سے زندگی بھر ملاقات نہیں ہو سکی۔ میں نے ملاقات کی گنجائش ہی ختم کر دی تھی۔

میرے ایک مضمون میں گورے ملکوں کے حکمرانوں کی بجائے گوروں کی مذمت

کی گئی تھی۔ فیض صاحب نے نہایت دلداری سے مجھے ٹوکا کہ سب گورے بُرے نہیں ہوتے، ان کے حکمران بُرے ہیں، جیسے ہم لوگ خراب نہیں مگر ہمارے حکمران بہت خراب ہیں۔ میں نے آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔

ایک روز میں نے فیض صاحب سے کہا کہ لاہور کے ایک روزنامے میں ہر ہفتے ایک صاحب آپ کے خلاف قطعہ لکھتے ہیں۔ آپ کے اتنے بے شمار عقیدت مند ہیں، کسی سے کہیے کہ وہ ان قطعات کے خلاف کسی اخبار میں جوابی قطعات لکھ دیا کرے۔ فیض صاحب بولے۔ ''چھوڑیے اسے، لوہاروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔'' میں فیض صاحب کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے عرض کیا۔ ''فیض صاحب یہ آپ نے کیا فرمایا؟ لوہار تو مزدور ہوتے ہیں اور ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق ہر لحاظ سے محترم ہوتے ہیں۔ آپ نے ان کا ذکر بُرے معنوں میں کیوں کیا؟'' فوراً بولے۔ ''غصے میں ایسا کہہ گیا ورنہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ سب کامی لوگ ہم سب کے احترام کے مستحق ہوتے ہیں۔''

۱۹۵۶ء میں فیض صاحب اور میں روزناموں کے سولہ مدیران کے اس وفد میں شامل تھے جسے پاکستان کے وزیر اعظم کے ہمراہ چین کا دورہ کرنا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار ہم اسی دورے کے سلسلے میں لاہور سے کراچی پہنچ گئے تھے مگر وہاں معلوم ہوا تھا کہ وزیر اعظم صاحب نے چین کا دورہ منسوخ کر دیا ہے۔ اب کے ہم لاہور سے کراچی اور کراچی سے عازم ہانگ کانگ ہو گئے۔

کے۔ ایل۔ ایم۔ کا بڑا طیارہ تھا اور میں پہلی بار طیارے میں سوار ہوا تھا۔ خلیج بنگال پر طیارہ ایک طوفان میں گھر گیا۔ کبھی نیچے جاتا تھا کبھی اوپر۔ بلندی پر جاتے ہی پھر سے نیچے چلا جاتا تھا۔ شدید جھٹکے لگ رہے تھے۔ ہمارے عقب میں دو تین پاکستانی ڈیلی گیٹ لفافوں میں قے فرما رہے تھے۔ مولانا اختر علی خان بلند آواز میں آیت الکرسی کا ورد کرنے لگے تھے۔ فیض صاحب میرے پہلو کی سیٹ پر سو رہے تھے۔ میں نے خوفزدگی میں انہیں پکارا۔ ''فیض صاحب...... فیض صاحب یہ جہاز کو

کیا ہو رہا ہے؟'' آنکھیں نیم وا کر کے خوابیدہ آواز میں بولے۔ ''ہوتا رہتا ہے، ایسا ہوتا رہتا ہے، سو جایئے!'' اور وہ سو گئے مگر اپنی تو نیند ہوا ہو چکی تھی۔ خدا خدا کر کے طوفان تھما۔ طیارہ خلیج بنگال طے کر کے جنوب مشرقی ایشیا کے سبزہ زاروں پر سکون سے اُڑتا جا رہا تھا۔

طیارہ بنکاک میں اُترا۔ وہاں کے۔ ایل۔ ایم۔ والوں نے ہمیں ایک کار دی کہ ہانگ کانگ جانے میں ابھی بہت وقت ہے۔ شہر کی سیر کر آؤ۔ فیض صاحب، مولانا اختر علی خان اور میں بنکاک کی مختلف سڑکوں پر گھوم پھر کر ایک ریستوران میں آئے اور کافی کا آرڈر دیا۔ مولانا اختر علی خان نے ایئرپورٹ پر ہی روپوں کے بدلے تھائی لینڈ کے کرنسی نوٹ حاصل کر لیے تھے۔ انہوں نے کافی کا بل ادا کرتے ہوئے ایک نوٹ دیا۔ جب بیرا باقی رقم واپس لایا تو مولانا نے ''ٹپ'' کہہ کر بقایا واپس کر دیا۔ بیرا بار بار رکوع کی حالت میں جھک جھک گیا۔ ہم باہر گاڑی میں آ کر بیٹھے تو تب بھی یہ بیرا رکوع پر رکوع کر رہا تھا۔ مولانا نے کہا۔ ''اِدھر کے لوگ کتنے مودب ہوتے ہیں۔ پاکستان میں تو ٹپ دو تو بیرے یوں لیتے ہیں جیسے یہ ان کا پیدائشی حق تھا۔'' بعد میں ایئرپورٹ پر جا کر معلوم ہوا کہ مولانا نے ہوشربا رقم ٹپ میں دے ڈالی تھی۔ مثال کے طور پر اگر بل پانچ روپے کا تھا تو مولانا نے ایک سو کا نوٹ بیرے کو دے دیا تھا اور پچانوے روپے اسے ٹپ کر دیے تھے۔ تب مولانا نے فرمایا۔ ''میں نے بھی کہا، اس بیرے کو کیا ہو گیا ہے کہ اس کے رکوع ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہے ہیں۔''

طیارہ ہانگ کانگ کے ایئرپورٹ پر اُتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ نیچے عین مین وہی منظر تھا جو میرے دیہاتی دوست محمد سعید نے کھینچا تھا۔ وہ پولیس میں بھرتی ہو کر ہانگ کانگ گیا تھا اور جنگ چھڑنے پر جاپان کا قیدی ہو گیا تھا۔ رہائی کے بعد وہ گاؤں آیا تو میں نے اس سے اس کے تجربات و مشاہدات کا پوچھا۔ اس نے ہانگ کانگ اور کولون کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہی نقشہ میرے سامنے تھا۔ میں محمد سعید کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا کہ اسی کی بتائی ہوئی تفصیلات سے کام لے کر میں نے اپنا افسانہ ''ماما'' لکھا تھا

جس کا پس منظر یہی ہانگ کانگ اور ملحقہ سمندر میں چھوٹے جزائر ہیں۔

ہانگ کانگ ہوٹل میں ایک چینی ٹیلر آیا۔ سوٹ کے کپڑے کے کئی نمونے اس کے پاس تھے اور اس کا وعدہ تھا کہ اب آرڈر دیجئے اور شام تک سلا سلایا سوٹ لے لیجئے۔ میں نے براؤن رنگ اور فیض صاحب نے سفید رنگ کا کپڑا پسند کیا اور شام کو اسی کپڑے کے سلے سلائے اور بالکل فٹ سوٹ ہمیں مل گئے۔

دوسرے روز ہم سب مدیران جرائد ہوٹل کے ڈرائنگ ہال میں ناشتے کے لیے اکٹھے ہوئے تو فیض صاحب وہی سفید سوٹ پہنے تشریف لائے۔ مگر وہاں ایک لطیفہ ہو گیا۔ ہوٹل کے بیروں نے بھی سفید سوٹ ہی پہن رکھے تھے۔ میں نے کہا۔ ''فیض صاحب جلدی سے سوٹ بدل آیئے، ورنہ کوئی گاہک آپ کو بلا کر کوئی آرڈر دے ڈالے گا۔'' فیض صاحب نے دائیں بائیں سب بیروں کو سفید سوٹ ہی میں ملبوس دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ پھر دس پندرہ منٹ کے بعد دوسرا سوٹ پہنے واپس آ گئے۔ اس کے بعد میں نے انہیں لاہور میں اس سفید سوٹ میں ملبوس نہیں دیکھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انہوں نے یہ سوٹ سمندر میں پھینک دیا ہو گا۔

میں ہانگ کانگ ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے کھڑکی میں سے سمندر کا نظارہ کر رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک مسکراتا ہوا چینی اندر آیا اور ننگی چینی لڑکیوں کا ایک البم میرے سامنے پھیلا دیا اور بولا۔ ''آپ جس تصویر پر ہاتھ رکھیں گے وہی لڑکی چند منٹ میں حاضر ہو جائے گی۔'' میں تو کانپ گیا۔ مجھے کوئی راہ فرار نہ سوجھی تو میں نے کہا کہ ہمیں اپنے لیڈر آف ڈیلی گیشن سے اجازت لینا ضروری ہے۔ وہ فلاں نمبر کمرے میں ہیں۔ پہلے ان کے پاس جاؤ۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ آٹھ دس منٹ بعد فیض صاحب کا فون آیا کہ کیا اس البم بردار کو آپ نے ہماری طرف بھیجا تھا؟ میں نے کہا۔ ''فیض صاحب میرا تو اپنے ملک سے نکلنے کا پہلا تجربہ ہے اور آپ نے تو پورا کرۂ ارض چھان رکھا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ ان بدمعاشوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ میں نے اسے آپ کے پاس بھیج دیا

کہ آپ اسے مناسب الفاظ میں ڈانٹ دیں گے۔'' فیض صاحب بولے۔ ''مطمئن رہیے، ہم نے ڈانٹ دیا ہے۔''

دوسرے روز شام کے قریب فیض صاحب میرے کمرے میں آئے اور بولے۔ ''چلئے، ذرا ساحل سمندر تک گھوم آئیں۔'' میں نے کہا۔ ''سبحان اللہ میرا بھی یہی جی چاہ رہا تھا۔'' ہم ایک دوسڑکیں طے کر کے ساحل پر پہنچے تو ساحل کی مضبوط ریلنگ پر یہاں سے وہاں تک سولہ سولہ سترہ سترہ سال کے لڑکے اونچی نیکریں پہنے ہوئے مختلف زاویوں سے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ہنس کھیل رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ اتنے زیادہ کم لباس لڑکے یہاں کیوں جمع ہیں جب ہانگ کانگ پولیس کا ایک سپاہی جو پنجاب سے تعلق رکھتا تھا، ہمارے پاس آیا اور اُردو میں پوچھا۔ ''آپ وہی پاکستانی تو نہیں ہیں جو چین جا رہے ہیں اور کل ہی یہاں پہنچے ہیں؟'' ہم نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا۔ ''آپ یہاں کیوں آنکلے ہیں۔ یہ تو لونڈے طوائفوں کا مرکز ہے۔ یہاں سے نکل جایئے ورنہ ابھی کوئی فوٹوگرافر آ کر آپ کی تصویر اُتار لے گا اور اخبار میں اس کیپشن کے ساتھ چھاپ دے گا...... ''پاکستانی ایڈیٹر ہانگ کانگ کے لونڈا بازار میں۔'' ہم یہ سن کر بھاگے تو نہیں مگر اس تیزی سے واپس آئے جیسے ہمارے پاؤں میں پر لگ گئے ہیں۔ ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر ہم سانس لینے کے لیے رُکے اور پھر خوب جی کھول کر ہنسے کہ اگر یہ پاکستانی نوجوان ہماری مدد کو نہ آتا تو ہمارا کیا بنتا!

دوسرے روز ہمیں چین میں داخل ہونا تھا مگر ہانگ کانگ کے پاکستانیوں میں سے ایک صاحب ہمارے پاس آئے اور چپکے سے بتایا کہ آپ کے وزیراعظم کا دورہ چین ایک بار پھر منسوخ ہو گیا ہے۔ دراصل ہمارے وزیراعظم صاحب اس خطرے کے تحت کرسی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے کہ ان کی غیر حاضری میں یہاں کوئی اور نہ آ کر بیٹھ جائے، فیض صاحب نے وفد کے سولہ افراد کو ایک کمرے میں اکٹھا کر کے انہیں چپکے سے بتایا کہ ہمارے وزیراعظم صاحب نے دورہ پھر منسوخ کر دیا ہے اور اگر ہمارے چینی میزبانوں کو اس کا پتہ چل گیا تو ہمیں ہانگ کانگ سے واپس کراچی پرواز کر جانا

پڑے گا۔ ایک بار ہم چین میں داخل ہو جائیں۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔ سب نے خاموش رہنے کی ہامی بھری اور ہم لوگ اپنے دو چینی ترجمان میزبانوں کے ہمراہ ریل گاڑی سے کینٹین روانہ ہو گئے۔

کراچی میں مجید ملک صاحب نے فیض صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ ''چین میں جو چاہے کھانا پینا، مگر چین کی خاص شراب ''موتائی'' کو چھونا بھی نہیں کیونکہ جو اس شراب کے عادی نہیں ہوتے وہ پیتے ہیں تو ہو سکتا ہے، ''موتائی'' کی وجہ سے انہیں موت ہی آ جائے۔ موتائی دراصل ''موت آئی'' ہے۔ خبردار رہنا۔''

اب ہم کینٹین کے ایک ہوٹل میں پہنچے تو میزبانوں میں سے ایک نے ہمارے لیڈر آف ڈیلی گیشن فیض صاحب سے شاید کافی یا چائے وغیرہ کے حوالے سے پوچھا۔ ''آپ کیا پینا پسند کریں گے؟'' فیض صاحب بولے۔ ''موتائی پلا دیجئے!'' میں نے گھبرا کر فیض صاحب کی طرف دیکھا مگر ہجوم میں کچھ کہہ نہ سکا۔ فیض صاحب نے موتائی کے دو تین پیگ چڑھا لیے۔ مگر مجال ہے جو ان کی پیشانی پر ایک شکن بھی نمودار ہوئی ہو۔

تب ایک چینی ترجمان اُٹھا اور بولا۔ ''حضرات ہمیں بڑا افسوس ہے کہ آپ کے وزیراعظم نے اپنا دورہ منسوخ کر دیا ہے۔ اس کا ہمیں ہانگ کانگ ہی میں علم ہو گیا تھا مگر آپ سے ذکر نہیں کیا کہ آپ پریشان ہوں گے۔ آپ کے وزیراعظم آتے تو آپ عوامی چین کی حکومت کے مہمان ہوتے۔ مگر اب آپ کل چائنا جرنلسٹس یونین کے مہمان ہیں اور ہم آپ کو پورے چین کا دورہ کرائیں گے۔'' ڈھیلی ڈھیلی تالیاں بجیں کیونکہ ہم سب اندر سے شرمندہ تھے کہ ہم جس خبر کو چھپائے ہوئے تھے، اس سے ہمارے میزبان بہت پہلے سے باخبر تھے۔

چین کی جرنلسٹ یونین نے ہمیں چین کے جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک کا دورہ کرایا۔ جب بھی ہم لوگ کسی شہر میں پہنچتے، ہمارے استقبال کو وہاں کے جرنلسٹ موجود ہوتے۔ ہر شہر میں فیض صاحب ہم سب کا تعارف کراتے۔ دورے

کے آخری دن تک میری باری آئی تو میرا نام بتانے کے بعد فیض صاحب یہ کہتے......

"He is the editor of a vernacular dialy "Imroze"

which means "Today"

ایک دو بار جی چاہا، فیض صاحب سے کہوں کہ ٹھیک ہے۔ میں روزناموں کے ایڈیٹروں کے وفد کا رکن ہوں مگر شاعر اور افسانہ نگار بھی تو ہوں۔ میرا تعارف کراتے ہوئے ایڈیٹری کے ساتھ ہی میری شاعری، افسانہ نگاری کا بھی ذکر کر دیجئے گا تو کیا کسی گناہ کا ارتکاب ہو جائے گا، جبکہ آپ خاص طور پر مشرقی پاکستان کے ایڈیٹروں کی جرنلزم کے علاوہ ان کے مصوری موسیقی وغیرہ کے شوق کا بھی ذکر فرما دیتے ہیں۔ مگر میں ایسا کہہ نہ سکا کہ شاید مناسب نہ تھا۔

چین کے دورے کے آخری روز فیض صاحب نے پورے وفد کو اپنے کمرے میں جمع کیا اور انہیں بتایا کہ ''میری اطلاع کے مطابق آل چائنا جرنلسٹس یونین الوداعی پارٹی میں ہم سب کو بہت سے تحفے دے گی۔ ہم نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا اور پاکستان کا ایک بھی تحفہ ساتھ نہیں لائے۔ اب یہی ممکن ہے کہ آپ لوگوں کے پاس اگر کوئی ایسی چیز ہے جو بطور تحفہ چینی دوستوں کو پیش کی جا سکے تو لائیے، تاکہ دعوت میں ہماری شرمندگی ذرا سی تو کم ہو سکے۔''

وفد کے ہر رکن نے کوئی نہ کوئی چیز پیش کر دی۔ مشرقی پاکستان کے ایڈیٹر صاحبان ہم سے زیادہ باخبر نکلے کہ وہ اپنے ہمراہ بطور خاص تحائف لائے تھے۔ ان کے پاس بانس کی بنی ہوئی نازک نازک چیزیں خاصی تعداد میں تھیں۔ وہ جمع ہو گئیں۔ میرے پاس میرے پہلے مجموعہ کلام ''جلال و جمال'' کا وہ نسخہ تھا جس کی طباعت مثالی تھی اور جس کا دیدہ زیب سرورق محترم عبدالرحمٰن چغتائی نے بنایا تھا۔ میں یہ کتاب پیکنگ یونیورسٹی میں اُردو کلاس کو نذر کرنے لایا تھا۔ یونیورسٹی میں تو ہم لوگ گئے تھے مگر اُردو کلاس کے انچارج ایک بھارتی صاحب تھے جن کا سلوک ہمارے وفد کے ساتھ کچھ اچھا نہیں تھا۔ سو میں نے مصلحتاً کتاب انہیں پیش نہ کی اور وہ اب کام آ گئی۔ جب

الوداعی دعوت میں یونین نے ہر رکن کو تحائف پیش کیے تو فیض صاحب نے بھی جوابی تحائف کا ''برگ سبز'' یونین کے صدر کو پیش کیا۔ عجیب بات ہے کہ سب چینی میری کتاب پر جھپٹے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ کتاب میری ہے اور میں شاعر بھی ہوں تو سب نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور شکایت کرنے لگے کہ تم نے پورے ایک ماہ کے دوران ایک بار بھی یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم شاعر بھی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ بتانا تو ہمارے لیڈر کا فرض تھا۔ یہ سوال ان ہی سے جا کر پوچھیے۔

اس شہر کا نام یاد نہیں آ رہا جہاں ایک سمندر نما جھیل دیکھ کر ہم دم بخود رہ گئے۔ ہمیں دخانی کشتی میں بٹھا کر جھیل کی سیر کرائی گئی جس کے وسط میں ایک جزیرہ سا تھا اور اس جزیرے پر ایک ریستوران تھا۔ یہاں ہمارا قافلہ رُکا تو بیشتر لوگ بیئر کی بوتلوں پر جھپٹے۔ میں نے اورنج جوس اور شاید ایک دو حضرات نے بھی صرف اورنج جوس پر اکتفا کی۔ میرے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا اور میں جزیرے پر درختوں کی وہ قطار دیکھ رہا تھا جس کی دھاگے کی سی باریک جھیل کے پانی پر جھکی شاخیں ہوا کے ذرا سے جھونکے سے دور دور تک لہرا جاتی تھیں۔ یکا یک فیض صاحب نے قہقہوں کے ساتھ اپنا بیئر کا گلاس میری اورنج جوس کے گلاس میں انڈیل دیا۔ میں نے اپنا یہ آلودہ جوس جھیل کے پانی میں گرا دیا تو فیض صاحب نے سخت شکایت کی کہ میں نے ایک نعمت کی ہتک کی ہے اور وہ آئندہ کبھی مجھے شراب پینے پر مجبور نہیں کریں گے۔ اور واقعی وہ اپنے اس عزم پر قائم رہے بلکہ بعض محفلوں میں، جہاں شراب اندھا دھند پی جا رہی تھی، فیض صاحب نے ان نشے میں دھت لوگوں کی دستبرد سے مجھے بچائے رکھا، جو نشے کے عالم میں بضد تھے کہ اگر یہ شاعر پیتا نہیں ہے تو آج اسے زبردستی پلا کر چھوڑیں گے۔

دیوار چین کی سیر کرنے کے بعد جب ہم لوگ دیوار ہی کے قریب ایک ریستوران میں چائے پی رہے تھے تو ہمارے میزبانوں نے اصرار کیا کہ ہم انہیں پاکستانی قومی ترانہ سنائیں۔ ضمناً مجھے یاد آیا کہ میں سٹرکٹ جیل کیمبل پور میں نظر بند تھا جب سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بتایا کہ حکومت کی طرف سے میرے نام چھاگلہ صاحب

کے اس آرکسٹرا کا ریکارڈ آیا ہے جس کے مطابق قومی ترانہ لکھا جائے گا۔ ایک بے گناہ محبوس شاعر سے قومی ترانہ لکھنے کی فرمائش پر میں حیران رہ گیا تھا۔ میں نے صرف یہ دھمکی دینے پر اکتفا کی کہ میں یہاں جیل میں ایسا ترانہ لکھوں گا کہ حکومت یاد کرے گی اور بس!

بہرحال حفیظ صاحب کا لکھا ہوا ترانہ ہمارا قومی ترانہ قرار پایا تھا مگر یہ نیا نیا واقعہ تھا اس لیے یہ ترانہ ہم میں سے کسی کو یاد نہیں تھا۔ چینی دوستوں کی فرمائش پر ہم لوگ بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جب مولانا اختر علی خان نے گومگو کی یہ کیفیت اپنی حاضر دماغی سے ختم کر دی۔ انہوں نے ہم سب کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس کے بعد وہ ہاتھ باندھ کر اپنے اباجی مرحوم (مولانا ظفرعلی خان) کی یہ مشہور نعت گانے لگے اور ہم سب ان کے ساتھ گانے میں شامل ہو گئے۔

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

چینی دوست ادب سے اٹینشن کھڑے رہے اور جب ہم نے ''کچھ فرق نہیں ان چاروں میں'' تک پہنچ کر ''ترانہ'' ختم کیا تو انہوں نے ہمیں اپنا قومی ترانہ سنایا اور ہم نے بھی مؤدب کھڑے ہوکر یہ ترانہ سنا۔ بعد میں ہم سب واپس ہوٹل میں آئے تو ایک جگہ جمع ہوئے اور فیض صاحب نے ہم سب کی طرف سے مولانا اختر علی خان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی حاضر دماغی نے ہمیں شرمندہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

سنکیانگ کی طرف جاتے ہوئے ہمارا طیارہ طوفان میں گھر گیا اور ایک مقام ''حامی'' کے ایئرپورٹ پر اُتر گیا۔ نہایت تیز ہوا جب ایئرپورٹ کی تنصیبات میں سے گزرتی تھی تو باقاعدہ انسانی چیخوں کی سی خوفناک آوازیں آتی تھیں، یہ عجیب تجربہ تھا۔

رات ہم نے حامی میں گزاری۔ دوسرے روز حامی کے کمیون (چوپال) پر گئے تو وہاں ہمارا تعارف فتح خان اور نور خان اور لعل بیگ کے سے ناموں والے چینی ترکستانیوں سے ہوا۔ فضا صاف ہونے پر ہم اُرمچی پہنچے۔ سب سے پہلے ہمیں لڑکیوں کے ایک ڈانسنگ اسکول کی سیر کرائی گئی اور ایک دراز قد نوجوان ترکستانی لڑکی نے، جو

بچیوں کو رقص کی تربیت دیتی تھی، ہمارے وفد کو اپنے رقص سے محظوظ کیا۔ یہ لڑکی ایک دائرے میں یوں رقص کر رہی تھی جیسے یہاں سے وہاں تیرتی ہوئی جا رہی ہے۔ صورت کی بھی پیاری تھی۔ ہم لوگ اس تواضع سے متاثر ہوئے مگر فیض صاحب تو اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ ان کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہاں سے ہمیں ایک اور مقام کی سیر کو جانا تھا مگر فیض صاحب نے ہمارے ہمراہ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ آج کی حسین و جمیل تواضع سے اس حد تک متاثر تھے کہ تنہائی میں شعر کہنا چاہتے تھے۔ سنکیانگ پر ان کی نظم شاید اسی تاثر کا اظہار ہے......

ساقیا! رقص کوئی، رقص صبا کی صورت
مطربہ! کوئی غزل رنگ حنا کی صورت

ہمیں ارمچی کے شمال مغرب میں پھیلی ہوئی وسیع چراگاہیں دکھائی گئیں جہاں چرواہے گھوڑوں پر سوار سینکڑوں بھیڑوں کے گلوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہماری مدارات کے سلسلے میں وہاں ایک خوبصورت خیمہ نصب تھا۔ اندر غالیچوں اور گاؤ تکیوں کی فرشی نشستیں تھیں۔ دو نوجوان ترکستانی لڑکیاں ہماری دعوت کا سامان سامنے رکھے ہماری منتظر تھیں۔ وہاں کا رواج ہے کہ اپنے معزز مہمانوں کو دعوت کے موقعہ پر قبیلے کی دو کنواری لڑکیاں کھانا نکال کر دیتی ہیں۔ ہمیں بھی ان لڑکیوں نے کھانا دیا، ساتھ ہی دودھ کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں بھی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ان پیالیوں میں گھوڑی کا دودھ ہے جو صرف معزز مہمانوں کی نذر کیا جاتا ہے۔ کسی نے بھی گھوڑی کا دودھ پینے کا حوصلہ نہ کیا۔ میں فیض صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا کہ اگر یہ دودھ کسی نے بھی نہ پیا تو میزبان بُرا مان جائیں گے۔ فیض صاحب بولے۔ ''تو پھر آپ ہی ہمت کیجئے۔ شراب نہیں پیتے تو دودھ ہی پی لیجئے۔'' میں نے وہ دودھ پی لیا اور پھر اتنے شدید فلو میں مبتلا ہو گیا اور مجھے اتنا تیز بخار ہو گیا کہ واپس پیکنگ پہنچنے پر دو تین روز تک ڈاکٹر مسلسل میرے علاج میں مصروف رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میرے گھوڑی کا دودھ پینے کی خبر کراچی کے روزنامہ ''ڈان'' میں چھپ گئی اور اس کے

بعد ''فتوے'' جاری ہوتے رہے کہ گھوڑی کا دودھ حلال ہے یا حرام ہے۔

فیض صاحب میری مزاج پرسی کو آئے تو بولے۔ ''گھوڑی کا دودھ حرام ہی ہوگا مگر ہمیں یہ تشفی ہے کہ کوئی حرام چیز تو آپ کے معدے میں اُتری۔''

لاہور واپس آ کر ہم اپنے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے میں شرکت کے لیے ہندوستان سے اسرار الحق مجاز کے علاوہ حضرت فراق گورکھپوری بھی تشریف لائے تھے۔ مجاز صاحب دفتر ''امروز'' میں مجھ سے ملنے آئے تو یہ نہایت دلچسپ واقعہ ہے جس کی تفصیل آئندہ کسی موقعے پر بیان کروں گا۔ البتہ فراق صاحب کی تشریف آوری ہمارے لیے ایک دلآویز واقعہ تھی۔

میں ''امروز'' کے دفتر میں بیٹھا تھا جب فراق صاحب تشریف لے آئے۔ شیروانی پہن رکھی تھی جس کے سب بٹن کھلے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی تھی۔ میں برسوں سے ان کا عقیدت مند تھا۔ میرے ہاں ان کی آمد میرے لیے سرمایہ افتخار تھی۔ میں نے عرض کیا کہ کیا آپ چائے پسند فرمایئے گا کیونکہ اخباروں کے دفتروں میں واحد مدارات چائے ہی سے ہوتی ہے۔ فراق صاحب بولے۔ ''وہ تو ہم ضرور پئیں گے مگر پہلے فیض کو بلاؤ۔ اس سے بالمشافہ دو دو باتیں ہو جائیں۔''

دراصل اُن دنوں کسی مسئلے پر فراق صاحب اور علی سردار جعفری صاحب کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور دونوں اخباروں اور رسالوں میں ایک دوسرے سے اختلاف کا اظہار کر رہے تھے۔ فیض صاحب نے ایک بیان میں جعفری صاحب کا ساتھ دیا تھا اور فراق صاحب اسی سلسلے میں فیض صاحب سے ''دو دو باتیں'' کرنا چاہتے تھے۔

میں نے فیض صاحب کو فون پر اطلاع دی کہ فراق صاحب میرے ہاں تشریف فرما ہیں اور آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ فیض صاحب فوراً پہنچے۔ فراق صاحب سے معانقہ کیا۔ تب فراق صاحب نے کہا۔ ''ہاں تو فیض! تحریری اختلاف سے خواہ مخواہ گرد اُڑتی ہے۔ بالمشافہ گفتگو ہو جائے تو اس سے بدرجہا بہتر ہے۔ سو بتاؤ کہ علی

سردار جعفری کے نظریاتی بچپنے کا تمہارے پاس کیا جواز ہے؟" فیض صاحب نے ہاتھ جوڑ دیے اور بولے۔ "میں آپ کے ساتھ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا فراق صاحب! میں معذرت چاہتا ہوں۔"

فراق صاحب نے کہا۔ "مگر اخباروں میں تو تم نے دبنگ بیان دے دیا تھا میرے نقطۂ نظر کے خلاف۔"

فیض صاحب بولے۔ "میں معذرت خواہ ہوں فراق صاحب! بس کوتاہی ہو گئی، جانے دیجیے۔"

اب فراق صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "ہاں بھئی ندیم! اب منگاؤ چائے۔ فیض نے تو ہتھیار ڈال دیے ہیں۔"

جب فراق تشریف لے گئے تو میں نے فیض صاحب سے عرض کیا۔ "ایک دم اتنی معذرت کی کیا ضرورت تھی فیض صاحب۔ تھوڑا سا تبادلۂ خیالات ہو جاتا تو کیا بُرا تھا؟"

فیض صاحب بولے۔ "آپ نہیں جانتے ندیم صاحب! یہ شخص بلا ہے بلا۔ اس نے اُردو، انگریزی، فارسی اور ہندی ادب کو گھوٹ کے پی رکھا ہے۔ شکست ہماری ہی ہوتی، اس لیے ہم نے معذرت ہی میں عافیت سمجھی!"

لاہور میں پاکستان آرٹس کونسل اسلام آباد کے زیر انتظام ایک تقریب منعقد ہوئی۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا مگر میں مصروفیت کی وجہ سے شامل نہ ہو سکا۔ ایک شام کو ابن انشاء صاحب میرے پاس آئے اور بولے۔ "آج ابھی ابھی ایک اجلاس کے بعد فیض صاحب نے متعدد اہل قلم کو ایک کمرے میں جمع کر کے پاکستان کو ایفرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کا رکن بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ پاکستان تو ایفرو ایشیائی کانفرنس کا رکن ہے اور ندیم صاحب اس کے چیئرمین ہیں۔ اس کی ایک باقاعدہ ورکنگ کمیٹی ہے جس کے رکن پورے پاکستان سے نامزد کیے گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کانفرنس کا مرکز کولمبو ہے اور چین اس کا نگران ہے۔ آپ کی کانفرنس کا

نگران روس ہے اور اس کا مرکز قاہرہ ہے۔ چنانچہ کسی تصادم سے بچنے کے لیے آپ اس کانفرنس کی رکنیت اختیار کرنے سے پہلے ندیم صاحب سے بات کر لیجئے جو لاہور ہی میں موجود ہیں۔ یوں یہ اجتماع ختم ہو گیا۔ فیض صاحب نے آپ سے بات کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اُمید ہے کہ کل وہ آپ کے پاس آئیں گے۔''

اور فیض صاحب آئے۔ قاہرہ کے مرکز والی کانفرنس کی رکنیت کا ذکر چھیڑا تو میں نے عرض کیا کہ میں پہلے اپنی مجلس عاملہ کے ارکان سے پوچھ لوں کہ کولمبو کے مرکز والی کانفرنس پہلے سے موجود ہے۔ اگر وہ آپ کی تجویز مان گئے تو تب آپ قاہرہ مرکز کی رکنیت کی بات کیجئے گا۔ ذرا سا توقف فرما لیجئے۔''

فیضؔ صاحب میری بات سنتے رہے۔ پھر تشریف لے گئے اور اسی شام کو انہوں نے مجھے اطلاع دیے بغیر اہل قلم کو جمع کر کے صفدر میر کو ایفرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے روسی دھڑے کا کنوینر نامزد کیا اور پاکستانی ادیبوں کی طرف سے اس کانفرنس کی رُکنیت کی درخواست تیار کر لی۔ مجھے فیض صاحب کے اس خود سرانہ رویے کا نہایت افسوس ہوا۔ دراصل وہ قاہرہ مرکز کی کانفرنس کی پاکستانی رکنیت کے لیے اس لیے بے چین تھے کہ وہ قاہرہ کانفرنس کے اجلاسوں میں بحیثیت مبصر شریک ہوتے رہتے تھے اور وہاں پاکستان کی نمائندگی بھارت کے علی سردار جعفری صاحب کرتے تھے۔ فیض صاحب چاہتے تھے کہ انہیں ان اجلاسوں میں پاکستان کے آفیشل رُکن کی حیثیت سے شرکت کا حق ملے۔ سو انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور یہ نہ سوچا کہ اسی نام کی کولمبو مرکز والی کانفرنس سے اختلاف کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مگر میں نے ایسا نہیں ہونے دیا اور اپنی مجلس عاملہ کے جن ارکان نے فیضؔ صاحب کے رویے پر اعتراض کیا، انہیں سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا۔ دراصل قاہرہ مرکز زیادہ سرگرم تھا۔ اس کا ایک خوبصورت رسالہ ''لوٹس'' بھی تھا۔ اس کے ایڈیٹر یوسف السباعی کے قتل کے بعد فیض صاحب اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ نہایت اہتمام سے چھپتا تھا۔ پورے افریقہ اور ایشیا بشمول پاکستان کے ادیبوں شاعروں کے انگریزی تراجم اس میں شائع ہوتے تھے۔ فیضؔ صاحب کی ادارت

میں شائع ہونے والے ''لوٹس'' کو میری شاعری یا افسانہ نگاری کا نوٹس لینے کی کبھی توفیق نہ ہوئی اور دیگر اہل قلم کے تراجم باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔ میں سمجھ گیا کہ فیض صاحب میرے حوالے سے کسی نہ کسی ڈھکے چھپے تعصب میں ضرور مبتلا ہیں ورنہ ایسا گمنام تو نہیں تھا کہ ان کے ''الٹرا ماڈرن لوٹس'' کے صفحات میں بار نہ پا سکتا۔

جنرل ایوب کے دور آمریت میں سرکاری سطح پر پاکستانی کلچر کے تعین کے سلسلے میں فیض صاحب کی رہنمائی میں ملک کے اہل فن اور اہل دانش سے مکالمے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پشاور سے ڈھاکہ تک فیض صاحب اپنے بعض ساتھیوں کے ہمراہ اسی سلسلے میں دورے کرتے رہے۔ لاہور میں ان کا قیام سب سے زیادہ طویل تھا مگر وہ میرے پاس تشریف نہ لا سکے اور نہ مجھے اپنے ہاں بلا بھیجا۔ شاید انہوں نے مجھے کلچر کے موضوع پر گفتگو کے قابل ہی نہ سمجھا جبکہ پاکستانی کلچر سے متعلق میرے متعدد مضامین ''امروز'' میں شائع ہوتے رہے تھے اور فیض صاحب ان سے بے خبر نہیں تھے۔ بہر حال وہ شعر وفن سے متعلق اپنے پسندیدہ لوگوں کے انٹرویو ریکارڈ کرتے رہے۔ ان کی اس نوع کی بے اعتنائیوں کے سلسلے میں اب میری حیرت ختم ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ شعوری طور پر مجھے پس منظر میں رکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا جبکہ میں تو اُن کا غیر مشروط نیاز مند تھا۔

ایوب خان ہی کے دَور میں الطاف گوہر صاحب (سکریٹری اطلاعات حکومت پاکستان) نے پاکستان کا ''ھو اِزھو'' مرتب کرنے کا ایک منصوبہ فیض صاحب کے سپرد کیا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ مشہور صحافی ظہیر صدیقی اس منصوبے میں ان کے دست راست تھے۔ اس ''ھو اِزھو'' کی ایک جلد میں نے روزنامہ ''ڈان'' کراچی کے دفتر میں دیکھی تھی۔ اس میں میرا بھی ذکر تھا مگر مجھے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جنرل سکریٹری کے بجائے محض ایک ''لبرل رائٹر'' بتایا گیا تھا۔

پھر فیض صاحب کراچی میں عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل اور یتیم خانہ وغیرہ کے مہتمم مقرر ہوئے اور ان سے ملاقاتوں میں کمی آگئی۔ رحیم یار خان کے ایک

مشاعرے میں تشریف لائے تو مجھ سے لاہور کا حال پوچھا۔ میں نے عرض کیا۔ ''ویسے تو لاہور میں درجہ بدرجہ خیریت ہی ہے مگر شہر میں افواہ گرم ہے کہ شاہی مسجد کے پڑوس میں جو محلہ ہے، اس کے ایک گھر میں گلشن نام کی ایک رقاصہ رہتی ہے اور اس نے گھر کے دروازے پر آپ کے مصرعے کا بورڈ لگا رکھا ہے......

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

فیض صاحب کچھ جھینپے ضرور مگر پھر بے اختیار ہنس دیے۔ میں مشاعرے میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ میرے باری آئی تو میں نے اس دور کی ایک بالکل تازہ غزل پیش کی جس کا مطلع تھا......

عمر بھر اس نے اسی طرح لبھایا ہے مجھے
وہ جو اس دشت کے اس پار سے لایا ہے مجھے

آخری شعر تھا......

اے خدا! اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

میں غزل پڑھ کر واپس فیض صاحب کے پاس آ کر بیٹھا تو فیض صاحب بولے۔ ''آپ تو زبان کے سلسلے میں خاصے محتاط ہیں مگر آخر کیا بات ہے کہ آپ تذکیر و تانیث کی غلطیاں کرنے لگے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے فیض صاحب؟'' بولے۔ ''آپ نے غزل کے آخری شعر میں کہا ہے...... ''اے خدا اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے!'' آپ نے فردوس کو مذکر قرار دیا ہے جبکہ آپ پاکستانی فلموں کی جس مشہور ہیروئن فردوس پر اپنا حق جتا رہے ہیں وہ خاتون ہے، سو مونث ہے!''

ہم اس بات پر دیر تک ہنستے رہے۔ تب میں نے ہنستے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ''فیض صاحب، آپ نے تو گلشن والے لطیفے کا فوراً ہی انتقام لے ڈالا ہے۔''

فیض صاحب ایک دو دن کے لیے لاہور آئے تو عزیزی ظہیر بابر اور بہن خدیجہ مستور نے انہیں اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ دوسرا مہمان صرف میں تھا۔ ہم

چاروں نے مزے لے لے کر اور شگفتہ باتیں کر کے خوب لطف اُٹھایا۔ خدیجہ بلا کی فقرے باز تھیں۔ وہ فقرے پر فقرہ مار رہی تھیں اور ہم ہنس رہے تھے۔ کھانے کے بعد پھل لائے گئے۔ نہایت خوبصورت انگوروں کے طشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے فیض صاحب سے کہا۔ ''فیض صاحب! یہ انگور بہت عمدہ ہیں۔ ضرور چکھئے۔'' وہ بولے۔ ''ہمیں انگور اس کچی صورت میں پسند نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''معاف کیجئے، مجھے معلوم تھا کہ آپ کو تو انگوروں کی صرف متعفن صورت پسند ہے۔'' اس پر سب کھل کے ہنسے۔

فیض صاحب نے قیام کراچی کے دوران ایک ادبی انجمن بھی قائم کی، جس کا نام بھول رہا ہوں۔ اس نام میں ''عوامی'' کا لفظ بھی شاید شامل تھا۔ بہرحال جب اس کا منشور شائع ہوا تو میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں پاکستان سے متعلق قریب قریب وہی نقطہ نظر پیش کیا گیا تھا جو اس دور کے روسی دانشور تواتر سے پیش کر رہے تھے۔ وہ نقطہ نظر یہ تھا کہ بھارت صرف ایک قوم کا ملک ہے مگر پاکستان میں پانچ قومیں بستی ہیں۔ ظاہر ہے اس نقطہ نظر میں دانش کا کوئی دخل نہ تھا بلکہ یہ سراسر سیاسی نظریہ تھا اور روس اور بھارت کے سیاسی اور دفاعی معاہدوں کا آئینہ دار تھا۔ فیض صاحب کی اس انجمن کے منشور میں بھی پاکستان کو پانچ قوموں پر مشتمل ملک قرار دیا گیا تھا۔ میں نے ''امروز'' ہی میں ایک مضمون کے ذریعہ وضاحت کی کہ پاکستان میں صرف ایک قوم آباد ہے جسے پاکستانی قوم کہتے ہیں۔ آپ نے جن ''قوموں'' کا ذکر فرمایا ہے، وہ دراصل ''قومیتیں'' ہیں۔ قوم اور قومیت میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اسے فیض صاحب سے بہتر کون جانتا ہوگا، مگر اس منشور میں یہ کیسی بات کہی گئی ہے جو پاکستان کے انتشار کی نشاندہی کر رہی ہے۔ متعدد دیگر اصحاب نے بھی میرا ساتھ دیا اور یہ انجمن ابتدائی سرگرمی کے بعد ختم ہوگئی۔

حیدرآباد میں ایک سیمینار تھا۔ مجھے لاہور سے بلایا گیا اور فیض صاحب کراچی سے تشریف لائے۔ مجھے سیمینار کے منتظمین نے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔ فیض صاحب تالپوری حضرات کے مہمان تھے۔ سیمینار ختم ہوا تو رسول بخش تالپور صاحب میرے پاس

آئے اور فرمایا۔ ''آپ حیدرآباد آئے اور کہیں اور ٹھہر گئے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اگر ہمارے عزیزی مہمان کہیں اور ٹھہر جائیں تو ہم انہیں اُٹھوا لیتے ہیں۔ کیا ارادے ہیں آپ کے؟'' میں نے عرض کیا کہ افراد کو اُٹھوا لینے میں تو یقیناً آپ کو یدطولیٰ حاصل ہے مگر میں تو سیمینار کے منتظمین کے بس میں تھا۔ کیا کرتا۔ فیض صاحب بھی تالپور صاحب کی طرح اصرار کرنے لگے کہ ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے عرض کیا کہ کل مجھے ایک ادبی محفل کی صدارت کرنی ہے جس میں حیدرآباد کے تین چار نوجوان افسانہ نگار اپنے افسانے پڑھیں گے اور محترم ڈاکٹر احسن فاروقی بضد ہیں کہ میں اس میں ضرور شرکت کروں۔ میرے پاس ایک یہی سوٹ ہے جو میں نے پہن رکھا ہے۔ آپ کے ساتھ جاؤں تو سونے کے لیے کپڑے کہاں سے لوں گا اور اس سوٹ کو کل کے لیے کیسے بچاؤں گا۔ رسول بخش صاحب بولے۔ ''معلوم ہوتا ہے آپ اپنے اُٹھوائے جانے پر بضد ہیں۔'' عرض کیا۔ ''ویسے تو اس سلسلے میں آپ کی بڑی شہرت ہے مگر......'' مگر فیض صاحب نے مجھے ہاتھ سے کھینچ کر کہا۔ ''نہیں آپ چلیں گے ہمارے ساتھ۔''

قہر درویش برجان درویش میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں رسول بخش صاحب کی پجیرو ایک بہت بلند دروازے کے سامنے رُکی۔ ہم تینوں ایک ہال میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی دو درجن وڈیرے حضرات وہسکی پی رہے تھے اور ہال میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ فیض صاحب کو سب پہچانتے تھے۔ ''فیض آگئے...... فیض آگئے'' کا شور اُٹھا اور وہسکی کی ایک بوتل کے ہمراہ تین گلاس فوراً ہمارے سامنے سج گئے۔ پلانے والے صاحب سے فیض صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ نہیں پیتے۔'' وہ صاحب بولے۔ ''نہیں پیتے تو آج پئیں گے۔ کیسے نہیں پئیں گے۔ ہم انہیں گرا کر پوری بوتل ان کے منہ میں خالی کر دیں گے۔'' نوجوان کے تیور دیکھ کر فیض صاحب اور رسول بخش صاحب دونوں نے وہاں سے کسی بہانے اُٹھ جانے کا فیصلہ کیا اور وہ وہاں سے نکل بھی آئے اور مجھے اس سلوک سے بچا لیا جو شاید میرے ساتھ واقع ہونے والا تھا۔

ہم تالپوریوں کے بنگلے پر پہنچے۔ سمندر کی طرف سے ٹھنڈی لطیف ہوا آ رہی تھی۔ تالپوری بنگلے کے باہر لان پر صوفے سجے ہوئے تھے۔ وسط میں دو چار میزیں سلیقے سے رکھی تھیں۔ وسطی بڑی میز پر شراب کی سرخ، زرد اور سبز رنگ کی عمر خیامی بوتلیں قطار میں کھڑی تھیں۔ رسول بخش تالپور صاحب کے بڑے بھائی میر علی احمد تالپور صاحب ہمارے انتظار میں تھے۔ فیض صاحب کے علاوہ وہ مجھ سے بھی بڑے تپاک سے ملے اور وہسکی پیتے ہوئے میرے اشعار سنانے لگے۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ تالپور صاحب نے میرے جتنے شعر سنائے ان میں سے آدھے خود مجھے بھی یاد نہیں تھے۔ پھر انہوں نے فیض کے، فراق کے، غالب کے اور میر کے، حافظ اور سعدی کے، نظیری اور بیدل کے اتنے بہت سے شعر اتنے عمدہ لہجے میں سنائے کہ لطف آ گیا۔ ساتھ ساتھ علی احمد صاحب اور فیض صاحب وہسکی پیتے رہے۔ میں نے رسول بخش صاحب سے سرگوشی میں کہا۔ ''میں تو محروم ہوں مگر کیا آپ یہ شوق نہیں کرتے؟'' بولے۔ ''بڑے بھائی کے سامنے میں وہسکی پینے کی بے ادبی نہیں کر سکتا۔ ویسے پیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ کم سے کم آج تو اس معاملے میں آپ میرے ساتھی نکلے۔''

کافی دیر کے بعد علی احمد صاحب اُٹھے اور بولے۔ ''معذرت! میں ابھی کچھ دیر میں حاضر ہوتا ہوں۔'' اور وہ تشریف لے گئے۔

رسول بخش صاحب نے بتایا کہ جب بھائی جان پر سرور کا عالم طاری ہونے لگتا ہے تو وہ محفل سے اُٹھ جاتے ہیں اور جا کر سو رہتے ہیں۔ وہ اب یہاں واپس نہیں آئیں گے۔''

میں نے عرض کیا۔ ''رسول بخش صاحب! آپ مجھے وہاں سے اُٹھوا تو لائے مگر اب تک نہ آپ نے خود کچھ کھایا ہے نہ میرے کھانے کا کچھ بندوبست کیا ہے اور اب تو شاید فیض صاحب کو بھی کھانے کی ضرورت ہوگی۔''

تالپور صاحب گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''یہ خیال تک نہ آیا کہ کھانا بھی تو کھانا ہے۔''

فیض صاحب بولے۔ ''ہم نہیں کھائیں گے۔''

رسول بخش صاحب نے کہا۔ ''مگر ندیم صاحب کا کیا ہوگا؟ ندیم صاحب، آپ میرے ساتھ آیئے۔ کچن میں جا کر دیکھتے ہیں کچھ نہ کچھ تو رکھا ہوگا۔''

فیض صاحب مسلسل وہسکی پینے میں مصروف تھے۔ ہم دونوں بنگلے کے اندر داخل ہوئے۔ ایک طرف سے ڈھولک اور نسوانی آوازوں میں سندھی گانے سنائی دیے۔ پردے کے پیچھے سے رسول بخش صاحب نے مجھے یہ منظر دکھایا جس میں بہت سی عورتیں سندھ کا بوقلموں لباس پہنے دائرے میں ناچ رہی تھیں۔ کوئی تقریب ہوگی۔ میں نے تفصیل نہ پوچھی کیونکہ میں تو بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ وسیع و عریض کچن میں رسول بخش صاحب یہاں سے وہاں تک دیگچوں اور دوسرے برتنوں میں جھانکتے رہے۔ آخر انہیں پکوڑوں کی شکل کی کوئی چیز ملی۔ وہ اُٹھا لائے مگر وہ چیزیں ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور کھانے لائق نہیں تھیں۔ میں نے کہا۔ ''رسول بخش صاحب چلیے، کھانے پر مٹی ڈالیے۔ اب باہر چلیں اور ذرا سا سو لیں، کیونکہ رات کے دو بج رہے ہیں۔ آپ یوں کریں کہ میرا یہ سوٹ بچانے کے لیے کوئی شلوار وغیرہ لا دیں۔''

میں باہر فیض صاحب کے پاس آ گیا۔ کچھ دیر کے بعد رسول بخش صاحب ایک بڑی سی سندھی شلوار لے آئے اور میرے حوالے کر دی۔ میں نے یوں ہی تجربتاً اسے کھولا تو وہ کھلتی چلی گئی۔ ایک **پائنچے** میں ٹانگ ڈالی تو وہاں آٹھ دس ٹانگوں کی گنجائش تھی۔ میں نے کہا۔ فیض صاحب، آپ اور میں اس شلوار کے ایک ہی **پائنچے** میں سما جائیں گے۔ تشریف لایئے کہ شلوار کا یہ ایک پائنچہ اوڑھ کر تھوڑا سو لیں۔''

فیض صاحب ہنستے رہے اور رسول بخش صاحب کہتے رہے۔ ''کیا کیا جائے۔ ہم سندھیوں کی شلوار تو ایسی ہی مردانہ ہوتی ہے۔''

میں نے سوٹ کے ساتھ ہی سو جانے کا فیصلہ کیا اور رسول بخش صاحب نے سونے کے لیے جانے کی اجازت مانگی۔ البتہ ہمیں خبردار کیا کہ...... ''کتے کھول دیے گئے ہیں۔ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو پلنگ پر سے ہی طلب کیجیے گا۔

خدمتگار آپ کے آس پاس موجود ہوں گے اور فیض صاحب صبح ٹھیک پانچ بجے کار تیار ہوگی۔ آپ کو واپس کراچی جانا ہے اور ندیم صاحب آپ کو اپنا سامان سمیٹنے اپنے ہوٹل جانا ہے۔ سوشب بخیر۔"

وہ تو چلے گئے مگر فیض صاحب نے وہسکی پینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر میں نے عرض کیا۔ "فیض صاحب! اب بس بھی کیجئے۔ آخر پینے کی کوئی تو حد بھی ہوتی ہوگی۔"

ایک مزید پیگ پینے کے بعد فیض صاحب پلنگ پر آگئے اور بولے۔ "چلئے، آپ کہتے ہیں تو ہم ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔"

پھر وہ سرور کے عالم میں شعر و شاعری اور مصوری و موسیقی کے بارے میں خوبصورت باتیں کرتے رہے۔ ایک بار رُک کر مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں سوتا بن گیا کہ شاید وہ بھی مجھے خاموش پا کر ذرا سا سو لیں۔ میں نہیں بولتا تو وہ چپکے سے اُٹھے اور میز پر سے ایک بوتل اُٹھا کر ایک پیگ تیار کیا اور پینے لگے۔

میں نے کہا۔ "فیض صاحب!"

چونک کر بولے۔ "ارے...... تو آپ جاگ رہے ہیں۔"

میں نے عرض کیا......

چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میرؔ
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

فرمایا...... "اچھا، آپ کہتے ہیں تو ختم۔" آخری پیگ پیا اور آکر پلنگ پر لیٹ گئے مگر چار بج چکے تھے۔ نیند کیسے آتی۔ ساڑھے چار بجے ڈرائیور نے چلنے کو کہا۔ ہم دونوں کار میں جا بیٹھے اور میں حیران ہوتا رہا کہ فیض صاحب کا ہاضمہ کس بلا کا ہے کہ رات گیارہ بجے سے صبح چار بجے تک مسلسل پیتے رہے ہیں مگر نہ زبان لڑکھڑائی نہ چلنے میں توازن بگڑا۔ میں نے کار میں اس بات پر انہیں داد بھی دی تو وہ بولے۔ "شکریہ، مگر ہم نے زیادہ تو نہیں پی!"

جو شخص مسلسل پانچ گھنٹے شراب پیتا رہا ہو، وہ اگر یہ کہے کہ میں نے زیادہ تو نہیں

پی، تو وہ یقیناً نشے میں ہے۔ میں نے اس روز پہلی بار فیض صاحب کو ''نشے'' میں دیکھا!

فیض صاحب کو سوویٹ روس کی حکومت نے ''لینن امن انعام'' دیا۔ اس کے ذکر سے پہلے ایک حالیہ واقعہ یاد آرہا ہے کہ انگریزی روزنامہ ''فیشن'' لاہور کی ۲۷ر جولائی ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں، فیض صاحب پر پروفیسر جیلانی کامران کا ایک کالم شائع ہوا جس میں جدید عالمی حقائق پر فیض صاحب کی گہری نظر کے حوالے سے انہوں نے لکھا کہ میں نے ایک ملاقات میں یہ سوچ کر فیض صاحب سے ایک تیز دھار سوال پوچھا کہ وہ ترقی پسندانہ انداز میں گھڑا گھڑایا جواب دیں گے۔ سوال یہ تھا کہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس کے بعد آپ کی نظر میں جدید ترین تاریخ کا اہم واقعہ کیا ہے؟ فیض صاحب نے کچھ سوچ کر جواب دیا کہ ۱۷۸۹ء کے بعد انقلاب ایران عظیم ترین واقعہ ہے! یہ جواب سن کر پروفیسر جیلانی کامران اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہوں نے فیض صاحب کو اسلامی تاریخ کے عظیم دانشوروں میں شامل کر دیا اور یہ تک کہہ دیا کہ مسلم دانشور کی حیثیت سے فیض صاحب کا کوئی مثیل ہی نہیں...... اور فیض صاحب کے ہم خیالوں اور عقیدت مندوں نے سوچا کہ فیض صاحب کو انقلاب فرانس کے بعد دو صدیوں تک یعنی آج تک کوئی دوسرا عظیم واقعہ یا عظیم انقلاب کیوں یاد نہ آیا جبکہ انقلاب روس اور انقلاب چین تو بیسویں صدی کے عظیم ترین انقلاب ہیں۔ کیا فیض صاحب ان انقلابات کو کسی اندرونی خوف کی وجہ سے گول کر گئے؟ آخر ان کے علاوہ مصر اور لیبیا میں بھی تو ایران کی طرح بادشاہتیں ختم کی گئیں اور ویتنام کے انقلاب نے تو امریکہ کی سی سپر طاقت کو مکمل اور ہمہ جہتی شکست کا مزہ چکھا دیا تھا۔ ایران کا انقلاب یقیناً اہم ہے مگر وہ اُنیسویں اور بیسویں صدی کے دوسرے انقلابات کی صف میں شامل ہے۔ فیض صاحب نے اسے نہ جانے کس سبب سے انقلاب فرانس کے بعد عظیم ترین انقلاب قرار دے ڈالا تھا۔ اس کا یقیناً کوئی باطنی سبب ہوگا اور پھر یہ پروفیسر جیلانی کامران بھی اگر فیض صاحب کا یہ جواب سن کر جھوم گئے تو ہمارے جدید ادب کی اس پڑھی لکھی شخصیت کا یوں جھوم جانا بھی ایک حیرت آمیز استفہامیہ تخلیق کرتا ہے۔

فیض صاحب جب ماسکو میں لینن امن پرائز لینے کے بعد لندن سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے تو انہوں نے بالکل ویسا ہی اوورکوٹ پہن رکھا تھا جیسا لاہور میں ہم چند ترقی پسند مصنفین نے لنڈے بازار سے خریدا تھا۔ ایک محفل میں جب فیض صاحب وہی کوٹ پہنے تشریف لائے تو میرے پاس آ بیٹھے۔ میں نے ان کے کوٹ کی آستین کو تھپتھپا کر پوچھا۔ ''یہ دانہ کتنے میں آیا ہے فیض صاحب؟''

''دانہ؟'' فیض صاحب حیران رہ گئے۔

میں نے کہا۔ ''لنڈے بازار والے سب سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کو ''دانہ'' ہی کہتے ہیں۔''

فیض صاحب بولے۔ ''لنڈا بازار والے کہتے ہوں گے۔ ہم نے تو یہ دانہ لنڈن سے خریدا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی پوچھے تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ کوٹ لنڈن سے آیا ہے جبکہ لنڈن کی بجائے لنڈے بازار سے آیا ہوتا ہے۔''

فیض صاحب ''لاحول ولا'' کہہ کر رہ گئے اور ہم دو تین مصنفین، جنہوں نے لنڈے کے ایسے ہی کوٹ پہن رکھے تھے، دل کھول کر ہنسے۔

کراچی سے صہبا لکھنوی نے اپنے رسالے ''افکار'' کا ندیم نمبر نکالا تو میرے بارے میں علم وادب کی بڑی بڑی شخصیات کی آراء بھی شائع کیں۔ جوش ملیح آبادی صاحب کا ارشاد تھا...... ''اس دور کے جس قدر بھی شاعر ہیں، احمد ندیم قاسمی کو ان سب سے بمراحل بہتر سمجھتا ہوں۔'' حفیظ جالندھری صاحب نے کہا...... ''مجھے تو اس حلقے میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے کسی جہت سے بھی احمد ندیم قاسمی کا مماثل کہہ سکوں۔'' اور فیض صاحب نے صرف یہ کہنا مناسب سمجھا...... ''ادب، صحافت، اور شاعری میں ان کا مقام مسلم ہے''...... یعنی پہلے ادب، پھر صحافت اور اس کے بعد میری بے چاری شاعری! یہیں سے مجھے شک گزرتا ہے کہ فیض صاحب نے میری شاعری کے حوالے سے اپنے اندر کوئی نامعلوم تعصب پال رکھا تھا۔

بھٹو مرحوم کے دورِ حکومت میں وہ اس حکومت کے مشیر مقرر ہوئے اور گلبرگ میں ان کا دفتر قائم ہوا۔ بہرحال دس بجے قبل دو پہر کا وقت تھا جب میں اس دفتر میں امجد اسلام امجد کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تب بھی وہ پی رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ ''امجد بہت اچھا شاعر ہے اور اس کا مستقبل ماشاء اللہ تابناک ہے، اس لیے اگر آپ اس کے مجموعہ کلام کا مختصر سا فلیپ لکھ دیں تو میں ذاتی طور پر ممنون ہوں گا۔'' مگر یہ عجیب المیہ ہے کہ بھٹو کی المناک موت پر انہوں نے ایک بھی شعر نہ لکھا جبکہ مختلف احباب پر ان کی نوحہ نما غزلیں سب کے سامنے ہیں۔

فیض صاحب وہسکی کا ایک گھونٹ لے کر مسکرائے اور بولے۔ ''ہم نے امجد کو پڑھا ہے۔ اچھی شاعری کر رہے ہیں۔ لکھ دیں گے کچھ۔''

اُن دنوں انہیں جب بھی دیکھا، منیر نیازی ان کے ہم کاب ہوتا تھا جبکہ سوائے شراب نوشی کے دونوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی۔

بعد میں ایک دن میں نے پوچھا۔ ''آپ تو چین سموکر تھے فیض صاحب! آپ کو میں نے بہت دیر سے سگریٹ پیتے نہیں دیکھا۔''

خوش دلی سے فرمایا۔ ''ہم بیک وقت سکھ اور مسلمان ہو چکے ہیں۔ تمباکو نوشی ترک کرنا پڑی سو سکھ ہو گئے۔ شراب نوشی ترک کرنا پڑی سو مسلمان ہو گئے۔''

میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء کے سلسلے میں پاکستان بھر کے سینئر ترقی پسند دوستوں کو خط لکھے اور ان کی رائے پوچھی۔ فیض صاحب سے بھی پوچھا، مگر انہوں نے میرے خط کا جواب دینے کی بجائے فون پر کہا کہ ہم چند روز کے اندر آپ کے پاس آ کر بالمشافہ چند تجاویز پیش کر دیں گے۔ مگر افسوس کہ وہ تشریف نہ لائے۔

میں نے اسلام آباد میں جنرل کے۔ ایم۔ عارف صاحب کے شعری مجموعے کی تقریب کی صدارت کی۔ ان کے بعض اشعار عمدہ تھے اور بعض میں خامیاں تھیں۔ میں نے اپنے خطبہ صدارت میں سرِعام کہہ دیا کہ ''جنرل صاحب! اوّل تو آپ نے بعض شعروں میں ایسی انقلابی باتیں کہی ہیں کہ اگر میں کہتا تو آج یہاں موجود نہ ہوتا

(میرا مطلب تھا کہ میں جیل میں ہوتا)۔ پھر آپ کی شاعری کے اساتذہ سید ضمیر جعفری صاحب اور جناب وقار انبالوی صاحب جو میرے سامنے اس محفل میں موجود ہیں، شاید آپ کے عہدے کے ڈر سے آپ کے بعض اشعار کی خامیوں کی نشاندہی نہ کر سکے۔'' (محترم عارف صاحب اتنے فراخ دل نکلے کہ بعد میں مجھ سے ان غلطیوں کی تفصیل پوچھی تا کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ ان کی تصحیح کر سکیں)۔ فیض صاحب نے میری اس محفل کی صدارت کو سراسر غلط قرار دیا کہ آخر عارف صاحب مارشل لاء کے ایک اہم کردار تھے۔ میں خاموش رہا مگر یہ عرض کرنے کو بہت جی چاہا کہ عارف صاحب تو بہرحال شاعر ہیں مگر آپ نے کس خوشی میں اپنی تاریخ کے گھناؤنے کردار...... انگریز...... کی فوجی ملازمت غلامی ہی کے دنوں میں قبول فرمالی تھی! عجیب بات ہے کہ چند ہی روز بعد اخباروں میں خبر چھپی کہ فیض احمد فیض صاحب نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کا وقت مانگا اور وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک جنرل صاحب سے گفتگو فرماتے رہے اور ظاہر ہے کہ یہ گفتگو صرف موسمی حالات کے بارے میں تو نہیں ہوئی ہوگی!

پھر اسلام آباد ہی میں انہوں نے پولیس کے ایک ریٹائرڈ آئی۔ جی۔ کے کالموں کی کتاب کی افتتاحی تقریب کی صدارت بھی فرمائی اور میں حیران ہوتا رہا کہ کے۔ ایم۔ عارف صاحب کی تقریب کی صدارت کے سلسلے میں وہ مجھ پر تو معترض تھے مگر آمر مطلق جنرل ضیاء الحق سے اپنی ہی درخواست پر ان کی ملاقات اور پولیس کے ایک کچھ زیادہ ہی اعلیٰ افسر کی کتاب کی افتتاحی تقریب کی صدارت کو کس کھاتے میں ڈالا جائے! سوچا ان سے اس تضاد کا پس منظر پوچھوں گا ضرور مگر وہ اس کے فوراً بعد علیل ہو گئے اور ۲۰ رنومبر کو ان کا انتقال ہو گیا...... ۲۰ رنومبر، جو میری تاریخ پیدائش ہے، ان کی تاریخ وفات قرار پائی۔ فیض کے جنازے میں شرکت اور ان کی تدفین اور ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں فورٹریس اسٹیڈیم کے ایک ریسٹورینٹ میں آیا جہاں میں نے اپنی سالگرہ کے سلسلے میں چند عزیزوں اور دوستوں کو کئی دن پہلے سے بلا

رکھا تھا، مگر یہ حادثہ ہو گیا۔ چنانچہ میں نے انہیں ایک پیالی چائے پلانے پر اکتفا کی۔

لاہور میں فیض صاحب کے دو ریفرنس منعقد ہوئے۔ میں نے دونوں میں فیض صاحب پر تحسینی مضامین پڑھے اور پھر جب فیض صاحب کی یاد میں اوپن ایئر تھیئٹر میں ایک بڑا پاک و ہند مشاعرہ منعقد ہوا تو میری باری آنے پر مجھے ہجوم میں بیٹھے ایک گروپ نے ''ہوٹ'' کر دیا کہ میں ضیاء الحق کا ہوا خواہ تھا؟!!! یعنی اس ضیاء الحق کا ہوا خواہ جس کے منعقدہ ریفرنڈم کو میں نے اس کے زمانہ اقتدار میں بھی ''ہیرالڈ'' کے ایک انٹرویو میں تاریخ کا سب سے بڑا فراڈ قرار دیا تھا اور جس سے ملاقات کی میں نے کبھی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔

مجھے فیض صاحب کبھی نہیں بھولیں گے اور فیض صاحب سے بے لوث عقیدت مندی کا یہ ''انعام'' بھی مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔

فیض صاحب کی شاعری کے حوالے سے اس مرحلے پر میں مختصراً یہ عرض کروں گا کہ صابر دت نے بمبئی سے اپنے رسالے ''فن اور شخصیت'' کا فیض احمد فیض نمبر شائع کیا تو مجھے بھی پیغام بھجوانے کو کہا۔ میں نے جہاں فیض کی میٹھی رسیلی شاعری کا ذکر کیا، وہاں یہ بھی لکھا کہ فیض فکر و حکمت کی گہرائیوں میں جانے سے شعوری طور پر گریز کرتے تھے، ورنہ جس طرح انہوں نے اپنی شاعری میں انقلاب کے موضوع کو مترنم بنا دیا، اسی طرح وہ فکری شاعری کو بھی فنی جمالیات کا ایک شعبہ بنا سکتے تھے۔ ان کے ہاں اگر فکری گہرائی نہیں ہے تو نقاد حضرات ہی اس کے اسباب پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ ایک نہایت پڑھے لکھے اور اُردو، پنجابی کے علاوہ انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں پر حاوی شخصیت نے فکری شاعری کو عملاً کیوں روکے رکھا، جبکہ غالب اور پھر اقبال اور دور حاضر میں راشد کی شاعری نے فکر کو شعر میں ڈھالنے کا کام آسان بنا دیا تھا۔

○○

طاہر مسعود

انٹرویو
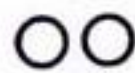
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

فیض احمد فیضؔ عہد حاضر میں اُردو شاعری کا سب سے بڑا نام تھا۔ ان کے کلام کی حسن کاری، شیرینی اور نغمگی کے دوست دشمن پہلے بھی معترف تھے اب بھی ہیں۔ ان کی شاعری نے اروزبان کو ایک نیا اسلوب اور سیاسی پس منظر عطا کیا۔ ان کی غزلیں اور نظمیں ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں ہم اپنے عہد کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں اور بقول کسے انہوں نے اُردو غزل کو احتجاج کی زبان دی۔ ان کے ہاں سادگی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا افسردہ اور کھویا کھویا سا لہجہ ملتا ہے جو روح کی تنہائی کے شدید احساس سے پیدا ہوا ہے۔ ان کی شاعری رومانویت اور حقیقت پسندی کا حسین امتزاج ہے۔

اقبال کے بعد اُن کے جتنی عزت اور مقبولیت کسی دوسرے شاعر یا ادیب کو نصیب نہیں ہوئی، کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ فیض کو لوگوں نے پڑھا کم ہے اور اُن سے محبت زیادہ کی ہے۔

فیض نے بیک وقت تہلکہ خیز، آرام دہ اور مرنجاں مرنج زندگی گزاری۔ موت کے وقت ان کے دل میں کوئی حسرت، کوئی تمنا باقی نہیں رہی ہوگی۔ انہوں نے دنیا کو خوب اچھی طرح سے دیکھ لیا تھا، سمجھ لیا تھا، ہر قسم کی راحت اور خوشی سے لطف اندوز ہو چکے تھے۔ انتقال سے پہلے وہ اپنے آبائی گاؤں گئے جہاں ضعیف العمر چچی نے ان کے ماتھے پر بوسہ دیا، جس پر ۷۳ برس کے فیض نے مسکرا کر کہا...... ''خدا کا شکر ہے دنیا میں

ابھی کوئی تو ایسا ہے جو مجھ پر اس طریقے سے مہربان ہوسکتا ہے۔''

فیض احمد فیض شاعر تو بڑے تھے ہی، انسان بھی بڑے تھے۔ انتہائی وضعدار، خوش خلق، انسان دوست، کم سخن، محبت آمیز، اپنے انسانی اوصاف کی بنا پر وہ دوستوں کے علاوہ نظریاتی مخالفین میں بھی پسند کیے جاتے تھے۔ انہوں نے مدرسی کی، صحافی رہے، نظم و نثر میں کمال حاصل کیا، جیل کاٹی، لینن امن انعام ملا، دور دراز کے سفر کیے، ملک کی شناخت بنے۔ ان کی شخصیت کو روس کی طرف ان کے غیر معمولی جھکاؤ نے متنازعہ بنایا۔ انہوں نے کبھی روس کے سامراجی کردار پر نکتہ چینی نہیں کی۔ تاہم کہتے ہیں کہ وہ پاک روس تعلقات میں سفارت کی خاموش کھڑکی تھے۔ یہ کھڑکی ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کی ایک دوپہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔

فیض احمد فیض کی شاعری ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ شروع ہوئی۔ ہندوستان میں سیاسی تحریکات عروج پر تھیں۔ ملک سیاسی اور اقتصادی بحران سے گزر رہا تھا۔ فیض شرمیلے اور الگ تھلگ رہنے والے نوجوان تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری کا مزاج سراسر رومانی ہونے کے باوجود ان کا اسلوب دوسروں سے منفرد و مختلف تھا۔ ترقی پسند تحریک میں شمولیت سے ان کی شاعری کو ایک نیا رخ ملا۔ پہلے ان کا غم ذاتی تھا، پھر اجتماعی ہو گیا۔ پہلے وہ صرف تماشائی تھے، بعد میں اس تماشے کا حصہ بن گئے جو برصغیر کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد پنڈی سازش کیس کی بنا پر اسیر زنداں ہوئے تو تجربات میں مزید تنوع پیدا ہوا اور ان کی شاعری زنجیر کی چھنک اور چمک سے آشنا ہوئی۔ قید و بند کی صعوبتوں نے ان کی شخصیت کو اور نکھارا اور انہیں سیاسی سطح پر وہ اہمیت دلائی جو کسی شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔

مارچ ۱۹۸۴ء کے آخری ہفتے میں فیض احمد فیض کراچی آئے تو میں ان کے دیرینہ نیازمند مرزا ظفرالحسن کے ہمراہ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں بیگم مجید ملک کے بنگلے پر حاضر ہوا، جہاں فیض صاحب عموماً قیام فرماتے تھے۔ وہ اس وقت چند ملاقاتیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ہم بیگم ایلس فیض اور بیگم مجید ملک کے پاس ہی براجمان ہو

گئے۔ مرزا صاحب اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں ان بیگمات سے الجھ لیے۔ ایلس اب صاف اور رواں اُردو بول رہی تھیں۔ وہ فیض صاحب کی صرف بیوی ہی نہیں، آئیڈیل دوست بھی تھیں۔ انہوں نے بُرے سے بُرے حالات میں بھی جس استقامت اور بے جگری سے اپنے شوہر کا ساتھ دیا، اس کی وجہ سے ان کے احترام میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

فیض صاحب ملاقاتیوں کو رخصت کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلے، وہ آسمانی رنگ کے سفاری سوٹ میں نہایت باوقار دکھائی دے رہے تھے۔ دمکتا سرخ چہرہ، روشن آنکھیں اور بظاہر چاق وچوبند ہونے کے باوجود وقت نے انہیں ایک جہاندیدہ بوڑھے میں تبدیل کر دیا تھا۔ البتہ ان کی شخصیت میں جس بلا کی محبوبیت کا میں ذکر سنتا آ رہا تھا، اس میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

مرزا ظفرالحسن نے فیض صاحب سے میرا تعارف کرایا، ہم نے مصافحہ کیا اور انٹرویو کے لیے کمرے میں چلے گئے۔ گفتگو شروع ہونے سے قبل انہوں نے ایک ادھورا خط مکمل کیا۔ یہ خط انہوں نے پنجاب کے کسی گاؤں کے کسی گمنام اور بے حیثیت شخص کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ میرے استفسار پر انہوں نے وضاحت کی کہ وہ ہر خط کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ اخلاقی ذمہ داری ہے۔ بڑے آدمی اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ میں نے انٹرویو کے بعد ان سے اور مرزا ظفرالحسن صاحب سے اجازت طلب کی۔

فیض صاحب اگلے روز برطانیہ پرواز کر گئے۔ چند ماہ بعد جب وہ واپس لوٹے تو مرزا ظفرالحسن کا انتقال ہو چکا تھا اور اس وقت جبکہ میں ان کا تعارف لکھنے بیٹھا ہوں، فیض صاحب موت کے سیاہ گھوڑے پہ سوار ابدیت کی طرف چلے گئے ہیں۔ کیا عجب وہ اپنے مرزا ظفرالحسن کے تعاقب میں گئے ہوں، جو اُن پر ہزار جان سے عاشق تھے۔ کسے پتہ مرزا صاحب کو فیض کی موت کی پیشگی خبر مل گئی ہو۔

علامہ اقبال اور فیض احمد فیض نے ایک ہی شہر (سیالکوٹ) میں جنم لیا اور ایک ہی

استاد (شمس العلماء مولوی سید میر حسن) سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۳رفروری ۱۹۱۱ء فیض صاحب کا جنم دن ہے۔ والد چودھری سلطان محمد خان بیرسٹر تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو مشن اسکول میں چوتھی جماعت میں داخلہ دلایا۔ ذہین اور لائق بیٹے نے ۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی۔اے اور عربی میں بی۔اے (آنرز) کیا۔ ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں فرسٹ ڈویژن میں ایم۔اے کیا۔ ایک سال بعد ایم۔اے او۔ کالج، امرتسر میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ دوسری عالمگیر جنگ نے زور پکڑا تو ۱۹۴۲ء میں بحیثیت کیپٹن فوج میں ملازم ہوئے اور لیفٹننٹ کرنل کے عہدے تک ترقی پائی۔ یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے کر لاہور واپس آگئے۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے اور جون ۱۹۶۲ء تک خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۴ء میں عبداللہ ہارون کالج، کراچی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۳۹-۱۹۳۰ء کے عرصے میں "ادب لطیف" لاہور کے مدیر رہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک پروگریسیو پیپرس لمیٹڈ سے وابستہ ہوئے اور "پاکستان ٹائمز" روزنامہ "امروز" اورہفت روزہ "لیل ونہار" کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا۔ ۱۹۴۱ء میں بیگم ڈاکٹر دین محمد تاثیر کی بہن اور لندن نژاد خاتون ایلس فیض سے اسلامی شرع کے مطابق شادی کی۔ شیر کشمیر شیخ عبداللہ نے نکاح پڑھایا۔ والدہ نے اسلامی نام کلثوم رکھا جو معروف نہ ہوسکا۔ راولپنڈی سازش کیس میں ۹رمارچ ۱۹۵۱ء کو پہلی بار سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیے گئے اور بغاوت کے الزام میں چار سال گیارہ ماہ گیارہ دن تک قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں۔ ۲۰راپریل ۱۹۵۵ء کو رہائی ملی۔ انکا بہترین کام سرگودھا، منٹگمری، حیدرآباد، کراچی اور لاہور کی جیلوں کا عطیہ ہے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں دوبارہ گرفتار ہوکر اپریل ۱۹۵۹ء کو رہا ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں مشہور زمانہ لینن امن انعام حاصل کیا۔ حکومت پاکستان نے روس سے نظریاتی اختلاف کے باوجود اس ایوارڈ کے ملنے پر کسی تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا جو روسی حکومت نے نوبل پرائز دیے جانے پر "ڈاکٹر ژواگو" کے مصنف کے ساتھ روا رکھا تھا۔

فیض نے شاعری میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی البتہ اپنی شاعری کے سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری اور کرنل مجید ملک جیسے قریبی احباب سے مشورے ضرور کیے۔

۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر اور صاحبزادہ محمود الظفر کی تحریک پر لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد مزدور تحریک سے وابستہ رہے اور ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے سان فرانسسکو میں آئی۔ ایل۔ او۔ کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔

فیض صاحب گزشتہ کئی برسوں تک ملک سے باہر رہے جسے ان کی جلاوطنی سے تعبیر کیا گیا، جس کی انہوں نے تردید کر دی۔ اسی عرصے میں وہ ''لوٹس'' (بیروت) مرتب کرتے رہے۔

تصانیف:

۱۔ نقش فریادی	(۱۹۴۱ء)
۲۔ دست صبا	(۱۹۵۳ء)
۳۔ زنداں نامہ	(۱۹۵۶ء)
۴۔ دست تہہ سنگ	(۱۹۶۵ء)
۵۔ میزان (تنقیدی مضامین)	(۱۹۶۲ء)
۶۔ سروادیٔ سینا	(۱۹۷۱ء)
۷۔ صلیبیں مرے دریچے میں (خطوط)	(۱۹۷۱ء)
۸۔ متاع لوح وقلم (نثر)	(۱۹۷۳ء)
۹۔ ہماری قومی ثقافت (نثر)	(۱۹۷۶ء)
۱۰۔ شام شہر یاراں	(۱۹۷۸ء)
۱۱۔ مہہ و سال آشنائی (یادداشتیں)	(۱۹۸۱ء)
۱۲۔ مرے دل مرے مسافر	(۱۹۸۱ء)
۱۳۔ سارے سخن ہمارے	(۱۹۸۳ء)
۱۴۔ نسخہ ہائے وفا	(۱۹۸۴ء)

انٹرویو

سوال : فیض صاحب! آدمی کا دل خواہشات سے لبریز رہتا ہے اور چند خواہشیں مثلاً عزت، شہرت، محبت اور خوشحالی کے حصول کی خواہشیں تو ہر دل میں ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو آپ کے دل میں شاید ہی کوئی ایسی خواہش، تمنا یا آرزو باقی رہ گئی ہو جو پوری نہ ہوئی ہو۔ خدا کی اتنی ساری نعمتوں کے میسر آجانے کے بعد بھی آپ کو اپنی زندگی میں کسی کمی کا احساس ہوتا ہے؟

فیض : بھئی بات یہ ہے کہ ہم نے زندگی سے جتنا کچھ مانگا تھا، اس سے زیادہ ملا۔ کبھی کبھی تو یہ سوچ کر ہم بے حد افسردہ ہو جاتے ہیں کہ جو کام ہمیں کرنا چاہیے تھا، وہ ہم سے نہیں ہو پایا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمیں کبھی جم کر بیٹھنے کا، اپنی ساری توجہ ایک چیز پر مرکوز کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس کے فائدے بھی ہوئے۔ وقتاً فوقتاً دوسرے کاموں کے مواقع ملے اور اس سے بہت سے رشتے ناطے قائم ہوئے۔

سوال : پچھلے دنوں کہیں آپ نے کہا کہ آپ شاعری میں کمال حاصل نہیں کر سکے۔ اس سے آپ کی کیا مراد تھی؟

فیض : یہ اور بات ہے لوگ ہمیں چاہتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ ہماری جو تمنا تھی، وہ پوری نہ ہو سکی، لیکن ان تمناؤں کی تکمیل کے بغیر بھی اتنا صلہ مل چکا ہے کہ شکایت کرنا ناشکر گزاری ہوگی۔ ہماری تمنا تھی کہ ہم شاعری میں درجۂ کمال کو پہنچتے۔ ناظم حکمت، پابلو نرودا، لورکا وغیرہ ہمارے عہد کے شاعر ہیں۔ ظاہر ہے ہم ان جتنے بڑے شاعر تو نہیں ہیں۔ ہماری مثال تو عربی کے اس محاورہ کے مطابق ہے کہ ہم بڑے نہیں تھے، بڑوں کے اُٹھ جانے نے ہمیں بڑا بنا دیا ہے۔

سوال : لوگوں نے آپ کا جس بے پناہ طریقے سے خیر مقدم کیا ہے اور آپ کو جس شاندار طریقے سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہے، کہیں آپ کے یہ احساسات اس کے

خلاف ردِّعمل کے طور پر تو پیدا نہیں ہوئے ہیں؟

فیض : یہ بھی ایک پہلو ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے کوئی کمال پیدا نہیں کیا یا جو کچھ ہمیں کرنا چاہیے تھا، وہ ہم نہیں کر سکے۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ مزدور کو کم معاوضہ ملے تو اسے رنجش ہوتی ہے اور زیادہ مل جائے تو ندامت ہوتی ہے۔ ہمیں ہماری خواہش سے زیادہ ملا ہے اس لیے شکایت تو نہیں ہے لیکن تھوڑی سی حیرت ضرور ہے کہ آخر ہم نے ایسا کیا تیر مارا ہے۔

سوال : آپ کے ناقدین کے خیال میں آپ کو بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر اہمیت دی جاتی ہے۔ ابتدائی زمانے میں تو آپ کو پنڈی سازش کیس کے حوالے سے شہرت ملی اور اب بائیں بازو کے عناصر نظریاتی ہم آہنگی کی بنا پر آپ کو اور آپ کے نام کو بطور علامت (Symbol) کے استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض : بات یہ ہے کہ راولپنڈی سازش کیس، جیل خانہ، سیاست یا اس طرح کے جو واقعات یا قصے ہمارے ساتھ پیش آئے، فرض کیجئے یہ سب پیش نہ آتا تو فی الحال یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ آگے چل کر کیا ہوتا اور کیا نہیں ہوتا۔ رہا سوال مخالفین کا، تو مخالفین کی بات دوسری ہے۔ اس لیے کہ انہیں ہماری ذات سے مخالفت یا مخاصمت تو ہے نہیں۔ ان کی مخالفت تو ہمارے سیاسی نظریات سے ہے۔ اگر ہم جیل خانے نہ بھی گئے ہوتے اور کچھ نہ بھی کیا ہوتا تو بھی انہیں ہماری مخالفت کا کوئی نہ کوئی بہانہ تو مل ہی جاتا۔ اس پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم جیل نہ جاتے تو ہمارے پاس اخبارات رہتے۔ اگر مارشل لاء قائم نہ ہوتا تو اخبار ہم سے چھِنا نہ جاتا اور ہم صحافت ہی کرتے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی نام پیدا کرنے کی گنجائشیں موجود تھیں، امکانات روشن کرتے۔ ہاں ممکن ہے شاعری میں پیچھے رہ جاتے اور صحافت کے ذریعہ لوگوں کی خدمت کر لیتے یا یہ بھی ممکن تھا کہ ہم صحافت میں نہ ہوتے اور مدرسی ہی کرتے رہتے جس سے ہم نے اپنی زندگی شروع کی تھی۔ ممکن ہے اس پیشے سے وابستگی کے نتیجے میں ہماری

استعداد میں اضافہ ہو جاتا اور ہم کم از کم اچھے استاد ہو جاتے۔

ہوا یوں کہ راستے میں اِدھر اُدھر کے بہت سے موڑ آئے اور سب کچھ خود بخود ہوتا رہا۔ ہم نے اپنی مرضی سے کوئی بھی پیشہ اختیار نہیں کیا۔ حالات بدلتے گئے اور ہمیں ان حالات کے ساتھ ساتھ چلنا پڑا۔ اب یہی دیکھئے کہ اخبارات ضبط ہوئے، لیکن ہم نے اسے اپنے شوق سے تو ضبط نہیں کرایا۔ اگر یہ سب کچھ اس طرح سے رونما نہ ہوا ہوتا تو ممکن ہے ہمیں شاعری کرنے کا زیادہ وقت مل جاتا اور ہم اس پر زیادہ توجہ اور وقت دے سکتے یا مدرسی ہی کر لیتے یا کچھ اور۔ جن حضرات کا یہ کہنا ہے کہ ہمارا نام اس لیے ہو گیا کہ ہم جیل خانے چلے گئے تھے، تو سوال یہ ہے کہ جو لوگ جیل خانے نہیں گئے، انہیں شہرت کیوں مل گئی۔ مثلاً فراق صاحب تو کبھی جیل نہیں گئے تھے، اس سے ان کی شاعری میں فرق تو نہیں آیا۔

سوال : گویا آپ کی زندگی میں جتنے موڑ آئے، اس میں آپ کے ذاتی ارادوں کا کم اور حالات کا دخل زیادہ رہا؟

فیض : جی ہاں، حالات ہی اس نوعیت کے پیدا ہوتے گئے جو ہمیں دھکیل کر اس طرف لے گئے، ورنہ ہم کبھی وہ راستہ اختیار نہ کرتے۔ بفرض محال اگر جاپان اور جرمنی حملہ نہ کرتے تو ہم فوج میں نہ جاتے یا پاکستان بننے کے بعد سیاسی حالات اچھے ہوتے تو ہمیں جیل کیوں جانا پڑتا۔ اس نوع کے معاملات میں ایک حد تک حالات کا دخل ہوتا ہے اور ایک حد تک آدمی کے اپنے اختیار کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں دو ہی صورتیں ہوتی ہیں، یا تو یہ کہ سب کچھ نظرانداز کر کے حالات سے سمجھوتہ کر لیا جائے یا پھر سمجھوتہ نہ کریں اور حالات کا جو تقاضا ہے، ان تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

سوال : راولپنڈی سازش کیس تو خیر اب پرانی بات ہو گئی لیکن میں جس نسل کا نمائندہ ہوں، کم از کم اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہے کہ آپ کی شخصیت اور شاعری جتنی دلآویز ہے، اس کے پیش نظر یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ بھلا آپ کا کسی

سازش، بغاوت یا حکومت کا تختہ اُلٹنے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟

اب جب کہ اس واقعے کو بھی برسوں بیت چکے ہیں، آپ اس بارے میں کچھ ارشاد فرمانا پسند کریں گے؟

فیض : بھئی قصہ یہ ہے کہ سارا پنڈی سازش کیس جو ہے وہ جسے بات کا بتنگڑ بنانا کہتے ہیں، وہ ہے۔ چونکہ ہم فوج میں رہ چکے تھے اس لیے بہت سے فوجی افسر ہمارے دوست تھے۔ ان سے ہمارے ذاتی مراسم تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہمارے سیاسی نظریات ہم آہنگ تھے۔ قصہ صرف اتنا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک دن بیٹھ کے بات کی کہ اس ملک میں کیا ہونا چاہیے؟ کس طریقے سے یہاں کے حالات بہتر بنائے جائیں، چونکہ ملک کو بنے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور نہ یہاں آئین بنا تھا، نہ سیاست کا ڈھانچہ ٹھیک طریقے سے منظم ہوا تھا۔ ملک کے بری، بحری اور فضائی افواج کے سربراہ لیاقت علی خان تھے۔ کشمیر کا قصہ بھی تھا۔ غرض یہ کہ اس طرح کے مسائل تھے جس پر عموماً گفتگو رہتی تھی۔ چونکہ ان دوستوں سے میرے ذاتی مراسم تھے اس لیے ہم بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوتے تھے۔ انہوں نے خود ہی ساری منصوبہ بندی کی اور ہم سے کہا۔ ''ہماری بات سنئے!'' ہم نے ان کی بات سن لی۔ پھر انہوں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ حکومت کا تختہ نہیں اُلٹنا ہے۔ انگریزوں نے سازش کا ایک قانون وضع کیا ہوا ہے کہ اگر تین آدمی ایک جگہ موجود ہوں اور ان میں سے دو آدمی کسی بات پر زبانی متفق ہو جائیں اور تیسرا آدمی گواہی دے دے کہ یہ دونوں اس بات پر متفق ہو گئے تھے تو سازش ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ضرورت نہیں رہتی کہ کسی قسم کی عملی کارروائی کی جائے۔ ہمارے معاملے میں اس قانون کے بجائے نیا قانون بنایا گیا تاکہ فوری طور پر صفائی کی جو گنجائشیں رکھی گئی ہیں، ان کو حذف کیا جاسکے۔ یہ قانون بھی پارلیمنٹ، یا نیشنل اسمبلی کے ذریعہ منظور نہیں ہوا بلکہ اسے قانون ساز اسمبلی نے وضع کیا تھا اور قانون ساز اسمبلی کا فیصلہ کسی عدالت

میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم نے بتایا، ہماری میٹنگ میں فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہمیں حکومت کا تختہ نہیں اُلٹنا ہے اور کسی نے اوپر جا کر مخبری کر دی کہ ہم لوگوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن پھر فیصلہ کیا گیا کہ منصوبے پر عمل درآمد نہ کیا جائے، لیکن ہم پر مقدمہ اس کے بالکل برعکس بنایا گیا۔ دوسری طرف استغاثہ کے جو انچارج تھے انہوں نے ہمیں بتایا کہ آپ لوگوں کی ساری باتیں ٹھیک تھیں، یعنی یہ کہ آپ لوگ ملے تھے، آپ نے گفتگو کی تھی، آپ نے طے کیا تھا کہ حکومت کا تختہ نہیں اُلٹنا ہے۔ ہم نے تو صرف اپنی طرف سے اتنا اضافہ کر دیا تھا کہ آپ نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مزید یہ کہ جن لوگوں نے یہ سارا پلان بنایا تھا..........

سوال : میجر جنرل اکبر خان نے؟

فیض : جی ہاں! انہوں نے ساری بات کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کہ کچھ نہیں کرنا ہے، جو کاغذات اس سلسلے میں تیار کیے تھے، وہ تلف نہیں کیے تھے۔ وہ ان کے پاس موجود تھے اور جب کسی نے مخبری کی تو سارے کاغذات نکل آئے اور پھر بات کا بتنگڑ بنایا گیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حکومت ہمارے دوست فوجی افسروں سے خفا تھی۔ دوسرے حکومت کا یہ تاثر بھی تھا کہ شاید یہ لوگ پوری طرح سے فرمانبردار نہیں ہیں، وہ ان سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح انہیں ایک اچھا موقعہ ہاتھ آ گیا۔ ہم تو بیچ میں یوں ہی آ گئے۔

سوال : اس واقعے نے تو آپ کی زندگی پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہوں گے؟

فیض : ہم چار سال تک جیل میں رہے۔ بہت کچھ سیکھا۔ بہت کچھ پڑھنے لکھے، دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملا۔ ہمارا ضمیر مطمئن تھا کیونکہ ہم نے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔ ہم بے گناہ تھے۔

سوال : ایسی سزا جو بے گناہ اور بے قصور ہونے کے باوجود ملے، کیا شدید غم و غصہ اور جھنجلاہٹ کو جنم نہیں دیتی؟

فیض : غصہ تو آتا ہے لیکن اس سے مورال بلند رہتا ہے۔ ہمت بلند رہتی ہے۔

سوال : کوئی ایسا مرحلہ درمیان میں آیا جب معافی نامہ وغیرہ لکھ کر رہائی پا لینے کی پیش کش ہوئی ہو؟

فیض : سازش کیس میں معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے ایسا کوئی موقع نہیں آیا۔ ہاں، البتہ ایوب خان کے دور میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے تھے، اس میں پیش کش ہوئی کہ معافی مانگ لو اور رِہا ہو جاؤ، لیکن ظاہر ہے معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال : آپ کے سیاسی نظریات کی وجہ سے ملک میں ایک طبقہ آپ کا شدید مخالف رہا ہے۔ اس نے آپ کی سیاسی اور نظریاتی وابستگی کی بنیاد پر آپ کو ہمیشہ اپنی تنقید اور طعنہ زنی کا نشانہ بنایا لیکن آپ میں ایک خوبی جسے میں نے ہمیشہ مستقل مزاجی کے ساتھ آپ کے اندر موجود پایا اور وہ یہ کہ آپ نے ان عناصر کو کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا اور نہ ہی ان کی سطح پر اُترے۔ یہ خوبی اتفاق سے میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اندر بھی پائی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کبھی اس نوع کی مخالفتوں کے پیش نظر دل گرفتہ، مایوس یا تلخ ہوئے؟

فیض : ہم اپنی ذات کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور نہ اسے مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات کے لیے کسی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیں۔ کوئی اصول یا نظریے کی بات ہو تو اس پر بحث کی جا سکتی ہے کیونکہ بحث کرنے کا جواز موجود ہے لیکن اگر کوئی ذاتی اعتراض ہو اور آپ اس کا اسی شدت سے جواب دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ معترضین کی سطح پر اُتر آئے ہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ آپ کو معلوم ہو کہ آپ کی ذات پر اعتراضات آپ کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کے عقائد و نظریات کی وجہ سے کیے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کو اتنی اہمیت کیوں دے؟ اپنی شخصیت کے حوالے سے باتیں کرنا محض تضیع اوقات ہے۔

سوال : اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں فرمائیں کہ کیا کسی ادیب کو کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کرنی چاہیے یا نہیں؟

فیض : اس کا کوئی لگا بندھا اصول یا قاعدہ قانون نہیں ہے۔ جس کا مزاج سیاست سے ہم آہنگ ہو، وہ بے شک سیاست میں حصہ لے اور جو مزاجاً سیاست سے الگ تھلگ ہو، ظاہر ہے اسے سیاست میں حصہ نہ لینا چاہیے۔ سیاست زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی طرح سیاست سے وابستہ ہے۔ سیاست سے عملاً علیحدہ رہتے ہوئے اس سے ذہنی اور جذباتی تعلق رکھنا ایک بات ہے اور سیاست میں عملی طور پر شامل ہونا یعنی کسی سیاسی جماعت میں داخل ہوکر اس کا ضابطہ اور قاعدہ اختیار کرنا بالکل دوسری بات۔ اس کا تعلق اپنے اپنے مزاج سے ہے۔ لہٰذا جو سیاست کر سکتے ہیں انہیں کرنا چاہیے اور جو نہیں کر سکتے انہیں نہیں کرنا چاہیے۔ ادب اور شاعری کا قاعدہ تو صرف اس حد تک ہے کہ زندگی کی چند بنیادی قدریں ہیں، جن کی حفاظت کرنی چاہیے۔ نیکی، انسان دوستی، صداقت کا تحفظ، ادیبوں اور شاعروں کا اولین فریضہ ہے اور جن سیاسی کارروائیوں پر ان کا اطلاق ہوتا ہے اس حد تک جدوجہد بھی کرنی چاہیے۔ جہاں تک کسی پارٹی یا جماعت میں شامل ہوکر ان کے قواعد کی پابندیوں کا تعلق ہے، شاعر و ادیب پر ان کی پابندی لازم نہیں ہے۔

سوال : ایک نقاد نے آپ کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ جانے آپ کی شاعری میں ایسا کیا جادو ہے کہ اسے پڑھ کر ایک طرف سرمایہ داروں کی کوٹھیوں پر ہل چلانے کے خواب دیکھنے والے انقلابی بھی جھومتے ہیں اور دوسری طرف ان ہی کوٹھیوں کے ڈرائنگ رومس میں بیٹھ کر انقلابیوں کو غدار کہنے والے سرمایہ دار بھی آپ کی شاعری سے اسی قدر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ترقی پسندانہ نقطہ نظر سے آپ اپنی شاعری کی اس خوبی کی کوئی تعبیر پیش کریں گے؟

فیض : میری شاعری کے اس پہلو کی کوئی ترقی پسندانہ توجیہ ہوسکتی ہے تو وہ غالباً یہی

ہے کہ زندگی کی بعض حقیقتیں ایسی ہیں جن کا اطلاق سبھی پر ہوتا ہے۔ ترقی پسند کے علاوہ اگر کوئی سرمایہ دار بھی میرے شعر پڑھ کر جھومتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر بھی ضمیر موجود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شعر کا ایک فنی پہلو بھی ہوتا ہے جس کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ غالب، میر یا شیکسپیئر کی شاعری کا بھی ایک جمالیاتی پہلو ہے جو ماورائے طبقہ ہے یعنی غیر طبقاتی ہے۔ شعر پڑھنے والا شاعری میں سے اپنی پسند کا عنصر الگ کر لیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے جیسے ملک میں لازم ہے کہ آپ کی بات صرف ایک طبقے تک نہ پہنچے بلکہ ہر طبقے تک ہماری آواز پہنچے۔ کیونکہ معاشرہ میں ہر طبقے کا کوئی نہ کوئی کردار ہوتا ہے۔ سماجی کاروبار میں معاشرت کی ترتیب و تنظیم میں ان کا اپنا رول ہوتا ہے۔ لہٰذا کوشش کرنی چاہیے کہ آپ کا پیغام کسی ایک طبقے تک محدود نہ رہے تاکہ وہ لوگ جن کا تعلق مظلوم ومحکوم طبقے سے نہیں ہے، ان کے ذہن یا ضمیر پر بھی یہ حقیقت واضح ہو کہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس میں انہیں ترمیم کرنی چاہیے۔ ان کے اندر تبدیلی واقع ہوگی تو لازماً اس کا اثر عوام پر بھی مرتب ہوگا۔

سوال : ویسے بھی شاعری انسان کو بہتر انسان بننے میں مدد دیتی ہے!

فیض : جی ہاں، ہماری بات ان تک پہنچنی تو چاہیے۔ خاص طور پر ہمارے جیسے معاشرے میں جہاں طبقاتی مسائل ابھی تک اس قسم کے ہیں کہ ایک طبقے کی بات دوسرے طبقے تک پہنچ ہی نہیں پاتی یا پہنچتی ہے تو وہ ایک دوسرے کو ہمدردی سے سمجھنے سے معذور ہوتے ہیں۔

سوال : آپ نے ایک انٹرویو میں ترقی پسند تحریک سے اپنے اختلاف کا ذکر کیا ہے جس میں آپ نے ترقی پسندوں کی جانب سے تنظیمی سطح پر قرۃ العین حیدر، منٹو یا عصمت وغیرہ کے خلاف جو مؤقف اختیار کیا گیا اور علامہ اقبال کی جو غلط تفسیریں پیش کی گئیں، اسے آپ نے ترقی پسند تحریک سے اپنے اختلاف کا سبب گنوایا ہے۔ اس حوالے سے میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کے

خیال میں اُردو ادب کی سب سے بڑی تحریک کے رو بہ زوال ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ ہمارے بعض بزرگ نقادوں کا خیال ہے کہ قیام پاکستان کے واقعے نے اس تحریک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا کیونکہ پاکستان کا قیام ترقی پسند تحریک کی توقع اور خواہش کے بالکل برخلاف تھا اور یہیں سے تحریک کو فکری اور عملی طور پر گہرے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔

فیض : قیام پاکستان سے قبل برصغیر میں آزادی کی جو تحریک چلتی تھی، وہ مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کے درمیان ایک متحدہ محاذ کے قیام کا نتیجہ تھی۔ اس متحدہ محاذ میں جو لوگ شامل تھے، ان کے سیاسی نظریات کلی طور سے ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں تھے لیکن چند ایک باتوں پر سبھی کا اتفاق تھا۔ یعنی یہ کہ انگریزوں سے آزادی ملنی چاہیے۔ عام آدمی کی زندگی میں آسائش اور سکون کا اضافہ ہونا چاہیے۔ اس محاذ میں دیگر معاملات اس حد تک اختلافی نہیں تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا کہ آزادی تو حاصل ہوگئی لیکن اب اس کے بعد کیا کرنا چاہیے؟ اس پر ترقی پسند تحریک میں شامل ہمارے دوستوں نے ذرا زیادہ ہی انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا کہ ہمیں اس کے بعد فوراً انقلابی ہو جانا چاہیے۔ مطلب یہ تھا کہ پورے طور پر جو لوگ انقلابی رویہ اختیار نہیں کرتے، وہ ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ یہ رویہ اختیار کر کے ایک طریقے سے انہوں نے حالات کا غلط اندازہ لگایا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ ترقی پسند تنظیم میں جو نوجوان شامل ہوئے، ان کا ذہن پورے طور پر صاف نہ تھا اور نہ سیاسی اعتبار سے وہ تجربہ کار تھے اور نہ ہی انہیں حالات سے اچھی طرح سے واقفیت تھی۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔ یہ ایسی کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ ملک بننے کے بعد ایک بالکل نئی صورت حال پیش آئی جس کا ہمیں پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ آزادی کا ایک بہت مبہم سا تصور تو تھا لیکن آزادی کے بعد واقعی صورت کیا بنی ہے، اس کے بارے میں ذہن صاف نہیں

تھا جس کے نتیجے میں بعض لوگ جذباتی ہو کر انتہا پسندی کی طرف چلے گئے اور ہوا یہ کہ جو لوگ ہمارے ساتھ تھے، جن کو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے تھا، ان کو ساتھ رکھ کر تحریک کو آگے بڑھانے کے بجائے ہم نے اپنا دائرہ یا حلقہ محدود کر لیا جو ظاہر ہے صحیح نہیں تھا۔ اصولاً ہمیں ادیبوں اور شاعروں کے نظریات تک محدود رہنا چاہیے تھا اور ہمیں ان کی تخلیقات کا احاطہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ تخلیقات کا احاطہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ منٹو، عصمت اور قرۃ العین حیدر جیسے ادیبوں کو اپنے دائرے سے خارج کرنا پڑا جس کا میں مخالف تھا۔

سوال : آپ نے اس غلط فیصلے کے خلاف اسٹینڈ کیوں نہ لیا۔ اس فیصلے میں جو مضرات آپ دیکھ رہے تھے، اگر اس کے خلاف آپ آواز اُٹھاتے تو شاید ترقی پسند تنظیم کو آگے چل کر جو نقصانات اُٹھانے پڑے، وہ اس سے محفوظ رہتی۔

فیض : نقصان تو یقیناً پہنچا اور صرف ترقی پسندی ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ ہماری جو دوسری تنظیمیں تھیں، مثلاً مزدوروں میں اور دوسرے طبقوں میں، ان سب کو نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ سارا کام جذباتیت کی وجہ سے خراب ہوا۔ آزادی کے بعد جو ایک نشہ ہوتا ہے اور جس میں سارے پہلو دکھائی نہیں دیتے، یہ اسی نشے کا اثر ہے۔ انہوں نے اس طرح سے سوچا کہ آزادی ملی ہے تو بس انقلابی ہو جانا چاہیے۔ خیر ہو جاتی ہیں غلطیاں!

سوال : فیض صاحب! ترقی پسند تحریک تو تحریک پاکستان کی حمایت میں نہیں تھی۔ اس لیے قیام پاکستان کے نتیجے میں جو آزادی ہمیں میسر آئی، اس کی یہ شکل وصورت تو یقیناً ترقی پسند تحریک کے زعماء کی نظروں میں نہیں ہوگی؟

فیض : جی ہاں، یہ صورت تو یقیناً نہیں تھی۔ صورت یہ تھی اور ہم نے سمجھا بھی یہی تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے آپس میں جو اختلافات ہیں اور جس کی وجہ سے انگریزوں کا برصغیر پر تسلط قائم ہے، وہ اختلاف آزادی ملنے کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ یہ تو کسی نے نہیں سوچا تھا کہ پنجاب تقسیم ہو جائے گا اور اس قدر

کشت وخون اور قتل وغارت گری ہوگی۔ یہ نقشہ ذہن میں بالکل نہیں تھا۔ نقشہ تو یہ تھا کہ جو جھگڑے وغیرہ چل رہے ہیں آزادی کے بعد ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پاکستان بن گیا اور ہندوستان کو آزادی مل گئی۔ ان معنوں میں ہماری خواہش تو پوری ہو گئی لیکن دوستانہ طریقے سے اختلافات کے خاتمے کی خواہش پوری نہ ہوئی، کچھ اپنی غلطیاں، کچھ انگریزوں کی ریشہ دوانیاں، کچھ عوام کی مرضی، کچھ خود غرض طبقوں کے مفادات، سب مل ملا کر ایسی صورتحال پیدا ہو گئی کہ اپنے ذہن میں جو نقشہ تھا، وہ ادھورا اور تشنہ تکمیل رہ گیا۔ اسی وجہ سے ہمیں آج تک یہ طعنہ ملتا ہے کہ ہم نے کہا تھا......

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

جنہوں نے وہ نقشہ نہیں دیکھا جو ہم نے دیکھا ہے کہ آزادی ہم کو کس طرح ملی۔ اس وقت تو ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس آزادی کے نتیجے میں ہمیں اس قدر قربانی دینی پڑیں گی اور ایسی گہری اذیت برداشت کرنی پڑے گی۔ نجات کے بجائے قتل وغارت گری کے غیر انسانی مناظر دیکھنے پڑیں گے۔

سوال : مجنوں گورکھپوری صاحب نے ایک انٹرویو میں رائے ظاہر کی تھی کہ ترقی پسند تحریک اس لیے ختم ہوگئی کہ پاکستان کا قیام عمل میں آگیا تھا۔ آپ ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟

فیض : مگر ترقی پسند تحریک ختم کہاں ہوئی ہے؟

سوال : ظاہر ہے ۱۹۳۶ء والی صورت حال تو نہیں رہی۔ ادب میں نئی تحریکات اور نئے رجحانات در آئے ہیں۔

فیض ترقی پسندی کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تنظیم ختم ہوگئی ہے۔ تنظیمیں تو ختم ہوتی اور بنتی رہتی ہیں لیکن تحریکیں ختم نہیں ہوتیں۔ ترقی پسندی ہم نے تو پیدا نہیں کی تھی۔ وہ تو شروع سے چلی آرہی ہے۔ حالات کے تقاضے نے ایک تنظیم کو جنم دیا اور پھر حالات ہی کی بنا پر تنظیم ختم بھی

ہوگئی لیکن تحریک کہاں ختم ہوئی ہے۔ ترقی پسند تنظیم اس زمانے میں قائم ہوئی تھی جب ترقی پسند تحریکیں چل رہی تھیں اور ادب میں داخلیت پسندی، ذاتی اور غیر شعوری تجربات کا اظہار کرنے والے موجود تھے۔ اس وقت بھی دونوں تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اور بعد میں جو نئی تحریکیں پیدا ہوئیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ادب میں تحریکیں پیدا ہوتی ہی رہتی ہیں۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کا تعلق ہے یعنی اس نقطہ نظر کا کہ عوام کے مصائب و آلام کو ادب میں منعکس ہونا چاہے تو اس میں کوئی بُعد نہیں آیا۔ ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ تنظیم نہیں بن سکی۔

سوال : فیض صاحب! تنظیم تو ختم ہوئی لیکن ساتھ ہی تحریک کی شدت میں بھی کمی آئی۔ یعنی اس نقطہ نظر کی شدت میں جس کے زیر اثر یک رنگا اور یک رُخا ادب لکھا گیا تھا۔

فیض : بھئی یہ بات صرف ترقی پسندی تک تو محدود نہیں ہے۔ پاکستان و ہندوستان بننے کے بعد جو ایک متفقہ تحریک حصول آزادی کے لیے چل رہی تھی، وہ ختم ہوگئی۔ اس لیے کہ آزادی مل گئی۔ آزادی کے بعد اگلی منزل کون سی ہے یا اس سے آگے کیسے جانا ہے؟ اس کے بارے میں صرف ترقی پسندوں ہی میں نہیں، زندگی کی سطح پر مختلف خیالات و نظریات پیدا ہوئے۔ اس سے ساری سیاسی زندگی متاثر ہوئی۔ یہ بالکل غلط بات ہے کہ پاکستان بننے کی وجہ سے تحریک ختم ہوگئی۔ اگر پاکستان نہیں بنتا اور ہندوستان میں آزادی کے بعد اسی قسم کے مسائل پیدا ہو جاتے تو؟ آزادی تو ایک مجرد چیز ہے۔ صرف یہ کہہ دینا تو کافی نہیں کہ ملک آزاد ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا سیاسی نقشہ کیا ہوگا؟ اقتصادی نظام کیسا ہوگا؟ معاشرے کا کاروبار کیسے چلے گا؟ ان ساری چیزوں کے بارے میں نئے طریقے سے سوچنا، تجاویز و منصوبے بنانا، تشریح کی صورتیں پیدا کرنا، ظاہر ہے ان تمام مسائل پر ہم متفق نہیں تھے۔ آزادی کے بعد اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی نظام کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے عمل کے بارے میں کسی کا ذہن بھی صاف نہیں تھا۔

سوال : ادیبوں کو اس وقت قومی تعمیر کے سلسلے میں جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا، کیا انہوں نے وہ کردار ادا کیا یا اس ذمہ داری سے پہلوتہی کی؟

فیض : ادیب کا کردار محدود ہوتا ہے کیونکہ وہ حکومت تو چلاتا نہیں ہے۔ وہ تو محض عوام کا ترجمان ہوتا ہے اور عوام کی ذہنی اور جذباتی تربیت کرتا ہے۔ اس زمانے میں اچھے ادیبوں کے مقدر میں جتنا کچھ تھا، انہوں نے کیا۔ لیکن ہر دور میں اچھے ادیبوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

سوال : جس دور کا ذکر ہو رہا ہے، اس وقت تک معاشرے پر ادیبوں اور دانشوروں کے اثرات گہرے تھے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادیبوں پر بحیثیت مجموری قومی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فرانس میں الجزائر کی جنگ آزادی کے معاملے میں سارتر نے جس بے باکی سے ایک موقف اختیار کیا یا جیسا کہ آپ نے لورکا اور نرودا وغیرہ کے نام لیے، انہوں نے شاعر ہونے کے باوجود جو سیاسی کردار ادا کیا۔ اس درجے کا کردار ہمارے ادیبوں میں نظر نہیں آتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض : کیوں نہیں نظر آتا۔ جس حد تک ہمارے ادیبوں میں صلاحیتیں تھیں، اس کے مطابق انہوں نے اپنا کردار ادا کیا اور پھر سارتر اور لورکا جیسے بڑے ادیب بھی تو ہمارے ہاں نہیں تھے اور بڑے ادیب روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ بڑے ادیب پیدا کرنے کا کوئی نسخہ تو ہے نہیں۔ فرانس میں بھی آپ سارتر یا اراگون کا نام لے دیں گے۔ اس سے زیادہ نام تو وہاں بھی نہیں ہیں اور بعض ملکوں میں تو ایک نام بھی نہیں ملے گا۔ یہ تو محض اتفاق ہے۔

سوال : مثلاً یہ دیکھئے کہ ہمارے ملک کا ایک حصہ علیحدہ ہو گیا، ایک بازو کٹ گیا، لیکن ادبی سطح پر جمود طاری رہا، اتنے عظیم سانحے نے ہمارے ادیبوں کے باطن میں کوئی ہلچل، کوئی طوفان برپا نہیں کیا، کوئی بڑا ناول کوئی ایسا ادب تخلیق نہیں ہوا، جس کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکیں کہ اقتدار پرستوں کے ضمیر مر چکے ہیں

لیکن ہمارے ادیب زندہ ہیں۔

فیض : ایسا اس لیے نہیں ہوا کہ جو بازو کٹا ہے، ادب وہاں پیدا ہونا چاہیے کیونکہ بازو ہمارا نہیں ان کا کٹا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مغربی پاکستان کے لوگوں کے لیے یہ بات کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تجربہ تو مشرقی پاکستان یا بنگالیوں کے لیے تھا، لہٰذا انہیں بڑا ادب تخلیق کرنا چاہیے۔

سوال : ہمارے یعنی مغربی پاکستان کے ادیبوں کے لیے یہ سانحہ ذہنی اور روحانی تجربے کی حیثیت تو رکھتا ہی ہوگا نا؟

فیض : ان کے لیے یہ ذہنی اور روحانی تجربہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ دور دراز کی بات تھی، براہ راست تجربہ تو نہیں تھا نا؟ بنگلہ دیش میں بہت سی چیزیں لکھی گئیں۔ وہاں کے ادیبوں کا تجربہ ہمارے دانشوروں کی نسبت براہ راست تھا۔ یہاں کے ادیبوں کا تجربہ تو خیال تھا۔ بنگالی تو ہمیں آتی نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہاں کے افسانہ نگاروں اور لکھنے والوں نے بہت سی مؤثر چیزیں لکھی ہیں۔ مثلاً شہید اللہ قیصر وغیرہ نے۔

سوال : ہمارے لیے ذہنی اور روحانی تجربہ تو تھا۔ خود آپ ہی نے اس تجربے کو موضوع بنا کر بہت ہی اچھی غزل کہی......

ہم کہ ٹھہرے اجنبی کتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

فیض : ہم نے تو کوشش کی لیکن ہمارے لیے بھی یہ راہ راست تجربہ نہیں تھا۔ بہر حال یہ ایک ذہنی تجربہ ضرور تھا۔ اس سانحے سے جسمانی طور پر جو لوگ گزرے ہیں، وہ زیادہ بہتر جانتے ہوں گے۔ ہمارے ہاں یہ ذہنی اور روحانی واردات اس لیے بھی نہیں بنی کہ ہمارے ہاں ایک دوسری الجھن پیدا ہو گئی تھی اور وہ یہ کہ یہاں ہندوستان کا حملہ ہو گیا تھا۔ لوگ اس میں الجھ گئے اور یوں سانحہ مشرقی پاکستان کی بات دور رہ گئی۔

سوال : ایک طرف آپ کا شمار عہد حاضر کے پیغمبروں میں کیا جاتا ہے۔ آپ کو جو مقبولیت ملی ہے، وہ اقبال کے بعد آپ ہی کا حصہ ہے۔ حالانکہ ن۔م۔ راشد، اور جوش بھی اسی زمانے کے ہیں لیکن آپ کے گلے میں جتنے ہار ڈالے گئے اور آپ کی آمد پر جتنی تالیاں بجتی ہیں، ان کا عشر عشیر بھی دیگر شعراء کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف آپ کے بعض ناقدین جن میں بالخصوص میرا جی اور راشد کے مکتبہ خیال کے ادیب شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کی شاعری کا مزاج سراسر رومانوی ہے۔ وہی دس بارہ مترنم بحریں، جھومتے ہوئے قافیے، وہ شاید اس طرح سوچتے ہیں کہ زندگی کے بنیادی جذبے مثلاً غصہ، نفرت، حقارت، خوف کا اظہار آپ کی شاعری میں نہیں ہوا ہے۔ برعکس اس کے آپ کے یہاں صرف چیزوں کو Beautify کر دینے کا عمل ملتا ہے اور یوں آپ کی شاعری کا کینوس محدود ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض : راشد کی شاعری کا کینوس کون سا وسیع ہے۔ ان کی شاعری کا تو کوئی کینوس ہی نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں سوائے ان کی ذات اور لاشعور کے اور ہے کیا؟ اسی طرح میرا جی گیتوں کے شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری کا سرے سے کوئی Content ہی نہیں ہے۔ شاعری میں کینوس سے مراد تجربے کی وسعت اور اس کا پھیلاؤ ہے۔ شاعر جب اپنی ذات سے باہر نکل کر کائنات سے اپنا تعلق جوڑنا چاہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے اپنے تجربات کو Beautify کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ اس کے بغیر ابلاغ ممکن نہیں تھا۔ راشد بہت اچھے شاعر ہیں لیکن انہیں کتنے لوگ سمجھتے ہیں، کتنے لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے لکھا کیا ہے اور وہ کہنا کیا چاہتے ہیں، ان کی شاعری کا تو ابلاغ ہی نہیں ہوتا اور شعر تو اُسی وقت شعر ہوتا ہے جب وہ دوسروں تک پہنچے۔

سوال : یعنی آپ کا اعتراض یہ ہے کہ راشد کی شاعری خاص تک محدود ہے؟

فیض : راشد تو خواص تک بھی نہیں پہنچتے۔ ان کا ابلاغ بہت ہی تھوڑے لوگوں تک ہوتا

ہے۔ خواص میں بھی صرف ان چند لوگوں تک جنہیں ایک بہت ہی محدود قسم کی سہولت یا آسائش حاصل ہے کہ وہ کلاسیکی انگریزی، مغربی شاعری اور مغربی ادب میں چلنے والی تحریکات مثلاً سرریلزم اور ایکسپریشن ازم سے واقف ہیں اور اس محدود طبقے کو اپنی زبان وادب سے واسطہ نہیں ہے اور پھر راشد صاحب کی تو زبان فارسی ہے اور نہایت مشکل فارسی جن افراد کو دونوں زبانیں نہیں آتیں، وہ تو انہیں سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ راشد صاحب اس ملک میں رہے ہی نہیں۔ یہاں کے لوگوں کے ساتھ ان کا رابطہ کٹ گیا۔ ان کو یہ دریافت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ ان کی بات لوگوں تک پہنچی یا نہیں۔ میراجی کی بات عوام تک پہنچتی ہے کہ وہ گیت کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری نہایت ہلکی پھلکی ہے۔

سوال : آپ ابلاغ کی اہمیت پر زور دے کر شاعری کو صحافت پر پروپیگنڈے کے قریب نہیں لا رہے ہیں؟

فیض : شاعری اور صحافت میں بس اتنا فرق ہے کہ صحافت میں جمالیاتی پہلو نہیں ہوتا۔ جمالیات کو آپ ابلاغ میں شامل کر لیں تو ادب بن جاتا ہے اور جمالیات کو خارج کر دیں تو وہ صحافت بن جاتی ہے۔

سوال : کیا شاعری کی کوئی ایسی قسم ممکن نہیں جسے خود کلامی سے تعبیر کیا جائے؟

فیض : بالکل ممکن ہے۔ خالص جمالیاتی شاعری کا تصور بھی موجود ہے اور اس میں فرحت کا پہلو بھی ہے، جو شاعری کے لیے لازم ہے لیکن اس کا میدان بہت محدود ہے۔ داغ کی شاعری بہت اچھی ہے لیکن آپ اسے غالب کے مقابلے پر تو نہیں رکھ سکتے۔ شاعری میں مضمون کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ محض فنی کمال سے بڑی شاعری پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی محض پروپیگنڈے سے۔ دونوں چیزیں یکجا ہوں، تب جا کر بڑی شاعری جنم لیتی ہے۔ خالص رومانی یا خالص غنائیہ شاعری کی تحقیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی اپنی جمالیاتی افادیت ہے۔

سوال : کہا جاتا ہے کہ راشد نے اظہار کے نئے نئے سانچے بنائے اور اسلوب میں بھی

تجربات کیے؟

فیض : تجربات تو ضرور کیے مگر محض تجربہ کرنا کافی نہیں ہے۔ تجربے کی اہمیت تو اسی وقت ہوتی ہے، جب تجربہ کامیاب ہو۔ ایک شاعر کا تجربہ جو اس کی اپنی حد تک محدود رہا اور شاعر کا حال یہ ہے کہ اسے آگے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تجربے کا کمال یہ ہے کہ اس سے بڑا آرٹ پیدا ہو۔

سوال : ایلیٹ نے لکھا ہے کہ ندرت تکرار سے بہتر ہے۔

فیض : تکرار سے تو ہر چیز بہتر ہے۔ آپ اقبال کی مثال لیں۔ ان سے زیادہ تکرار کسی کے یہاں ملتی ہے مگر اس سے ان کی شاعری میں فرق تو نہیں آیا۔ تکرار کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ مکھی پر مکھی مارتے چلے جائیں اور دوسری یہ کہ آپ ایک پرانے مضمون کو اس طرح آگے بڑھائیں کہ اس میں حسن پیدا ہو جائے اور تکرار باقی نہ رہے۔

سوال : مغرب میں بہت سے ادیب ایسے ہیں جنہوں نے بہ وقت تخلیق وتنقید سے اپنا رشتہ قائم رکھا، مثلاً ایلیٹ نے شاعری بھی کی اور تنقید بھی کی۔ لارنس نے بھی فکشن اور تنقید میں وسیع سرمایہ چھوڑا۔ ہمارے ہاں فراق اور حسن عسکری اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ آپ نے بھی شاعری کے ساتھ تنقید کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا لیکن ''میزان'' کے بعد آپ نے تنقید پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی، اس کی کیا وجہ ہے؟ خصوصاً اس پس منظر میں کہ ہمارے ہاں مدتوں سے سنجیدہ تنقید کی کمیابی کا رونا رویا جاتا رہا ہے۔

فیض : (ہنس کر) توجہ دینی چاہیے تھی لیکن نہیں دی۔ بہت سے کام ایسے تھے جن پر توجہ نہیں کی، آخر کیا کیا کرتے، شاعری کرتے، صحافت کرتے، مدرسی کرتے یا تنقید لکھتے۔ زندگی میں بہت کچھ کرنا تھا لیکن ضروری تو نہیں کہ آدمی جو چاہے وہ پورا ہی ہو۔ آپ کی یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہاں تنقید نہیں لکھی گئی ہے۔ تنقید لکھنے کے لیے آدمی کو بہت Competent ہونا چاہیے۔ ہمارے بیشتر نقاد تخلیقی

صلاحیت سے محروم ہیں اور تخلیقی نقاد تو صرف فراق صاحب ہیں۔

سوال : حسن عسکری صاحب کے بارے میں کیا رائے ہے؟

فیض : عسکری صاحب سمجھدار نقاد تھے، ان میں حساسیت بھی تھی مگر وہ آخری عمر میں اس طرف نکل گئے تھے جو ان کا میدان نہیں تھا۔

سوال : اُن کی دو کتابیں ''ستارہ یا بادبان'' اور ''انسان اور آدمی'' کے بارے میں آپ کے تاثرات......؟

فیض : اچھی کتابیں ہیں مگر سوائے چند ایک مضامین کے، انہوں نے کوئی مستقل چیز نہیں چھوڑی۔ ویسے عسکری صاحب بہت ذہین آدمی تھے۔ افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے تنقید کا میدان چھوڑ کر فلسفہ کا میدان اختیار کر لیا۔ جو اُن کا اصل میدان نہیں تھا۔

سوال : عزیز حامد مدنی ایک محفل میں گلہ کر رہے تھے کہ جس طرح مغرب میں ہر بڑا شاعر اپنے پیچھے آنے والے شاعروں کے نام گنواتا ہے اور اس کی حیثیتیں متعین کرتا ہے۔ آپ نے اس ذمہ داری کو کبھی قبول نہیں کیا اور اپنے بعد کے شاعروں کے بارے میں خاموش رہے ہیں۔

فیض : بھئی بہت سے اچھے لکھنے والے ہیں، ان میں سے دو ایک نام لے دیں اور باقی دس نام رہ جائیں تو شکایت پیدا ہوگی۔ میرے کہنے سے کوئی اچھا ہو جاتا ہے اور نہ کوئی بُرا۔

سوال : لیکن اس سے شاعر کو تو قوت ملتی ہے نا؟

فیض : دیکھئے ناقد کی رائے شاعر کو چھوٹا یا بڑا نہیں بناتی۔ شاعر پیدائشی طور پر چھوٹا یا بڑا شاعر ہوتا ہے۔

OO

امین الرحمن

فیضؔ کا کلام موسیقی کے روپ میں

فروری ۱۹۷۶ء میں ممتاز شاعر فیض احمد فیضؔ کی پینسٹھویں سالگرہ غیر معمولی جوش وخروش کے ساتھ اور اس طور منائی گئی جسے کئی لحاظ سے ایک یادگار تقریب کی حیثیت حاصل رہے گی۔ جہاں جناب فیض احمد فیضؔ کو ہم عصر شعرا اور ادیبوں کی طرف سے تہنیت کے بے شمار پیغامات موصول ہوئے، ان کی شاعرانہ اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے ادبی مجالس اور مذاکرے منعقد ہوئے، وہاں ان کے کلام کی غنائیت کو عقیدت کا ایک ایسا خراج بھی پیش کیا گیا جس کا ہمارے ملک میں اس سے پہلے نہ تو کوئی رواج تھا اور نہ کوئی روایت۔ یہ غیر روایتی خراج عقیدت ایک لانگ پلے اِنگ ریکارڈ (ایل پی) کی صورت میں تھا جسے ایک گراموفون ریکارڈ بنانے والے ادارے نے عین اس دن جاری کیا جو جناب فیض احمد فیضؔ کی ۶۵ رویں سالگرہ کا دن تھا یعنی ۱۳ رفروری ۱۹۷۶ء۔

مغربی ملکوں میں اس قسم کے یادگار موقعوں پر گراموفون ریکارڈوں کا اجرا کوئی نئی بات نہیں۔ مثال کے طور پر جب ۱۹۶۹ء میں فرانس کے ایک ممتاز موسیقی نگار ہیکٹر برلیو کی صد سالہ برسی کی تقریبات سال بھر بڑے اہتمام اور عقیدت سے منائی گئیں تو ان کے اختتام پر فلپس کمپنی نے فرانس کے اس عظیم موسیقی نگار کے مشہور اوپرا ''لے ترویان'' کو جس کا پلاٹ ہومر کی طویل نظم 'اِلیڈ' سے لیا گیا تھا، برطانوی کنڈکٹر ڈیوڈ کولس کی زیر نگرانی خاص طور پر ریکارڈ کرایا اور برلیوں کی برسی کی تقریبات کی سب سے اہم یادگار اب اسی ریکارڈ کو سمجھا تا ہے۔

غالباً کچھ اسی قسم کے جذباتِ عقیدت کے زیر اثر ای۔ ایم۔ آئی۔ پاکستان لمٹیڈ (سابق گراموفون کمپنی آف پاکستان) نے جناب فیض احمد فیضؔ کی ۶۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ایک یادگار لانگ پلے اِنگ ریکارڈ جاری کرنے کا فیصلہ کیا جس کا انگریزی عنوان ''نیرہ سنگز فیضؔ'' ہے جسے اُردو میں فیضؔ کا کلام نیرہ کی نغمہ سرائی کہا جاسکتا ہے۔

فیض احمد فیضؔ کو اپنے سیاسی عقائد اور ثقافتی مسلک کی بنا پر ایک متنازعہ فیہ شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن فیضؔ کی شاعری کی تاثیر خاص ہے اس کی غنائیت میں شاید ہی کسی کو کلام ہو۔ اسی طرح فیضؔ کی شاعری کا نفسِ مضمون خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فیضؔ کا ہر مصرعہ بلکہ مصرعہ کا ہر رکن ایک خاص قسم کی غنائیت کا حامل ہے۔ جس کے لیے فارسی شاعری میں سعدیؔ، خسروؔ، حافظ اور قاآنیؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اُردو شاعری میں داغؔ، اقبالؔ اور حفیظؔ جالندھری، انگریزی شاعری میں سوئن برنؔ اور بنگالی شاعری میں رابندر ناتھ ٹیگور۔

فیضؔ کے کلام میں غنائیت کا یہی عنصر ہے جس نے ان کے اشعار کو نغمہ سرائی کے لیے بے حد موزوں بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہت سے مشہور گانے والے اور گانے والیوں نے فیضؔ کے کلام کا جادو اپنی آواز سے جگا کر سامعین سے ہمیشہ تحسین کی داد حاصل کی ہے۔

نور جہاں، مہدی حسن، فریدہ خانم اور اقبال بانو کو یقیناً یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے فیضؔ کے کلام کو اپنی خوش نوائی سے نغمے کی زبان میں ایسے معانی دیئے ہیں جن سے دل اور سماعت وجدان کی سی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔

فیضؔ کا کلام یوں تو بے شمار گانے والوں نے گایا ہے، لیکن ان کی طرزیں شاید ہی معیار کے اوسط سے پیش ہوئی ہوں۔ مثال کے طور پر مہدی حسن کی طرز ''چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے'' ایک معمولی طرز ہے جس میں اثر انگیز موسیقی کا کوئی شائبہ محسوس نہیں ہوتا لیکن اس کے برخلاف فیضؔ کی وہ غزل جس کا پہلا مصروہ ''آئے کچھ اَبر کچھ شراب آئے'' مہدی حسن نے بڑے جذبے کے ساتھ گائی ہے، بعض سروں پر قیام

خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔ بعض جگہ سروں کی بے ساختہ چھوٹ سے طرز میں جان سی پڑ گئی ہے اور برجستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہی حال نور جہاں کی گائی ہوئی فیضؔ کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' کی ہے۔ اس کی طرز غالباً رشید عطرے مرحوم نے کسی فلم کے لیے موزوں کی تھی۔ لیکن اس میں فلمی طرزوں کا روایتی اوچھا پن نہیں ہے۔ اس کی وجہ اس نظم کی شاعری کا غیر معمولی ہونا ہے۔ رشید عطرے نے اس کی تال بھی ایسی چنی ہے جس میں الاپ کا انداز بھی کھپ جاتا ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہوگا کہ نور جہاں کی آواز میں جو سریلا پن ہے اس کی وجہ سے بھی اس کی موسیقی میں جذب اور شوق کی ایک تڑپ سی دکھائی دیتی ہے۔

فیضؔ کی ایک مشہور نظم کو جو نظم معریٰ کی صورت میں ہے اقبال بانو نے گایا ہے۔ اس نظم کی غنائیت اس کے شروع کے بولوں ہی سے ظاہر ہے۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں

لرزاں ہیں،

تیری آواز کے سائے، تیرے ہونٹوں کے سراب

......اور غالباً کچھ اسی قسم کی وجوہ سے مہدی ظہیر نے اس کی موسیقی موزوں کرنے کے لیے اسے منتخب کیا۔ اس نظم معریٰ کی طرز بھی موسیقی میں ایک نیا تجربہ ہے۔ مہدی ظہیر نے اس طرز میں یہ خصوصیت رکھی ہے کہ طبلہ بالکل ہی پس منظر میں رہے اور کہیں بھی یہ ظاہر نہ ہو کہ نظم کے بول اور طبلے کی ضربیں مترادف ہیں۔ اقبال بانو کی آواز میں جو برق سا کرشمہ ہے مہدی ظہیر اسے پورے طور پر بروئے کار لائے ہیں اور بلمپت لے میں اقبال بانو کو یہ مواقع فراہم کیا کہ وہ طرز کے اہم سروں پر طویل قیام سے وارفتگی کی کیفیت کو نغمے کی شکل مستعار دیتی چلی جائے۔

میرے خیال میں فیضؔ کے کلام کی غنائیت کو موسیقی کے موزوں ترین قالب میں ڈھالنے کا مہدی ظہیر کا یہ تجربہ انتہائی کامیاب ہے۔

یہ فیضؔ کے کلام کی غنائیت سے استفادہ کرنے کی چند مثالیں ہیں۔ غنائیت کے اعتبار سے فیضؔ کا کلام اُردو میں اُسی اہمیت کا حامل ہے جو فارسی میں حافظ شیرازی کو حاصل ہے یا جرمن زبان میں گوئٹے، ہائنے اور شلر کو۔ میں نے ان تین جرمنوں کا نام اس لیے لیا ہے کہ ان عظیم شاعروں نے جرمن زبان میں نہایت خوبصورت گیت اور نظمیں لکھی ہیں جنھیں خود چند عظیم جرمن موسیقی نگاروں جیسے براہمز، شوبرٹ اور شومان نے نہایت دل کش نغموں کی صورت میں اس طرح ڈھالا ہے کہ نظم کے ہر لفظ، رکن یا مصرعے کی معنی خیزی سر اور آہنگ کی صورت میں آ کر دو چند ہو گئی ہے۔

اگر فیض احمد فیضؔ بھی ان شاعروں کے مانند ہوتے جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقار بھی تھے اور جنھوں نے اپنے کلام کو خود ہی موسیقی کے قالب میں منتقل کیا ہے جیسے آئرستانی شاعر ٹامس مور (جس کی ایک مشہور نظم کا اُردو میں ترجمہ 'اکثر شب تنہائی میں' اُردو ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے) یا پھر رابندر ناتھ ٹیگور جو اپنے گیتوں کی دھنیں بھی خود ہی بناتے تھے اور جن کی موسیقی کو رابندر سنگیت کا نام دیا گیا ہے، تو پھر وہ بھی موسیقی نگاروں سے بے نیاز ہوتے لیکن اب جب کہ فیضؔ محض ایک شاعر ہیں اس لیے یہ فرض ہمارے موسیقاروں کا ہے کہ وہ ان کے کلام کا بغور مطالعہ کریں اور ان کے گیتوں، غزلوں اور نظموں کی ایسی دُھنیں موزوں کریں جنھیں نہ صرف ہماری موسیقی ہی میں ایک خاص مقام حاصل ہو بلکہ بین الاقوامی طور پر بھی انھیں مقبولیت حاصل ہو۔

فیض احمد فیضؔ کو براہمز، شوبرٹ یا شومان جیسے پختہ کار اور بین الاقوامی شہرت کے حامل موسیقی نگاروں کی خدمات ملنے میں شاید ابھی کچھ دیر لگے لیکن موسیقاروں کا ایک نوجوان گروہ ہماری توجہ کا یقیناً مستحق ہے جس نے فیضؔ کے چیدہ چیدہ کلام کو نغمے کے قالب میں اس طرح پیش کیا ہے کہ فیضؔ کی شاعری کی روح بھی برقرار رہے اور اسے سُر اور آہنگ کے ذریعہ ایک نیا اظہار بھی ملے۔ اس گروہ میں گانے والے بھی ہیں، موسیقی موزوں کرنے والے بھی اور ساز بجانے والے بھی۔ دو تین برس کے اندر اندر اس بے نام گروہ نے فیضؔ کے کلام کو خاص کر ٹیلی ویژن کے مقبول پروگراموں 'دیچ

گپ' اور 'ٹال مٹول' میں وقتاً فوقتاً پیش کر کے ایک اچھا خاصا مجموعہ تیار کر لیا جسے اب ای۔ ایم۔ آئی۔ پاکستان لمیٹڈ نے فیض احمد فیضؔ کی ۶۵ ویں سال گرہ پر ایک لانگ پلے اِنگ ریکارڈ کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ اس ''ایل۔ پی'' میں کل بارہ چیزیں ہیں جو فیضؔ کی شاعری کی پوری پوری نمائندگی کرتی ہیں، کیونکہ اس میں گیت بھی ہیں اُردو کے بھی اور پنجابی کے بھی، غزل بھی ہے اور نظم معریٰ بھی ہے۔ ریکارڈ ایک انتساب سے شروع ہوتا ہے جسے شعیب ہاشمی نے پڑھا ہے اور نیرہ نور نے فیضؔ کی نظم 'آج کے نام' کے مصرعے درمیان درمیان میں گا کر پیش کیے ہیں۔

آج کے نام اور آج کے غم کے نام

زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے......

اس آزاد نظم کی طرز نوجوان موسیقی نگار شاہد طوسی نے موزوں کی ہے جو بجائے خود ہماری موسیقی میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پس منظر میں وائر وفون اور گٹار کی موسیقی نے غنائیت کی فضا قائم کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ اس ایل۔ پی۔ کی خاص طور پر جو قابل ذکر چیزیں ہیں ان میں ''تم میرے پاس رہو'' جسے نیّرہ نور نے بڑی دلسوزی سے گایا ہے۔ ''یہ دور کنارا'' جس کی موسیقی راگیشوری پر مبنی ہے اور ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' جس کی دھن بہاگ میں ہے، یقیناً بہت پسند کی جائیں گی۔

نیرہ نور کی آواز میں بے حد ملائمت ہے اور وہ نازک سی نازک جگہوں کو بھی بڑی آسانی سے ادا کرتی ہیں۔ موسیقی کی دُنیا میں اسے آئے ہوئے ابھی چھ برس ہی ہوئے ہیں لیکن اس مختصر سے عرصے میں اس نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلموں میں ایک پلے بیک سنگر کی حیثیت سے اپنے لیے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس ایل پی کی ساری موسیقی دونوجوان موسیقاروں شاہد طوسی اور ارشد محمود نے موزوں کی ہے۔ دونوں شوقین فنکار ہیں اور کسی نے بھی موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، صرف نجی شوق اور ریاض کی بدولت انہوں نے موسیقی کی دُنیا میں قدم رکھا ہے۔ شاہد طوسیؔ ہماری کلاسیکی موسیقی سے نابلد ہے، صرف ذوق سلیم ہی اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے

برخلاف ارشد محمود کلاسیکی موسیقی کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی طرزوں میں راگوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ فیضؔ کی مشہور نظم 'آج بازار میں پابجولاں چلو' کو ارشد محمود نے بہاگ راگ میں اس طرح باندھا ہے کہ راگ کی ساری خوب صورتی سمٹ کر اس طرز میں آگئی ہے۔

''تم مرے پاس رہو'' کی طرز شاہد طوسیٰ نے موزوں کی ہے۔ اتفاق سے فیضؔ کی یہی نظم ملکہ پکھراج نے بھی گائی ہے اور ٹھمری کے انداز میں 'تم مرے پاس رہو' کے بول ہر بار نئے انداز سے ادا کیے ہیں لیکن شاہد طوسیٰ نے اس کی جو دھن بنائی ہے اور نیرہ نور نے اسے جس جذبے کے ساتھ گایا ہے اس کا ملکہ پکھراج کی طرز اور گانے سے مقابلہ کرنا یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا کیونکہ دونوں طرزیں الگ الگ اُسلوب کی مظہر ہیں۔

اس ایل پی کے تمام گانوں کی موسیقی میں سازوں کو نہایت اہتمام اور سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔ 'چلو پھر سے مسکرائیں' میں ماجد خان نے ستار کی مینڈ کاری کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ یقیناً ماہرانہ صلاحیت کے غماز ہیں۔ اگرچہ ایل پی میں کوئی کورس نہیں لیکن اس کمی کو ایک دوگانے 'برکھا برسے چھت پر' نے پورا کر دیا ہے جسے نیرہ نور اور ان کے موسیقار شوہر شہریار زیدی نے گایا ہے۔ اس دوگانے کی طرز شاہد طوسیٰ نے بنائی ہے جس میں بنگالی انگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

اس ایل۔ پی۔ کو کوئی عارضی یا ہنگامی حیثیت حاصل نہیں بلکہ جدید پاکستان کی موسیقی میں اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کی موسیقی کے موزوں کرنے' اسے ترتیب دینے اور گانے میں سب شوقیہ فن کاروں نے حصہ لیا اور اس طرح اس کی موسیقی اس ابتذالِ نغمہ سے بچی رہی جو آج کل کے پیشہ ور موسیقاروں کی موسیقی میں بدرجہ اُتم موجود ہوتی ہے۔ ای ایم آئی کے اس ایل پی کی موسیقی میں ایک نیاپن اور تازگی ہے کیوں کہ یہ ان نوجوان فنکاروں کی کاوش سے وجود میں آئی ہے جو موسیقی کے میدان میں پیشہ ور نہیں۔

OO

اقبال مسعود

فیضؔ، ہمارے شہر میں

دن: ۱۵ر ستمبر ۱۹۷۸ء

وقت: سورج اپنے سفر کے چوتھے مرحلے میں

مقام: آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن، بھوپال

ڈرائیور کے مشاق ہاتھ سڑکوں کے بیچ بہتے ہوئے انسانی سیلاب اور گاڑیوں کی ریل پیل میں مہارت اور چابکدستی سے گاڑی کو ڈرائیو کر رہے ہیں۔ سڑکیں، عمارتیں، چوراہے، سب پل پل گزرتے جا رہے ہیں۔ سامنے بھوپال کا مشہور تال دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے دوسرے کنارے کو آسمان جھک کر چوم رہا ہے۔ کملا پارک والی سڑک پر دو رویہ گھنے بوڑھے درخت جوانوں کی طرح ایستادہ ہیں۔ کلول کے فوارے ہواؤں میں اوپر اور اوپر تک اڑ رہے ہیں۔ موڑ پر چھوٹا تالاب اپنی جھلک دکھاتا ہے اور گہرے سبز درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو جاتا ہے۔ سوچتا ہوں، اسی راہ سے فیضؔ بھی گزرے ہوں گے یا شاید گزرنے والے ہوں۔ کیسا لگے گا انہیں یہ میرا شہر، میری زمین۔ جی چاہتا ہے معصوم بچوں کی طرح سارے شہر کو فیضؔ کے سامنے سجا دیا جائے۔ ''دیکھو، یہ سارا کا سارا ہم ہیں، ہم سب کتنا خوبصورت کیسا حسین۔'' گاڑی نے تیزی سے چوراہے پر 'یوٹرن لیا ہے اور اب ہم شملہ ہل کی چڑھائی پر ہیں۔ سامنے ہی ریڈیو اسٹیشن ہے۔ میں گاڑی سے اترتا ہوں اور بے صبری سے پوچھتا ہوں۔ ''کیا فیضؔ آ گئے؟' معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آئے ہیں۔'' میرے منہ سے خوشی اور سکون کی سانس نکل جاتی

ہے۔ ''تو وہ واقعی بھوپال آ گئے۔''

فیضؔ سے میری دوستی جب ہوئی جب میرا عہدِ طفلی لڑکپن کی سرحدوں میں داخل ہو رہا تھا۔ سنہرے خوابوں کے آسمان محل اور ان میں رہنے والی پریاں، بنفشی پروں والی تتلیاں اور نیلی، پیلی، سرخ مچھلیاں اور ان گنت رنگوں والی جل پریاں' حیرت انگیز واقعات اور چمکتے دمکتے رات دن سب پر جیسے کسی نے شب خون مار دیا تھا۔ سنہری محل زمین بوس ہو گئے تھے اور ان میں الٹے پیروں والی چڑیلیں اور کالے پیلے دیو گھومتے تھے۔ بنفشی پروں والی تتلیوں نے سیاہ چمگادڑوں کا روپ دھار لیا تھا اور مجھ کو پہلی بار حالات کی سختی اور سنگینی کا احساس ہوا تھا۔ پہلی بار پتہ چلا تھا کہ زندگی محض ہنسی نہیں اور یہ کہ جینے کے لیے کھانا بھی ضروری ہے اور کھانے کے لیے محنت بھی لازمی ہے۔ والد کے انتقال نے یکا یک دُنیا کی تلخیاں نمایاں کر دی تھیں اور اس زمانے میں جس شاعر نے کورس کی کتابوں کے علاوہ سب سے زیادہ متاثر کیا وہ فیضؔ تھے اور ان کی نظم 'تنہائی' میری پہلی پسندیدہ نظم تھی اور یہ پسند خالص رومانی ذہن اور اپنے آپ کو دُنیا کا سب سے زیادہ مایوس اور مظلوم انسان سمجھ کر تھی۔ پھر وقت کے غبار میں آہستہ آہستہ بہت کچھ دب گیا مگر فیضؔ کی شاعری کی پرتیں تہہ بہ تہہ کھلتی گئیں۔ ان کی انسانیت، دل سوزی، لہجہ کی گھلاوٹ اور سیاسی فکر کے راز میرے اوپر منکشف ہونے لگے' اور جب سے آج تک فیضؔ کی شاعری سے میں فیض حاصل کر رہا ہوں۔

مجھے علم تھا کہ پچھلے سال مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی نے فیضؔ کو اپنے مشاعرہ کے لیے مدعو کیا تھا اور وہ بعض ناگزیر وجوہات کی وجہ سے اس تاریخی مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے تھے' جس کے سامعین کی تعداد مشاعروں کی تاریخ میں ایک یادگار اہمیت رکھتی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ نفوس کا مجمع تھا' اور اب میرا جی چاہتا تھا کہ پھر ان کو مدھیہ پردیش مدعو کیا جائے۔ اب کے وہ جب سے ہندوستان آئے تھے ان کو سرکاری مہمان قرار دیا گیا تھا۔ ملک کے مختلف صوبوں میں وہ بطور مہمان خصوصی کے جا رہے تھے۔ سارا ملک ان کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے تھا۔ جلسے، محفلیں، دعوتیں،

استقبال لیے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فیض لہر آ گئی ہو۔ چنڈی گڑھ، حیدر آباد، لکھنؤ اور بمبئ سے جب ان کے شاندار استقبال اور بے مثال پذیرائی کی خبریں ملیں تو خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی۔ خوشی اپنی زبان کے پسندیدہ شاعر کے لیے تھی اور غم اس بات کا کہ کاش بھوپال میں بھی ان کی پذیرائی کے لیے ایسا ہی انتظام ہو سکے۔

میں نے اپنے غم اور جذبات کا اظہار اپنے دوست فضل تابش کو خط میں لکھ کر کیا۔ ان کا فوراً جواب آیا کہ اگر فیض بھوپال آنے پر آمادہ ہوں تو ان کے شایان شان کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کر لیں گے۔

پھر دوسرا خط آیا کہ للت کلا پریشد والے ان کی میزبانی کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تم ان کا پتہ معلوم کر کے لکھو یا پھر فون نمبر بھیجو اور پھر اشوک باجپائی نے واقعی تیز رفتاری دکھائی۔ فوراً رابطہ قائم کیا۔ فیض نے کچھ دن کی مہلت مانگ لی۔ پھر میرے سر ذمہ داری آ پڑی کہ بات کر کے تاریخ لکھو۔ ادھر دلی میں سب نے ڈرا دیا۔ بھلا فیض کو تم کس طرح بھوپال جانے کے لیے آمادہ کرو گے۔ ارے خدا کے نیک بندے ڈاکٹر محمد حسن سے کہلوایا ہوتا تو راضی بھی ہو جاتے۔ ان باتوں نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ میں نے فیض سے ملاقات کا وقت لے لیا اور دوسرے دن ۸ رنگ روڈ، نئ دہلی پر جا پہنچا۔ وہاں بنے خوبصورت بنگلے کے ڈرائنگ روم میں شاہد علی خان، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر قمر رئیس موجود تھے۔ کچھ اور بھی احباب تھے، فیض صاحب نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ بٹھایا اور باتیں شروع کر دیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس علی گڑھ بک ڈپو کے لیے فیض کے تمام مجموعوں کے حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے، شاہد علی صاحب 'شامِ شہر یاراں' کے سلسلے میں بات کر رہے تھے اور گوپی چند نارنگ انہیں کسی جگہ کھانے کے لیے مدعو کر رہے تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند نانگ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی شہرت کے مقابلے میں بہت کم عمر دکھائی دیتے ہیں اور ان کی بات چیت اور لہجہ میں ایک خاص قسم کا عالمانہ رنگ جھلکتا ہے۔ بہر حال خدا خدا کر کے ان حضرات کے مسائل حل ہوئے تو فیض صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ "ہم تمہارے بھوپال گئے ہیں۔

اس وقت ہم فوج میں تھے اور ہمارے ایک عزیز نواب بھوپال کے یہاں نوکر تھے۔''
پھر کچھ واقعات سنائے، سیاسی بھی اور ادبی بھی۔ میں نے کہا۔ ''فیضؔ صاحب! یہ تو سب ٹھیک ہے۔ پر یہ تو بتائیں آپ بھوپال کب چل رہے ہیں۔''

فیضؔ صاحب نے کہا۔ ''چلیں، گے ضرور چلیں گے۔ ابھی تو ہم یہاں ہی بہت مصروف ہیں۔''

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا۔ 'فیضؔ صاحب! میں آپ کو عوامی شاعر سمجھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ آپ مکمل طور پر آج کے مزدور اور دہقان، کلرک اور استحصال زدہ عوام کے شاعر ہیں۔ مگر اب مجھے لگتا ہے کہ یہ غلط تھا۔ آپ پیٹی بورژوا ذہن کے انسان ہیں۔ اگر آپ سے کوئی مشہور اور بڑا آدمی درخواست کرتا تو آپ ضرور تشریف لے جاتے، ظاہر ہے کہ مجھ جیسا معمولی فرد کہہ رہا ہے، اس لیے آپ کو انکار ہے۔''

فیضؔ نے زیرِلب تبسم کیا اور میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا۔
''بُرا کیوں مانتے ہیں، ہم چلیں گے...... اور لیجئے یہ طے رہا کہ ہم پرسوں چلیں گے۔ آپ ہمارے لیے ہوائی جہاز کی سیٹ کا بندوبست کرا دیجئے۔''

میں نے سوچا اگر فیضؔ ٹرین سے چلنے پر آمادہ ہو جائیں تو سفر میں زیادہ لطف رہے گا۔ سارے سفر میں فیضؔ پر میرا ہی قبضہ ہو جائے گا۔ پھر خوب باتیں ہوں گی اور فیضؔ ٹرین سے چلنے کے لیے تیار بھی ہو گئے۔ میں نے اسی دن تابش کو خط لکھا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ شام کو فیضؔ کا فون ملا کہ وہ ہوائی جہاز ہی سے جائیں گے اور یہ کہ وہ اب مدھیہ پردیش سرکار کے سرکاری مہمان ہیں۔ میں نے یاد دلایا کہ ''بھوپال کے پروگرام میں سیفیہ کالج کو نہ بھول جایئے گا۔''

وہ ہنسے۔ ''نہیں نہیں، یاد رہے گا۔'' دوسرے دن میں بھوپال کے لیے روانہ ہو گیا اور آج صبح فیضؔ بھی آ گئے ہیں، پر ملنا اب تک نہ ہوا تھا۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ جب صبح بیراگڈھ پر جہاز نے لینڈنگ کی تو بے شمار لوگ ان کی پذیرائی کے لیے موجود تھے۔ سرکاری بھی اور غیر سرکاری بھی۔ ان کو لے جانے کے لیے غیر ملکی گاڑیاں موجود

تھیں۔ میں سوچتا ہوں کہ افسوس ان کے ڈرائیور تو ہندوستانی ہی تھے۔ فیضؔ کو وی۔ آئی۔ پی۔ گیسٹ ہاؤس ''آئینہ بنگلے'' میں ٹھہرایا گیا ہے۔ دن میں وہاں شہر کے معززین پروفیسر، صحافی، فنکار اور عام لوگوں کا مجمع لگا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میلا لگا ہو۔ بھوپال کے مشہور صحافی محمود الحسینی نے بات چیت کے دوران فیضؔ سے سوال کیا کہ ''آپ نے پاکستان میں اُردو کے خلاف پنجابی تحریک کی قیادت کی تھی؟''

فیضؔ نے کہا۔ ''پاکستان میں اُردو کے خلاف جو پنجابی کی تحریک چلی تھی اس کی قیادت میں نے نہیں کی۔'' انہوں نے مزید کہا۔ ''ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی مختلف زبانیں ہیں، لیکن سندھ کو چھوڑ کر وہاں کسی قسم کا کوئی لسانی جھگڑا نہیں ہے۔''

روزنامہ 'دعوت' دہلی کے مدیر صغیر بیدار کے ایک سوال کا جواب فیضؔ نے یوں دیا۔ ''پاکستان میں ابھی صنعتیں طاقتور نہیں ہو پائی ہیں۔ اس لیے وہاں بائیں بازو کی تحریک مضبوط نہیں ہو سکی ہے۔'' اسی ملاقات میں فیضؔ نے یہ بھی کہا۔ ''اس حقیقت کو تسلیم کر ہی لینا چاہیے کہ بھائیوں نے اپنے گھر علاحدہ بنا لئے ہیں اور انہیں علاحدہ کرنے والی دیوار کی تعمیر ہو چکی ہے۔ مگر یہ ممکن ہے کہ اس دیوار میں کھڑکیاں اور روشندان بنائے جا سکتے ہیں۔'' اور میں سوچتا ہوں کہ فیضؔ کا یہ سفر اس دیوار میں روشن دان کھولنے کے ہی مترادف ہے۔

''اقبال...... وہاں کیوں کھڑے ہو؟ اِدھر آؤ۔'' فضل تابش کی آواز مجھے خیالوں کی دُنیا سے واپس لے آتی ہے۔ فضل تابش بے انتہا مخلص اور سچا دوست ہے۔ یاروں کا یار، قلم کا قول کا اور شکل کا خالص پٹھان۔ ''چلو فیضؔ سے بات چیت میں تم بھی اندر بیٹھنا۔'' ہم لوگ اندر چلے جاتے ہیں۔ اسٹوڈیو نمبر ۴ میں سب لوگ جا رہے ہیں۔ اندر فیضؔ احمد فیضؔ سفید کھادی کے پاجامے کرتے اور کالی واسکٹ پہنے بیٹھے ہیں۔ اختر سعید خان، اشوک باجپائی، مثنیٰ رضوی اور اقبال مجید موجود ہیں۔ اسٹوڈیو کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ سامنے شیشے کے بنے پارٹیشن پر سرخ بلب روشن ہو گیا ہے۔ اقبال مجید کہہ رہے ہیں۔

فیضؔ احمد فیضؔ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ فیضؔ کی شاعری کی خوشبو باغ کی دیواروں کو پھاند کر مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پھیلے ہوئے انسانوں کے درد میں بس گئی ہے کہ یہ درد تو ہمارا درد ہے۔ اس شعر کے ساتھ:......

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ہم فیضؔ کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ اقبال مجید خاموش ہو گئے ہیں۔ اختر سعید صاحب سوال کر رہے ہیں۔ ویسے تو فیضؔ کے ہزاروں معنوی شاگرد ہیں مگر میں نے فیضؔ صاحب سے انگریزی ادب کی تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ رک کر خاموش ہو جاتے ہیں اور پھر یوں گویا ہوئے۔

''ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں فیضؔ صاحب۔ آج کل جو ادب پاکستان میں تخلیق ہو رہا ہے جہاں تک نثر کا تعلق ہے ایک قسم کا ذہنی دباؤ اور احتجاج پایا جاتا ہے، البتہ شعری ادب میں اس قسم کی بازگشت سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اس کی کیا کچھ سیاسی وجوہات ہیں جو یہ احتجاج کی لے ڈوب گئی ہے۔''

میں فیضؔ صاحب کی طرف دیکھتا ہوں، ان کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ چہرہ ضرورت سے زیادہ سُرخ ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اچھا ادب کسی نہ کسی رنگ میں حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم وہاں کے سیاسی معاملات کے بارے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ وہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔ ویسے نثر و نظم میں، میں سمجھتا ہوں کہ کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اب دیکھئے پاکستان میں پرانے لکھنے والوں میں احمد ندیم قاسمی، نوجوان لکھنے والے ہیں منیر نیازی، اور یہاں فیضؔ رُک گئے۔ پھر مسکرا کر کہا۔ ''خیر وہ ایسے نوجوان بھی نہیں ہیں۔ پھر فہمیدہ ریاض ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں نے حالات کو سمجھنے اور اس کی عکاسی کرنے میں کبھی کوتاہی کی ہو اور بہت سی احتجاجی آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ بہر حال مجموعی طور پر کوئی خاص فرق نظم و نثر کے لہجہ میں نہیں ہے۔

فیضؔ کے خاموش ہوتے ہی اشوک باجپائی سوال کرتے ہیں۔ ''آپ کی نظموں

کے عنوانات ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس صدی میں فرد کی آزادی اور اس کی سماجی ترقی پر جو بندشیں لگی ہیں وہی آپ کا بنیادی موضوع ہیں۔ آپ کی شاعری کا یہ موضوع بار بار آپ کو اپنی طرف متوجہ کیوں کرتا ہے۔''

فیضؔ نے کہا۔ ''ہر صدی کا یہی موضوع رہا ہے، ہر صدی میں فرد پر بندشیں عاید کی گئی ہیں اور ہر صدی کا حساس باشعور فنکار جیل کی چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن بھی کرتا رہا اور دل کی بات بھی کہتا رہا ہے۔ پھر اس صدی میں شعور تیز ہوگیا اور دوسرے دُنیا بھر میں آزادی کی رو چلی اور اس کو میں نے کوئی اختیاری طور پر بنانے کی کوشش نہیں کی، یہ تو عالمگیر مسئلہ تھا اور گھر کی بات بھی تھی کہ نصف صدی سے ہم پر بدیسی حکمرانی کر رہے تھے، پھر افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بھی یہ ہی شعلے فروزاں تھے، اور ظاہر ہے کہ ان باتوں کو نظر انداز کرنا اور چھٹکارا پانا مشکل تھا۔ ذہن و دل، دماغ متاثر ہوئے، یہاں تک کہ ان جذبوں کو اشعار میں ڈھالنے کی کوشش کی اور یہ کوئی ہم نے ہی نہیں کیا یہ کام اور لوگوں نے بھی کیا۔'' فیضؔ نے بڑے اطمینان اور رسان سے جواب دیا۔

اختر سعید جو بھوپال کے بڑے شاعر اور مانے ہوئے وکیل ہیں، بول پڑے۔ ''فیضؔ صاحب، لیکن آج ہمارے شاعر کی آواز میں کاٹ نہیں ظلم کے خلاف اور مظلوم کی حمایت میں۔''

فیضؔ نے پھر اسی اطمینان سے جواب دیا۔ ''میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ ویسے فیصلہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ساری کتابیں سامنے ہوں۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ پہلے ایک سیدھی لائن تھی کہ انگریز سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ آزادی کے بعد معلوم ہوا کہ آزادی حاصل کرنے سے تو مسئلے حل نہیں ہوتے، اور اب آوازیں بکھر گئی ہیں مگر ان کے خلوص اور دیانت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بس یہ ہی ہے کہ پہلے آوازیں مشترک تھیں۔''

اختر سعید نے پھر کہا۔ ''پہلے شاعر خود مظلوم تھا اور اب نہیں ہے۔''

فیضؔ نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ''ہر شاعر کے بارے میں تو یہ بات صحیح نہیں ہے، اور نہ یہ ضروری کہ ہر شاعر جیل چلا جائے، اور نہ سب خوش حال ہیں۔ شاعری کے لیے مصائب، مشکلات، درد و غم ضروری نہیں اور نہ یہ کہ وہ خود پریشان حال ہو۔ اصل تو یہ ہے کہ اس کے دل میں عام انسانوں اور مسائل کے لیے کتنا درد ہے اور کس حد تک نہیں ہے۔ اقبال کی ہی مثال سامنے ہے۔''

اختر سعید نے تیزی سے کہا۔ ''خیر اقبال تو کافی خوش حال تھے۔''

فیضؔ نے اس سے بھی زیادہ تیزی دکھائی۔ ''خیر ایسے زیادہ خوش حال بھی نہ تھے۔''

ایک ہلکی مہذب سی ہنسی سب کے لبوں پر آگئی۔ اتنے میں مثنیٰ رضوی نے سوال کر دیا۔ ''جدید شاعری ترقی پسند تحریک کے خلاف ایک بڑا ردعمل ہے لیکن جب آپ کا نام آتا ہے تو ان کا سر بھی عقیدت سے جھک جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بڑی شاعری محض سماجی وابستگی کے ساتھ نہیں ہوتی۔ ہم اس کے بغیر بھی اچھی شاعری کر سکتے ہیں۔''

فیضؔ نے جواب دیا۔ ''بغیر سماجی وابستگی کے آپ اچھی شاعری کر ہی نہیں سکتے۔ اصل میں ہم سماجی وابستگی اور وقتی سیاسی مصلحت میں فرق نہیں کرتے اور جہاں تک ناموں کا تعلق ہے تو ترقی پسند تحریک میں بھی پانچ، سات نام معتبر ہیں۔ ویسے کوئی تحریک اور کوئی زمانہ بھی لے لیجئے اتنے ہی نام رہتے ہیں۔ ہمارے کلاسیکی ادب نے لاکھوں شاعر پیدا کیے۔ مگر کتنے نام باقی ہیں۔''

مثنیٰ رضوی نے پھر ایک سوال کر دیا۔ ''پروپیگنڈہ اور سماجی وابستگی میں حدِ فاضل کہاں قائم کیجئے گا۔''

فیضؔ کا جواب تھا۔ ''ہر شاعری پروپیگنڈہ ہوتی ہے، لیکن پروپیگنڈہ اور اچھی شاعری کا فرق پوسٹر اور شاہکار تصویر کا ہے، ایک میں جذبہ، فن اور دوسرے میں حسن ہے، فرق حسن کاری اور فنکاری اور غیر حسن کاری کا ہے۔'' میں دیکھ رہا تھا کہ فیضؔ جوابات کتنی تیزی سے دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سوچ بچار کر کے جوابات اگر وہ دیں

تو جوابات تصنع آمیز ہو جائیں۔ فیضؔ کا زندگی اور ادب کے بارے میں نقطۂ نظر اور ذاتی نقطۂ نظر میں کوئی تضاد نہیں۔ جو ہے جیسا ہے سامنے ہے، تبھی تو جوابات اتنے سچے اور کھرے ہیں۔ ثنیٰ رضوی کی آواز سے میں پھر اسٹوڈیو میں آ گیا ہوں۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ ''ابھی جو آپ نے کلاسیکی شاعری کے بارے میں فرمایا کہ ان میں کچھ ایسے شاعر ملتے ہیں جن کے اشعار دل کو چھو جاتے ہیں تو آپ کی ایک نظم تنہائی کو عسکری صاحب داخلی شاعری کا معیار مانتے تھے۔ داخلی شاعری میں ہم سماجی وابستگی کو کیسے ایڈجیسٹ کر سکتے ہیں۔''

''تنہائی'' کے ذکر پر مجھے یاد آتا ہے کہ اس کو فراق نے اُردو نظم کا جیتا جاگتا کلاسک کہا۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ 'تنہائی' معنوی' فنی اور جمالیاتی اور سیاسی و سماجی لحاظ سے فیضؔ کی شاعری کی معراج ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ فیضؔ کے اندیشوں کا فلسفہ، فیضؔ کے اندھیاروں کا دُکھ، فیضؔ کی تنہائیوں کی المناکی اور اس نظم کا میٹھا دھیما لہجہ، سب مل کر ایسا تاثر پیدا کرتے ہیں جیسے فیضؔ دریچے میں کھڑے ہیں۔ اس میں قاری بھی ہے۔ جہاں چاند کے لٹ جانے کا دکھ اور ستاروں کے سرخاشاک برس جانے کا غم جاگتا رہتا ہے۔ یہ وہی دریچہ ہے جس میں ہزاروں صلیبیں گڑی ہیں۔ اپنے اپنے مسیحا کا رنگ لیے۔

فیضؔ کی گلفشانی گفتار سے میں چونکتا ہوں، پرانی شاعری محض داخلی شاعری ہے۔ اوّل تو میں اس مفروضے کو نہیں مانتا۔ غزل تو ایجاد اس لیے کی گئی ہے کہ بات آپ سیدھے طریقے سے نہیں کر سکتے۔ ایسے کریں اور غزل کی شاعری بھی داخلی شاعری نہیں ہے صرف معلوم ہوتی ہے؟ میں سوچتا ہوں جدید شہروں کی تیز رفتار زندگی اور صنعتی نظام کے پیدا کردہ مشینی انداز کے انسان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ اس تنہائی نے بیمار ذہنیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ فیضؔ کے یہاں یہ احساس موجود ہے مگر اس کی سطح اور لے دوسری ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ثنیٰ رضوی نے جو سوال کیا ہے وہ خود میری سوچ و فکر سے کتنا قریب ہے......

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ بول رہے ہیں۔ ''آپ کے یہاں جو تنہائی کا احساس تھا اور جو آج ہے۔ اس میں کیا فرق ہے؟'' میں فیضؔ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں کہ اس سوال کا جواب میرے لیے بھی ہے۔

''ایک تنہائی تو وہ ہے کہ واقعات آگے نہیں بڑھتے اور ایک تنہائی اوڑھی ہوئی ہوتی ہے، دونوں میں فرق ہے۔ فضل تابش کچھ سوال کرنے کو آگے بڑھتے ہیں تو اقبال مجید اُن کا تعارف کراتے ہیں۔ ''یہ ناراض جنریشن کے شاعر ہیں۔'' مگر فضل تابش انتظار نہیں کرتے۔ وہ بول پڑتے ہیں۔ تنہائی کو دو مختلف سطحوں پر اگر خود تنہائی کا احساس ہو تو تین سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری وابستگی کی شاعری ہے اور ان کے یہاں تنہائی مختلف سطحوں پر ہے۔ جیل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں میں، ایلس کے نام خطوط میں، پھر ''دستِ تہہِ سنگ'' اور ''سروادیٔ سینا'' میں اور ایک خاص بات کہ ان نظموں کا ڈکشن اور خیال پچھلے دیوانوں سے مختلف ہے۔ ان میں تنہائی اعلیٰ درجے کی شاعری کی جان ہے۔

فیضؔ کے ہونٹ متبسم ہیں۔ ''حضرت مسیح نے فرمایا۔ ''جب میں بچہ تھا تو بچوں کی سی باتیں کرتا تھا۔ بڑا ہوا تو وہ لہجہ چھوڑ دیا۔ عمر اور بدلتے حالات کے ساتھ ہمیں لگا کہ ہم ایک ہی طرح کے شعر کہہ رہے ہیں۔ یہ خانہ تو بھر گیا ہے، دوسرا راستہ ڈھونڈیں دہرانے اور نقل کرنے کے خطرے سے بچنے کے لیے نئی راہ اپنائی۔ اب وہ کامیاب ہے یا ناکامیاب۔ یہ آپ لوگ جانیں۔''

فضل تابش بنارکے دوسرا سوال کرتے ہیں۔ ''ابتداءً آپ کی بہت کم نظمیں ایسی ہیں جن میں لہجہ تلخ ہوا ہو۔ دوسرے اب جو نظمیں لکھ رہے ہیں ان میں امید اور روشن مستقبل کی نظمیں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا یہ خود آگہی کا سبب ہے؟ یا پھر تحریک کے کمزور ہو جانے کا اثر؟''

فیضؔ ذرا رُکے، پہلو بدلا اور کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تحریک کو تو لوگ اب پہلے سے زیادہ اختیار کر رہے ہیں۔ پہلے سوچتے تھے کہ جب آبادی ملے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، افق روشن نظر آتا تھا مگر اُجالا داغ داغ تھا۔ آزادی کے بعد آزمائشی گھڑی تھی۔ ذاتی بھی اور سیاسی بھی، اپنے سماج کے لیے بھی اور دُنیا بھر کے سماج کے لیے بھی۔ کچھ لوگوں نے سہل پسند قسم کی رجائیت اختیار کر لی۔ حالانکہ فنکار کا کام تھا کہ کامیابی اور ناکامیابی دونوں قسم کی صورت حال کا اپنے شعری پیکر میں اظہار کرتا اور آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے آمادہ جہاد رہتا۔''

''فیضؔ صاحب آپ نے غزل میں شروع ہی سے علامتوں کو نئے معنی دینے کی ایک خاص کوشش کی مگر آپ کی نظموں کا شعری رویہ مختلف ہے۔'' فضل تابش نے ایک اور سوال نئے انداز سے اٹھایا اور جواب بھی کم طرحدار نہ تھا۔ ''بھئی یہ فرق نظم اور غزل کے پیٹرن کا ہے۔ غزل کے شعر کا سانچہ ڈھلا اور بنا ہوا ہے۔ کرتب اس کے اندر ہی دکھانا ہے جبکہ نظم کا اُسلوب خود بنانا پڑتا ہے جو اس کے موضوع سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے اس لیے فارم اور ڈکشن نظم میں بدل جاتا ہے۔ میں نے ضرورت پڑنے پر پرانے انداز سے انحراف بھی کیا ہے......''

فیضؔ کا جملہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اقبال مجید نے ہم عصر ادب کا ایک متنازعہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ ''آج کل نثری نظموں کی رسائل میں بہت اشاعت ہو رہی ہے۔ میں نے اُردو کے مشہور افسانہ نگاروں کے چند اقتباسات لے کر ان کو ایک رسالہ میں نثری نظم کے نام سے شائع کروا دیا۔ مدیر محترم نے لکھا۔ ''آپ کی نظموں میں شعری منطق کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ میری یہ التماس ہے کہ شعری منطق نا جان سکوں تو کم از کم نثری منطق ہی جان جاؤں۔ اِدھر ان کو الگ الگ ناموں سے یاد کیے جانے کا سلسلہ بھی چل رہا ہے۔''

فیضؔ مسکرائے اور بولے۔ ''سلسلہ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ بہرحال نثری نظم کوئی نظم نہیں ہے زیادہ سے زیادہ 'نظمیہ نثر' کہہ لیں۔ یہ بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ۱۹۲۶ء

وغیرہ میں بھی یہ سلسلہ چلا تھا۔ ''انشائے لطیف'' کے نام سے اور ٹیگور کے تتبع میں۔ بنیادی فرق ہے نثر میں بکھرنے اور نظم میں یکجا کرنے کا۔ یہ ضروری نہیں کہ عربی سے ماخوذ عروض کی پابندی کریں۔ آپ لے اور آہنگ پیدا کریں جو سننے والے کو گوارا ہو تو ہمیں بھی اعتراض نہ ہوگا۔'' فیضؔ بولتے بولتے تھم گئے، پھر اختر سعید صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کوئی ضابطہ کوئی آئین کوئی آہنگ، کوئی ترنم، کوئی لے ہو۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ عروض سے کوئی چھٹکارا دلائے۔''

فیضؔ خاموش ہوگئے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے۔ اشوک باجپائی نے کافی دیر کی گمبھیر خاموشی کے بعد گفتگو میں حصہ لیا۔ ''پال ویری سے کسی نے پوچھا کہ نثر اور نظم میں کیا فرق ہے، جواب تھا۔ ''جو ناچنے اور چلنے میں ہوتا ہے۔''

فضل تابش نے بات کو وسیع پس منظر میں بیان کیا۔ ''منثور نظمیں اگر بڑی شاعری نہیں بن سکیں تو یہ شاعر کا قصور ہے۔ ہندی میں اس کی اچھی اور بڑی مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے یہاں ان نظموں کے لیے بہتر امکانات ہوں تو کچھ ظاہر ہو۔ پچھلی نسل کے بزرگوں نے بھی آپ کی شاعری ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ خود فیضؔ صاحب پر کشن پرشاد کول نے اعتراضات کیے۔ ویسے بنے بھائی نے خود اس طرح کی شاعری کی ہے۔ ہم بھی اسے اختیار کر سکتے ہیں۔'' فضل تابش بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں گفتگو کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ مگر فیضؔ نے اس کو شعر کی طرح مختصر کر دیا۔ ''بالکل صحیح ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔''

وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ مگر مشینیں 'پل' 'پل' لمحہ لمحہ وقت کو بتا رہی تھیں۔ ۱۵ منٹ، ۱۴ منٹ ۱۳ منٹ اُلٹی گنتی مٹتے وقت کا احساس دلا رہی تھی۔ اقبال مجید صاحب نے جاتے لمحوں کو اور یادگار بنانے کے لیے اب شعر پڑھنے کی درخواست کی۔ سب سے پہلے فضل تابش کا نام آیا۔ انہوں نے کہا کہ فیضؔ کے سامنے کچھ سنانا میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ پھر دو شعر سنائے......

نہ کر شمار کہ ہر شے گنی نہیں جاتی
یہ زندگی ہے حسابوں سے جی نہیں جاتی
مچلتے پانی میں اونچائی کی تلاش فضول
پہاڑ پر تو کوئی بھی ندی نہیں جاتی

......پھر دو شعر دوسری غزل کے سنائے......

ریشہ ریشہ اُدھیڑ کر دیکھو
روشنی کس جگہ سے کالی ہے
دن نے چہرہ کھرونچ ڈالا تھا
تب تو سورج پہ خاک ڈالی ہے

داد و تحسین کے کلمات کے ساتھ فضل تابش خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کے بعد بھوپال کے مشہور شاعر اختر سعید خاں غزل سرا ہیں......

مڑ کر دیکھا اور پتھر کے ہوئے اس شہر میں
خود صدا بن جاؤ، آوازیں اگر پیچھا کریں

فیضؔ بے حد دلچسپی اور محویت سے سن رہے ہیں۔ ماحول شعر و ادب میں ڈھل گیا ہے اور اب فیضؔ صاحب سے درخواست کی گئی ہے۔ انہوں نے نظم شروع کر دی ہے۔ بار بار کے سنے ہوئے اشعار ذہن و شعور کا حصہ بن چکے ہیں۔ مگر فیضؔ کے منہ سے اچھے اور نئے لگ رہے ہیں۔

موری عرض سنو دستگیر پیر
میرے دل مرے مسافر

شیشے کے پارٹیشن پر لگا سرخ بلب بجھ گیا ہے اور فیضؔ سے یہ گفتگو بھی ہزاروں خواہشوں کی طرح تشنہ ہے لیکن پھر بھی یہ حرفِ چند فیضؔ کے ہیں۔ اسٹوڈیو کے باہر ایک بھیڑ منتظر ہے۔ کئی دستِ حنائی اور ساعد سیمیں آگے بڑھتے ہیں اور فیضؔ ان کو آٹوگراف دینے لگتے ہیں۔ کیمرے کی کلک کلک اور فلش لائٹوں کے جھما کے ہو رہے

ہیں۔ میں فیضؔ سے آگے چلتا ہوا باہر کھلی ہوا میں پہنچ جاتا ہوں۔ ہوا میں پھولوں کی مہک ہے۔ سامنے ایک امپورٹیڈ امپالا کھڑی ہے۔ یہ فیضؔ کے لیے ہے۔ ایک ملازم دروازہ کھولے کھڑا ہے۔ فیضؔ اپنے شائقین کے بیچ گھرے سیڑھیاں اتر کر گاڑی کی طرف آگئے۔ میں آگے بڑھ کر پوچھتا ہوں۔ ''آپ سیفیہ کالج کب آرہے ہیں؟'' پیچھے سے ایک آواز آتی ہے۔ ''ابھی پروگرام طے نہیں ہوا ہے۔'' مگر میں پیچھے نہیں مڑتا۔ فیضؔ میرا ہاتھ دبا کر کہتے ہیں۔ ''پرسوں آئیں گے۔'' وہ گاڑی میں بیٹھ گئے ہیں بلکہ بٹھا دیے گئے ہیں۔ گاڑی کا انجن ہلکی آواز کے ساتھ چالو ہوگیا ہے اور وہ کسی پرندے کی طرح سبک رفتاری سے آگے بڑھ گئی ہے اور ہم دل میں سیکڑوں باتیں اور آرزوئیں لئے کھڑے غبار دیکھتے رہے۔

دن: ۱۵ر ستمبر ۱۹۷۸ء
وقت: فیضؔ کے اس مصرعہ کی طرح: شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
مقام: ٹیگور بھون کا سرسبز لان

ٹیگور بھون کی شاندار عمارت کے سامنے پھیلے ہوئے سبزہ زار پر ایک وسیع پنڈال کا انتظام کیا گیا ہے۔ کئی رنگوں کا یہ پنڈال خوبصورت بھی ہے اور کشادہ بھی۔ چاروں طرف بندھی قنات کی وجہ سے یہ ہال کی سی شکل اختیار کر گیا ہے، اور اس وقت یہ ہال انسانوں سے لبریز ہے۔ باہر دور دور تک لوگوں کی ٹکڑیاں بکھری پڑی ہیں۔ بڑی گہما گہمی ہے۔ ہر طرف ذکرِ فیضؔ ہے۔ فیضؔ کے اشعار ہیں، ان کے افکار کی باتیں ہیں۔ میں سوچتا ہوں بیسویں صدی میں اقبال کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اور محبت صرف فیضؔ کو ملی ہے۔ مجھے ان کی ایک ابتدائی نظم ''اقبال'' یاد آرہی ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے دورانِ تعلیم میں جن مقاصد کو جگہ دی تھی ان میں انسانیت کا کرب دور کرنے اور عوام کی بے حسی بے عملی اور قنوطیت کے خلاف نئی زندگی پیدا کرنے کا جذبہ موجزن ہے۔ ان کے دل میں اقبال کی قدر و منزلت اس لیے نہیں

تھی کہ ان کی شاعری اُسلوب و زبان و بیان کا مرقع تھی بلکہ اس لیے کہ جب کشمکش حیات سے تنگ آکر ہر فرد موت کا انتظار کر رہا تھا، جب انسانی بازوؤں میں عمل کی آرزو ناپید ہو چکی تھی، مشرقی زندگی کی رگوں کا خون تھم تھم کر چل رہا تھا، ایسی حالت میں ان کے شعلہ نفس نغموں نے خاموشی کا سحر توڑ کر مشرق کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑا دیا۔ ''نبود و بود'' کے راز پھر سے ظاہر ہوئے، قطرے کو وسعت دے کر دریا کر دیا اور ذرہ کو ثریا کے مقابل بنا دیا، فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر دیں یہاں تک کہ:

طلسم کن سے تیرا نغمہ جاں سوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا

ایک طرف زندگی کا یہ شعور اور دوسری طرف مارکس، اینگلس، لینن وغیرہ کا مطالعہ۔ اقبالؔ اور فیضؔ کے خیالات، نظریات اور طرزِ فکر میں بہت کچھ مماثلت ہے، حالانکہ انسانیت کو بلند کرنے اور سنوارنے کے طریقۂ کار مختلف ہیں۔

اس سرزمین اقبال مند سے اقبالؔ کا بھی گہرا تعلق رہا ہے اور فیضؔ کو بھی یہاں کی عوام بے انتہا پسند کرتی ہے۔ ابھی فیضؔ اور اقبال کا ساتھ تھا کہ محمد نعمان خاں صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے مجبوراً اقبال و فیضؔ کی دُنیا سے واپس لوٹ آنا پڑا۔ محمد نعمان خان بھوپال کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس نے بھوپال کو مشہور ترین حاذق دیئے اور آج بھی اس فن کا پرچم ان کے خاندان میں اسی آب و تاب سے بلند ہے۔ وہ بھی عاشق فیضؔ ہیں۔ سامنے طویل سجے ہوئے اسٹیج پر منتظمین اس طرح مستعد ہو گئے ہیں کہ جیسے مہمان خصوصی تشریف لے آئے ہوں اور وہ واقعی لوگوں کے جلوس میں کسی چاند کی طرح طلوع ہوئے۔ سارے ہال میں خوشی اور جوش کی لہر دوڑ گئی۔ اسٹیج پر کئی عدد کرسیاں رکھی ہیں۔ فیضؔ درمیان میں بیٹھ گئے ہیں اور ان کے محبّ، احباب اور پرستار پروانوں کی طرح ان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ فیضؔ ہنس رہے ہیں، مسکرا رہے ہیں اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہے ہیں۔ اُن کے پرستاروں میں جوانانِ رضا بھی ہیں، خمیدہ کمر بوڑھے بھی، غزالی آنکھوں اور صبیح رنگ دوشیزائیں،

شفق رنگ حنائیں اور پھولوں جیسے عارض والے بچے...... سب ہی فیضؔ کو پسند کرتے ہیں۔ واقعی فیضؔ کی خوشبو پھول کی مانند مہکتی اور پھیلتی رہتی ہے، ملکوں اور زمانے کی سرحدیں اسے روک نہ سکیں اور ان کی شخصیت تمام دُنیا کے مظلوموں اور محنت کشوں کی شخصیت کا ایک حصہ بن گئی۔

ہری بھاؤ جوشی (صوبائی وزیر پنچایت اور صدر مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی) مائک پر آگئے ہیں۔ اُن کی آواز گونج رہی ہے۔ ''فیضؔ صاحب اُردو زبان کی صفِ اوّل کے شعرا میں اہم مقام کے مالک ہیں۔ مجھے اس خوبصورت شہر کے شاندار باشندوں کی جانب سے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے مسرت ہے اور ہم بھوپال میں ان کا استقبال کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں۔ فیضؔ صاحب نے نہ صرف ہماری بلکہ مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی، ساہتیہ پریشد اور کلا پریشد کی بھی عزت افزائی کی ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں...... اور میں اس سوچ میں ہوں کہ ہری بھاؤ جوشی کتنی صاف اور اچھی اُردو بول رہے ہیں۔ بے ساختہ جی چاہا ''اُردو زندہ باد'' کا نعرہ لگا دوں۔ ہری بھاؤ جوشی نے آگے کہا۔ ''مدھیہ پردیش میں تمام زبانوں اور ان کے قلم کاروں کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں حکومت ہر ممکن تعاون کرتی رہے گی۔'' تالیوں کی بے پناہ گونج میں انہوں نے وزیر اعلیٰ شری وریندر کمار **سکلیچا** اور فیضؔ کی گل پوشی کی۔ شری **سکلیچا** مسکراتے ہوئے مائک کے سامنے آئے اور کہا......

''فیضؔ صاحب نے آج کی تقریب میں شرکت کر کے اس تقریب میں چار چاند لگا دیئے ہیں اور ہم کو جو عزت بخشی اس کے لیے ہم ان کے سپاس گزار ہیں۔ وہ صرف ہندو پاک بلکہ بین الاقوامی سطح پر شہرت یافتہ ہیں۔ ان کی ادبی خدمات اور شاعرانہ رہبری آنے والی نسلوں کو انسانی بیداری اور اخوت کا پیغام دیتی رہے گی۔ میں حکومت اور مدھیہ پردیش کے عوام کی جانب سے ان کا استقبال کرتا ہوں۔''

تالیوں کی لہر طوفانی انداز میں گرجنے لگی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں' باہر دور دور تک انسانی سروں کا سمندر موجزن ہے، جوش ہے، ولولہ ہے اور خوشی ہے جو چھلکی پڑ رہی

ہے، اور یہاں فیضؔ کی کرامات کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ فیضؔ نے جو کچھ سہا، قید و بند کی صعوبتیں اُٹھائیں، اُنہیں اپنے سیاسی افکار اور اپنے دور کی کشمکش میں حل کر کے اس طرح پیش کیا کہ محض الفاظ کے ذریعہ لوگوں میں دوڑنے والا لہو نہیں بلکہ تاثیر کے لحاظ سے آنکھوں سے ٹپکنے بھی لگتا ہے اور اس طرح فیضؔ نے اپنی آواز کو زمانے کے اتار چڑھاؤ میں جذب کر دیا کہ ان کی شاعری ہر فرد کے دل کی آواز بن گئی۔ اسٹیج پر کوئی سپاسنامہ پڑھ رہا ہے۔ کون ہے؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔ میں پاس والوں سے پوچھتا ہوں، مگر سب ادھر ہی متوجہ ہیں اور میں اپنی سوچوں کے درمیان نام ہی نہ سن سکا۔ کبھی کبھی تو میں اپنی سوچوں سے عاجز آجاتا ہوں۔ میں پھر اسٹیج کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں کیا شاندار الفاظ ہیں۔

"لینن بین الاقوامی امن انعام حاصل کرنے والے امن دوست شاعر کی خدمت میں ہم اپنی محبت کے پھول اس امید کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ان کی مہک ہمیشہ ایک تحفہ کی طرح ساتھ رہے گی...... اور اس موقع پر آپ کی شاعری کے تعلق سے آپ ہی کا ایک شعر پڑھنے کی اجازت چاہتے ہیں اور یہ شعر ہم سب کے دل کی آواز ہے......

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تیری محفل سے آئے ہیں

ایک بار پھر تالیوں کا شور ہے اور جب فیضؔ مائک کی طرف آتے ہیں تو یہ تالیاں دوگنی قوت سے بجنے لگتی ہیں۔ ان کی آواز کے شعلے یوں فروزاں ہوتے ہیں۔

"جناب وزیر اعلیٰ، وزیر تعلیم، وزیر پنچائت اور میرے دوستو!

ہر چند کہ ہمارا کام الفاظ کی بازی گری کرنا ہے مگر ایسے مواقع بھی آجاتے ہیں کہ الفاظ ناکام ہو جاتے ہیں۔ آج میری جس طرح آپ نے پذیرائی کی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں۔ یہ آپ کا شہر حسین اور تاریخی شہر بھوپال جس میں ہم کو دوبار حاضری کا موقع ملا ہے پہلی بار قیام مختصر رہا تھا اور تشنہ۔ میری دیرینہ تمنا تھی کہ اس تاریخی اور حسین شہر کو پھر سے دیکھوں، یہاں کے لوگوں کی محبت سے لطف اندوز ہوسکوں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے ہم کلام ہوں۔

آپ کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ آپ نے اقبال کی آخری عمر میں میزبانی کی اور یہ آپ کا شہر تیرتھ ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے لیے۔ آپ اُردو دوست ہیں، اُردو نواز ہیں، اس شہر کی ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں اور کارناموں کا ذکر دور دور تک کیا جاتا ہے۔ آپ نے بہت اچھے اور بڑے لکھنے والے ہم کو بھی عطا کیے ہیں۔ پاکستان میں محسن بھوپالی۔ صہبا لکھنوی، عذرا جمال سب آپ کے یہاں ہی سے گئے ہیں۔'' پھر کچھ دیر وقفہ رہا اس کے بعد فیضؔ نے کہا۔ ''ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات ہوں وہ مرحلہ جلد آئے کہ ہم لوگ یہاں آئیں اور آپ کی وہاں پذیرائی کریں اور اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے کرسکیں۔

اور اب جو یہ سلسلہ شروع ہوا ہے، باہم میل جول کا، التفات کا، تو وہ بڑھے گا اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے اور نہ ہمارے پاس طبل و علم ہے نہ ملک و مال ہم تو صرف دل جلانا جانتے ہیں۔ ہم پر نوازشوں کی کتنی بارش آپ نے کی وہ ہمارے لیے یادگار ہے۔

ایک واقعہ ہمیں یاد آ رہا ہے کہ ایک بار ہم ماسکو سے واپس آ رہے تھے۔ وہاں ایرپورٹ میں ہماری بیٹی بھی لندن سے آ رہی تھی۔ الوداع کہنے کے لیے ہمارے احباب اور دوست بہت بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ جب ہم جہاز میں اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تو لندن سے سوار ہونے والے ایک بڑے میاں نے ہم سے پوچھا ''کیا آپ کسی جگہ کے وزیر ہیں؟'' ہم نے کہا۔ ''نہیں۔'' ''تو پھر بزنس مین؟'' ہم نے کہا۔ ''وہ بھی نہیں۔'' وہ حیران ہوا ''تو پھر اتنے لوگ آپ کو الوداع کہنے کیوں آئے؟'' ہم نے کہا۔ ''ہمارے دوست ہیں۔ ہم سے محبت کرتے ہیں اور محبت پاتے ہیں۔''

بہت سے لوگ کہتے ہیں ہماری قدر نہیں ہوئی۔ غالباً وہ قدر کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ مال و دولت کی ریل پیل ہو۔ ہم نے تو محبت کی اور محبت ملی اور اس سے زیادہ بڑھ کر ایک فنکار کی قدر دانی کیا ہوسکتی ہے جو لوگ محبت کرنا جانتے ہیں اور اس کے جواب میں محبت کا حوصلہ ملتا ہے تو وہ کسی وزارت عہدہ اور پیسے سے زیادہ ہے، اور

یہاں مجھے فیضؔ کا ایک شعر یاد آجاتا ہے......

غمِ جہاں ہو، رخِ یار ہو، کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

فیضؔ کی تقریر کے بیچ کئی بار تالیوں کا سیلاب آیا اور پھر انہوں نے شعر سنانا شروع کر دیئے۔ فیضؔ شعر کیا سناتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔

"لیجئے ہم وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے یہ کاروبار شروع ہوا تھا۔"

"اس زمانے کی ایک غزل سنئے......"

"......اب شاعر کے نام سے زیادہ گانے والے کا نام لیا جاتا ہے سو ہم کہتے ہیں یہ تو مہدی حسن کی غزل ہے یا نور جہاں کی ہے۔"

فیضؔ ایک گھنٹے تک مسلسل اپنا کلام سناتے رہے۔ فرمائشیں ختم ہی نہ ہونے میں آرہی تھیں اور فیضؔ بڑی خندہ پیشانی سے سب کی فرمائش پوری کر رہے تھے، جیسے جن کے لیے یہ تخلیق ہے وہ یہ ہی ہیں اور مجھے یہاں میر تقی میر یاد آگئے......

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

منتظمین نے مجبوراً اشوک باجپائی کو شکریہ ادا کرنے کے لیے بلا لیا ہے۔ فیضؔ اسٹیج سے نیچے تشریف لا رہے ہیں۔ عوامی سیلاب جیسے ہر طرف سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ میں اس سیلاب میں تنکے کی طرح بہتا ہوا باہر نکل آیا ہوں، سیفیہ کالج کے پرنسپل شکور خاں سامنے ہی نظر آجاتے ہیں۔ میں آگے بڑھ کر اُن سے کہتا ہوں کہ "فیضؔ سیفیہ کالج میں پرسوں آنے پر رضا مند ہو گئے ہیں۔ وہ آگے بڑھتے ہیں۔ چلو میں ان سے خود درخواست کروں گا۔ سیفیہ کالج کے سکریٹری اور صوبائی انجمن ترقی اُردو ہند کے صدر جناب فخرالدین بھی ساتھ ہیں۔ فیضؔ کے لیے جو گاڑی مہیا کی گئی ہے اس کے سامنے بھیڑ ہے مگر شکور خاں صاحب کا ایک طالب علم جو پولیس انسپکٹر کی وردی میں

ملبوس تھا فوراً ان کے لیے جگہ بناتا ہے اور شکور صاحب فیضؔ کو باقاعدہ کالج آنے کی دعوت دے دیتے ہیں۔

گاڑیاں چل پڑی ہیں۔ بھیڑ میں شکور صاحب کا ساتھ چھوٹ گیا ہے، لیکن اس بھیڑ سے کوئی وحشت نہیں ہوتی۔ کوئی اجنبی پن نہیں لگتا ہے کہ یہ سب محبِّ فیضؔ ہیں، فیضؔ کو چاہنے والے، محبت کرنے والے۔

.... یہ کوئی ہنگامی فسادی بھیڑ نہیں ہے۔

جو انسانی خون کی پیاسی ہوتی ہے...... یہ تو امن دوست شاعر کی پذیرائی میں آنے والے لوگ ہیں۔

امن کے دوست،

امن کے نقیب۔

دن: ۱۶ر ستمبر ۱۹۷۸ء

وقت: دن خاموشی سے لیلائے شب سے مات کھاتا ہوا۔

مقام: للت کلا پریشد

فیضؔ احمد فیضؔ ایک نام ایک عہد۔ ایک روایت حق کی، سچائی کی اور نیکی کی۔ ایک آواز جو مظلوموں کے خلاف ظلم سے برسرِ پیکار ہے، جو اس دُنیا کی ازلی کشمکش میں یزداں کا نمائندہ ہے۔ اس کے علاوہ فیضؔ ادیب ہے، شاعر ہے، اور فنکار بھی، وہ کالج میں لیکچر بھی دیتا رہا اور فوج میں افسر بھی رہا اور اخبارات کا ایڈیٹر بھی۔ اس نے فلم بھی بنائی۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک سے منسلک ہے اور ٹریڈ یونین سے بھی۔ وہ انسان اور اس کی نیکی اور اچھائیوں سے پیار کرتا ہے۔ اسے زندگی اور اس کی اعلیٰ اقدار سے محبت ہے۔ اُسے تخلیقی قوتوں سے پیار ہے، وہ محبِّ وطن ہے اور دُنیا بھر کی آزادی کا محبِّ بھی اور اسی پیار، اسی محبت کی وجہ سے وہ بدی کا اور جنگ کا اور تباہی کا دشمن ہے۔ وہ سامراج سے نفرت کرتا ہے۔ وہ جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ چاہتا ہے۔

اس نے مقتل میں جانے کی شان ہی سلامت نہیں رکھی بلکہ جان دینے سے فرار بھی اختیار نہیں کیا اور جب تک لب آزاد ہیں وہ سچ بولتا رہے گا۔ ''للت کلا پریشد'' کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے خیالات کی پوزیشن نے مجھے بیدم سا کر دیا تھا۔ میں ستانے کے لیے کلا پریشد کے ہال کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔

جگہ جگہ جدید پینٹنگ کے شاہکار لگے ہیں۔ Land scape ہو یا پورٹریٹ تجرید کے دھندلے عکس اور خطوط کے طلسم نے سب کو اسیر کر رکھا ہے۔ کچھ مجسمے بھی رکھے ہیں، عجیب و غریب شکلوں کے جنس اور صنعتی زندگی کے صد ہزار پہلو لیے ہوئے۔ میں سوچتا ہوں کہ وسط ہند کا یہ فنون گھر کیا صرف جدید شاہکاروں کو ہی سینے سے لگائے رہے گا؟ کیا ماضی بعید اور ماضی قریب سے اس کا سلسلہ بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ اس ارض پاک سے کیسے کیسے نامور فنکار اٹھے اور فنون کی دُنیا میں اپنا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت کر گئے۔ مگر یہ کیا کہ اس سرکاری فنون گھر میں ان کے قدموں کے نشان تک مفقود ہیں؟ تان سین، باز بہادر اور روپ متی کے گیت۔ سُر اور راگنیاں آج بھی ہمارے خون میں گھلے ملے ہیں۔ ہزاروں سال پرانے سانچی کے استوپ کی نقاشی اور کھجورا ہو کے مندروں میں بنے جنس کی تہہ در تہہ علامات اور معنویت کو جیسے پتھروں میں تراشا نہ ہو اشعار میں ڈھال دیا ہو، مانڈو کے محلوں کا حسن اور بھوپال کی مسجدوں کی عظمت، پہاڑوں، تالابوں اور ندیوں کا حسن جو تصویروں میں مجسم ہو گیا۔ اس سرزمین کے کیسے کیسے نقش ہیں کہ جن کا اس فنون گھر میں پتہ ہی نہیں۔ ہائے کیسا کم قیمت اور کتنا کم اہم ہے یہ للت کلا بھون کہ جس خطہ پاک نے ہندی کے عظیم شاعروں، ناقدوں اور کہانی کاروں کو جما اور جو اُردو فارسی اور عربی کے بین الاقوامی ادیبوں کی آماجگاہ رہا۔ ان کی کوئی تصویر کوئی یادگار یہاں نہیں اور افسوس تو یہ ہے کہ اس عظیم صوبے کی راجدھانی میں بھی کوئی جگہ کوئی مقام ان کے لیے نہیں، ویسے کہنے کو یہاں ٹیگور بھون بھی ہے، ہندی بھون بھی، پتر کار بھون بھی اور شاید اُردو گھر بھی بن جائے۔ مگر کیا عمارتیں صرف چونے، پتھر، گارے، سیمنٹ کی عمارتیں ہی سب کچھ ہوتی ہیں؟ خونِ جگر کے بغیر اور بنا سخت کوشی

کے کیا زندگی کا جام آبگیں ہوسکتا ہے......؟ 'ہلو'۔ 'ہلو'۔ کب آئے'' کی آوازیں سن کر میں چونک جاتا ہوں۔ کلا پریشد کا ٹیرس جیسے انسانوں سے چھلکنے ہی والا ہے۔ آسمان پر مشرقی کونے میں زرد روشنی ہو رہی ہے۔ شاید چاند نکلنے والا ہے۔ ٹیرس پر آتی ہوئی بوگن ویلیا کی شاخوں میں پھول چمک رہے ہیں۔ سامنے ہی اسٹیج بنے ہیں اور پورے ٹیرس پر سفید چاندنی کا فرش ہے۔ فضل تابش اپنے پٹھانی خدوخال اور پُرخلوص بھوپالی لہجے میں مجھے بلا رہے ہیں۔ ''ارے خاں۔ ادھر آؤ۔'' مگر میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے روداد لکھنا ہے اور فضل تابش کے پاس بیٹھ کر لکھنا ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی باتوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میں ایک کونے کی طرف بڑھ جاتا ہوں اور وہاں ٹیرس پر بنی دیوار کے سہارے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ فیضؔ ابھی تک نہیں آئے ہیں۔

کلا پریشد کے بالکل سامنے ٹیگور بھون کی عمارت ہے اور بیچ میں 'بان گنگا'۔ دونوں طرف سڑکوں پر چلتا ہوا ٹریفک، دور شمال میں بنی اونچی عمارتیں اور جنوب میں تالاب کا چمکتا پانی۔ اس جگہ قدیم اور جدید شہر کا سنگم ہے۔ اس میں نفاست، نزاکت ہے اور خوبصورتی ہر منظر ہر زاویہ سے آشکارا ہے۔ اتنے ہی میں نیچے سے موٹریں رکنے کی آواز آتی ہے اور لیجئے فیضؔ آگئے۔ سفید سفاری سوٹ پہنے، چمکتی آنکھیں، ہونٹوں پر تبسم کی لکیر اور سرخ چمکتا چہرہ، ہاتھ میں سلگتا سگریٹ۔ آگے پیچھے بھاگتا ہجوم اور اب ہر طرف خاموشی ہے۔ فیضؔ سب سے سلام دُعا کرتے ہوئے اسٹیج پر پہنچ گئے ہیں۔ اشوک باجپائی للت کلا پریشد کے سکریٹری ان کا بڑھ کر استقبال کرتے ہیں۔ ساری نگاہیں اسٹیج پر لگی ہیں۔ اشوک باجپائی ہندی کے بڑے سلجھے ہوئے شاعر اور اچھے ناقد ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں:

''ہندوستانی اور کبھی کبھی بین الاقوامی فنکاروں سے بحث و مباحثہ کرنے کا للت کلا پریشد انتظام کرتی ہے۔ فیضؔ احمد فیضؔ ایک اہم بین الاقوامی شخصیت ہیں۔ جو بھی آج کے جدید دور میں شاعری کرتا ہے یا شعر سے دلچسپی رکھتا ہے، ان کے لیے یہ نام اہم بھی ہے اور ایک قسم کا گھریلو بھی۔ ان کا تعارف کرانا میں سمجھتا ہوں کہ غیر ضروری

ہے۔ اس وقت ان سے کھلی بات چیت ہوگی جس میں سب حصہ لیں گے۔ مگر اس بحث مباحثہ سے پہلے فیضؔ گائین کا پروگرام ہے۔ فنکار ہیں۔ ثروت حسین۔ اسماء منان۔ ایس حفیظ اور جگدیش ٹھاکر۔"

ثروت حسین اسٹیج پر آتے ہیں اور فیضؔ کی مشہور غزل......

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے

......شروع کرتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ فیضؔ کو اپنے سیاسی عقائد اور ثقافتی مسلک کی بنا پر ایک متنازعہ شخصیت سمجھا جاتا ہے، لیکن ان کی شاعری میں غنائیت سے شاید ہی کسی کو کلام ہو اور یہ ہی وہ عنصر ہے جس نے ان کے اشعار کو نغمہ سرائی کے لیے بے حد موزوں بنا دیا ہے۔ فیضؔ کا کلام یوں تو بے شمار گانے والوں نے گایا ہے لیکن ان کی طرزیں شاید ہی معیار کے اوسط سے پیش ہوئی ہوں۔ ثروت حسین کی دھن بھی معمولی سی تھی گو یہ اور بات ہے کہ داد و تحسین انہوں نے حاصل کی مگر جب ایس۔ حفیظ نے......

یوں سجا چاند کہ جھلکا تیرے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا میرے ہمراز کا رنگ

شروع کی تو سماں بندھ گیا۔ ایس حفیظ کی آواز میں بے حد ملائمت ہے اور وہ نازک سی نازک جگہوں کو بھی بڑی آسانی سے ادا کر رہے تھے۔ چاند نے بھی آسمان کے مشرقی دامن سے دھیرے دھیرے طلوع ہونا شروع کر دیا تھا۔ غالباً یہ ۱۳رویں یا ۱۴رویں شب کا چاند تھا' گہرا زرد اور حفیظ صاحب اس شعر تک آ پہنچے تھے......

ایک سخن اور کہ یہ رنگِ تکلم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سامعین' نیلگوں آسمان پر زرد چاند، بوگن ویلیا کے پھول، دور سڑکوں پر بہتا ٹریفک اور چاند کی طرح چمکتا پانی سب کے سب ساکت تھے، حفیظ کی آواز کے جادو سے اور فیضؔ کے کلام کے رنگ سے، پھر اسماء منان آئیں:

کب تک دل کی خیر منائیں کب تک راہ دکھلاؤ گے

آواز میں ٹھہراؤ بھی تھا اور درد بھی۔ حفیظ اور اسماء منان دونوں ہی شوقین فنکار ہیں، کسی نے بھی موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ صرف نجی شوق اور ذوق سلیم کی رہنمائی میں اپنی آواز کے شعلوں کو فروزاں کرتے ہیں۔ مگر جب جگدیش ٹھاکر نے گیت چھیڑا......

اب کیا دیکھیں راہ تمہاری، بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات

تو احساس ہوا کہ یہ کوئی اناڑی آدمی کی آواز نہیں بلکہ ان کو کلاسیکی موسیقی کی باریکیوں کی اچھی سمجھ ہے، اور اس گیت میں راگوں کی جھلکیاں صاف نمایاں تھیں۔ خاموشی، چار سو سناٹا اور اس سب سے ابھرتی ڈوبتی، ڈولتی آواز ''چھوڑو غم کی بات......''

فیضؔ گائین ختم ہوتے ہی داد و تحسین کی آوازوں نے پورے ماحول کو اسیر کر لیا۔ اسی بیچ راشدہ سلطان نے فیضؔ پر لکھی ہوئی ڈزرٹیشن پیش کی۔ فیضؔ نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''شکریہ۔ لیکن ابھی اس کی ضرورت کیا تھی۔'' خالد محمود میرے پاس آ گئے ہیں اور ہم لوگ دلّی کے بارے میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔

دلّی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب
رہتے ہیں منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک بھی لوٹ کے ویراں نہ کر سکا
ہم رہنے والے ہیں اسی کوئے بہار کے

اتنے میں اشوک باجپائی کی آواز سے ہمارا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ ''فیضؔ صاحب نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم جتنی دیر چاہیں 'فنونِ لطیفہ' شاعری اور اس کے سماجی محرکات اور مسائل پر جب تک چاہیں، ان سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ اب آپ لوگ کچھ سوال کریں تاکہ بحث کا آغاز ہو سکے۔''

سب لوگ خاموش ہیں، کوئی سوال نہیں۔ شاید وہ فیضؔ سے صرف شاعری سننا چاہتے ہیں۔ یہ موقع بار بار کہاں آتا ہے۔ آج کی رات مہربان ہے سحر کو بار بار تلاش

میں نہیں جانا ہے۔ اس وقت فیضؔ کچھ بھی سنائیں سب گوش برآواز ہیں۔ چاہے یہ آتش کی جوانی کا قصہ ہو یا وطن کی گلیوں پر نثار ہونے کا جذبہ یا ہونٹوں کی لالی کی چاہت میں دار کی خشک ٹہنی پر لٹکنے کا خواب یا کوئی حرف سادہ کہ جو فیضؔ کی زبان پر آکر اعجاز کا رنگ اختیار کرلے۔ اشوک باجپائی سے زیادہ دیر خاموش نہیں رہا جاتا' آخر کو وہ کلا پریشد کے روح رواں ہیں۔ خود ہی بحث کا آغاز کر دیتے ہیں۔

''فیضؔ صاحب! آپ اوّل تو یہ بتائیے کہ پاکستان میں جو شاعری اس وقت کی جارہی ہے اس کا انداز کیا ہے؟ ہندوستان میں خاص طور پر ترقی پسندی نئے مرحلے میں داخل ہوگئی ہے وہاں صورت حال کیا ہے؟ آپ کی یا آپ کے ملک کی شاعری کے تجربات میں کیا تبدیلیاں آرہی ہیں؟ اور دونوں ملکوں میں کلچرل لین دین کی کتنی گنجائش ہے؟ اور آپ کے یہاں دانشور اس بارے میں کس طرح سوچتے ہیں؟'' پھر رک کر کہا۔ ''آپ لوگ اور سوال کریں، لیکن یاد رکھیں سوال جواب نہیں ہوتے، اس لیے مختصر ہوں۔ ویسے تو آپ فیضؔ صاحب سے یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کون سی قسم کا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں، لیکن پھر سلسلہ دراز ہوجائے گا۔ سوال ایسے کریں جس میں ہماری، آپ کی اور دوسروں کی دلچسپی ہو۔ ایک مغربی دانشور نے کہا تھا کہ ''آتما کا لوہا کھانا'' تو سوال ایسا ہو جو ان کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد کرے۔''

اشوک باجپائی جب یہ سوال کر رہے تھے تو مجھے ہندی کے مشہور شاعر بھوانی پرشاد مشرا کی یاد نہ جانے کیوں آگئی۔ انہوں نے فیضؔ سے کہا تھا۔ ''فیضؔ صاحب ہم آپ کو پڑھتے ہیں آپ ہم کو نہیں پڑھتے۔ ہم بھی بہت محنت سے لکھتے ہیں، جیل بھی جاتے ہیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہماری آواز اس پورے برصغیر میں بھی نہیں سمجھی جاتی جہاں ایک جیسا کلچر اور ملتی جلتی زبان ہے۔ ہماری شاعری کو بھی اُردو رسم الخط میں لکھا جانا چاہیے' اور ہندی والوں سے بھی میری استدعا ہے کہ وہ زبان آسان استعمال کریں۔ انسان دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں اور واپس آجاتے ہیں لیکن شبد جاتے ہیں تو جم جاتے ہیں۔''
میرے خیالات کا تسلسل فیضؔ کی آواز سے ٹوٹ جاتا ہے وہ کہہ رہے ہیں......

''ہمارا کام تو شعر لکھنا ہے۔ دوسرا کیا لکھتا ہے؟ کیوں لکھتا ہے؟ کیسے لکھتا ہے؟ یہ دیکھنا دوسروں کا کام ہے۔ پاکستان کے متعلق آپ نے بہت بڑا سوال کیا ہے ہم مختصر جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک وہاں کے لکھنے والے صرف اُردو میں لکھتے تھے باقی زبانوں میں کیوں کہ تعلیم نہیں دی جاتی تھی اس لیے لوگوں کے دل زبان اور ذہن کی ٹریننگ نہ ہوتی تھی۔ لے دے کے صرف سندھ کے شاہ عبد اللطیف بھٹائی اور سرحد کے خوشحال خاں خٹک کو ہی لوگ جانتے تھے۔ پھر اُردو کے ساتھ سیاسی معاملہ بھی تھا کہ اُردو کی ٹھیکیداری صرف مسلمانوں کی ہے۔ لیکن اب صورتِ حال بدل رہی ہے۔ لوگوں نے اپنی اپنی بولیوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے، اور علاقائی زبانوں میں اچھے اچھے ادیب اور شاعر پیدا ہو رہے ہیں جیسے سندھی ادیب شیخ ایاز، بلوچی کے گل خاں نظیر جو پچھلی حکومت میں وزیر تعلیم بھی تھے پھر پشتو کے عبدل خاں، ولی خاں اور اکبر خاں خٹک۔ پنجابی میں استاد دامن اور احمد راہی جیسے دانشور لکھ رہے ہیں اور یہ آزادی کے بعد نئی چیز پیدا ہوئی ہے۔ دوسرے اُردو نثر میں پہلے صرف کہانی لکھی جاتی تھی، وہی زیادہ مقبول بھی تھی۔ لیکن اب ناول لکھے جانے لگے، پبلشر کہتا ہے...... ''کہانی مت لاؤ، ناول لاؤ'' اور کچھ جدید دور کے ماحول کی عکاسی کے لیے بھی ناول ایک اہم ذریعہ ہے۔ ہمارے یہاں 'اداس نسلیں، خدا کی بستی' جیسے اچھے ناول لکھے گئے۔ عام طور سے ناول ان واقعات کے متعلق ہیں جو پارٹیشن کے بعد کے حالات نے پیدا کئے۔ دوسرے 'مہاجر ادب' جو ماضی کی یادگاروں پر لکھا گیا۔ خدیجہ مستور کا 'آنگن' اس کی اچھی مثال ہے۔ پھر ہمارے یہاں ایک عجیب قسم کا ناول لکھا گیا۔ اس کو پورے طریقے سے ناول تو نہ کہنا چاہیے۔ یہ محمود خالد اختر کا 'چاکی واڑا میں وصال' ہے یہ 'ڈکنس' کے اسٹائل پر لکھا گیا ہے۔ اس میں حقیقی شخصیتوں کو توڑ مروڑ کر طنزیہ مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک جاسوسی ناول نگار ہے۔ ایک آٹو گراف جمع کرنے والا ہے، اور یہ سارے کارٹون اور اس کے پیرائے انداز نے اس کو اُردو کا واحد انداز کا ناول بنا دیا ہے۔

ڈرامہ صرف ریڈیو کے لیے لکھے جاتے تھے۔ ایک انار کلی کو چھوڑ کر جو کبھی اسٹیج

نہیں ہوا تھا۔ اسٹیج تھا ہی نہیں تو ہوتا کیا۔ رفیع پیرزادہ اور امتیاز علی تاج نے بھی ریڈیو کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھے۔ ویسے آزادی کے دس سال اُدھر اور دس سال ادھر صرف ریڈیو ڈرامہ ہی لکھا گیا۔ اب یہ ہوا کہ آزادی کے بعد لاہور میں ایک اسٹیج قائم ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں آرٹ کونسل قائم ہوئی اور ۱۹۶۹ء میں یہ ادارہ ہماری تحویل میں دے دیا گیا تو ہم نے باقاعدہ کام شروع کیا۔ ترجمے وغیرہ کرائے لیکن مشکل یہ تھی کہ لڑکیاں اس کو غیر شریفانہ سمجھ کر اس میں حصہ نہیں لیتی تھیں۔ تب ہماری اور تاج کی بیٹیاں اسٹیج پر آنے لگیں اور اس کے بعد تو یہ بات شریفانہ مانی گئی حالانکہ پرفارمینس تو اب بھی نہیں ہے۔'' فیضؔ کی اس بات پر مجھے یاد آتا ہے کہ فیضؔ کی بیوی اور سالی بھی اسٹیج پر کام کیا کرتی تھیں اور اب جس کو فیضؔ نے اپنے آنگن میں تلسی کے پوتر بوٹے کی طرح گاڑ دیا ہے اور خود دُنیا کی کھوج میں چل پڑے ہیں۔ حالانکہ وہ تلسی کا پودا نہیں بجلی کی لہر گاڑ آئے ہیں اور یہ لہر مسلسل ان کے گرد تھرکتی ہے۔ ہر انگ سے ہر زاویے سے اور یہ جو ساری شہرت ہے یہ جو ناموری ہے اور جو عروج ہے اس میں اسی لہر کے ہزاروں رنگ اور زاویے پوشیدہ ہیں۔

فیضؔ آگے بول رہے ہیں۔ ''جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس میں کوئی بہت بڑا فرق تو نہیں آیا ہے۔ اقبال کی روایت سے ہم نے کانٹ چھانٹ کی، پھر میراجی اور راشد تھے۔ ہم تو سماجی باتیں کرتے تھے، وہ دوسرے قسم کے ساتھ پرانے استاد بھی تھے جو کہتے تھے 'الف' نہ گر جائے 'ب' نہ گر جائے، وہ بھی چل رہے ہیں۔ غزل میں نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ احسن علی خاں اور ظفر اقبال کے رنگ میں پرانے استعارے اور علامتیں ختم ہو رہی ہیں۔ نئی علامتوں کو رواج دیا جا رہا ہے۔ ان کے علاوہ ایک گروہ ہے جس کو جدید یا جدیدیت کہا جاتا ہے مگر ان کا اب وہ زور نہیں جو پچھلے دس بارہ سال پہلے تھا۔ اس میں بھی مختلف گروہ ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ نئے پن پر سنجیدگی سے سوچتے ہیں، کچھ وہ ہیں جو پرانے لوگوں سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ پھر یورپ سے لوٹ کر آنے والے ہیں جو امریکن یا مغربی ادب کی کتابیں پڑھ کر پاکستان میں بھی

ایسے ہی اسٹائل کا' ادب لکھنا چاہتے ہیں اور سماج و سماجی فکر کی پرواہ کئے بغیر آپس میں ہی بیٹھ کر ایک دوسرے کو داد دے لیتے ہیں۔

بہر حال ہمارے یہاں نئے تجربے ہو رہے ہیں اور ان تجربات کے لیے نئے لہجے اور آہنگ کی بات بھی چل رہی ہے، Prose Poetry ابھی وہاں پہنچی ہے۔ ہم حکم لگانا نہیں چاہتے۔ بہر حال بات ابھی تک آگے نہیں بڑھی ہے بعد میں شاید کوئی بڑا شاعر نکل آئے۔ پرانی لے اور آہنگ کو آپ چھوڑ سکتے ہیں، بشرطیکہ آپ کوئی نیا آہنگ پیدا کریں۔ ویسے تو روز مرہ کی زبان میں بھی آہنگ ہوتا ہے لیکن فنکارانہ اور دلکش انداز میں زبان کے استعمال کے لیے شیکسپیئر چاہیے۔ شاید نثری نظم کو بھی ایسا جینئس مل جائے۔ ایسا آدمی جس کو پرانی روایت کا بھرپور اعجاز ہو، گرفت ہو، تو شاید آپ کچھ نکال سکیں اور آپ نکال سکتے ہیں۔ مگر جس پودے کی جڑ کاٹ دی جائے وہ سرسبز نہیں ہوسکتا یہ حال روایت سے مکمل انحراف کی صورت میں ہوتا ہے۔"

میں سوچتا ہوں یہ عجیب بات ہے کہ سارے عروض کے پابند شعراء ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ روایت تو تشکیل دی جائے گی، ابھی تو راہ کے خار کم کرنے والے چلے۔ آگے گل و گلزار بھی مہکیں گے۔ خود فیضؔ اور ان کی نسل نے آزاد نظم پرانے سانچوں سے انحراف کی شکل میں ہی پیش کی تھی اور اب موجودہ نسل اسی راہ پر اگر کچھ قدم اور آگے بڑھاتی ہے تو برہمی کیسی۔ پھر یہ عہد تو سپر سانک عہد ہے۔ میں شاکی نظروں سے فیضؔ کی طرف دیکھتا ہوں ادھر فیضؔ کی گفتگو اب مصوری اور موقلم کی سرحدوں میں داخل ہوگئی ہے۔" وہ کہہ رہے ہیں۔ "مصوری میں پاکستان نے قابلِ لحاظ ترقی کی ہے۔ ہمارے زیادہ تر مصوروں نے امریکہ اور فرانس میں تعلیم پائی ہے مگر اب ہم نے خود ایک کالج کھول لیا ہے۔ "نیو اسکول آف آرٹس" تو پہلے سے ہی موجود تھا اب اس کی توسیع کر کے اسے 'نیشنل اسکول آف آرٹس' کر دیا گیا ہے۔

عبد الرحمٰن چغتائی کی عظیم روایت کو گپتا' شاکر علی اور صادقین نے بڑی خوبی سے آگے بڑھایا ہے۔ کبھی گرانی میں انقلابی انداز کی تبدیلیاں آئی ہیں۔ صادقین نے

دُنیا کا سب سے بڑا سیورل بنایا ہے جو ۲۲۰ فٹ لمبا ہے۔ اس کی وجہ سے craft میں بھی ترقی ہوئی ہے۔ پورے ملک کے لوک گیت جمع کیے گئے ہیں اور دستکاریوں کے نمونے اکٹھا کر کے ایک میوزیم قائم کیا گیا ہے۔ ایک دوسرا کلاسیکل میوزک میوزیم بھی ہے۔ یہ دونوں کام خود ہم نے شروع کیے تھے۔ تان سین سے لے کر موجودہ عہد تک جتنے گائین گزرے ہیں ان سب کی تصاویر ہم نے جمع کی ہیں اور ایسی نادر تصاویر بھی جو ہمارے سوا دُنیا میں اور کہیں نہیں اور ان سب گھرانوں کے شجرے اور حالات بھی جمع کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ان گھرانوں کی گائیگی کی خصوصیات جو ہیں اور ان کے خصوصی راگ، ان سب کو تقریباً ۲۰ ر لانگ پلے کارڈس کی شکل میں تیار کر لیا ہے اور یہاں آ کر بار بار ہمارے ملک میں گاڑی اٹک جاتی ہے۔

یہاں آپ لوگوں کو بہت سی سہولتیں میسر ہیں جو ہم کو نہیں ہیں۔ ٹیگور کی مہربانی سے آپ کے پورے ملک میں ٹیگور تھیٹر اور ہال بن گئے ہیں۔ جگہ جگہ سنگیت اکاڈمیز اور للت کلا اکاڈمی اور ناٹک اکیڈمیاں موجود ہیں۔ ہمارے یہاں صرف M.C.A. ہی ہے چنانچہ یہاں رونق گرمی بازار زیادہ ہے۔

بہرحال وہاں اور یہاں دونوں ہی جگہ نئی چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ نئے تجربے کیے جا رہے ہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ پرانی روایتوں سے دوبارہ ناطہ جوڑا جائے۔ دوسو سالہ غلامی کا ملمع جو ہم نے اپنے اوپر چڑھایا ہے اس کو اتارنا چاہیے۔ یہ بات درست ہے کہ ہم ٹیکنیکی فائدہ اٹھائیں مثلاً نوٹنکی ہے یا پھر بنگال میں جاترا ہے اس کو مغربی ٹیکنک کے انداز میں لے کر ہم اپنے کلچر میں ڈھال سکتے ہیں۔ اب موسیقی کو ہی لے لیجیے۔ پرانے زمانے میں پانچ دس شاگرد ہوتے تھے۔ ان کو بیٹھ کر استاد سکھاتے تھے، اب ہم بڑی بڑی اکیڈمیاں بناتے ہیں۔ مگر ان سے بڑا موسیقار پیدا نہیں ہوتا۔ موسیقی کار اکیڈمی سے نہیں نکلتا۔ اس کے لیے وہی پرانے طریقے نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر فیضؔ خاموش ہو گئے۔ ذرا رک کے پھر کہا۔ ''لو جی۔ لمبا لیکچر ہو گیا، کیا کریں، سوال ہی لمبا تھا۔''

فیضؔ کے خاموش ہوتے ہی غزلوں کی نظموں کی اور قطعات کی فرمائش ہونے لگی اور میں سوچتا ہوں کہ مدھیہ پردیش جو بنیادی طور پر ہندی ریاست ہے اور یہ فیضؔ کے سامعین جن میں زیادہ تعداد غیر اُردو داں حضرات کی ہے کس طرح اُردو اشعار اور غزلوں کی فرمائش کررہے ہیں۔ شاید یہ فیضؔ کی شاعری اور ان کی ذات کا فیضان ہے......

کوئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آگئے تو گرمیِ بازار دیکھنا

فیضؔ کی آواز پھر مجھے ماحول میں لے آئی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ ''اب جلدی سے سن لیجئے۔ ہم کھانا کھانے جائیں گے۔'' ہنسی کی آواز سے ماحول کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ فیضؔ کہتے ہیں۔ ''اچھا شعر سنائیں— تو لیجئے شعر سن لیجئے......

درد تھم جائے گا۔ غم نہ کر، غم نہ کر

یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ فیضؔ کے اشعار سامعین کو تقریباً پورے پورے یاد ہیں۔ وہ ایک مصرعہ پڑھتے ہیں باقی لوگ خود ہی پورا کر دیتے ہیں۔ جہاں فیضؔ اٹکتے ہیں وہاں بول دیتے ہیں، جہاں بھولتے ہیں وہاں ٹوک دیتے ہیں اور کبھی کبھی تو فرمائش کے بہانے خود ہی پورا کا پورا قطعہ سنا دیتے ہیں۔ فیضؔ شعر پر شعر غزل پر غزل سناتے چلے گئے۔ وقت کی رفتار جیسے مدھم پڑ گئی تھی۔ پھر بھی آدھا گھنٹہ اور نکل گیا۔ فیضؔ تھک کر خاموش ہوگئے...... مگر سامعین بے چین ہیں۔

''اور سنائیے۔''

''ونس مور''

پیچھے سے کسی نے مصرعہ اچھالا۔ ع......

''تیری امید' تیرا انتظار کب سے تھا''

فیضؔ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اجی اچھا۔ ''ہم کے ٹھہرے اجنبی''

''یہ ہی سنائیے۔'' پبلک نے اصرار کیا۔

فیض نے نظم شروع کر دی۔ پھر سبب تالیف بتایا اور جب ختم ہوئی تو فیض نے کہا۔
''آپ کے گھر والوں کو انتظار نہیں ہے؟ مگر میرا انتظار دوسروں کے گھر میں ہے۔''
سارے ٹیرس پر لوگ کھڑے ہو گئے ہیں۔ فیض ان کے بیچ سے نکل رہے ہیں۔ ہنستے، مسکراتے، مذاق کرتے۔ جملہ چست کرتے۔ میں بھی عوامی ریلے کے ساتھ بہہ رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ، کبھی تیز۔ سیڑھیوں پر بھیڑ اس طرح اتر رہی ہے جیسے آبشار گر رہا ہو۔

للت کلا اکیڈمی کے سامنے چودھویں کا چاند روشن ہے۔ رات کی رانی مہک رہی ہے اور سامنے چھوٹے تالاب کا پانی چاندی کی طرح چمک رہا ہے۔ کنول کے پھول ساکت ہیں اور میرے پاس سے کچھ زندہ ہنستے، کھلکھلاتے مہکتے پھول گزر گئے ہیں۔ مجھے محمد علی تاج کا ایک شعر بے ساختہ یاد آ گیا ہے......

سنور کر آؤ اے لالہ رخو، آئینہ خانوں سے
تمہارے شہر میں اک ناقدِ اصنام آیا ہے

دن: ۱۷ر ستمبر ۱۹۷۸ء
وقت: شہزادہ خاور کے سفر کی یہ ہے منزلِ اولیں
مقام: سیفیہ کالج

کھڑکی کے شیشے پر کھٹ کھٹ کی آواز سے نیند کھل گئی۔ روز صبح یہ چڑیا میری کھڑکی پر دستک دیتی ہے اور میں بیدار ہو جاتا ہوں، گھڑی کی طرف دیکھتا ہوں، ۸ بج گئے ہیں۔ موسم خوشگوار ہے۔ جلدی جلدی مشینی انداز میں شیو کرتا ہوں۔ ناشتہ آ گیا ہے اور میں فیض کے بارے میں سوچتے سوچتے ناشتہ کر رہا ہوں۔ فیض کو بھوپال آئے ۴۸ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ ان کا کتنا مصروف پروگرام ہے۔ کل وہ روزنامہ آفتابِ جدید اور روزنامہ ''افکار'' کے دفتر بھی گئے اور مہارانی لکشمی بائی گرلس کالج میں بھی تشریف لے گئے جہاں ان کی پذیرائی ہوئی۔ آج کل بھوپال کے اخبارات فیض کے کارناموں اور

کلام سے بھرے ہوتے ہیں، ویسے وہ خود صحافی ہیں اور انہوں نے بحیثیت صحافی کے آزادی اور جمہوریت کے لیے جو قربانیاں دیں اس کی وجہ سے ان کے ہم وطنوں کا سر اونچا ہوا۔ درحقیقت فیضؔ ہم سب کے ضمیر کی آواز بن گئے۔ دُنیا میں محنت کشوں پر جہاں بھی ظلم ہوا تو فیضؔ نے سب سے پہلے آواز اٹھائی۔ ناشتہ سوچوں کے درمیان ہی ختم ہوگیا۔ میں تیار ہو کر کالج کے لیے روانہ ہوگیا۔

جانی پہچانی سڑکیں، سیفیہ کالج روڈ، کالج کا بڑا گیٹ، کیمپس میں بنی مسجد اور تین طرف پھیلی سہ منزلہ عمارت یہ ہے سیفیہ کالج۔ ایک شریف انسان کے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر۔ اس کالج کے ذرے ذرے میں سجاد حسین کا پسینہ خون بن کر رواں ہے۔ ایک فرد واحد نے جو خود پڑھا لکھا نہ تھا۔ اس نے اپنے زور بازو سے کمائی حق حلال کی دولت قوم کو علم سکھانے کے لیے صرف کر دی۔ میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے۔ سنگِ مرمر کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا میں شعبہ اُردو میں پہنچ گیا ہوں۔ برآمدے میں سے دیکھتے ہوئے سرو کے درختوں نے میرا استقبال کیا ہے۔ شعبہ میں صدر شعبہ عبدالقوی دسنوی صاحب سخت مصروف ہیں۔ کسی سے میز صاف کروا رہے ہیں، کسی کو اوپن ایرتھیٹر کی طرف دوڑا رہے ہیں کہ وہ وہاں کا انتظام دیکھے اور کبھی خود ہی کپڑا لے کر صفائی کرنے لگتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی گھڑی کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ گھڑی کی سوئیاں دس بجے کا اعلان کر رہی ہیں۔ ''کوئی بات نہیں صرف ایک گھنٹہ لیٹ ہیں۔'' وہ مسکرا کر کہتے ہیں۔ میں شرمندہ ہوں سوچتا ہوں کہ کہوں ''اقبال ہمیشہ لیٹ آتا ہے۔'' یا پھر یہ کہ کمبخت وقت ہمیشہ میری رفتار سے تیز چلتا ہے۔ شعبہ میں آفاق حسین صدیقی، محمد نعمان خاں، خورشید اختر، خالد محمود، محمود ہاشمی، حلیمہ صلاح الدین، ریحانہ، سارے پرانے ساتھی جمع ہیں۔ 'کاروانِ سیفیہ' مکمل تو نہیں پھر بھی بہت سے شریک کار موجود ہیں۔ دسنوی صاحب کہتے ہیں۔ ''چلیے نیچے چلتے ہیں۔'' فیضؔ کی پذیرائی کے لیے ہم جیسے ہی نیچے پہنچے، کالج کے طویل وعریض صحن میں گاڑیاں آنے لگتی ہیں۔ لیجیے فیضؔ بھی آگئے ہیں۔ فخرو بھائی نے ان کو بڑھ کر خوش آمدید کہا ہے۔ سب لوگ اوپن ایرتھیٹر کی

جانب گامزن ہیں۔ تھیٹر کا کھلا ہال طلباء سے بھرا ہوا ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے رنگ برنگے کپڑوں نے پورے ہال کو شوخ چمکتے رنگوں میں تبدیل کر دیا ہے۔

کئی فٹ لمبے اسٹیج پر فیضؔ اور ان کے شائقین اور شعراء اور کالج انتظامیہ کے افراد سب ہی موجود ہیں، کوئی بھی فیضؔ سے دور نہیں رہنا چاہتا اور فیضؔ کے مسکراتے ہونٹ' پرسکون چہرہ' پیار' خلوص اور نیکی اور سچائی اور ہمدردی کا مظہر ہے۔ مجھے یہاں ان کی ایک تقریر یاد آ رہی ہے جو انہوں نے ۱۹ر مارچ کو لائل پور پاکستان میں اپنی ۶۵ ویں سالگرہ کے موقع پر کی تھی۔ ''شعر کہنا تو کوئی بات نہیں۔ نہ اخبار کی ایڈیٹری کوئی کمال ہے۔ بہت سے لوگ ایڈیٹری کرتے ہیں۔ تھوڑا بہت جو ہم نے کیا، اس میں یہ کہ جھوٹ نہ بولیں۔ زندگی میں غالباً کبھی کبھی یہ مجبوری تو ہو جاتی ہے کہ آدمی سچ نہ بول سکے۔ لیکن اس پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ جھوٹ بولو۔ چنانچہ اگر ہم نے سچ نہ بھی بولا تو کوشش کی کہ کم از کم جھوٹ بھی نہ بولیں اور جہاں تک حق اپنے بس میں ہے ادا کرتے رہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے......

چوں حرفِ حق بلند شود دار می رسد

حرفِ حق کی وجہ سے دار پر چڑھنے کی ہمت تو نہیں تو کم از کم جھوٹ تو نہ بولو۔ دوسری کوشش یہ کی کہ کسی قسم کی منافقت یا بد دیانتی نہ کریں، کوئی ایسی بات نہ کہیں جس کی وجہ سے اپنے آپ پر یا کسی دوسرے پر اخلاقی طور سے کوئی حرف آئے۔ تیسرے یہ کہ لوگوں سے محبت کی ہے، سب سے، اس کے علاوہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اگر آپ نے یہ سب قبول کر لیا ہے اور ان داغ ہائے سینہ کی آپ نے کوئی قیمت لگائی ہے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔''

مائک پر پرنسپل شکور خاں کی محبت آمیز پُر خلوص آواز میرا دھیان اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

''مہمان محترم۔ یہ ادارہ آپ سے غائبانہ متعارف ہے۔ آپ کی شہرت بوئے گل کی طرح ہمارے ادارے میں برسوں سے پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے اساتذہ اور طلبا

آپ کے کلام کے مطالعے اور تدریس میں مصروف ہیں۔ ہم خوش ہیں کہ ایک عظیم شاعر اور اچھے استاد کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔'' اور جب ذکر سیفیہ کا ہو تو ملاّ سجاد حسین کا نام نامی آپ ہی آپ ہونٹوں پر آجاتا ہے۔ شکور صاحب نے بڑی خوبصورتی سے سجاد حسین صاحب کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

توان کردم تمامی عمر را مصروفِ آب و گل
کہ شاید یک دمے صاحب ولے آں جا کند منزل

اے صاحبِ دل انسان، علم کے علمبردار، محبت کے مسیحا، آج اس ادارہ کے در و دیوار بھی آپ کا خیر مقدم کر رہے ہیں آپ کی آمد پر ہم خوش ہیں کہ برسوں سے جو انتظار تھا اس کے لمحات ختم ہوئے......''

میں سوچتا ہوں انتظار ختم کب ہوا۔ فیضؔ تو نسیم صبح کے جھونکے کی طرح آئے ہیں اور اب جانے والے بھی ہیں اور ہم پھر گلوں میں رنگ بھرنے اور بادِ بہار کے چلنے کے منتظر رہیں گے۔ ہماری نظروں میں ان کی یاد کے پھول مہکتے اور امید کی شمعیں جلتی رہیں گی اور ہم سوچتے رہیں گے کہ شاید کسی سہانے لمحے، کسی گھڑی فیضؔ واپس آئیں اور ہم ان کی پذیرائی اس سے بھی زیادہ شاندار طریقے سے کر سکیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ شکور صاحب کے بعد اختر سعید صاحب مائک پر تشریف لا رہے ہیں۔ اختر سعید چونکہ وکیل ہیں، اس لیے ہمیشہ اپنی بات لمبے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ مگر یہاں وہ کہہ رہے ہیں:

''فیضؔ کے بارے میں چند لفظوں میں اپنی بات پوری نہ کر سکوں گا۔ ویسے فیضؔ نے جو ہماری شاعری کو وقت کی آگہی بخشی ہے اور ایک نیا موڑ دیا ہے اس کا ہر شخص معترف ہے، اور آج شاعری جس راہ پر گامزن ہے اس کے قافلہ سالار فیضؔ ہیں......اور مجھے اس بات پر فیضؔ کا ایک شعر یاد آتا ہے......

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ، گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

پروفیسر عبد القوی دسنوی مائک پر آ گئے ہیں اور سپاس نامہ پیش کر رہے ہیں۔ دسنوی صاحب بھوپال اور سیفیہ کالج کی آبرو ہیں۔ شعبہ اُردو، اس کی مطبوعات اور اُردو میں طلباء کی تعداد۔ سب کچھ اُن کا رہین منت ہے۔ یہاں حق پوشی، چشم پوشی، اور غلط کوشی ہوگی کہ اگر اس بات کا اعتراف نہ کیا جائے کہ دسنوی صاحب نے اپنی لگن، خلوص اور کاوش خونِ جگر سے اُردو کی ایک شمع جلائی ہے اور اس تنہا شمع نے لا تعداد چراغوں کو روشن کردیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس آپادھاپی کی صدی میں جہاں رفاقتوں کی طلب، کچی کلیوں کی مہک، لہو کی تپش، موت کے نوحے، سہاگ کے گیت، جمالِ یار کی بو العجبیاں، ویتنام کا امن، فلسطینیوں کی مظلومی، ولز اور سیزر سگریٹ سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہوگئے ہیں۔ دُنیا ابلاغ کی سطح پر جتنی قریب آئی ہے، ستاروں کا طلسم جس آسانی سے ٹوٹا ہے، بشر کے درمیان واسطے اتنے ہی کمزور، ناقص اور بودے ثابت ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے وقت اور ایسے حالات میں قوی صاحب کی اپنے شاگردوں سے محبت اور خلوص اور ادب کے لیے بے پناہ لگن ہم کو حوصلہ دیتی ہے، ہمت بندھاتی ہے۔ تالیوں کے شور سے میں اپنے خیالوں سے نکل آتا ہوں۔ دسنوی صاحب سپاسنامہ پڑھ رہے ہیں اور کسی اچھے جملے پر تالیوں کا طوفان آیا ہے۔ میں ان کی طرف متوجہ ہوجاتا ہوں وہ کہہ رہے ہیں۔

"ہمارے عظیم شاعر، آپ صاحب علم ہیں، صاحب نظر ہیں، انسان دوست ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کی ہے۔ انسانوں کو زندگی کا حوصلہ دیا ہے۔ ان میں ہمت اور قوت پیدا کی ہے۔ انہیں زندگی کے راز سے آشنا کیا ہے۔ انہیں سچائی کا پرستار بنایا ہے، انہیں انسانیت کی خدمت گزاری سکھائی ہے۔ انہیں مفلسوں کی بے چارگی سے باخبر کیا ہے۔ انہیں مظلوموں کی آہ وزاری سے آشنا کیا ہے اور انہیں دردمندی عطا کی ہے۔

یہ سچ ہے کہ آپ تربیتِ لوح وقلم کے ذریعہ جو دل پر گزرتی رہی ہے اسے رقم ہی نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ اس کے اثر وتاثیر سے ایک دُنیا کو اپنا گرویدہ، شیدائی اور

مشتاق بناتے رہے ہیں۔ انہیں مشتاقوں میں سے چند نفوس آج سیفیہ کالج کے کھلے میدان میں جمع ہوئے ہیں تا کہ اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار نہایت خلوص اور سادگی کے ساتھ آپ کے حضور میں پیش کرسکیں اور آپ کو یہ بتا سکیں کہ ہم سینکڑوں میل دور بظاہر انجانے رہنے کے باوجود اپنے انسان دوست شاعر کے دل سے قدرداں ہیں۔"

میں دیکھ رہا ہوں دسنوی صاحب بے انتہا جذباتی انداز اور جوش وخروش سے سپاس نامہ پڑھ رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سپاسنامہ کو انہوں نے راتوں رات لکھا اور صبح تک طبع بھی کروالیا۔ اس پر بھی یہ سپاسنامہ اتنا شاندار اور پر وقار ہوگیا کہ اس کو سن کر ایسا لگ رہا ہے جیسے لفظوں میں جو بات کہی جا رہی ہے وہ دل سے نکلی ہے اس لیے اثر انگیز ہے۔ دسنوی صاحب کہہ رہے ہیں:

"ہماری دلی دُعا ہے کہ ایسے مواقع بار بار آئیں تا کہ ہمارے خلوص کے رشتے نہ صرف دو انسانوں بلکہ پھیل کر دو ملکوں کے درمیان مضبوط سے مضبوط تر ہوجائیں۔"

تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں دسنوی صاحب سپاسنامہ فیضؔ کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد معزز مہمان کی گلپوشی کی جاتی ہے اور کالج کی طرف سے انہیں بھوپال کے چند نادر تحائف پیش کئے جاتے ہیں۔ تالیاں برابر بج رہی ہیں اور اب تالیوں نے ایک خاص انداز اختیار کرلیا ہے جیسے فوجی بینڈ کسی کو اعزازی سلامی دے رہا ہو۔ فیضؔ آہستہ آہستہ مائک پر تشریف لاتے ہیں۔

"بزرگو اور عزیزو......

ہم جب کسی ملک کیا کسی شہر میں جاتے ہیں تو پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس شہر کے طلبہ سے ضرور ملیں کہ یہ نئی نسل ہی ہماری رہنمائی کرے گی اور ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم نے بزرگوں کی باتیں کب مانیں تھیں، جو کچھ ٹھیک سمجھا وہ راستہ اختیار کیا تھا۔ آپ بھی محض ہماری رہنمائی پر تکیہ نہ کریں کہ ہر شہر اور ہر ملک اور ساری دُنیا کا مستقبل آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کو دُنیا کے نقش ونگار سنوارنا ہیں، بنانا ہیں اور سجانا ہیں۔

یہ دیکھ کر جی خوش ہوا اور مسرت ہوئی کہ آپ لوگوں نے اور آپ کے ادارے

نے کس کامیابی سے کس قدر ترقی کی ہے اور کتنی اچھی اشاعت کر رہے ہیں اور یہاں سے کس قدر طالب علم فیض یاب ہو کر ملک اور بیرون ملک میں مشہور ہو رہے ہیں۔ باقی جو پذیرائی ابھی ہوئی ہے اس کے لیے امیر خسرو کے شعر کا یہ پہلا مصرعہ عرض ہے......

کرم کردی الٰہی زندہ باشی

فیض یہ کہہ کر بیٹھ گئے اور اب طلباء ان کے کلام کی فرمائش کر رہے ہیں، کسی طالب علم نے فرمائش کی......

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

فیض نے سامعین میں رنگ برنگے آنچلوں کی افراط دیکھ کر کہا۔ اس کو اس طرح بھی پڑھا جا سکتا ہے......

مجھ سے پہلی سے محبت میری محبوب نہ مانگ

یہ کہہ کر انہوں نے سگریٹ جلایا۔ کش لیا اور نظم شروع کر دی۔ ایک اور جام کی فرمائش اور فیض کی شاعری کا بہتا گہرا دریا جس کی تہہ میں فن و فکر کے موتی ہیں۔ وقت کب تھما ہے، وہ برابر آگے بڑھ رہا ہے اور فیض سگریٹ پر سگریٹ پی رہے ہیں، شعر پر شعر سنا رہے ہیں۔

فیض کی فلائٹ ایک بجے دن کو ہے اور اب گیارہ بجنے والے ہیں۔ مجبوراً طلباء انہیں چھوڑتے ہیں۔ وہ شعبہ اُردو میں چائے پینے تشریف لاتے ہیں۔

ہر طرف کام و دہن کے لوازمات ہیں اور الماریوں میں سجی کتابیں ذہن و دماغ کو جلا بخشنے والی ہیں۔ دیواروں پر اُردو ادب کے چاند ستارے سجے ہیں۔ فیض باتیں کر رہے ہیں۔ بے تکلفی کے ساتھ اور ہم حیران کہ اتنے مختصر پروگرام میں فیض ہر اس جگہ گئے جہاں ان کے پرستار محبت و خلوص کے چراغ روشن کیے ان کے منتظر تھے۔ اتنے دنوں میں کتنی ہی دعوتیں ہوئیں، کتنے ہی جلسے ہوئے۔ آج ہی صبح نو بجے وہ 'دین دیال وچار پرکاشن' کے اُردو اخبار 'ایاز' کے دفتر میں تشریف لے گئے تھے۔ جہاں سنا کہ ان کو ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا۔ واقعی فیض بہتا دریا ہیں۔ محبت کا اور خلوص کا اور ہمدردی

کا۔ میں احترام سے ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ پورے ہندوستان میں ہزاروں دل اور ہزاروں لاکھوں آنکھیں فیضؔ کے لیے فرش راہ بنی رہیں۔ انہوں نے بمبئی میں ایک بڑی دلچسپ بات کہی کہ ''ہم ہندوستان کے جس مقام پر بھی گئے ہم کو وہاں بے پناہ خلوص اور پیار ملا تاہم ان مقامات کی حیثیت محبوبہ کی سی ہے جبکہ لاہور ان کے لیے بیوی کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں پھر فیضؔ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں کیمرے چل رہے ہیں۔ نئے نئے زاویوں سے فوٹو کھینچے جا رہے ہیں اور فیضؔ ہر شخص اور فرد کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کو آمادہ ہیں۔ کسی سے انکار نہیں۔ کسی کو نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ اور بھی بیٹھنے کو آمادہ ہیں مگر کچھ لوگ ان کو لے جانا چاہتے ہیں، ایک اور جگہ دعوت ہے۔ پھر ایئر پورٹ بھی پہنچنا ہے۔ فیضؔ کھڑے ہو گئے ہیں اور طلباء کے سیلاب کے ساتھ آہستہ آہستہ گاڑی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں شعبہ میں ہی رک جاتا ہوں۔ جدائی کا یہ منظر اب نہ دیکھا جائے گا۔ کچھ دیر بعد عبد القوی دسنوی واپس آ گئے ہیں۔ چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے۔ جب کوئی فنکشن کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے تو دسنوی صاحب اسی طرح خوش ہوتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں ان کی یہ خوشی کوئی کمینی خوشی نہیں کہ جو کسی کو گرا کر یا اس کے بارے میں برائی پھیلا کر حاصل کی جاتی ہے۔ یہ تو اچھائی، سچائی اور نیکی کی خوشی ہے۔

دسنوی صاحب مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ 'چلو فخرو بھائی کے ساتھ ایر پورٹ چلتے ہیں۔ میں ان کو یاد دلاتا ہوں کہ فیضؔ سے ہم نے تاثرات تو لکھوائے ہی نہیں۔ وہ تاثرات کی لال بک نکال لاتے ہیں اور ہم فخرو بھائی کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھتے ہیں۔ ہمارے ساتھ علامہ محوی لکھنوی کے صاحب زادے منیر محوی بھی آ گئے ہیں۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح نیک اور شریف انسان ہیں۔ فخرو بھائی بھی خوش ہیں کہ کالج میں کامیاب پروگرام رہا۔

گاڑی سبک رفتاری کے ساتھ بھوپال کی سڑکوں پر سے گزر رہی ہے۔ اولڈ سکریٹریٹ کی شاہانہ عمارت، سامنے دور تک پھیلا احمد آباد، دُور دکھتا تال اور سرسبز

گھاٹیاں، سارے منظر جلد جلد بدل رہے ہیں، اور اب ہم بھوپال کے بیراگڑھ ایئرپورٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ وہاں پہلے ہی سے کافی بھیڑ جمع ہے۔ ایرپورٹ کا لاؤنج سادہ اور متاثر کن ہے۔ ہم لوگ وہاں بنے ریستوران میں چلے جاتے ہیں اور فیضؔ کی باتیں اور پروگرام پر عام تاثرات کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ چائے منگوالی ہے۔ دسنوی صاحب بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جہاز کے آنے کا ٹائم ہوچکا ہے۔ ہم لاؤنج میں لگی فرانسیسی انداز کی کھڑکیوں سے دیکھتے ہیں کہ گاڑیوں کا ایک قافلہ چلا آرہا ہے۔ ہم جلدی سے بل پے کر کے نیچے اترتے ہیں۔ جب تک سب نے فیضؔ کو گھیر لیا ہے۔ فوٹوگرافر مصروف ہیں ہر شخص چاہتا ہے کہ فیضؔ کے ساتھ وہ اپنے ایک ایک لمحے کو یادگاری بنوالے۔ فیضؔ وی۔ آئی۔ پی۔ لاؤنج میں چلے گئے ہیں۔ بھیڑ نے بھی وی آئی لاؤنج پر دھاوا بول دیا ہے۔ میں آگے بڑھ کر فیضؔ کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ مسکرا کر کہتے ہیں۔ "لو ہم آپ کے بھوپال آگئے۔" میں پوچھتا ہوں۔ "کیسا لگا آپ کو یہ شہر؟ یہاں کے لوگ؟" فیضؔ خوش نظر آرہے ہیں۔ جواب دیتے ہیں۔ "بہت خوبصورت، پھر آپ لوگوں سے ایک جذباتی تعلق بھی تو قائم ہوگیا ہے جس طرح اس شہر میں ہمارا استقبال اور پذیرائی ہوئی۔ ایسا شاندار استقبال تو نہ اس سے قبل پاکستان میں ہوا اور نہ ہی ہندوستان کے کسی دیگر شہروں میں۔ میں خوش ہوجاتا ہوں اور کالج کے تاثرات کی کتاب آگے بڑھا دیتا ہوں۔ فیضؔ کتاب کھولتے ہیں اور مشاہیر کی رائے پڑھنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ آٹوگراف لینے والوں اور تصاویر کھنچوانے والوں کو بھی مستفیضؔ کرتے جاتے ہیں پھر لکھتے ہیں:

"آج سیفیہ کالج کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہاں کے اساتذہ، طلبہ سے ملاقات ہوئی، تعلیم و تدریس، علم و ہنر میں اس ادارے کی کامرانیوں اور اعزازات کا حال سنا اور اس ادارے کے علمی، ادبی، ثقافتی کاوشوں سے یک گونہ طمانیت حاصل ہوئی۔ ان کے خلوص اور پذیرائی کے لیے تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

کرم کردی الٰہی زندہ باشی

۱۷ر دسمبر۔ فیضؔ

میں قوی صاحب کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ بے حد خوش اور مسرور ہیں۔ اتنے میں ایک ساعد سیمیں آگے بڑھتا ہے۔ ''پلیز ایک صفحہ پر ہمیں بھی آٹو گراف دلا دیجئے۔'' وہ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر' اس کا آخری صفحہ فیضؔ کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔

فیضؔ نے لکھا......

یہ آرزو تو بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

میں چاہتا ہوں کہ صفحہ پھاڑ کر اس حورتمثال نگار کو دے دوں مگر دسنوی صاحب تیار نہیں۔

''اس کتاب سے کوئی صفحہ نہیں پھاڑا جا سکتا۔''

''پھر یہ آٹو گراف ہے؟''

''وہ بھی ہم ہی رکھیں گے۔''

میں لڑکی کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں غصہ ہے۔ فیضؔ پھر دسنوی صاحب سے باتوں میں مصروف ہوگئے۔ اس درمیان گوہر جلالی، اختر سعید اور کیف بھوپالی آجاتے ہیں۔ باتیں، لطائف اور جملے بازی چل رہی ہے۔ فیضؔ کو کچھ لوگ آکے بتاتے ہیں جہاز روانہ ہونے والا ہے۔ فیضؔ ایرپورٹ انچارج کے ساتھ دوسرے راستے سے جا رہے ہیں اور ہم لوگ باہر نکل کر ریلنگ پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔ دسنوی صاحب ریلنگ پر پاؤں رکھے، بار بار بے صبری سے ہاتھ ہلا رہے ہیں اور فیضؔ بنا کسی طرف دیکھے جہاز کی طرف گامزن ہیں۔

دسنوی صاحب سے میں کہتا ہوں۔ ''اب چلئے مگر وہ وہاں سے نہیں ہلتے۔'' وہ ایک بار ادھر دیکھ تو لیں پھر چلتے ہیں مگر ان کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی اور جہاز فیضؔ کو اُردو شاعری کے رقیب کی طرح اپنی آغوش میں لے کر ایک فاتحانہ 'زوں' کی آواز کے ساتھ فضا کی بے کراں وسعتوں میں اڑ گیا، اور دھیرے دھیرے دور ہوتا ہوا

غائب ہوگیا مگر دسنوی صاحب ابھی بھی ہاتھ ہلا رہے ہیں......

ہم لوگ مضمحل قدموں کے ساتھ واپس لوٹ رہے ہیں اور میرے ذہن میں فیض کی مسکراہٹ جگمگا رہی ہے۔ اس مسکراہٹ کو زمانے کے آلام و مصائب نے ایک بڑی غم آلود نرماہٹ اور بچوں کی طرح چمکیلی اور شریر ذہانت عطا کر دی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ مسکراہٹ صرف کسی ایک فرد کے لیے نہیں، صرف ہندوستان اور پاکستان کی نئی نسل کے لیے نہیں بلکہ کراچی سے کیوبا اور کیوبا سے ٹوکیو تک رجعت پرستی کی چلچلاتی دھوپ میں تیسری دُنیا کے ادب اور سیاست کے لق و دق ریگزاروں کے بیچوں بیچ ایک گھنیرے درخت کی طرح ہے۔

خدا کرے فیض کی زندگی کے چراغ کی لو اور بڑھے اور بڑھے کہ اس کے اُجالے کے ساتھ ساتھ ترقی کا راستہ بھی بڑھتا اور نکھرتا جاتا ہے۔

○○

سرفراز اقبال

دامنِ یوسف

میں ان خطوط کو شائع کرانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی...... ہاں، شاید کبھی نہیں ...... کہ یہ میری ذاتی دولت تھی اور اپنی دولت سے کون محروم ہونا چاہتا ہے؟ لیکن ڈاکٹر افضل اقبال اور اسلامک یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر افضل جیسے مہربان دوستوں کے اصرار پر آج میں اس دولت کو سب کے حوالے کر رہی ہوں۔

اور یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ فیضؔ جیسے لوگ اور ان کے اصول اور ان کے نظریات، ان کی سوچیں اور ان کی خواہشیں، ان کی بزم اور ان کی تنہائیاں، کہی اور اَن کہی باتیں...... جب یہ سب کچھ ان کا ذاتی نہیں ہوتا کہ یہ لوگ تو مجسم، قوم کی امانت ہوتے ہیں تو پھر میں کیسے ان کی عقیدت میں گزارے ہوئے لمحوں کی یاد کو اپنی ذاتی دولت قرار دے سکتی ہوں...... کہ خوشبو کو مٹھی میں کس نے بند کیا ہے؟ اور چاند کی روشنی صرف میرے آنگن کی اسیر تو نہیں رہ سکتی۔

آج اس دولت کو عام کرتے ہوئے مجھے یہ اطمینان ضرور ہے کہ میرے دل میں جو عقیدت فیضؔ صاحب کے لئے تھی، اسے میں نے اپنے خطوں کے ذریعے ان تک پہنچا دیا تھا۔ اس محبت اور عقیدت کے بدلے انہوں نے میرا مان بڑھایا اور اپنی خوشیوں اور اپنی اُداسیوں میں مجھے بھی یاد کر کے یہ احساس دلایا کہ ان تک میری عقیدت پہنچ رہی ہے۔

ان خطوط کو فیضؔ صاحب کے چاہنے والوں کے حوالے کرتے ہوئے میں اپنا یہ

مان بھی Share کر رہی ہوں کہ ایسے عہد ساز صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اگر ایسے لوگ اپنائیت کا احساس دیں تو مجھ جیسے عقیدت مندوں کو اپنی خوش بختی پر ناز تو کرنا چاہئے نا!...... میں نے ہمیشہ دُکھ چھپائے ہیں، سکھ اور خوشیاں سب کے ساتھ Share کرنے کی میری عادت ہے...... آج میں اپنی اس عادت کو دہرا رہی ہوں۔

میں نے یہ خط آپ کے سامنے لا کر رکھ دئے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ حال دل بھی بیان کر ڈالا ہے۔ مگر مجھے شدت سے احساس ہے کہ میں اس سکون، طمانیت اور محبت کا کوئی کنارہ بھی اس کوشش کے دوران ظاہر نہیں کر سکی، جو مجھے ان خطوط کی صورت میں یوں ملا جیسے دھرتی کو سات سمندر......!

شاید وہ لوگ جو فیضؔ پر وطن دشمنی کا لیبل لگاتے ہیں، وطن کی تڑپ ان خطوط میں محسوس کریں کہ وطن تو سب کی میراث ہوتی ہے۔ میں ادیب نہیں اور نہ ہی میں اس کوشش کو ادبی کارنامہ قرار دلانے کی خواہش رکھتی ہوں۔ لیکن ''دامن یوسف'' سے اگر کچھ ذہنوں میں وطن دشمنی اور اصول پرستی کا فرق واضح ہو جائے تو یہی میری عمر بھر کی کمائی اور فیضؔ کے چاہنے والوں کی جیت ہے۔

''دامن یوسف'' میں کچھ خط ابن انشاء اور جناب سبطِ حسن کے بھی شامل ہیں۔ میرے نزدیک یہ ضروری تھا تا کہ کچھ باتوں کی وضاحت ہو جائے جو دوسری صورت میں شاید میرے عجز قلم کے باعث ممکن نہ ہوتا۔

میں...... کہ جسے اپنے جذبات کے اظہار کا سلیقہ نہیں، اگر اس کتاب کو ترتیب دینے میں کہیں ٹھوکر کھا گئی ہوں تو ناواقفِ آدابِ تحریر جان کر درگزر کر دیں کہ میں تو اس وقت بھی، جب فیضؔ صاحب کی جدائی کا سانحہ گزرا، چند سطریں ضبطِ تحریر میں نہ لا سکی تھی اور آج بھی ان کی دائمی جدائی کے صدمے یاد کرتی ہوں تو فقط ان ہی کی نظم کے یہ مصرعے دہرا لیتی ہوں، جو ایک بار انہوں نے اپنے خط میں لکھے تھے......

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا

آنکھوں کے دریچے میں کسی حسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
شاید وہ کوئی وہم تھا، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اب بیر نہ الفت نہ کوئی ربط نہ رشتہ
اپنا کوئی تیرا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن میرے دل، یہ تو فقط ایک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو، جینے کو تو اک عمر پڑی ہے

ان آخری دو مصرعوں کو یاد کر کے مجھے ہمیشہ یوں لگتا ہے جیسے فیضؔ صاحب مجھے دُکھی جان کر پرچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب کے لئے سحر صدیقی اور تدوین و تکمیل کے لئے خالد شریف اور مستنصر جاوید کی شکرگزار ہوں۔ اپنے شوہر محمد اقبال کی بھی ممنون ہوں جن کے تعاون کے بغیر شاید یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ یہاں اپنے ان احباب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کے مشورے قدم قدم پر میری راہنمائی کرتے رہے۔

—— سرفراز اقبال

۸/اگست ۱۹۸۸ء

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔

کوئٹہ میں مارچ اور اپریل کے اداس مہینے دھیمی رفتار سے گزرتے جا رہے تھے۔ میرے مکان کے آنگن میں بادام کے درختوں پر سفید پھول خاموش موسموں کی چاپ

سنتے رہتے تھے۔ ہوا میں بے نام رتوں کی باس رچی ہوئی تھی اور آنے والے موسموں کا انتظار کچھ زیادہ ہی جان لیوا محسوس ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھار تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں سے کھڑے پہاڑ انتظار ختم کر کے اب اپنے گھروں کو واپس چل دیں گے۔ شام ہوتے ہی یہ احساس اور زیادہ شدید ہونے لگتا تھا۔

میں یہ موسم 'کافی' اور کتابوں کے ساتھ بسر کرنے کو ترجیح دیتی تھی۔ اچھا شعر ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔ میں شاعر کے تجربے کی کیفیت کو کافی کڑواہٹ میں آمیز کر کے آہستہ آہستہ رگوں میں اتارنے کو سب سے بڑی تفریح سمجھتی ہوں۔ شروع سے ہی میری زندگی کا ماحصل......

فراختے و کتابے و گوشۂ چمنے

......رہا ہے اور شاید زندگی کی جانب اسی رویے نے آنے والے دنوں میں ایسے ایسے گہر ہائے آبدار میری جھولی میں بھر دئے، جنہوں نے میری پوری زندگی کو تابناک بنا دیا۔

ایک دن اچانک فون کی گھنٹی بجی، میں نے پوچھا...... ''کون؟''

جواب ملا...... ''فراز بول رہا ہوں۔''

فراز سے ہمارے گھرانے کے پرانے تعلقات ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا......

''آج میں تمہاری بات ایک ایسے شخص سے کرا رہا ہوں جس کی تم مداح ہو۔''

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''مگر تم بول کہاں سے رہے ہو؟''

آواز آئی...... ''میں تو لاہور ریڈیو اسٹیشن سے بول رہا ہوں...... بہرحال تم فیض صاحب سے بات کرو...... لو، کرو بات اب۔''

فیض صاحب......!

مجھے یکدم بادام کے پھول تالیاں بجاتے ہوئے محسوس ہوئے جیسے خاموش گزرتا موسم مسکرانے لگا ہو، پہاڑوں نے ایک گہرا سانس لیا ہو...... اطمینان کا سانس......! اس وقت میرے سامنے چند کتابیں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک ''دست صبا'' بھی تھی۔ تب مجھے اس چھوٹی سی کتاب کے سارے الفاظ ہاتھ کی لکیروں میں اترتے محسوس ہوئے۔

اسی لمحے گہری نیند میں ڈوبی ہوئی سرگوشی میرے کان میں اتری۔ ''فیضؔ'' آواز نے کہا تھا اور یہ اس کی آواز تھی جس کی میں پرستار ہوں۔

''ہیلو۔'' دور سے آتی ہوئی آواز کچھ اور قریب ہو گئی تھی۔ ''ہیلو؟'' کیسے مخاطب کروں، کیا کہوں...... ''ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب''...... فراز تم بہت خراب ہو، مجھے بتا تو دیتے، فیضؔ صاحب سے بات کرنے کے لئے میں کچھ لفظ اور حواس تو جمع کر لیتی۔ مجھے تو حبس میں ٹھنڈی پھوار نے اچانک آن لیا تھا۔ درمیان سے آندھی غائب تھی۔ یہ امن اور وفا کا شگون ہے۔ میں نے سوچا تھا اور اس سوچ نے میرا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ مجھے میری آواز واپس مل گئی تھی، اطمینان کا گہرا سانس اور میں نے کہا تھا......

''فیضؔ صاحب، السلام علیکم!'' دوبارہ خاموشی کا طویل وقفہ، اور یہ طوالت صرف میں محسوس کر سکتی تھی۔ ورنہ دوسری طرف سے کوئی جواب آنے سے پہلے میں کہہ رہی تھی اسی شوخ روانی کے ساتھ جیسی کہ میں ہوں۔ ''فیضؔ صاحب! آپ زیارت میں تین دن رہ کر چلے گئے، مجھے بعد میں معلوم ہوا ورنہ میں ضرور ملنے آتی۔''

دوسری طرف سے وہی نیند میں ڈوبی ہوئی شفقت سنائی دی۔ ''لو بھئی، ہم تو سوچتے تھے کہ صرف سی۔ آئی۔ ڈی۔ ہمارے پیچھے پھرتی ہے...... اب پتہ چلا تم جیسے لوگ بھی یہی کام کرتے ہیں۔ اچھا اپنا نام تو بتاؤ!''

جس کی خواہش تھی اس کے اچانک مل جانے کی خوشی نے میرا اعتماد بڑھا دیا تھا۔ ''جی! آپ فراز کو عزت سے بلا لیجئے!'' اور انہوں نے فراز کو عزت سے بلا کر ریسیور دوبارہ اسے تھما دیا اور میں اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ 'میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو!

''صرف اتنی سی بات کرنی تھی فیضؔ صاحب سے؟'' مجھے فراز کے لہجے میں طنز لگا تھا۔

''لیکن یہ بیچ میں تم کہاں سے آن ٹپکے؟ میں نے تو ابھی فیضؔ صاحب کو اپنا نام ہی بتایا تھا۔''

''لیکن تمہارا نام ایسا تو نہیں کہ جسے سن کر بات آگے نہ بڑھ سکے۔''

''نہیں، انھوں نے میرا نام پوچھا تھا۔ میں نے کہہ دیا فراز کو عزت سے بلا لیجئے۔
عزت یعنی سر (Sir) ......اور فراز...... سرفراز۔''
''اور فیضؔ صاحب نے بڑی عزت کے ساتھ ٹیلیفون میری طرف بڑھا دیا۔'' یہ کہہ کر فراز نے حسب عادت زوردار قہقہہ لگایا اور ٹیلیفون بند ہو گیا۔

فراز نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ تمہارا نام ایسا تو نہیں جسے سن کر بات آگے نہ بڑھ سکے۔ بات آگے بڑھی اور یوں میری زندگی کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جس کے روز و شب میں ان چند لمحوں کی گفتگو کا بڑا گہرا اور مستقل تعلق رہا۔ پھر اس کے بعد تو میرے لئے فیضؔ صاحب کی باتیں، جس کے بے انت موسموں میں ہمیشہ ٹھنڈی پھوار کی مانند رہیں۔

فیضؔ صاحب کا فون ریسیو کرنے کے بعد میری اس روز کی حالت کوئی نہیں جانتا۔ اپنی باتوں اور اپنے انداز سے فیضؔ صاحب مجھے کتنے معصوم لگے تھے، اور میرا جی چاہا تھا کہ میں باہر صحن میں بیٹھ کر شگفتہ پھولوں اور معصوم چڑیوں کو دیکھتے ہوئے ساری عمر گزار دوں یا پھر اڑتے بادلوں کی نرماہٹ سے اپنے مکان کی دیواروں پر اتنی بار فیضؔ صاحب کا نام لکھوں کہ دیواریں اور بادل دونوں ختم ہو جائیں۔

میری سوچ کی اسی جاگو میٹی میں سال نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی سال کو اتنی تیزی سے گزرتے نہیں دیکھا۔

کچھ عرصہ بعد کراچی جانا ہوا۔ وہاں کا موسم مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ لیکن اس بار کراچی کے کسیلے موسم کا مزاج کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ میں نے فیضؔ صاحب کو فون کیا، وہ ان دنوں 'عبداللہ ہارون کالج' کے پرنسپل تھے۔

''فیضؔ صاحب، ٹھیک ہے ہمیشہ پیاسا ہی کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔ لیکن کیا آج ایسا نہیں ہوسکتا کہ جذبے کی صداقت کنوئیں کو سرکا دے اور میری آپ سے ملاقات کی خواہش پوری ہو جائے؟''

یہ سنتے ہی انہوں نے ایک معصوم سا قہقہہ لگایا جیسے کہہ رہے ہوں...... بس، اتنی

ذرا سی بات۔ جیسے انہیں اس سے زیادہ مطالبے کی توقع رہی ہو۔

''ٹھیک ہے بھئی، ہم پانچ بجے انٹر کان پہنچ جائیں گے۔''

''جی شکریہ! میں لاؤنج میں انتظار کروں گی۔'' اور پونے پانچ بجے میں انٹر کان کے لاؤنج میں تھی۔

میں نے کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔ انتظار کرنے کی مجھے عادت نہیں کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ انتظار کرب کی سب سے سنگین منزل ہے۔ تو گویا میں نے سنگین منزلوں کی طرف سفر کا آغاز کر دیا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا، اور مجھے یوں لگا تھا جیسے میں خواب میں چل کر یہاں تک پہنچی ہوں۔

''یہاں فیض صاحب کیوں آئیں گے اور وہ بھی میرے لئے؟'' شک نے کرب کا دروازہ کھول دیا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ میں اس دروازے سے اندر جھانک کر دیکھتی، اچانک میرے سامنے سفید فوکس ویگن رکی، دروازہ کھلا، اندر سے ایک شخص اترا۔ وہ عام سا آدمی تھا مگر مجھے منفرد لگا۔ جیسے وہ سب جیسا ہو مگر کوئی اس جیسا نہ ہو۔ میں نے دیکھا، شک کے سارے دروازے بند ہو چکے تھے اور میں نے یقین کر لیا یہی فیض صاحب ہیں۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا۔ میری بہن اور بہنوئی بھی ساتھ تھے، وہ بھی ملے۔

فیض صاحب خاصے خوش دکھائی دیتے تھے۔ مجھے سکون اور حوصلہ میسر آیا۔

ہم ایک ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے اور چائے کے لئے کہا، ساتھ میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔

میں نے پوچھا تھا۔ ''آپ کراچی میں کیوں رہتے ہیں؟''

وہ حیرت سے بولے۔ ''کیا مطلب!''

''آپ کو لاہور میں رہنا چاہئے، وہاں کا موسم بہتر ہے آپ کے لئے۔'' میں نے وضاحت کی۔ وہ بولے۔

''ہم ایوب دورِ حکومت میں دو سال باہر رہ کر آئے تھے، واپسی پر ہماری دوست شوکت ہارون نے اصرار کر کے ہمیں یہیں روک لیا، اور ہم ان کی خواہش پر رک گئے، ویسے اب جائیں گے لاہور......!''

چھوٹے چھوٹے وقفوں کے ساتھ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی اور معصوم باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ویٹر بل لے آیا۔ سچ کہتی ہوں، مجھے یوں لگا جیسے ابھی اس نے چائے بھی 'سرو' نہ کی ہو اور پہلے ہی بل لے آیا ہو۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تھے کہ فیضؔ صاحب نے ہاتھ بڑھا کر بل لے لیا۔

''لیکن ہمیں یہاں آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے کہ یہ بل......''

''ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے باجی!'' میری بہن نے ہولے سے میرے کان میں کہا۔

اس روز پہلی بار میں نے اپنی آنکھوں سے وقت کو پر لگا کر اڑتے دیکھا۔ میں نے فیضؔ صاحب سے ضد کی کہ بل میں ادا کروں گی۔

''ہم جب تمہارے شہر میں آئیں گے تو خاطر کر لینا، اب نہیں۔'' فیضؔ صاحب نے بڑی شفقت سے منع کر کے بل ادا کر دیا۔

یہ پہلی ملاقات تھی جو ختم ہو گئی تھی...... ایک عام سی ملاقات۔ لیکن میرے دل، میرے ذہن پر اس ملاقات کا جو نقش ثبت ہوا، اس کے بعد ہونے والی ملاقاتیں اسے ماند نہ کر سکیں۔ کتنا خاص آدمی، کتنا عام سا لگتا ہے، میں نے سوچا تھا۔ کوئی ناز کوئی ادا بڑے آدمیوں والی نہیں۔ اس روز فیضؔ صاحب سے مل کر مجھے ایک لحظہ کے لئے تو یوں لگا تھا جیسے کسی قدیم یونانی دیوتا کا بُت اچانک اپنی آنکھیں جھپکنے لگا ہو۔

میں نے واپس کوئٹہ جا کر فیضؔ صاحب کو کراچی خط لکھا جس میں ان سے تصویر کی فرمائش بھی تھی۔ جس کے جواب میں انہوں نے لکھا تھا......

عزیزی...... دُعا!

آپ کا خط بہت دن ہوئے ملا تھا، لیکن کوئی تصویر ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ یہ شوق یا تو

فلمی ستاروں کو ہوتا ہے یا نوجوانوں کو کہ 'Fans' کے لئے بہت سی تصویریں بنوا کر رکھیں۔ بہرصورت آج یہ تصویر دستیاب ہوئی جو بھیج رہا ہوں۔

آپ کی محبت اور خلوص سے بہت دل خوش ہوا۔ انشاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی اور تم نے اپنا پورا نام بھی نہیں لکھا، اب کے لکھ دینا۔

فقط...... مخلص
فیضؔ

۲۴/اکتوبر

عزیزی سرفراز!

آپ کے دو مختصر خطوط ملے تھے۔ آپ کی فرمائش ملفوف ہے، خاص اچھی نہیں۔ لیکن ہمیں فلم اسٹار ہونے کا دعویٰ کب ہے؟ وہ تو جوانی میں بھی نہیں تھا۔

میں مری سے واپسی پر رات بھر کے لئے پنڈی ٹھہرا تھا۔ آپ کا پتہ اور وقت غیر مساعد تھے۔ اس لئے ملاقات نہ ہوسکی۔ اب کبھی آنا ہوا تو آپ کو پہلے سے مطلع کرنے کی کوشش کروں گا۔

ادب اور ادیبوں سے آپ کی شکایات کی تفصیل تو مجھے نہیں معلوم، لیکن زندگی یا زمانے سے شکایت کسے نہیں؟ اور اس کے باوجود شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک...... اقبال صاحب اور بچوں کو دعا۔

فقط...... مخلص
فیضؔ

کراچی، ۱۰/فروری

عزیزی سرفراز!

آپ کا خط ملا۔ بھئی شکایت تو مجھے کرنی چاہئے تھی۔ آپ کو شکوہ کیسا؟ جس رات

میں وہاں پہنچا ہوں اس سے اگلے دن اقبال کا فون آیا کہ آپ لوگ شام کو آئیں گے۔ چنانچہ میں نے انتظار کیا۔ اس سے اگلے دن میں قریب قریب سب وقت اسلام آباد میں تھا۔ شام کو لوٹ کر پھر انتظار کیا۔ ہوٹل والوں سے بھی دریافت کیا کہ کوئی پیغام تو نہیں ہے، تو جواب نفی میں ملا۔ ہفتے کی صبح اقبال کو ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دفتر ہی نہیں آئے۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید آپ لوگ کہیں شہر سے باہر چلے گئے۔ اسی سہ پہر کو میں چلا آیا۔ اس لئے ملاقات نہ ہو سکی، جس کا افسوس ہے۔ بہرحال...... تمہاری میزبانی سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ ہم نے ہرگز ترک نہیں کیا۔ جب بھی آنا ہوا تمہاری یہ ضد بھی پوری ہو جائے گی۔ ۱۳؍فروری تو اب یہیں گزرے گی، لیکن اس کے بعد جب بھی طلبی ہوئی، تمہیں مطلع کر دوں گا۔

اقبال صاحب اور بچوں کو دعا!

فقط

فیضؔ

عزیزی سرفراز!

افسوس ہے کہ آج ایک بجے ہماری پھر طلبی ہو گئی ہے۔ اس لئے تمہیں کھانا نہیں کھلا سکیں گے (اور تمہیں اطلاع دینے کی بھی کوئی صورت نہیں)، اس لئے تم شام کو پانچ ساڑھے پانچ یا کل صبح نو دس بجے تک ملاقات اٹھا رکھو...... Sorry۔

فیضؔ

۱۹-۰۸-۷۶

کیوں بھائی، تم لوگ ہمیں بھول گئے؟

بالکل بھول گئے، بے مہر نکلے، بے وفا نکلے۔ فیضؔ صاحب کے واپس آجانے کا اور وہاں موجود ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اور کوئی باقی نہیں رہا۔ سورج اپنی جگہ، چاند اپنی

جگہ، چھوٹے موٹے ستارے اپنی جگہ۔ بعض ایسی راتیں بھی ہوتی ہیں کہ سورج ہوتا ہے نہ چاند ہوتا ہے۔ بس ستاروں کو دیکھ کر اور گن کر دل بہلانا پڑتا ہے۔ بلکہ گننے اور دل بہلانے کے لئے تارے زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ سورج صرف ایک ہے، چاند بھی ایک ہے، اسے کوئی کہاں تک گنے گا۔

پاکستان میں گرمی ہے۔ موسم کی بھی، سیاست کی بھی، روزے بھی ہیں۔ یہاں موسم خوشگوار ہے، سازگار ہے اور ٹھنڈا ہے۔ ہر طرح کا آرام ہے اور اپنی پسند کا آرام ہے۔ پھر بھی دل مضطرب اور بے کل رہتا ہے اور کچھ لکھنے لکھانے کا Incentive نظر نہیں آتا۔ ہمارے پاکستان آنے تک ہمارے چند پڑھنے والے ہمیں فراموش کر چکے ہوں گے۔ خیر، ہم ان کو فراموش کر دیں گے۔ ویسے کون سا ہم کو ان سے دودھ ملتا ہے۔ فنون مجھے تو ملا نہیں۔ نہ اسے پڑھنے، دیکھنے اور اس نظم کا سامنا کرنے کی خواہش ہے۔ لیکن پاکستان سے کئی لوگوں کے خط آئے ہیں۔ ایک صاحب ہیں کراچی میں باسٹھ سال کے، شاعر ہیں، کنور اعظم خاں خسروی۔ انہوں نے بھی بقیہ سالوں کی پیشکش کی ہے۔ نہیں معلوم کہ بکنگ بند ہو چکی ہے۔ نورالحسن جعفری نے بھی پڑھ کر بڑے دلاسے اور اضطراب کا خط لکھا تھا۔ بس یہ وقت وقت کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس لمحے کا تصور کر کے ہول آتا ہے جب یہ لکھی تھی۔

میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟ اس میں دیمی (میرا چھوٹا بیٹا ندیم) کے نام علیحدہ خط بھی تھا، لیکن اس کے کچھ اور معنی تو نہیں نکالے؟ اخبار میں دیکھا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے کوئی کتاب فیضؔ پر لکھی ہے۔ وہ کتاب مجھے بھجواؤ۔ تم بھجواؤ کہ فیضؔ صاحب بھجوائیں، یا ڈاکٹر ایوب مرزا بھجوائیں۔ خود فیضؔ صاحب کا ارادہ لوٹ کر آنے کا تھا۔ یعنی وہ تو حضرت داغؔ ہیں، جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے۔

تین صفحے ہو گئے۔ اب آگے تمہارا خط آنے پر۔ شہاب صاحب بھی کابل سے اسلام آباد واپس آ گئے ہوں گے۔ ان کا ارادہ غالباً اکتوبر میں آنے کا ہے۔ پھر مزے رہیں گے۔ اس دوران الفت میں دیکھنا، اپنا ہاتھ وغیرہ نہ کٹا لینا۔ یہ ہر قسم کی چوری

پر کاٹا جا سکتا ہے۔ سینہ زوری پر دونوں کٹنے چاہئیں۔ کوشش کریں گے کہ کوئی بہانہ کر کے سال کے آخر میں ایک چکر پاکستان کا لگائیں۔ لیکن اب کے ہمیں انٹر کانٹی نینٹل میں کون ٹھہرائے گا اور بوجوہ اس کے علاوہ کہیں ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔

مفتی سے بات ہوئی ہے؟ درجہ بدرجہ سب کو سلام۔

اور حصہ رسدی سب کو پیار۔

صحت کی فکر نہ کرو، ٹھیک جا رہی ہے۔

ابن انشاء

Hotel New Stanley
Kimathi Street
Nairobi
28/10

عزیزی سرفراز اینڈ کو.

ہم یہاں خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ خوبصورت جگہ ہے اور موسم بھی بہت اچھا ہے۔ یہاں کافی دن رکنا ہوگا اس لئے تم اگر چاہو تو اپنی لکھ بھیجنا۔ اس تصویر جیسی کوئی چھوٹی موٹی چیز چاہئے تو لیتے آئیں۔ ویسے ہاتھی، زیبرہ بھی دستیاب ہیں...... پیار!

فیض

۹/۱۱

عزیزی سرفراز!

بھئی تم سے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوٹتا۔ کل شہاب صاحب نے ابن انشاء کے خط کے ساتھ اخبار لا کر دیا جس میں تمہاری بہت خوبصورت تصویر چھپی ہے۔ لکھنے والے کا نام پڑھ کر ڈاکٹر کی تم سے اور بھی پکی لڑائی ہو جائے گی۔ یہاں دن رات بہت مصروفیت میں گزر رہے ہیں۔ خیال تھا یہاں کسی سے جان پہچان نہیں ہے، لیکن میزبانوں کا ایسا تانتا لگا ہوا ہے، ہم اگلے ہفتے تک Booked ہیں۔ بہت اچھے لوگ

ہیں۔تمہاری ایک فرمائش تو معلوم ہے۔ کچھ اور بھی چاہیے تو لکھ دو۔

فیضؔ

لندن

پیارے دیمی!

کل پرسوں تمہارا خط ملا۔ تمہاری امی وغیرہ ہمیں یاد کریں تو ہم خاص Flatter نہیں ہوتے۔ وہ تو برابر کا دوستانہ ہے۔ لیکن اگر تم نے یاد کیا تو واقعی بہت خوشی کی بات ہے۔ اور بھئی، گھر لوٹنے کو تو ہم خود بہت بے چین ہیں۔ لیکن یہاں کے لوگوں نے ہمیں جس کام میں گرفتار کر رکھا ہے، وہ ان کی غفلت کی وجہ سے ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ کچھ دن گاڑی چلتی ہے تو وہاں سے پیسے آنے بند ہو جاتے ہیں اور کام رک جاتا ہے۔ بہرصورت آج ہم نے لکھ دیا ہے کہ اب ہم اور نہیں ٹھہریں گے۔ چھ تاریخ کو یہاں سے بلغاریہ روانگی ہے۔ وہاں تین چار دن کا کام ہے۔ وہاں سے واپسی پر بارہ تیرہ جون کو یہاں سے گھر کی راہ لیں گے اور راستے میں تمہیں دیکھتے جائیں گے۔

یہاں اب جا کر موسم کچھ خوشگوار ہوا ہے اور ہمارے فروری مارچ جیسی کیفیت ہے۔ سب مخلوق کو ملکہ کی جوبلی کا بخار چڑھ رہا ہے۔ ویسے تو ہم بھی .M.B.E کی حیثیت میں ملکہ کی گارڈن پارٹی میں جا سکتے ہیں، لیکن ہمیں جنابہ کی صورت کوئی ایسی پسند نہیں۔

امی کے خط بھی مل گئے ہیں۔ تم جواب میں ہماری طرف سے پیار کر لینا (اور باقی سب کو بھی)۔ اگر کسی کی کوئی فرمائش ہے تو ابھی سے لکھ دو۔ ہم صوفیہ سے واپسی پر لیتے آئیں گے۔ باقی ملاقات پر......

فیضؔ

ہونولولو، ہوائی/ ۵رفروری

پیاری سرفراز!

بہت زمانے کے بعد تمہارا دوسرا خط یہاں آن کر ملا۔ کچھ تسکین ہوئی۔ تمہیں ایک خط اور کچھ اشعار پروفیسر سجاد ملک (P.N.C.A.) کے ہاتھ دو تین ماہ پہلے بھجوایا تھا۔ نہ جانے وہ خط تمہیں ملا کہ نہیں۔ تمہارے خط کے بعد آج ایک خط اپنے دوسری دیمی (ندیم) کا بہاولپور سے آیا ہے۔ اسے بھی لکھ رہا ہوں۔ مینا (میری بیٹی ثمینہ یاسمین) سے تو خیراب کُٹی ہوگئی ہے۔ مانو (میری بیٹی غزالہ شاہین) اور غالب (میرا بیٹا) سے البتہ کوئی لڑائی نہیں۔ اس لئے کہ وہ اب معتبر لوگوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہاں Hawai میں اتنی دوستیاں ہوگئی ہیں کہ مانو یہاں آنا چاہے تو ہر وقت ہی بلا سکتے ہیں۔لیکن سنا ہے کہ یہاں کی یونیورسٹی میں ڈاکٹری کی تعلیم کوئی خاص اچھی نہیں ہے۔ اگرچہ دوسری آسائشیں بہت ہیں۔ ایک آدھ اور یونیورسٹی میں بھی کچھ یاد اللہ ہوگئی ہے۔ وہاں آکر بات کریں گے۔ اپنے سفر کا یہ آخری مرحلہ ہے۔ اگلے ہفتہ یہاں سے روانگی ہوگی۔ واشنگٹن میں ۷ارتاریخ کو ایک تقریب ہے۔ شاید راستے میں ایک آدھ جگہ رکنا پڑے، لیکن اس ماہ کے آخر میں بہرصورت گھر پہنچ جائیں گے، انشاء اللہ۔ تم نے اقبال (میرے شوہر) کے بارے میں کچھ نہیں لکھا؟ ایران کا تو قصہ پاک ہوگیا، اب کہیں اور رُخ کریں۔ پیشتر اس کے کہ وہاں بھی ''کل من علیہا فان'' ہو جائے۔ یہاں پر گھر کی خبر اول تو آتی نہیں، اور کچھ چھپتا بھی ہے تو محض دل جلانے کے لئے۔ خیر ''جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔'' اور یہ بیچارے جوشؔ نے کس کا کیا بگاڑا تھا یا ہم نے۔ اگرچہ ہم نے تو فقیروں کی صدا اپنا لی ہے کہ جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ یعنی جو اچھا ہے اس کا بھی بھلا جو بُرا ہے اس کا بھی بھلا۔ اپنوں اور پرایوں کی دوستی اور محبت سے اتنا کچھ مل چکا ہے کہ حریفوں کا کیا گلہ کیجئے۔

اللہ کرے کہ اپنے دیس اور لوگوں پر کوئی اور افتاد نہ پڑے۔

بہت سا پیار............ فیضؔ

پیاری سرفراز!

یہ مزے کی بات ہے کہ تمہیں خط لکھیں تو جواب ڈیمی کی طرف سے آتا ہے۔ اس لئے ہم بھی یہ خط اسی کے پتے پر بھیج رہے ہیں۔ اس نے تمہاری اداسی کا لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ پردیس میں صورت حال اور بھی ابتر ہے، لیکن مجبوری کے ہاتھوں ہم نے لکھا تھا کہ ''یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔'' لیکن وہ تو اپنے وطن کے جیل خانے کی بات تھی۔ پتہ چلا کہ پردیس کے چار دن آزادی اور آسائش کے باوجود زیادہ کڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اب یہاں بہار کا موسم ہے اور دوست احباب سے ملنے کے علاوہ کوئی مصروفیت نہیں۔ لیکن پھر بھی صبح آنکھ کھلتی ہے تو روشنی اچھی نہیں لگتی۔ یہی جی چاہتا ہے کہ ''لیٹے رہیں، تصور جاناں کئے ہوئے''۔ خیر...... یہ دن بھی گزر جائیں گے۔

مانو کی بات کی تفصیل لکھ دو، کب اور کس سے۔ زیادہ دل اچاٹ ہوا تو شاید ہم لوٹ ہی آئیں۔ کینیڈا جانا نہیں ہو سکا۔ ہندوستان، امریکہ، ہنگری، جرمنی...... چاروں طرف سے دعوتیں ہیں لیکن اول تو اب بقول غالبؔ...... ''ہوسِ سیر و تماشہ کہ جو کم ہے ہم کو'' اور دوسرے دل چاہتا ہے کہ آوارہ گردی کی بجائے ایک جگہ ٹک کر کوئی کام کریں۔ دل سے فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر مانو کی شادی جلد طے ہوئی تو اسے اکیلے پردیس کیسے بھیج دو گی؟ بہتر تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ جا کر اس کا گھر وغیرہ ٹھیک کرنے میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ جو کام نہیں آتا ہو، ہم سے پوچھ لینا!

بہت سا پیار!
فیضؔ

پیاری سرفراز!

ہم دو تین روز ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ تمہارا پرانا خط بھی رکھا ہوا مل گیا۔ اس دوران ہندوستان تو رکنا نہ ہو سکا، البتہ تاجکستان اور ازبکستان، قزاقستان میں دو تین ہفتے بہت اچھے گزرے۔ خاص طور سے تاجکستان میں، جہاں ان کے قومی ادیب کی صدسالہ برسی

منائی جارہی تھی اور بہت سے ملکوں کے نمائندے آئے ہوئے تھے۔ ایک آدھ تقریب تو بالکل پاکستان کی نذر ہوگئی...... یعنی علامہ اقبال کا کلام گایا گیا۔ ہمارے نام ان کے ایک مشہور شاعر کی نظم پڑھی گئی۔ پھر ہماری کچھ چیزوں کا ترجمہ گایا گیا اور آخر میں ''سوہنی دھرتی......'' تمہیں یاد ہوگا ان کا طائفہ (ادارہ ثقافت پاکستان کی دعوت پر آنے والا ایک روسی ثقافتی طائفہ) ہمارے اسلام آباد آنے سے کچھ دن بعد ہمارے ہاں آیا تھا۔ وہی لوگ یہ نغمہ یاد کرکے لے گئے ہیں اور اب یہاں اکثر گایا جاتا ہے۔

یہاں سے اس ماہ کے آخر میں غالباً کینیڈا جانا ہوگا، شاید امریکہ بھی۔ واپسی پر ہندوستان کا دورہ مکمل کریں گے اور اس کے بعد اللہ مالک ہے۔ ویسے تو ہر جگہ مسافرنواز بہت ہیں اور آرام سے گزر رہی ہے۔ لیکن گھر سے ایسی لمبی غیر حاضری سے کبھی کبھی دل دکھتا ہے اور آپ لوگ اکثر یاد آتے ہیں۔ اگر اقبال ایران چلے گئے ہیں اور دیمی لاہور میں ہے تو تم بہت تنہا ہوگی۔ لیکن یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ پنجابی شاعر کے بقول ''دل نوٹھکانے رکھیے''۔ ایلس نے لکھا ہے کہ کبھی کبھی تمہارا ٹیلیفون آتا ہے جس سے وہ بہت خوش ہے۔ اچھی بات یہ ہو کہ تم مینا اور مانو کو جلدی سے امریکہ روانہ کر دو۔ بلکہ انہیں ساتھ لے جاؤ۔ راستے میں کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جائے گی۔ ڈاکٹر (ڈاکٹر ایوب مرزا) اور شیریں کو پیار پہنچا دو۔ میں انہیں خود بھی لکھوں گا۔ ایک نظم بھی سن لو......

دل من، مسافر من

مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں

کسی یار نامہ بر کا
ہر ایک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سر کوئے ناشناساں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
جو ملا نہ کوئی پُرساں
بہم التفات کرنا
''تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے''
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
''ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا''

۱۹ر جون

پیاری سرفراز!

تمہارا خط ملا، میرا دوسرا خط بھی تمہیں پہنچ گیا ہوگا۔ جو تم نے لکھا ہے کیفیت اپنی بھی کچھ ویسی ہی ہے، یعنی جہاں تک بدعادتوں کا تعلق ہے۔ تمہاری عادت ہمیں بھی اتنی پڑ چکی ہے کہ آنکھ کھلتے ہی ''صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی'' کا مضمون ذہن میں آتا ہے۔ کسی زمانے میں ایک آدھ یاداللہ یہاں پر تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ لندن سے جی کافی بھر گیا ہے۔ اس لئے اگلے ہفتے چند دنوں کے لئے پیرس اور

فرانس کا ارادہ ہے۔ وہاں سے لوٹ کر کہیں اور کا سوچیں گے۔ لیکن پتہ یہیں کا رہے گا۔ سنا ہے اس سال آپ کے یہاں بہت گرمی پڑی جو شاید عذاب الٰہی کا اشارہ ہے۔ حالانکہ یہاں والے شدید سردی کو اس کی علامت سمجھتے ہیں، اور اس سال جب ہم یہاں پہنچے تو واقعی بہت سردی تھی۔ اب موسم مزاج یار کی طرح ہے۔ ایک دن بارش، ایک دن دھوپ، کل لاہور میں چھیمی اور میزو (فیضؔ صاحب کی بیٹیاں، سلیمہ ہاشمی اور منیرہ ہاشمی) سے بات ہوگئی تھی۔ جس سے تشفی ہوئی۔

مانو کی بات غالباً اب تک طے ہوگئی ہوگی جس سے کچھ تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا مینا تو اپنا انتظام خود ہی کرے گی۔ اقبال کا جانا ہوا کہ نہیں، یا اب مانو کو رخصت کر کے جائیں گے؟

تھوڑی بہت تنگ بندی ہو جاتی ہے۔ کچھ بھجوا رہا ہوں، کچھ پھر بھیج دوں گا۔

بہت سا پیار
فیضؔ

پیارے دیمی!

پرانی عید مبارک (یعنی سب لوگوں کو)

پانچ چھ دن پہلے عید سے اگلے روز ہمیں تمہارا اور تمہاری امی کا خط ملا تھا جس میں تمہاری امی نے لکھا تھا کہ وہ اور مانو عید کے بعد لندن جا رہی ہیں۔ لیکن یہ نہیں لکھا تھا کہ عید کے کتنے دن بعد اور کتنی دیر کے لئے اور کس کام سے۔ اس سے دو ہی دن پہلے ہم بلغاریہ سے ماسکو پہنچے تھے۔ (ہم یعنی یاسر (فیضؔ کا نواسہ اور سلیمہ ہاشمی کا بیٹا) اور ایلس کے ساتھ جو اس سے ایک ہفتہ پہلے ماسکو پہنچے تھے اور آتے ہی ہمارے ساتھ صوفیہ روانہ ہو گئے تھے) اس لئے جلدی میں وہاں سے جواب نہیں لکھ سکے۔ یہ جگہ سمندر کے کنارے ایک صحت افزا مقام ہے جہاں دو تین ہفتے کے لئے ہمیں ''صحت بنانے'' کے لئے قریب قریب زبردستی بھیجا گیا ہے۔ اٹھارہ یا اُنیس تاریخ کو ماسکو واپسی

ہوگی اور پھر ایلس اور یاسر تو گھر چلے جائیں گے اور ہم کسی اور طرف بستر باندھنے کی سوچیں گے۔ اگر ان دنوں تک تمہاری امی اور مانو لندن یا انگلستان میں ہوں تو اُدھر کوشش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن پہلے ان کا پتہ تو چلے۔ یہ خط امی کے بجائے تمہیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اگر وہ روانہ ہوگئی ہوں تو ان کا پتہ مجھے ماسکو میں تار سے بھجوا دو اور اگر نہیں گئی ہیں تو ان کا پروگرام بھی ان سے کہیں کہ کسی طرح جلدی سے بھجوادیں۔ یہاں خط و کتابت کے لئے اتنی مدت درکار ہوتی ہے کہ جلدی میں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن خیر پھر بھی اگر کسی طرح لندن میں ان کا ساتھ ہو سکے تو اچھا ہوگا۔ اس لئے کہ لندن میں اجنبی لوگوں کو کافی دقت پیش آسکتی ہے۔ امی کی اطلاع آجائے تو انہیں بعد میں لکھیں گے۔ مینا کا پتہ کہیں گم ہوگیا ہے، وہ بھی لکھ بھیجو۔

سب کو بہت سا پیار
انکل

پیاری سرفراز!

دو تین دن پہلے ماسکو سے چلتے وقت تمہارا بہت اداس خط ملا تھا۔ اداسی یہاں کیا کم ہے؟ تم تو پھر بھی گھر میں، بچوں کے پاس ہو۔ یہاں تو ابھی تک سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ملا۔ مسافر نواز تو بہتیرے ہیں لیکن ان کی تواضع سے دل کی پیاس کب بجھتی ہے۔ تمہاری ہنستی ہوئی صورت تو اکثر سامنے رہتی ہے کیوں کہ رونا تو تمہیں بالکل Suit ہی نہیں کرتا۔ سیر و تماشا کی ہوس تو بہت پہلے پوری ہوگئی تھی۔ اب تو اس سے ''ضبط آرزو سے بدن ٹوٹنے'' کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں اور بدن ٹوٹنے کی چارہ گری پردیس میں کون کر سکتا ہے۔ ایلس واپس گھر چلی گئیں۔ تم سے ملاقات ہو تو باقی حالات ان سے پوچھ لینا۔ مینا تو میں نے سنا تھا، آسٹریلیا چلی گئی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کا پتہ لکھ بھیجو۔ اسے ضرور خط لکھیں گے۔ دیمی کو بہاولپور کے پتہ پر کارڈ بھیجا تھا، غالباً اسے مل گیا ہوگا اور مانو کی جہاں بات چل رہی تھی اس کا کیا ہوا اور اس کے

امریکہ جانے کا کیا ہو رہا ہے۔ امریکہ میں تو بہت سے اچھے لڑکے موجود ہیں لیکن اتنی دور سے کوئی بات کیوں کر طے ہو سکتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ جب بھی ہو سکے اُسے امریکہ بھجوا دیں، ہم نے بہت سے شہروں میں واقفیت پیدا کر لی ہے جو اس کی دیکھ بھال کر لیں گے اور تمہارے لئے اچھی بات یہی ہے کہ ہم تمہیں ٹکٹ بھجوا دیتے ہیں۔ تم میاں سے مہینہ بھر کی چھٹی لے کر ہمارے پاس آجاؤ اور ہم ضمانت دینے کو تیار ہیں کہ تمہیں صحیح سالم واپس کر دیں گے۔

انگلستان میں نو، دس مئی تک قیام، پھر واپس ماسکو جانا ہوگا۔ تم دونوں میں سے کسی پتے پر جواب بھیج دو۔ کچھ اشعار تمہیں پروفیسر سجاد حیدر کے ہاتھ بھیجے تھے، تمہیں ملے یا نہیں؟ کچھ اور سن لو!

بہت سا پیار!
فیض

"جو میرا تمہارا رشتہ ہے"

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطف وصل و درد فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدم مہ و سال
اس عشق خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے

یاد کا پھر کوئی دوازہ کھلا آخر شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخر شب

صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخر شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخر شب

چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخر شب
کون کرتا ہے وفا، عہد وفا آخر شب

گھر جو ویراں تھا سر شام وہ کیسے کہئے
فرقت یار نے آباد کیا آخر شب

جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اول صبح
"اسی انداز سے چل باد صبا آخر شب"

پیاری سرفراز!

تمہارا قریباً دو ماہ پہلے کا لکھا ہوا خط بھی کچھ ہی دن پہلے ملا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ گزشتہ مہینہ کے شروع میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں انگولا (Angola) جانا پڑا۔ جہاں سے قریباً پورے مہینے کے بعد ابھی واپسی ہوئی ہے، لیکن اب بھی پاؤں رکاب میں ہے۔ اگلے ہفتے یاسر عرفات صاحب کی دعوت پر بیروت روانگی ہے۔ غالباً چار پانچ دن قیام ہوگا۔ پھر شاید کہیں کچھ دن چین سے بیٹھنا ہے۔ کانفرنس میں افرو ایشیائی ادیبوں کے سہ ماہی رسالے کی ادارت اب باقاعدہ ہمارے حوالے کر دی گئی ہے۔ صرف یہ طے کرنا باقی ہے کہ اپنا دفتر کہاں رکھیں۔ اگرچہ میں نے نوٹس دے دیا ہے کہ موجودہ ہنگامی حالات سنبھل جانے کے بعد ہم اپنا دفتر اپنے گھر میں ہی رکھیں گے۔ وہ تو خیر جب ہوگا سو ہوگا، لیکن اس سے پہلے ہم اکتوبر نومبر میں گھر کا ایک چکر ضرور کریں گے، تمہاری دو تین سال کی تاریخ کا کون انتظار کرے، لیکن وہ دعوت نامہ اپنی جگہ ہے۔ دو تین سال کے بعد سہی اس لئے چند روز مری جان، اگرچہ یہ چند روز بالکل شیطان کی آنت ہوتے جا رہے ہیں اور صبر تو مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ نہ کریں تو کیا کریں، اور وہ تو غالباً شیخ سعدی کی کہانی ہے کہ ایک بار ان کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے تو اللہ میاں سے

شکایت کرنے کو جی چاہا، لیکن پھر ایک فقیر کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے تو اللہ میاں کا شکر ادا کیا۔

"جنگ" اور "نیرنگ خیال" دونوں کی فرمائشیں پوری ہو جائیں گی۔ کچھ شعر لکھے تھے لیکن وہ عبداللہ ملک اپنے رسالے کے لئے لے گئے ہیں۔ (ویسے ان کے ساتھ بڑا اندوہ ناک سانحہ ہو گیا۔ میاں بیوی بلغاریہ کے دورے پر آئے تھے۔ بیوی پہلے چلی گئیں اور یہ تاشقند وغیرہ کی سیر کے لئے چلے گئے۔ یہاں پہنچے تو بیوی کی وفات کا تار رکھا ہوا تھا۔ بہت پریشان گئے ہیں۔)

لاؤ تو قتل نامہ میرا

سننے کو بھیڑ ہے سر محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
رندوں کے دم سے آتش مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سو
کس کھوج میں ہے تیغ ستم گر لگی ہوئی
آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی
"لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی"

(یہ داغ کا شعر ہے)

مینا کو خط لکھ رہا ہوں، اور مانو کے رشتے کا کیا ہو رہا ہے؟ بھئی جلدی کیا ہے۔ انگریزی محاورے میں تو شادیاں آسمانوں پر طے ہوتی ہیں، یہ بھی ہو جائے گی۔ اچھا

اب تم ہنس کر دکھاؤ۔ باقی باتیں وہاں آ کر ہوں گی۔ بہت سا پیار!

فقط

پیاری سرفراز اینڈ کمپنی!

تمہیں اس سے پہلے صرف اس وجہ سے نہیں لکھا کہ اپنا کوئی پتہ طے نہیں تھا۔ کچھ دن ماسکو اور بیروت کی گفت وشنید میں لگے، پھر یہاں دفتر اور رہنے کی جگہ تلاش کرنے میں کچھ وقت گزرا۔ اب یہ ٹھکانہ ملا ہے۔ چھجو کے چبارے والی بات کہاں، لیکن پھر بھی کم از کم منظر پُر فضا ہے۔ سمندر کے کنارے دو ملحقہ فلیٹ ہیں۔ بہت مختصر گنجائش ہے، یعنی دو کمروں میں گھر اور دفتر، لیکن پھر بھی غنیمت ہے۔ کم از کم ہوٹل اور ہوائی جہاز سے نجات ملی۔ پھر کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی ہے، البتہ لبِ ساحل جو عالیشان ہوٹل اور ریسٹوران تھے، سب تباہ ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ ٹوٹی ہوئی دکانیں، اور نیم پختہ جھگیاں بن گئی ہیں۔ اس میں ایک فائدہ ہے کہ ضرورت کی ہر چیز دو قدم پر موجود ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنی لمبی بیکاری کے بعد اب ہم کام پر لگ گئے ہیں۔ جس کا یہ مطلب نہیں کہ جی بھی لگ گیا ہے...... پریشانیِ دل کا تو اپنے گھر کے علاوہ کوئی بھی علاج دنیا میں موجود نہیں، خیر کبھی وہ دن بھی آ جائے گا۔ پھر کچھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ گھر دور سہی، لیکن پہلے جیسا دور نہیں ہے۔ آپ لوگ کس حال میں ہیں؟ سفر کیسا گزرا؟...... اور جاتے جاتے یہ مکہ میں تم نے کیا شرارت کی ہے؟ اللہ کے گھر میں تو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا!

ایلس ابھی تک نہیں آئیں۔ آجکل میں یہاں پہنچنے کی امید ہے۔ اس دوران ہم نے کم از کم ناشتے کے لئے چائے بنانا اور انڈا ابالنا سیکھ لیا ہے جو کافی بڑا کارنامہ ہے۔ کھانا ایک خاتون آ کر کھلا دیتی ہیں۔ ہوٹل میں کافی رونق تھی۔ یہاں دفتر کے وقت کے بعد محض تنہائی ہے لیکن پھر بھی پہلے کی طرح بے اطمینانی نہیں ہے۔ پڑھنے لکھنے میں وقت گزر جاتا ہے۔ ایک آدھ دوست بھی مل گئے ہیں اور موسم بہت خوشگوار ہے اور

یہاں تک ہوا ہے کہ ہم ہر روز ایک دو میل پیدل بھی گھوم آتے ہیں۔ (اگرچہ جناب یاسر عرفات نے صرف ایک دو ملاقاتوں کے بعد ایک گاڑی بھی مرحمت فرما دی ہے۔) اور کوئی خاص بات لکھنے کو نہیں ہے۔ صرف شام ہوتے ہی اِدھر اُدھر سے کبھی مشین گن کی گڑگڑاہٹ کبھی بموں کے دھماکے سنائی دیتے ہیں، لیکن یہاں کا معمول ہے اس لئے کوئی خاص نوٹس نہیں لیتا۔

تم نے دو نظموں کی فرمائش کی تھی جو بھیج رہا ہوں۔ سب کو بہت سارا پیار!

اے وطنِ عزیز

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہئے اے وطن عزیز
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کرے
کتنی آہوں سے کلیجہ تیرا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

ترے ایوانوں میں پرزے ہوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودۂ اقرار ہوئے
کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی
خواب کتنے تری شہ راہوں میں سنگسار ہوئے

بلا کشانِ محبت سے جو ہوا سو ہوا
جو مجھ پہ گزری مت اس سے کہو، ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
لہو کے داغ تو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا

ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے، ہمارا کیا ہے

پیرس

دن ڈھلا کوچہ و بازار میں صف بستہ ہوئیں
زرد رو روشنیاں
ان میں ہر ایک کے کشکول سے رم جھم برسیں
اک بھرے شہر کی ناآسودگیاں
دور پس منظر افلاک میں دھندلانے لگے
عظمت رفتہ کے نشاں
پیش منظر میں کسی سایۂ دیوار سے لپٹا ہوا
سایہ کوئی
دوسرے سائے کی موہوم سی امید لئے
روز مرہ کی طرح
زیر لب
شرح بے دردیٔ تنہائی کی تمہید لئے
روشنیوں، سایوں سے کتراتا ہوا
اپنے بے خواب شبستاں کی طرف جاتا ہوا

○○

مشفق خواجہ

دامنِ یوسف یا دامن تار تار

فیض احمد فیضؔ بلاشبہ اُردو کے مقبول ترین شاعروں میں سے ایک ہیں۔ غالب و اقبال کے بعد وہ ہی ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں برصغیر پاک و ہند سے باہر بھی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ فیض کی مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کے اشعار، مصرعوں اور شعری ترکیبوں کو اس طرح استعمال میں لاتے ہیں جیسے یہ مالِ غنیمت ہو۔ فیض کے کلام کو مالِ غنیمت سمجھنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں۔ بلکہ ہم نے تو ہمیشہ خود فیض صاحب کو بھی مالِ غنیمت ہی سمجھا اور اُن کے بارے میں بیسیوں ''سخن گسترانہ'' کالم لکھے۔ فیض صاحب سے ہمیں نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ ہمارے بہت سے کرم فرما ہمارے کالموں کے حوالے سے فیض صاحب کے کان بھرتے تھے۔ لیکن مرحوم نے ان باتوں کو کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا اور ہمیشہ ہم سے محبت اور شفقت سے پیش آتے رہے، اور یوں ہمیں فیضیات میں مضامینِ نو کے انبار لگانے کے مواقع ملتے رہے۔

فیض کے انتقال کے بعد ہم نے ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ فیض پر لکھنے کا مزا تو اُن کی زندگی میں ہی تھا۔ مگر آج ہم اپنی اس روایت کو توڑ رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے دوران احساس ہوا جیسے فیض صاحب ہمارے درمیان موجود ہوں اور ہم انہیں چلتے پھرتے ہی نہیں، دُوسروں کو ٹہلاتے ہوئے بھی دیکھ رہے ہوں۔ فیض پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور

آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن اس وقت جو کتاب ہمارے سامنے ہے، اس کے بارے میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسی کتاب کبھی نہیں لکھی گئی، اور شاید آئندہ بھی نہ لکھی جائے۔

اس کتاب کا نام ''دامانِ یوسف'' ہے اور یہ تالیفِ لطیف ہے محترمہ سرفراز اقبال کی۔ محترمہ نے اپنے نام فیض کے خطوں کو اُن کے پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب اُن کی آپ بیتی کی صورت اختیار کر گئی ہے، ایک ایسی آپ بیتی جسے فیض کی سوانح حیات کا ایک باب بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کا آغاز فیض کے اس معنی خیز شعر سے ہوتا ہے......

عشق دل میں رہے تو رُسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

محترمہ سرفراز اقبال کون ہیں؟ زیرِنظر کتاب میں شامل خطوں کے حوالے سے عرض ہے کہ وہ ایک ادب نواز خاتون ہیں جن کے ہاں شاعروں، فنکاروں اور دُوسرے معززین کی آمد ورفت رہتی ہے۔ اُن کا دولت خانہ ادب وفن کا مرکز ہے۔ محترمہ کے ہاں محفلوں کا تذکرہ ابن انشاء نے اپنے ایک خط میں کیا ہے، جو اسی کتاب میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں......

''آپ کو محفل آرائی اور دوست نوازی اور دیگر آرائیوں اور نوازیوں سے فرصت نہیں تھی۔ تاہم ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو...... آپ کے سول اور ملٹری دوستوں کا کیا احوال ہے؟ افسوس کہ آپ کا گھر چھوٹا ہے لیکن سامنے کا پلاٹ خالی ہے۔ وہاں شامیانے لگواکر ہر روز صبح کو آپ کو اپنا دربار بھی منعقد کرنا چاہیے اور نذرانے بھی وصول کرنے چاہئیں، اور خلعت وانعام بھی تقسیم کرنے چاہئیں۔ حد ہے اتنے دنوں سے وہ جگہ خالی ہے اور آپ لوگوں نے اس پر قبضہ کر کے اُسے ابھی تک کچی آبادی بھی نہیں بنایا ہے، جو کبھی نہ کبھی تو مستقل ہوتی ہے۔''

محترمہ نے خود اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے......

"بعض اوقات میں یہ سوچتی ہوں کہ یہ دوستی، محبت، عشق، چاہت...... یہ سب کیا ہے؟ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکی۔ ممکن ہے بہت سے دوست یا لوگ اسے میری کمزوری تصور کریں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میں اس کے باوجود ان لفظوں کی معنویت کے اعتبار اور وقار پر پورا یقین رکھتی ہوں۔ ان باتوں کے بارے سوچنا اور سننا اچھا لگتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ لفظ کاش کبھی مجسم ہوکر مجھ سے ملنے آئیں، میں اُنہیں اپنے کمرے میں بٹھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دوں اور پھر ان کی باتیں سنوں...... سنتی ہی جاؤں، سنتی ہی جاؤں...... حتیٰ کہ سننے سنانے کے لیے کچھ باقی ہی نہ رہے۔ آوازیں ختم ہو جائیں، کمرہ خالی رہ جائے۔" (ص: ۱۰۷)

وہ بقول خود اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے فیض کو خط لکھا کرتی تھیں اور اسی خطوط نگاری کے نتیجے میں زیرِنظر کتاب عالمِ وجود میں آئی، اور یہ کتاب بھی اس لائق ہے کہ دروازے کی چٹخنی چڑھا کر پڑھی جائے۔

محترمہ پہلی مرتبہ احمد فراز کے ذریعہ فیض صاحب سے متعارف ہوئیں۔ فون پر بات چیت ہوئی، وہ اس پہلی بات چیت میں فیض سے کہنا چاہتی تھیں: "میرے قاتل میرے دلدار مرے پاس رہو۔" مگر کہہ نہ سکیں۔ (شاید اس لیے کہ کہیں احمد فراز یہ نہ سمجھیں کہ روئے سخن اُس کی طرف ہے۔) اس غائبانہ ملاقات کا محترمہ پر کیا اثر ہوا، اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیجئے......

"فیض صاحب کا فون ریسیو کرنے کے بعد میری اُس روز کی حالت کوئی نہیں جانتا۔ اپنی باتوں اور اپنے انداز سے فیض صاحب مجھے کتنے معصوم لگے تھے اور میرا جی چاہا تھا کہ میں باہر صحن میں بیٹھ کر شگفتہ پھولوں اور معصوم چڑیوں کو دیکھتے ہوئے ساری عمر گزار دوں، یا پھر اُڑتے بادلوں کی

نرماہٹ سے اپنے مکان کی دیواروں پر اتنی بار فیض صاحب کا نام لکھوں
کہ دیواریں اور بادل دونوں ختم ہو جائیں۔" (ص: ۲۰)

بادلوں کی نرماہٹ سے دیواروں پر کسی کا نام لکھنا ایک نیا اور اچھوتا خیال ہے۔ بلاشبہ فیض بہت بڑے شاعر تھے لیکن خیال کی ایسی ندرت تو ان کے اپنے کلام میں بھی نہیں ملتی ہے۔

کچھ عرصہ بعد کراچی میں پہلی ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے بعد خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری ملاقات پشاور کے ایک ہوٹل میں ہوئی جہاں احمد فراز محترمہ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس ملاقات کا حاصل یہ مصرعہ تھا جو فیضؔ نے ایک کاغذ پر لکھ کر اور اپنے دستخط کر کے محترمہ کو پیش کیا تھا......

فراز اوج پہ پہنچے تو سرفراز ہوئے

محترمہ کا بیان ہے کہ...... "فراز آج تک اس مصرعے کی تاب نہ لا سکا۔" اس ملاقات کا محترمہ پر جو اثر ہوا وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے......

"اگلے روز میں راول پنڈی واپس پہنچی تو فیض صاحب میرے لیے اس روشن ستارے کی مانند تھے، اندھیری رات کے مسافر جس سے رہنمائی حاصل کر کے منزلوں سے قریب تر ہوتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب مجھے کوئی مشکل ہوگی میں ان سے ضرور مشورہ کروں گی کیونکہ یہ وہ شخص ہے جو مجھے یوں محسوس کر سکتا ہے جیسے میں خود کو محسوس کرتی ہوں۔" (ص: ۲۵)

اس کے بعد خطوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں محترمہ کی باتیں بھی جاری رہتی ہیں۔ کہیں وہ کسی خط کا پس منظر پیش کرتی ہیں۔ کہیں کسی غیر واضح جملے کی تشریح کرتی ہیں، کبھی فیض صاحب سے اپنی کسی ملاقات کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔ انداز بیاں اتنا خوبصورت ہے کہ کہیں کہیں تو فیض کی شاعری محترمہ کی نثر کے سامنے ماند پڑتی نظر آتی ہے۔ محترمہ کی عقیدت اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ فیض کے بعض سرسری اور بے مزہ خطوں کو بھی اپنی توضیح وتشریح سے ادب پارہ بنا دیتی ہیں۔

اس کتاب میں فیض کے کل ملا کر ۵۶ر خطوط ہیں۔ چند خط محترمہ کے بچوں کے نام ہیں لیکن ان میں بھی روئے سخن محترمہ ہی کی طرف ہے۔ تین چار کے علاوہ باقی سب خط مختصر ہیں، لیکن ان کے اختصار میں ایک جہان معنی نظر آتا ہے۔ ابتدائی دو چار خط ''عزیزی'' سے شروع اور ''فقط'' پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کے بعد کے خطوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والا ان کی ابتداء سے پہلے اور اختتام کے بعد بھی بہت کچھ پڑھ سکتا ہے اور بین السطور میں جو کچھ ہے اس سے استفادہ کرنے کے لیے چشم بینا کی نہیں، ذہن رسا کی ضرورت ہے۔ ان خطوں میں کیا کچھ ہے، اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اقتباسات سے کیجیے۔

''جو تم نے لکھا ہے، کیفیت اپنی بھی کچھ ویسی ہی ہے۔ یعنی جہاں تک بدعادتوں کا تعلق ہے، تمہاری عادت ہمیں بھی کچھ اتنی پڑ چکی ہے کہ آنکھ کھلتے ہی ''صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی'' کا مضمون ذہن میں آتا ہے۔'' (ص:۶۱)

''.....تمہارے لیے اچھی بات یہی ہے کہ ہم تمہیں ٹکٹ بھجوا دیتے ہیں، تم میاں سے مہینے بھر کی چھٹی لے کر ہمارے پاس آجاؤ اور ہم ضمانت دینے کو تیار ہیں کہ تمہیں صحیح وسالم واپس کر دیں گے۔'' (ص:۶۶)

''تم نے ہمیں ٹی۔وی پر دیکھ لیا، لیکن ہم کیسے دیکھیں؟ شاعر لوگ کہتے ہیں کہ دل میں تصویر رکھنی چاہیے اور جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی۔ اس سے زیادہ آرام دہ صورت تو یہی ہے کہ بار بار گردن جھکانے کے بجائے تصویر کہیں سامنے ہی رکھ لی جائے، لیکن وہ تو تصویر ہوئی، اس سے بات کیسے کی جائے یا اُس کی آواز کیسے سنی جائے۔'' (ص:۸۸)

''تمہارا کہنا غلط ہے کہ تمہیں ملاقات کی ہم سے زیادہ طلب ہے۔ تمہارے پاس تو پھر بھی وہاں دل لگی کا بہت سا سامان موجود ہے۔ (خواہ اس سے کچھ نہ کچھ گڑبڑ کیوں نہ ہوتی رہے)۔ یہاں تو یادوں کے سوا کچھ نہیں

ہے...... اسی وجہ سے ہم دامن چھڑا کر اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں لیکن وہاں وہ چیز تو نہیں ملتی جو پہلے نمبر۔۱۰۴ اور اب سنا ہے کسی نئے تاج محل میں ہے۔'' (ص:۹۱) [محترمہ کے پرانے مکان کا نمبر۔۱۰۴ تھا، نئے تاج محل سے مراد نیا مکان ہے۔]

''ہم نے تمہاری عادتیں بگاڑ دی ہیں تو یہی شکایت یہاں تم سے بھی ہے، اور اسی بگاڑ کی وجہ سے اپنا کمرہ اور اپنا بستر زیادہ یاد آتا ہے۔'' (ص: ۹۵)

''کراچی سے روانگی سے پہلے تمہاری آواز سن کر خوشی ہوئی۔ تمہارا بہت ہی اچھا خط بھی ملا تھا۔ ہم کبھی کسی کا خط رکھتے نہیں ہیں لیکن یہ میں نے رکھ لیا ہے تاکہ سند رہے اور تم بھاگ نہ سکو۔'' (ص:۱۱۴)

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فیض کی عادتیں کس حد تک ''بگڑ'' چکی تھیں اور آخری اقتباس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ محترمہ کے خطوط بنام فیض ادب عالیہ کا نمونہ تھے۔ افسوس، کہ فیض نے نہ جانے کن اندیشہ ہائے دُور دراز کی وجہ سے محترمہ کے سارے خطوط ضائع کر دیے اور ایک خط جو بطور سند کے یا محترمہ کو ''بھاگنے'' سے روکنے کے لیے محفوظ رکھا تھا، وہ بھی معلوم نہیں اب کہاں ہے۔ کاش محترمہ اپنے خطوں کی نقلیں اپنے پاس رکھ لیتیں تو ان کی شمولیت سے یہ کتاب دو آتشہ ہی نہیں، سہ آتشہ ہو جاتی۔ سہ آتشہ اس لیے کہ ایک آگ پڑھنے والے کے دل میں بھی تو بھڑک اُٹھتی ہے۔

فیض کی شاعری میں ''رشک'' کا مضمون ذرا کم ہی نظر آتا ہے۔ وہ اتنے فراخ دل ہیں کہ وہ اپنے رقیب سے مفاہمت کر ہی لیتے ہیں۔ یعنی کہ ساجھے کی ہنڈیا سے چٹخارے لیتے ہیں لیکن ان خطوں میں معاملہ برعکس ہے۔ ذرا دیکھئے غالبؔ کی طرح فیض کس کس انداز سے 'رشک' کا مضمون باندھتے ہیں۔ رقیبوں پر نظر رکھنے کے لیے جاسوس مقرر کرنے کی سوچتے ہیں......

''تمہیں نیا گھر مبارک ہو۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ ہم نے نہیں دیکھا۔ اس

میں ہمارا کوئی کمرہ ہوگا۔ خیر کبھی وہ بھی ہو جائے گا، لیکن اگر تمہارا ریٹائر
ہونے کا ابھی ارادہ نہیں تو اس دوران میں کیا ہوگا؟ خالد سعید بٹ کو لکھتے
ہیں کہ جاسوسی کے فرائض انجام دیں۔" (ص:۷۵)

"تم نے ہمارے دوست میر (علی احمد تالپور) صاحب کو بھی دریافت کر
لیا۔ بھلا تم سے کوئی کیسے بچ سکتا ہے؟ لیکن کسی خوبصورت عورت کو میر
صاحب کی رکھوالی میں دینا تو گوشت اور بلّی والا معاملہ ہے۔" (ص:۸۲)

"غلط قسم کے دوست چننے میں جو تمہیں مہارت حاصل ہے، اس کا کچھ
علاج ضرور ہونا چاہیے۔ مسکرا کر خیر مقدم کرنے تک تو ٹھیک ہے، لیکن اگر
مسکرانے کا انداز ہی ایسا ہو کہ...... "کسی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگیں" تو
اس میں کسی کی کیا خطا؟ اس کے جواب میں تم کہو گی کہ ہم کیا کریں، ہماری
صورت ہی ایسی ہے، تو وہ بات بھی ٹھیک ہے۔" (ص:۱۰۳)

'رشک' کے معاملے میں محترمہ بھی فیض سے کم نہیں۔ فیض نے ایک خط میں کسی
خاتون سے ملاقات کا ذکر کیا، اس کی باتیں انہیں پسند آئیں اور ان باتوں پر ایک گیت
لکھ دیا۔ یہ گیت انہوں نے محترمہ کو بھیجا۔ محترمہ نے لکھا: "میں بھی تو باتیں کرتی
ہوں۔" اس کے جواب میں فیض لکھتے ہیں: "تم نے چاہنے والوں کا ذکر کیا ہے، وہ تو
ہیں، اور اللہ انہیں خوش رکھے، لیکن ہر کسی سے تو وہ کچھ نہیں مانگ سکتے، نہ مل سکتا ہے جو
حسن اتفاق سے وہاں میسر آ گیا تھا، اور جس کی طلب ہمیشہ کی طرح باقی ہے۔ تم نے
لکھا تھا کہ تم بھی تو باتیں کرتی ہو، اور شاید اسی وجہ سے اچھی لگتی ہو۔ تم اچھی ضرور لگتی
ہو، لیکن اس میں باتیں کرنے کے علاوہ اور چیزوں کو بھی دخل ہے۔" (ص:۱۸۴)

خطوں کی توضیحی عبارتوں میں محترمہ نے بھی جگہ جگہ شاعری کی ہے۔ مثلاً......

"میرا جی چاہتا تھا کہ فیض صاحب مجھ سے ملیں تو میں اُن کو یہ خط واپس کر
دوں، لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔
بھلا کوئی شخص چودھویں کے چاند کو کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم اپنی چاندنی کا یہ

حصہ واپس لے لو جو ندی کے پانی کے بجائے اُداس ہوا میں تیرتا جا رہا ہے۔" (ص:۲۹)

"فیض صاحب کی شخصیت دراصل اب میرے لیے اس سنگ میل کی طرح تھی، زندگی کے سارے راستے جس سے ہو کر گزرتے ہیں۔"

"فیض کو الوداع کر کے...... جہاز کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ ہاتھ ہلایا، مجھے اپنا وجود جہاز کے پیچھے اُڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ کاش میں بھی ایک پرندہ ہوتی۔" (ص:۵۷، یکم مارچ ۱۹۸۹ء)

(۲)

"دامنِ یوسف" فیض کے سدابہار خطوط کا مجموعہ ہے۔ فیض شاعری میں طرزِ سخن کے موجد تھے ہی، نثر میں بھی انہوں نے ایک نئے انداز واسلوب کی بنیاد رکھی ہے۔ کوئی تعجب نہیں، آگے چل کر، غالب کی طرح فیض بھی اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ زیرِ نظر خطوں کے حوالے سے یاد رکھے جائیں۔ فرق یہ ہے کہ غالبؔ......

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

...... پر عامل تھے۔ فیض کا کوئی خط اور خط کا کوئی جملہ بھی بغیر "مطلب" کے نہیں ہے۔ غالب نے خط دل لگا کر لکھے تھے، فیض نے خطوط میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔

اُوپر کہیں ہم نے عرض کیا ہے کہ اس مجموعے میں محترمہ سرفراز اقبال کے بچوں کے نام فیض کے جو دو چار خط ہیں، ان میں بھی روئے سخن محترمہ ہی کی طرف ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔ ایک بچے نے اپنے خط میں محترمہ کے حوالے سے فیض صاحب کو بے وفائی کا طعنہ دیا۔ ماشاء اللہ کتنا سمجھ دار اور معاملہ فہم بچہ ہے! اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں...... "امی سے کہہ دینا یہ بے وفائی نہیں، دنیاداری ہے۔" (ص:۳۲) ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے...... "امی کے خط مل گئے ہیں، تم جواب میں ہماری طرف سے پیار کر لینا۔" (ص:۴۴) اسی طرح یہ جملہ بھی بیک وقت خوشی اور غم

کا آئینہ دار ہے...... ''تم نے امی کا جو حال لکھا ہے، اسے پڑھ کر کچھ اُداس بھی ہوں، لیکن دل کچھ خوش بھی ہوا کہ ہمیں کوئی یاد تو کرتا ہے۔'' (ص: ۶۰)

فیض بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہیں اور اُن سے انہیں کی سطح پر آ کر باتیں کرتے ہیں...... ''امی سے تم نے مقابلہ کب سے شروع کیا ہے؟ تم نے خود ہی لکھا ہے کہ وہ کبھی کبھی یاد کر کے رو بھی دیا کرتی ہیں لیکن تم نے کتنے آنسو بہائے ہیں؟'' (ص: ۶۲)

فیضؔ کے خطوں پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن ابھی ہمیں ابن انشاء اور سید سبط حسن کے خطوں کا ذکر بھی کرنا ہے، اس لیے فیض کے خطوں کی صرف ایک اور خصوصیت بیان کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے اور وہ ہے ان کا مزاحیہ انداز۔ ایک مرتبہ محترمہ حج کر کے آئیں تو فیض نے انہیں لکھا...... ''خوشی کی بات یہ ہے کہ تمہارے نو سو تو پورے ہو گئے۔ اب اگلے نو سو ہونے تک تمہیں کافی لمبی چھٹی ہے۔'' (ص: ۱۰۸)

اپنی اور محترمہ کی عمروں کے حوالے سے یوں گل افشانی ہے...... ''تمہیں ابھی سے اپنی عمر کی فکر کیوں ہونے لگی۔ ابھی تو...... تمہیں اپنے دامادوں کو رام کرنا ہے اور تمہاری یہی صورت رہی تو اُن کی اولادوں کو بھی۔ البتہ ہمیں اب کبھی کبھی یہ خیال ضرور آنے لگا ہے کہ اس عمر میں دنیا والوں سے منہ موڑ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے، لیکن تم جیسے لوگ یہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ بلکہ اب ہم دہلی گئے تو تم جیسے لوگوں میں ایک آدھ کا اور اضافہ ہو گیا۔ اگرچہ یہ بات تم سے نہیں کرنی چاہیے۔'' (ص: ۸۸)

محترمہ جب پہلی مرتبہ نانی اماں بنیں تو فیض صاحب نے جو برسوں پہلے نانا ابا بن چکے تھے، انہیں مبارکباد کا خط لکھا۔ یہ خط نانا نانی کے باہمی ربط کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے...... ''آپ خدا کے فضل سے نانی اماں بن چکی ہیں، مبارک ہو۔ میرے خیال میں اب تم اپنے لیے ایک ''گرینڈ مدر'' کا بیج بنوا لو جو بوقت ضرورت سامنے لگا لیا کرو، لیکن خیر نانی پن سے تم میں کیا فرق آئے گا۔ البتہ اب ہم واقعی ریٹائر ہونے کی سوچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کچھ دن تمہارے ساتھ گزار لیتے تو اچھا تھا۔'' (ص: ۱۰۳)

مختصر یہ کہ فیض کے خط بہت اہم ہیں۔ اُردو کے پس ماندہ اور درماندہ محققین کے لیے یہ ایک نیا موضوع ہے۔ اب وہ برسوں ان خطوں پر تحقیق کرتے رہیں گے۔ خود محترمہ کے نزدیک ان خطوں کی اہمیت کیا ہے، اس کا اندازہ اُن کے اِن الفاظ سے کیجیے...... ''میں جب فیض صاحب کے ان خطوں، ان کی باتوں، ان کے لفظوں اور ان کے پس منظر میں سانس لیتے جذبوں کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتی ہوں تو یہ سب مل کر مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے ابدی ہجرت میں یہی میرا زادِ سفر ہوگا اور کبھی کبھی تو میرا یہ گمان ایمان کا روپ دھار لیتا ہے کہ جب میری روح مکاں سے لامکاں کی وسعتوں میں تحلیل ہو رہی ہوگی تو حدِ نظر پر کسی مقدس سمت سے اچانک کوئی خوشبو دھنک رنگ لہجے میں سرگوشی کرے گی۔ ارے بھئی میرے خط کہاں ہیں؟ وہیں دنیا میں چھوڑ آئی ہو...... کیا ایسا ممکن ہے؟ کاش ایسا ممکن ہو۔'' (ص:۱۴۴)

فیض کے خطوں کے اس مجموعے میں ابن انشا اور سید سبط حسن کے بھی چند خطوط شامل ہیں۔ ممکن ہے کہ ان دونوں کے اور خطوط بھی ہوں جو الگ الگ مجموعوں کی صورت میں شائع ہوں۔ زیرِ نظر کتاب میں صرف وہی خطوط ہیں جن کا تعلق فیض صاحب سے ہے۔ پہلے ذرا ابن انشاء کی استادانہ نثر کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے......

> ''فیض صاحب کے واپس آجانے کا اور وہاں موجود ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اور کوئی باقی نہیں رہا۔ سورج اپنی جگہ، چاند اپنی جگہ، چھوٹے موٹے ستارے اپنی جگہ۔ بعض ایسی راتیں بھی ہوتی ہیں کہ سورج ہوتا ہے نہ چاند ہوتا ہے۔ بس ستاروں کو دیکھ کر اور گن کر دل بہلانا پڑتا ہے بلکہ گننے اور دل بہلانے کے لیے ستارے زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ سورج صرف ایک ہے، چاند بھی ایک ہے، اسے کوئی کہاں تک گنے گا؟'' (ص:۳۶)
>
> ''اس دورِ الفت میں دیکھنا اپنے ہاتھ وغیرہ نہ کٹا لینا۔ یہ ہر قسم کی چوری پر کاٹا جاسکتا ہے۔ سینہ زوری پر دونوں کٹنے چاہئیں۔'' (ص:۳۷)

”......اب تو میرا تعارف اس حیثیت سے کرایا جاتا ہے کہ ان سے ملو، یہ معمولی آدمی نہیں ہیں۔ یہ بیگم سرفراز اقبال کے جاننے والے ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب اس شخص کا نام فیض، قدرت اللہ شہاب وغیرہ کی فہرست میں آتا ہے تو یہ بھی کچھ تو ہوگا۔ ایسے ویسے کو تو بیگم اقبال منہ لگانے سے رہیں۔ میں آپ کا Fan ہوں۔“ (ص:۳۹)

ابن انشا تو خیر مزاح نگار تھے، ان سے اس قسم کی باتیں غیر متوقع نہیں لیکن خدا جانے سید سبط حسن جیسے سنجیدہ آدمی کو کیا ہوا کہ انہوں نے فیض صاحب کے انتقال کے فوراً بعد اُن کی ”متروکات سخن“ کو ”متروکات منقولہ“ سمجھ کر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ انہوں نے فیض کے انتقال پر تعزیت بھی محترمہ ہی سے کی۔ تعزیتی خط کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں...... ”میرے اچھے دوست! محبت بہت لطیف، بہت پاکیزہ جذبہ ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں، قدرت جن کو یہ جذبہ عطا کرتی ہے۔ وہ ساری عمر گزار دیتے ہیں۔ نہ کسی سے محبت کر پاتے ہیں نہ کوئی ان سے محبت کرتا ہے۔ مگر آپ تو اُن خوش قسمت اور خوش خصلت انسانوں میں سے ہیں جن کو محبت کرنا آتا ہے۔ مجھ کو کبھی کبھی فیض صاحب پر رشک آتا تھا، ان کو کتنا پیارا چاہنے والا ملا ہے۔ مگر وہ تو خود بہت ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ مجھ میں وہ دلداری کی صلاحیت کہاں، لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کے غموں کو جہاں تک ممکن ہو، ہلکا کر دوں یا بانٹ لوں۔“ (ص:۱۲۱)

سید صاحب نے غموں کو ہلکا کرنے یا بانٹنے کی بات محض تکلفاً نہیں لکھی۔ وہ واقعی غم کی تصویر بن گئے...... ”میری مہربان دوست! خوش رہو۔ مگر تم بتاؤ یہ کوئی دوستی ہوئی کہ نہ خط نہ ٹیلی فون نہ تصویریں، جن کا تم نے وعدہ کیا تھا۔ اب میں صبح شام اپنے ڈاک کے ڈبے کھولتا ہوں کہ شاید تمہارا کوئی خط ہو مگر ناکامی ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم فیض صاحب کا احسان کبھی نہ بھولیں گے جن کی بدولت تم سے ملنا نصیب ہوا، ورنہ اتنے بھرے دربار میں اس فقیر گوشہ نشین کی رسائی محال تھی۔ کئی دن سے تم بہت یاد آ رہی ہو۔ کل جی بہت گھبرایا تو ”نسخہ ہائے وفا“ کی ورق گردانی شروع کر دی۔ پھر شعر

گنگناتے گنگناتے کچھ مصرعے بننے لگے۔ بس تک بندی کی ہے اور شاعری کا خون کیا ہے۔ بہرحال جس کی یادوں نے یہ الٹے سیدھے شعر کہلوائے ہیں، اُسی کی نذر ہیں۔''
(ص:۲۲۴)

سید سبط حسن اور شاعری؟ جی ہاں، انہوں نے شاعری بھی کی ہے۔ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری نظم ایک ادبی ''شاہکار'' ہے۔ یہ نظم ملاحظہ فرمایئے اور اس کی داد دیجیے کہ سید صاحب نے بارہویں مصرعے میں محترمہ کا نام کس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے......

میرے محبوب کے ہونٹوں کی مٹھاس
میرے محبوب کے ہونٹوں کی حرارت
لب گویا! تری شیرینی گفتار کہاں سے لاؤں؟
تیرا انداز تکلم، جس سے خوش بوئے وفا آتی ہے
چاہت کی مہک، پیار کے پھول
الفت و مہر کا مژدہ لائے
عہد و پیمان کا نغمہ جن کو
میرے کانوں نے سنا، میری آہوں نے سنا
اور قلب مضطر نے تسلی پائی

میرے غم خانے میں یہ کون آیا
آیا اور درد کا درماں بن کر
مجھ کو سرفراز کیا
خوشبوؤں کا در باز کیا

اور اب یادوں کی سب رنگ دھنک

تجدید ملاقات کا ارماں بن کر
ان کی بانہوں کی طرح
میری فرقت کے شب و روز کو
اپنی آغوش محبت میں سکوں بخشتی ہے

فیض صاحب نے اپنے خطوں میں نثر میں شاعری کی ہے۔ سید صاحب نے شاعری میں نثر لکھی ہے۔ پہلے کام کی طرح یہ کام بھی بہت مشکل ہے۔

سید صاحب نے محترمہ کو خوش کرنے کے لیے اپنے ایک خط میں بیگم ایلس فیض کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے...... ''ایلس کی بے رخی کا شکوہ فضول ہے۔ وہ فیض صاحب کی کسی چاہنے والی کو پسند نہیں کرتیں بلکہ اپنا رقیب سمجھتی ہیں۔ یہ ان کا احساس کمتری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ آپ اپنا دل میلا نہ کریں۔'' (ص:۱۲۱)

محترمہ ایلس فیض کی نظر سے جب یہ الفاظ گزریں گے تو انہیں رنج ہوگا کہ فیض کا ایک اتنا قریبی دوست ان کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا۔ ہماری دلی ہمدردیاں بیگم فیض کے ساتھ ہیں لیکن ہماری ہمدردیوں سے کیا ہوتا ہے؟ سنا ہے بیگم سرفراز اقبال کے پاس فیض کے کئی اور قریبی دوستوں کے خطوط بھی ہیں۔ جب یہ خطوط شائع ہوں گے تو معلوم ہوگا کہ فیض کیسے کیسے دوستوں کے درمیان زندگی بسر کر گئے!

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کتاب کا نام ''دامنِ یوسف'' کی بجائے ''دامنِ تار تار'' ہونا چاہیے کیونکہ اس کے ہر صفحے پر ''دستِ زُلیخا'' کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کتاب میں پاکیٔ داماں کی حکایت بیان کی گئی ہے، اس لیے وہی نام دُرست ہے جس نام سے یہ کتاب چھپی ہے۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو فریقین کا طریقۂ واردات ہے اور پڑھنے والوں کو اِسی سے سروکار رکھنا چاہیے۔

ایک قاری نے یہ شکایت کی ہے کہ کتاب کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ صرف

۱۲۶/صفحات ہیں اور قیمت ۷۰/روپے ہے۔ ناشر نے زیادہ صفحات کا تاثر دینے کے لیے کتاب کے آخری چار صفحات میں نمبر شمار میں سو کا اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ۱۲۶/صفحات ۲۲۶/ہو گئے ہیں۔ محترم قاری کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ کتاب ہرگز مہنگی نہیں ہے۔ ۷۰/روپے دراصل اس تصویر کی قیمت ہے جو کتاب کے عقبی سرورق پر چھاپی گئی ہے جس میں فیض صاحب شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے پلنگ پر نیم دراز ہیں اور ان کے شانوں پر ہاتھ رکھے کوئی اور بھی موجود ہے۔ ۷۰/روپے میں یہ تصویر خریدیے، کتاب اس کے ساتھ مفت ملے گی۔

○○

(۸/مارچ ۱۹۸۹ء)

انیس امروہوی

فیضؔ احمد فیضؔ: مختصر زندگی نامہ

- ۱۳؍فروری ۱۹۱۱ء کو قصبہ کالا قادر ضلع سیالکوٹ، پنجاب (پاکستان) میں فیض احمد فیضؔ کی ولادت ہوئی۔
- فیضؔ کے والد چودھری سلطان محمد خاں سیالکوٹ کے معروف بیرسٹر اور ادب نواز انسان تھے۔
- اسکول میں فیضؔ کی تاریخ ولادت ۷؍جنوری ۱۹۱۲ء درج ہے۔
- فیضؔ کے خاندان کا تعلق سہارنپور (اُتر پردیش) کے راجہ سین پال کی نسل سے تھا، جس کی اولاد میں سے کسی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔
- فیضؔ کے والد نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا بے اولاد انتقال ہوا۔ بعد کی دو بیویوں سے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہوئیں۔ والد کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا۔
- فیضؔ کی والدہ کا نام سلطان فاطمہ تھا۔
- فیضؔ کے بھائی بہن بالترتیب اس طرح ہیں۔ حاجی طفیل احمد، میجر عنایت احمد، بشیر احمد، بیگم شجاع الدین، بیگم حمید، بیگم نجیب اللہ خاں، بیگم اعظم علی، رشیدہ سلطانہ۔
- فیضؔ کو بچپن میں اپنی بوڑھی ملازمہ، جنہیں نانا جی کہتے تھے، سے کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔
- ۱۹۱۵ء میں فیضؔ نے قرآن پاک کے دو سی پارے حفظ کیے۔

- ۱۹۱۶ء میں ابراہیم سیالکوٹی کے مکتب گئے اور عربی اور فارسی کی تعلیم شروع کی۔
- ۱۹۲۱ء میں سیالکوٹ کے سکاچ مشن ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخل ہوئے۔
- ۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔
- ۱۹۲۸ء میں شاعری کا آغاز ہوا۔ اسی برس اخوان الصفا کے مشاعرے میں پہلی بار فیض نے غزل پڑھی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا......

  لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے

  وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا

- ۱۹۲۹ء میں مرے کالج، سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اسی کے ساتھ علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی میر حسن سے باقاعدہ فارسی اور عربی کی تعلیم بھی لیتے رہے۔
- ۱۹۲۹ء میں فیض احمد فیض کی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' گورنمنٹ کالج، لاہور کے رسالہ ''راوی'' میں شائع ہوئی۔
- ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی۔اے اور پھر عربی میں بی۔اے آنرز کیا۔
- ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔
- ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں ایم۔اے فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ اسی برس پہلا مضمون بھی شائع ہوا۔
- ۱۹۳۵ء میں امرتسر کے ایم۔اے۔او کالج میں بحیثیت لکچرار فیض کا تقرر ہوا۔
- ۱۹۳۸ء میں ماہنامہ ''ادب لطیف'' کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں۔
- ۱۹۴۰ء میں ملازمت ترک کی اور لاہور کے ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔
- ۲۸/اکتوبر ۱۹۴۱ء کو لندن نژاد انگریز خاتون مس ایلس جارج سے فیض کا عقد اسلامی شرع کے مطابق سری نگر میں ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ نے نکاح پڑھایا اور ایلس کا اسلامی نام 'کلثوم' رکھا گیا۔ بعد میں ''دست صبا'' کا انتساب بھی فیض نے

کلثوم کے نام کیا ہے۔ مس ایلس دین محمد تاثیر کی بیگم کی حقیقی بہن تھیں۔

- اس شادی میں جوشؔ ملیح آبادی اور مجازؔ، جی۔ ایم۔ صادق، ڈاکٹر تاثیر، بیگم تاثیر اور اُن دنوں سری نگر میں ہیلتھ انسپکٹر نور حسین بطور خاص شریک ہوئے۔
- ۱۹۴۱ء میں ہی فیض احمد فیضؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''نقشِ فریادی'' شائع ہوا، اسی برس درس و تدریس کے پیشے کو خیر باد کہہ کر فیضؔ فوج میں کیپٹن کے عہدے پر فائز ہوئے اور لاہور سے دہلی منتقل ہو گئے۔
- ۱۹۴۲ء میں ترقی پا کر فیضؔ میجر کے عہدے پر محکمہ تعلقات عامہ دہلی میں فائز ہوئے۔ اسی برس فیضؔ کی بڑی بیٹی سلیمہ کی ولادت ہوئی۔
- ۱۹۴۴ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ہوئی۔
- ۱۹۴۵ء میں فیضؔ کی چھوٹی بیٹی منیزہ کی ولادت ہوئی۔
- یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے کر فیضؔ دہلی سے واپس لاہور چلے گئے۔
- ۱۹۴۷ء میں فیضؔ حکومت پنجاب لیبر ایڈوائزری کمیٹی کے سرپرست بنائے گئے اور ۱۹۵۱ء تک بنے رہے۔
- ۱۹۴۷ء میں فیضؔ نے پروگریسیو پریس لمیٹڈ میں ''پاکستان ٹائمز'' اور روزنامہ ''امروز'' اور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۸ء تک چلتا رہا۔
- ۱۹۴۸ء میں عالمی امن کونسل کی ریگزیکیوٹو کمیٹی کے رکن بنے اور ۱۹۷۰ء تک بنے رہے۔
- ۱۹۴۸ء میں ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدوروں کے نائمدے کی حیثیت سے فیض احمد فیض نے سان فرانسسکو کی کانفرنس میں شرکت کی۔
- ۱۹۴۹ء میں ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدوروں کے نائمدے کی حیثیت سے فیض احمد فیض نے جنیوا کی کانفرنس میں شرکت کی۔

- ۱۹۵۰ء سے ایرانی عوام، فلسطینی عوام اور افریقی عوام کی آزادی کی تحریکات سے جڑے رہے۔
- ۹؍مارچ ۱۹۵۱ء کو لیاقت خاں کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش میں فیضؔ گرفتار ہوئے اور ۲۰؍اپریل ۱۹۵۵ء کو رہائی نصیب ہوئی۔ یہ مقدمہ راول پنڈی سازش کیس کے نام سے مشہور ہے۔
- ۱۹۵۱ء میں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر چنے گئے۔
- ۱۹۵۲ء میں فیض احمد فیضؔ کا دوسرا شعری مجموعہ ''دست صبا'' شائع ہوا۔
- ۱۹۵۳ء کی ۲۸-۲۹؍اپریل کی درمیانی شب میں حیدرآباد کی سینٹرل جیل میں فیضؔ نے اپنی مشہور نظم ''کنج زنداں میں''، لکھی۔
- ۱۹۵۶ء میں ایشین رائٹرز کانفرنس منعقدہ دہلی میں لاہور سے اعجاز حسین بٹالوی کے ہمراہ شرکت کے لیے تشریف لائے۔ اسی برس فیضؔ کا تیسرا مجموعہ ''زنداں نامہ'' شائع ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں ہی فیض احمد فیضؔ نے پاکستان کے وزیر اعظم کے ہمراہ چین کا دورہ کیا۔ اس وفد میں روزناموں کے سولہ مدیران شامل تھے۔
- ۱۹۵۷ء میں وی۔ جی۔ کیرتن نے فیضؔ کی شاعری کے انتخاب کا ترجمہ ''پوئمز بائی فیضؔ'' کے عنوان سے کیا۔ انگریزی زبان میں فیضؔ کے تعلق سے یہ پہلی کتاب ہے۔
- ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خاں کی ڈکٹیٹرشپ کے دَور میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور ۱۹۵۹ء میں رہا کیے گئے۔
- ۱۹۵۸ء سے ایفرو ایشیائی ادبی انجمن کے بنیادی رکن رہے اور آخری دم تک بنے رہے۔
- ۱۹۵۹ء میں مارشل لاء کے تحت فیضؔ پہلے لاہور جیل میں اور پھر قلعۂ لاہور میں مہمانِ زنداں رہے۔ اِسی برس ۱۱؍فروری کو لاہور جیل میں ہی فیضؔ نے اپنی مشہور نظم ''آج بازار میں پابہ جولاں چلو......''، لکھی تھی۔

- ۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹ کونسل، لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے۔
- ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک فیض احمد فیضؔ نے محکمہ اطلاعات و نشریات میں بطور اعزازی مشیر خدمات انجام دیں۔
- ۱۹۶۲ء میں فیضؔ کو بین الاقوامی لینن ایوارڈ سے نوازا گیا۔
- ۱۹۶۳ء میں فیض احمد فیضؔ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''میزان'' شائع ہوا۔
- ۱۹۶۴ء میں عبداللہ ہارون کالج، کراچی میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ اسی برس انگلستان، روس، الجیریا، مصر، لبنان اور ہنگری کے طویل سفر کیے۔
- ۱۹۶۵ء میں فیضؔ کا چوتھا شعری مجموعہ ''دست تہہ سنگ'' شائع ہوا۔
- ۱۹۷۰ء میں پہلی بار فیض احمد فیضؔ کی ملاقات سرفراز اقبال سے احمد فرازؔ کے ذریعہ ہوئی، جو بعد میں گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔
- ۱۹۷۱ء میں فیض احمد فیضؔ کا پانچواں شعری مجموعہ ''سروادی سینا'' شائع ہوا۔ اسی برس فیضؔ نے ماسکو کا سفر کیا۔
- ۱۹۷۲ء میں فیضؔ کے خطوط کا مجموعہ ''صلیبیں میرے دریچے میں'' شائع ہوا۔ اسی برس فیضؔ کو قومی ادبی اکادمی پاکستان کا صدر منتخب کیا گیا۔
- ۱۹۷۳ء میں فیضؔ کا چھٹا شعری مجموعہ ''متاع لوح وقلم'' شائع ہوا۔
- ۱۹۷۴ء میں ''سفرنامہ کیوبا'' شائع ہوا۔
- ۱۹۷۶ء میں ادبی ایفروایشیائی لوٹس انعام سے نوازا گیا۔
- ۱۹۷۷ء میں فیض احمد فیضؔ کے بارے میں ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' لاہور سے شائع ہوئی۔
- ۱۹۷۸ء میں ''شام شہر یاراں'' شائع ہوا۔ اسی برس ایفروایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے نمائندہ اخبار لوٹس کی ادارت سے وابستہ ہوئے۔
- ۱۹۷۹ء کی ۱۳رفروری کو فیضؔ کی پینسٹھ ویں سالگرہ پر پاکستان کی ایک ریکارڈنگ کمپنی ای۔ ایم۔ آئی نے فیضؔ کی غزلوں کا ایل۔ پی۔ (لانگ پلے) ''نیّرہ

سنگ فیضؔ'' کے عنوان سے جاری کیا۔

- 1981ء میں ''میرے دل میرے مسافر'' شائع ہوا۔
- فیضؔ اپنی تمام عمر میں حافظؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور داغؔ سے بے حد متاثر رہے۔
- فیضؔ نے فلم ''جاگو ہوا سویرا'' اور فلم ''درد ہے دُکھ کا دیس'' کے نغمے اور مکالمے بھی تحریر کیے۔
- ۱۹۸۴ء میں ۲۰/نومبر بروز منگل دوپہر ایک بج کر پندرہ منٹ پر لاہور کے میو ہاسپٹل کے ایسٹ میڈیکل وارڈ میں فیض احمد فیضؔ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے حقیقی خالق سے جا ملے۔
- ۱۹۸۸ء میں فیض احمد فیضؔ کے خطوط پر مشتمل کتاب ''دامن یوسف'' شائع ہوئی۔ یہ خطوط فیضؔ نے اپنی بہترین دوست سرفراز اقبال کو لکھے تھے۔

○○

کتابیات

استفادہ اور شکریہ

۱۔ فن اور شخصیت، فیض نمبر، ممبئ، مدیر: صابر دت

۲۔ معیار، فیض نمبر، دہلی، مدیر: شاہد ماہلی

۳۔ معاصر، لاہور، مدیر: عطاالحق قاسمی

۴۔ معیار، اسلام آباد۔

۵۔ انتخاب مضامین ظ۔ انصاری، رسالہ ''چراغ''، بمبئ۔

۶۔ فیض احمد فیضؔ: تنقیدی جائزہ، (کتاب) مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم

۷۔ ہدایت نامہ شاعر (کتاب)، ساقی فاروقی

۸۔ پانچ جدید شاعر (کتاب)، حمید نسیم

۹۔ تلاش و تعبیر (کتاب)، رشید حسن خاں

۱۰۔ میرے ہم سفر (کتاب)، احمد ندیم قاسمی

۱۱۔ دامنِ یوسف (کتاب)، سرفراز اقبال

۱۲۔ سخن در سخن (کتاب)، خامہ بگوش، مشفق خواجہ۔

۱۳۔ یہ صورت گر کچھ خوابوں کے (کتاب) طاہر مسعود

۱۴۔ تفہیم (کتاب)، اختر شاہجہاں پوری، ۲۰۱۱ء

○○

عِلم اور عَمل

یادرکھو کہ
عِلم کے ساتھ عَمل ضروری ہے
نہ عَمل کے بغیر عِلم نافع ہے اور نہ عِلم کے بغیر
عَمل نفع بخش ہے
جس عِلم کی پُشت پر عَمل موجود نہ ہو
وہ عِلم جہل ہی کے زُمرے میں شامل ہے۔

OO

— **حضرت داتا گنج بخشؒ**

﴾کَشفُ اَلمَحجُوبُ سے﴿

اُس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اے چشم تماشائی (فیضؔ)
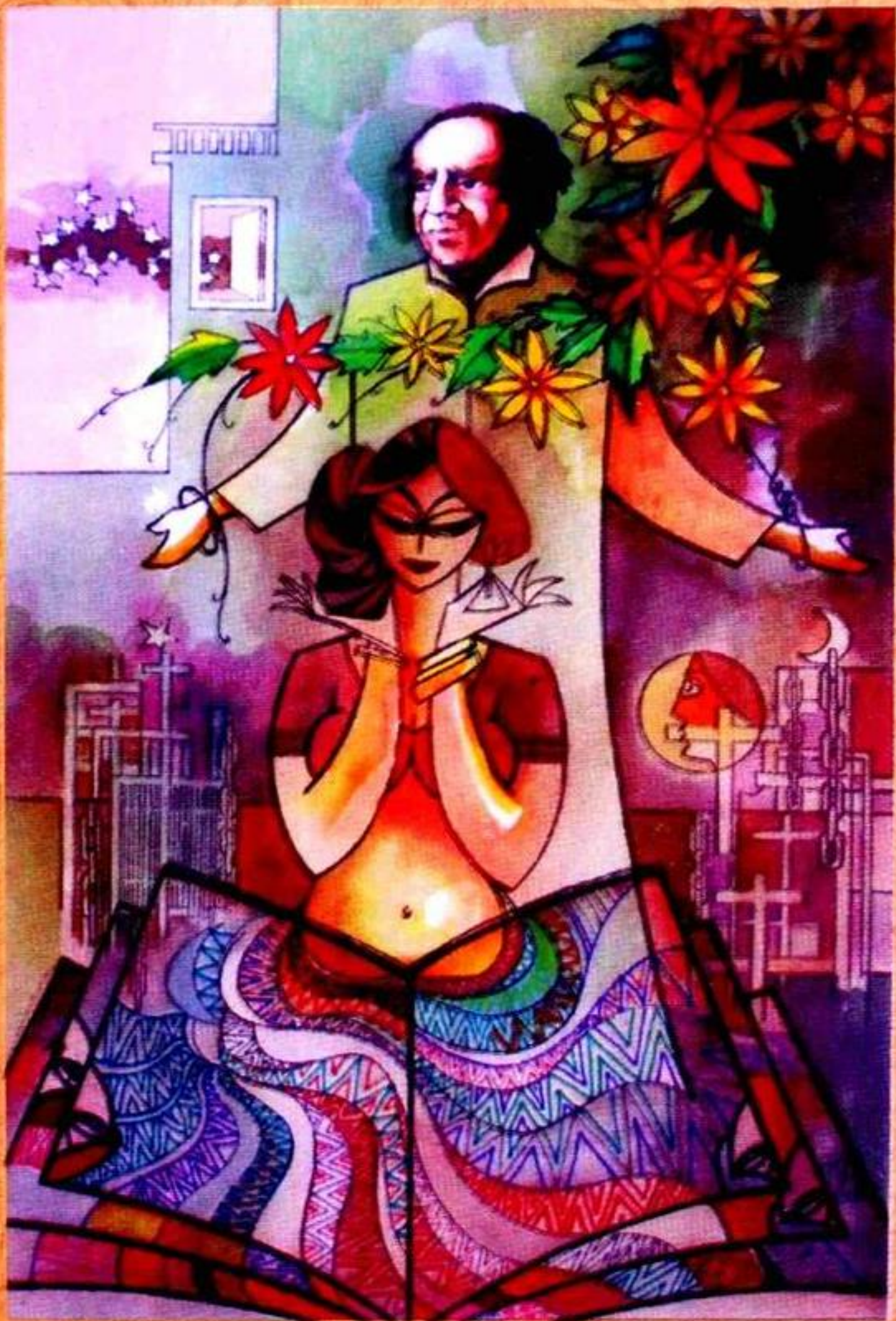
عمل: اسلم کمال

بہار آئی تو جیسے یک بار......... (نظم) (فیض)

عمل: اسلم کمال
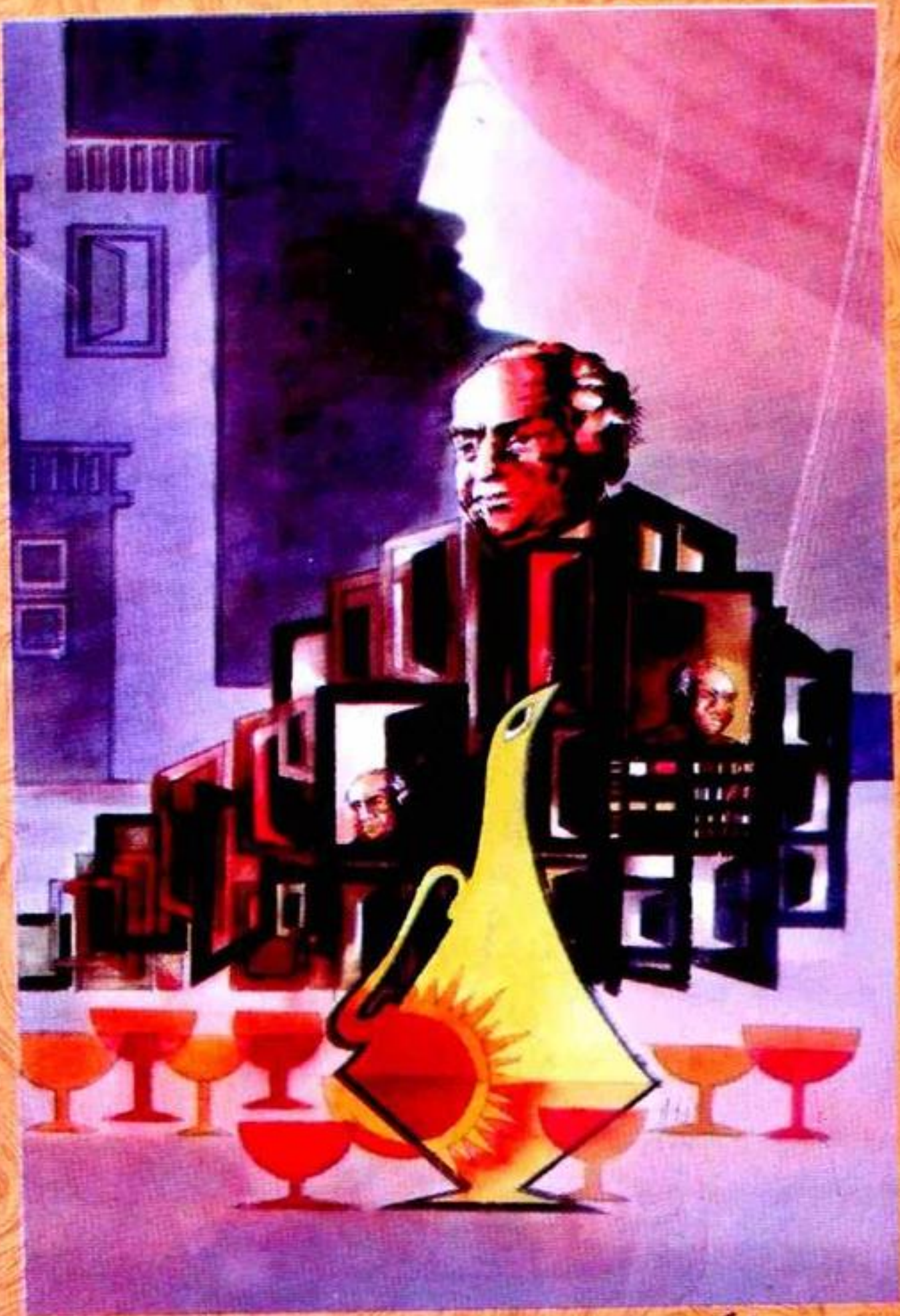
آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے سے (فیضؔ)

عمل: اسلم کمال

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ راہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے (فیض)

عمل: اسلم کمال
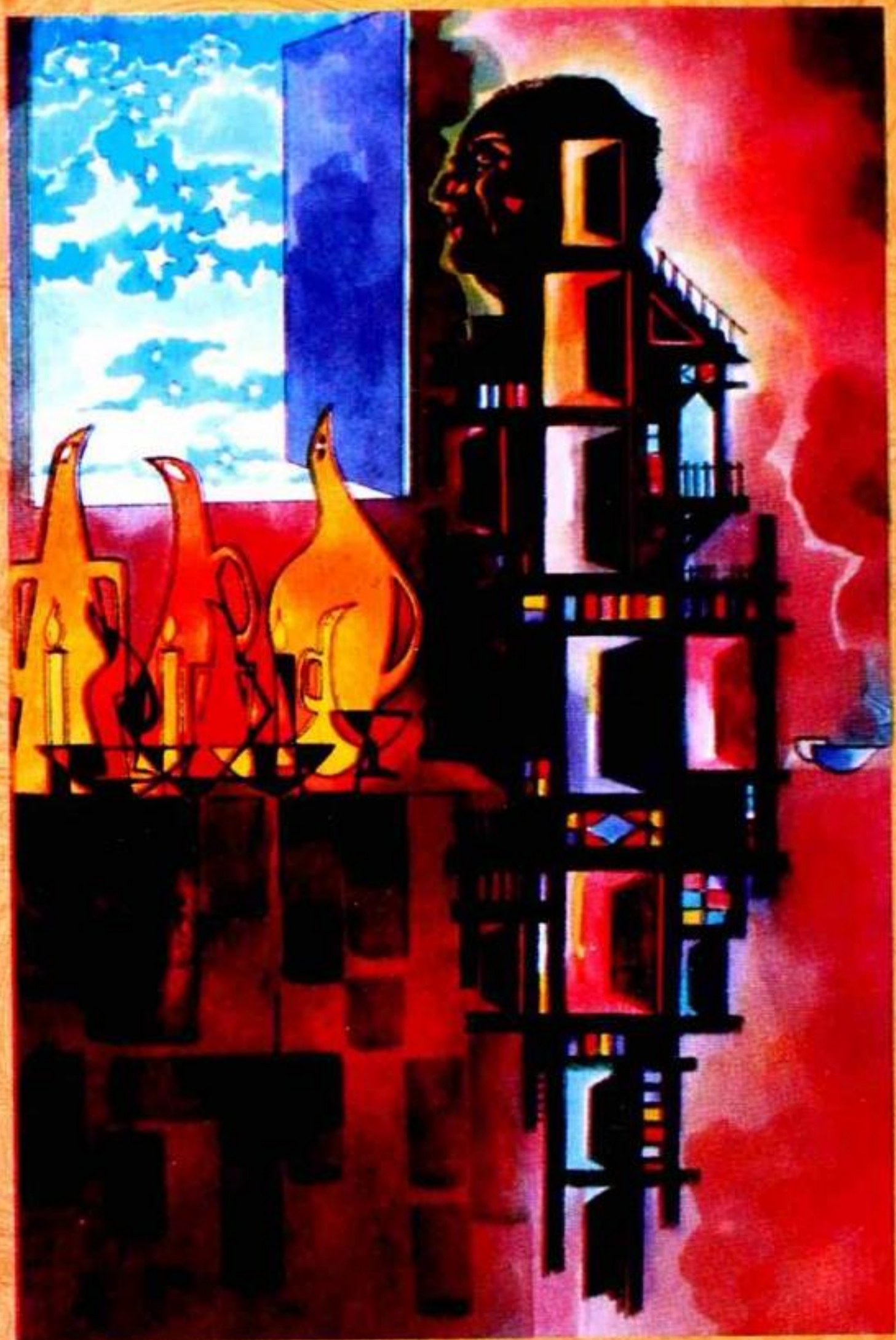
تنہائی (نظم) (فیضؔ)

عمل: اسلم کمال

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
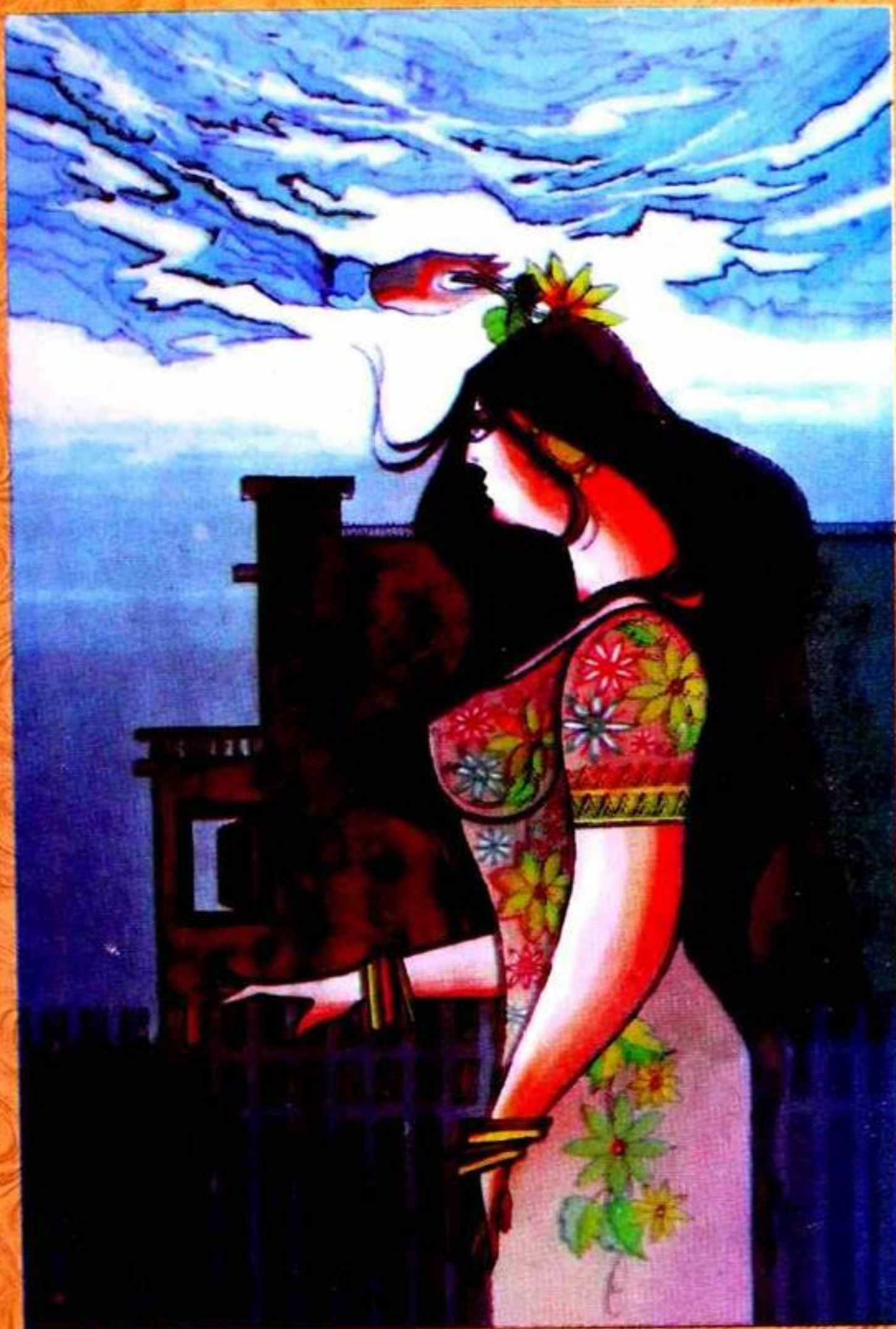
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام (فیضؔ)

عمل: اسلم کمال

خُدا وہ دِن نہ کرے کہ سوگوار ہو تُو (نظم) (فیض)

عمل: اسلم کمال

تری کج ادائی سے ہار کر شبِ انتظار چلی گئی

مرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے (فیضؔ)

عمل: اسلم کمال